واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

۳۱۔ نیا گاؤں مغربی ۲۲۶۰۱۸
الفرقان بکڈپو (نظیر آباد) لکھنؤ۔ انڈیا

واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی

الفرقان بکڈپو ۳۱- نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ-۲۲۶۰۱۸ انڈیا

[illegible]

- ابوالفرج اصفہانی شیعی ہیں۔ حضرت معاویہ کے خلاف جو بات ملے خوشی سے قبول کر لیتے ہیں خواہ کیسا ہی جھوٹ ہو صفحہ ۱۱۳ شبلی رحمہ
- حضرت حسینؓ کے نام کے ساتھ "امام" کا لفظ شیعی اصطلاح ہے صفحہ ۱۲۴
- یزید کو ولی عہد بنانا اسلامی قانون کی خلاف ورزی نہیں صفحہ ۳۱۶ ابن حزم
- امام نسائی کا واقعہ جو حضرت معاویہ کے خلاف بات کرنے پر ان کے ساتھ بیتی صفحہ ۱۵۱
- حضور کی حدیث: شریف کو گناہ پر چھوڑنا اور ضعیف اور چھوٹے کو پکڑنا، اسکی مذمت صفحہ ۹۲

- عام عربوں کا رجحان بنو ہاشم کے مقابلے میں بنو امیہ کی طرف زیادہ تھا۔ مورخین نے بنو امیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ پہلے ہم بھی بنو امیہ کے خلاف باتیں پڑھ کر متاثر ہو جاتے تھے مگر اب نہیں۔ صفحہ ۸۳ مولانا سندھی رحمہ
- صحابی پر نامناسب تنقید کے حوالے سے سید سلیمان ندوی کا رجوع [illegible] کی وجہ سے صحابہ سے سوء ظن پیدا ہوتا تھا صفحہ ۳۲۸
- حضرت ابوسفیان کے خلاف ابوالحسن ندوی صاحب کا [illegible] صفحہ ۸۵ [illegible]
- یزید خلافت ملنے تک صالح تھا۔ مولانا گنگوہی رحمہ صفحہ ۱۲۵
- مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ کا قلم جب بنو امیہ کے بارے میں تیز چلا تو علامہ شبلی نعمانی رحمہ نے ان کا خوب تعاقب کیا۔ جس میں بنو امیہ، حجاج رحمہم کی دینی و سیاسی خدمات کو سراہا گیا ہے صفحہ ۳۲۷ تا ۳۳۹

واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان بکڈپو ۱۱۴۔ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

نوٹ: واقعۂ کربلا پر تبصرہ اور خیال حضرت سید سلیمان ندوی کے فرزند سید سلمان ندوی کا ملاحظہ ہو: ماہنامہ الفرقان لکھنؤ مئی ۲۰۰۷ء
جلد ۷۲ شمارہ ۵ ص ۳۴

(حقوق طبع محفوظ ہیں)

تیسرا ایڈیشن ——— فروری ۲۰۰۰ء

صفحات ——— ۳۱۶

کتابت ——— مولانا عبدالسمیع

کمپیوٹر کمپوزنگ ——— پرنٹ لائن کمپیوٹرس، لکھنؤ

طباعت ——— کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ

ناشر ——— الفرقان بکڈپو، نظیر آباد لکھنؤ

قیمت:

یہ کتاب درج ذیل پتہ سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے

FURQAN PUBLICATIONS
90B HANLEY ROAD
LONDON N4 3DW (U.K.)

انتساب

والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے نام

جن کے

فیضِ قلب ونظر کے لئے

میری ساری زندگی ممنون ہے

اور

اسی فیض کا اثر میری نظر میں یہ کتاب بھی ہے

جو انھیں کے ارشاد کی تعمیل میں لکھی گئی۔

فہرست

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر

عنوانات	صفحہ نمبر
دیباچہ طبع سوم	۱
مکاتیب گرامی ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس)	۷
دیباچہ طبع دوم	۹
افتتاحیہ از والد ماجد حضرت مولانا نعمانیؒ	۱۱
بچپن کی باتیں	۱۱
سنبھل کے ڈھول	۱۲
عشرۂ محرم کے معمولات	۱۲
ہمارے گھر کی مجلس	۱۳
کچھ اپنا رونا رلانا	۱۳
تبدیلی کا آغاز	۱۴
شہرت عام کی تاثیر	۱۵
الفرقان ۱۳۷۰ھ کا مضمون	۱۶
یہ کتاب	۱۷
مقدمہ (از مصنف)	۱۹
تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال	۲۱
طبری کا اپنا اعتراف	۲۲
پھر کونسی بات بعید ہے	۲۳
کربلا کے واقعہ میں غلط بیانی کے اسباب	۲۴
کام مشکل بھی اور ضروری بھی	۲۵
ایک ناگزیر ضمنی بحث	۲۶
اصلی بات جو کہنا تھی	۲۹
سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات	۳۰
حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ	۳۱
بے انصافی کی ایک مثال	۳۲
لکیر کی فقیری یا طلب علم و تحقیق	۳۴
مومن کا معیار اور اس کی ذمہ داری	۳۷
اس کام کی ضرورت	۳۹
کچھ حوالوں کے سلسلہ میں	۴۰
تشکر و امتنان	۴۱
باب اول-۱	
شہادت عثمان-خانہ جنگی-صلح حسن	۴۳
شہادت عثمانؓ اور خانہ جنگی	۴۳
جنگ جمل اور صفین	۴۴
حضرت علیؓ کی شہادت	۴۷
حضرت حسنؓ کی خلافت	۴۷
عالی مقام بیٹا	۴۸
امن و یکجہتی کے بیس سال	۵۲
حضرت معاویہؓ اور حضرات حسنینؓ	۵۳
باب دوم-۲	
کوفی مزاج-ریشہ دوانیاں-اور حضرت حسینؓ	۶۱
اہل کوفہ	۶۱
حضرت حسینؓ کی رائے	۶۵
باب سوم-۳	
یزید کی ولیعہدی کی تجویز اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ	۶۹
ولیعہدی کی تجویز	۷۰
حضرت مغیرہؓ کا مقام صحابیت	۷۰
حضرت مغیرہؓ خلفائے راشدینؓ کے دور میں	۷۲
فاروقی انتظامیہ کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہؓ	۷۴
حضرت مغیرہؓ کی دوسری عظمت	۷۶
بدنام کن روایت کا متن	۷۷
کچھ اور اس سے بڑھتی ہوئی روایتیں	۸۰
حاصل کلام	۸۱
ایک اور پہلو	۸۲
طبری کی روایت کا سقم	۸۳
ایک اور سوال	۸۴
اور اب سند کی بات	۸۶
باب چہارم-۴	
ولیعہدی کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟	۸۷
قرین قیاس بات	۸۹
ایک اور فائدہ	۹۱
باب پنجم-۵	
ولیعہدی کی بیعت اور مخالفین کا قصہ	۹۳
نہ صرف ابن عباسؓ بلکہ ابن ابو بکرؓ بھی	۹۴
ابن کثیر کا بیان	۹۷
طبری کی روایت	۹۸
ایک سوال اور اس کا حل	۱۰۰
وفود کی کہانی	۱۰۲
سوالیہ نشان	؟
ابن اثیر اور حضرت معاویہ کا سفر حجاز	۱۰۹
ایک لمحۂ فکریہ	۱۱۴
واقعہ کی قرین قیاس صورت	۱۱۷
فیصلہ کن بات	۱۲۳
باب ششم-۶	
یزید کی ولیعہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟ اور دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟	۱۲۵
اصرار اور اس کی بنیاد	۱۲۵
ابن خلدون کا کلام	۱۲۸
اس کلام پر ایک تنقیدی نظر	۱۳۲
اہل اختلاف کے اختلاف کی بنیاد	۱۳۷
یزید اپنے ایک خطبے کے آئینہ میں	۱۴۲
ضمیمہ-ایک اہم فائدہ	۱۴۷
باب ہفتم-۷	
حضرت امیر معاویہ کی وفات-عہد یزید کا آغاز حضرت حسینؓ کی ہجرت	۱۵۱
یزید کو معاویہؓ کی وصیت	۱۵۱
مخالفین سے بیعت کا مطالبہ	۱۵۵

اسی واقعہ کی دوسری روایت	۱۵۶
نتیجہ بحث	۱۵۹
امام باقر کی روایت	۱۵۹
مکہ کو روانگی	۱۶۰
پورے کنبہ کے ساتھ	۱۶۱
شاہراہ سے سفر	۱۶۲
خیرخواہوں اور عقیدتمندوں کے مشورے	۱۶۳
ایک اور روایت	۱۶۵
دونوں روایتوں کے لہجے کا فرق	۱۶۶

باب ہشتم-۸
مکہ میں ورود - اہل کوفہ کے خطوط - اور وفود ۱۶۹

مسلم بن عقیل کا مشن	۱۶۹
مسلم بن عقیل کوفہ کو	۱۷۰
والی کوفہ حضرت نعمان بن بشیر کا انتباہ	۱۷۱
امیر یزید کو شکایت	۱۷۱
عبید اللہ بن زیاد کا تقرر	۱۷۲
کوفے میں تقریر	۱۷۲
عملی کارائی	۱۷۳
مسلم کی تبدیلیٔ مکان	-۳
ایک معمہ	۱۷۳
ایک اور معمہ	۱۷۵
مزید برآں	۱۷۵
کیا ہونا چاہئے تھا؟	۱۷۶
جناب مسلم کا انجام	۱۷۷
تنہائی کی پسپائی اور مسلم بن عقیل کا سانحہ	۱۷۸

باب نہم-۹
قافلۂ حسین اپنی آخری منزل کی طرف ۱۸۱

حج سے ایک دن پہلے روانگی	۱۸۲
خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں	۱۸۳
۱- حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۱۸۳
۲- ابو بکر بن عبدالرحمٰنؒ	۱۸۶
۳- کئی اور مخلصین	۱۸۷
عبداللہ بن جعفرؓ کی سعی	۱۸۸
والیٔ حرمین کی طرف سے بجبر روکنے کی روایت	۱۸۹
نوٹ کرنے کی بات	۱۹۱
ذی الحجہ ۸ / یا ۱۰ /	۱۹۲
کربلا تک کی روداد سفر	
اور یوم شہادت کی روایتیں	۱۹۴
فرزدق سے ملاقات	۱۹۵
انجام حضرت مسلم کی خبر	۱۹۷
ساتھیوں کو آگاہی	۱۹۸
ابلیس کا مشورہ	۱۹۹
حضرت محمد الباقر کی روایت	۲۰۰
سمت سفر کی تبدیلی اور نزول کربلا	۲۰۱

باب دہم-۱۰
کربلا کی سرگذشت

عمر بن سعد کی آمد	۲۰۳
صلح کی بات اور ناکامی	۲۰۳
ایک دوسری روایت سے تائید	۲۰۴
جنگ اور شہادت	۲۰۶
حر بن یزید دوسری روایات میں	۲۰۸
دونوں روایتوں میں تطبیق	۲۱۰
حر کے کردار کی کچھ اور تفصیلات	۲۱۰
اور یوم عاشورہ کی باقی کہانی	۲۱۴
حضرت حسینؓ اور رفقاء کی تقریریں	۲۱۵
معاملہ کا ایک اور پہلو	۲۲۱
زہیر بن قین کی تقریر	۲۲۴
ایک خاص نکتہ	۲۲۶
سبھی کچھ تصنیف	۲۲۷
مبارزانہ جنگ کے قصے	۲۲۷
صبح سے سہ پہر تک کے معرکے	۲۲۸
لمبے وقت کے دامن میں لپٹے قصے	۲۳۰
داماں اہل بیت کے لیے ننگ	۲۳۲
سب سے بڑی مثال	۲۳۴
ایک تاویل لاطائل	۲۳۴
قصہ مختصر	۲۳۸
بندش آب	۲۳۹
معاملے کے کچھ اور پہلو	۲۴۰
روایت کی اندرونی شہادت	۲۴۲
اور خود راوی کے اوصاف	۲۴۳
خلاصۂ کلام	۲۴۵
روایت حضرت باقر کی خطا	۲۴۶
ناقابل انکار حقیقت	۲۴۸

باب یازدہم-۱۱
شہادت کے بعد کی کہانی ۲۵۱

خواتین کی بے حرمتی	۲۵۱
لاش کی بے حرمتی	۲۵۲
سر کی بے حرمتی	
اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی	۲۵۲
تنقید کی ایک نظر	۲۵۳
حُمید بن مسلم کے تضادات	۲۵۴
قصر یزید میں	۲۵۷
حضرت محمد الباقر کی روایت اور یہ قصے	۲۵۹
امام ابن تیمیہ کا ارشاد	۲۶۳

باب دوازدہم-۱۲
ایک نوشتۂ تقدیر تھا جو پورا ہوا ۲۶۵

نوشتۂ تقدیر کا راز؟	۲۶۸
حضرت حسینؓ کا اقدام اور ابن تیمیہ	۲۶۸
ظلم کی ذمہ داری کس پر؟	۲۷۳
ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟	۲۷۴
ابن زیاد کیوں بضد ہوا؟	۲۷۶
آہ یہ بے توفیقی	۲۷۹
اختتامیہ	۲۸۱
اشاریہ	۲۹۵
کتابیات	۳۰۸

(حصہ دوم کی فہرست اگلے صفحہ)

دیباچۂ طبعِ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۹۲ء میں نکلا تھا۔ مصنف کے لیے کوئی سوال اس گمان کا نہ تھا کہ چھ مہینے کے اندر ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پیش آجائے گی۔ اس لیے دوسرا ایڈیشن جولائی ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تو اس میں نظر ثانی کا وہ ضروری کام بالکل نہ ہوسکا جس کے لیے کچھ مناسب مہلت درکار تھی۔ سوچ لیا گیا کہ جو کام رہ گیا ہے وہ ان شاء اللہ تیسرے ایڈیشن میں ہوجائے گا جس کی ضرورت پیش آنے میں شاید زیادہ وقت نہیں لگے گا ــ مگر کتاب کی منجانب اللہ مقبولیت کہ دوسرے ایڈیشن کے ساتھ ہی ساتھ مختلف مقامات پر ــ خاص طور سے پاکستان میں ــ لوگوں نے مصنف یا پبلشر کی اجازت کے تکلف میں پڑے بغیر ہی اپنے اپنے طور پر اس کے ایڈیشن نکال ڈالے، جن میں سے چار تو خود مصنف تک بھی پہنچے۔ اسکے بعد ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے تیسرے ایڈیشن کی نوبت کہاں جلدی آسکتی تھی۔ تاہم اب وہ ضرورت پیش آچکی ہے اور یہ نیا ایڈیشن اب ان تمام اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ جن کی ضرورت مصنف نے طبع اول کے بعد کتاب پڑھ کر خود محسوس کی یا بعض حضرات کے خطوط سے یہ ضرورت محسوس ہوئی۔

ترمیمات کا حصہ تو بہت معمولی سا ہے جزوی قسم کا ہے۔ البتہ اضافوں میں ایک تو مستقل ایک باب "اختتامیہ" کے عنوان سے آخر میں بڑھایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل انڈکس ہے جس کی کمی خاص طور پر کتاب میں دلچسپی لینے والے اہل علم نے محسوس کی۔ ان دو مستقل اضافوں کے علاوہ باب اول اور باب دوم میں کئی صفحات کا اضافہ ہوا ہے[1] اور بعض مقامات پر حواشی

(۱؎ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

حضرت معاویہ اور یزید کی ولیعہدی - مولانا عبد العلی فاروقی ص ۳۱۱
تصویر کا دوسرا رخ (یزید کے اچھے کارنامے) مولانا سلطان الحق ... ص ۳۲۷
نگاہِ اولیں ص ۳۴۴
خط و کتابت مابین مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابو الحسن ندوی ص ۳۵۵ تا ص ۳۶۱
واقعہ کربلا پر کتاب پر عبد اللہ عباس ندوی کا تبصرہ ص ۳۶۷
مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کے عبد اللہ عباس ندوی کو خطوط ضمیمہ ۲ ص ۳۷۲ اور ضمیمہ ۳ ص ۳۷۷
ندوہ والوں کا تبصرہ - ضمیمہ ۴ ص ۳۸۲
ناقدوں کے تصرف میں مقالوں کے ضمیمے مولانا عتیق سنبھلی ص ۳۸۶
واقعہ کربلا کتاب پر تبصرہ و تجزیہ پروفیسر مظہر صدیقی ص ۴۴۴
گزارش احوال واقعی مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی ص ۴۵۶
ص ۴۵۸
عبد اللہ عباس ندوی کا اعتراف جرم و خط ص ۴۸۷
زہے ملامت بزہے نصیب مولانا عتیق الرحمن سنبھلی ص ۵۲۰
اموی دور حکومت کا تاریخی تجزیہ مولانا عبد اللہ سندھی ص ۵۲۲
ندویوں کے جواب میں ماہنامہ دار العلوم دیوبند کا اداریہ ص ۵۴۸
واقعہ کربلا کتاب پر تبصرہ

بڑھائے گئے ہیں۔

انسان کا کوئی کام نقائص سے سو فی صدی خالی تو کسی منزل پر بھی نہیں ہو پاتا۔ لیکن ان اضافوں اور ترمیموں کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ کتاب علمی اور تحقیقی حیثیت سے مزید بہتر معیار کو پہنچے اور اپنے موضوع پر زیادہ بہتر علمی و دینی خدمت ثابت ہو۔

کتاب کی اس پذیرائی کے پہلو بہ پہلو جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ گزرا کچھ دوسرے قسم کے تبصرے اور تاثرات بھی سامنے آئے۔ چند الفاظ اس نئی اشاعت کے موقع پر ان کے بارے میں کہنا بھی مناسب ہوگا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا نام بتا رہا ہے، ان چودہ سو سالہ قدیم واقعے کے بارے میں وہی باتیں دہرانے کے لیے تو ظاہر ہے، نہیں لکھی گئی تھی جو باتیں مسلسل کہی جاتی رہی ہیں اور لوگوں کو ازبر ہیں۔ نام کے اشارے کے علاوہ کتاب کے مقدمے سے اس کی ایک مختلف نوعیت کا بھرپور اظہار بھی ہوتا تھا۔ اس لیے یہ تو عین متوقع تھا کہ کتاب کا استدلال اور اس کا علمی اور تحقیقی انداز کتنا بھی مؤثر ہو جائے، پھر بھی ایک روایتی تصور پر اگر اس سے کہیں ضرب پڑے گی تو ایسے لوگ ضرور ایک تعداد میں نکلیں گے جو ایک مخالفانہ ردِّ عمل کا اظہار کریں، یا کم از کم کچھ چونکنے کا سا۔ چنانچہ یہ دونوں ہی باتیں سامنے آئیں۔

چونکنے کا سا اظہار کرنے والوں نے یہ تاثر دیا کہ اس میں یزید کی کچھ طرفداری نظر آتی ہے۔ یہ تاثر کتاب کی مجموعی طور پر تحسین کے ساتھ دیا گیا تھا۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی قابلِ توجّہ تھا۔ لیکن نظرِ ثانی

---

۱ (حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) باب اول میں دو باتیں خاص طور سے اضافہ طلب تھیں۔ ایک جنگ جمل اور جنگ صفین کا صرف ذکر آیا تھا تفصیل بالکل نہ تھی جس کی کمی محسوس کی گئی۔ دوسرے جو بعض بڑے صحابہ حضرت علیؓ سے بیعت کر لینے کے باوجود ان جنگوں کے سلسلے میں آپ سے متفق نہ تھے ان کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے موقف کی وضاحت بالکل نہ ہو سکی تھی۔ ان دونوں کوتاہیوں کو ان اضافوں کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب دوم میں کوفیوں کے مزاج و کردار کو کچھ تاریخی حوالوں کی روشنی سے اور زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ اختتامیہ میں کتاب کا خلاصہ اور کچھ وضاحتیں ہیں۔

کے لیے کتاب اول سے آخر تک بغور، بلکہ بار بار پڑھنے کے باوجود ہمیں کوئی لفظ اور کوئی عبارت ایسی نہ مل سکی جس میں اس تاثر کی تصدیق کا پہلو نظر آتا ہو اور اس لیے اس پر نظرِ ثانی کر لی جائے۔ تاثر دینے والے حضرات بھی کسی خاص مقام کی نشاندہی نہ فرما سکے۔ اس لیے ان کے اس تاثر کی بنیاد سوائے اس کے کچھ نہیں سمجھ میں آئی کہ یزید کے سلسلے میں دو باتیں جو روایتی اور تشنیعی تصور کے خلاف کافی صراحت اور وضاحت سے آئی ہیں بس وہی ان کو یہ تاثر دے گئی ہیں۔ ۱ یہ کہ یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کے موقف کے سلسلے میں جو یزید کے فسق و فجور کی بات لائی جاتی ہے اس کا کوئی ثبوت حضرت حسینؓ کی زبان سے بھی نہیں ملتا۔ ۲ یہ کہ اس کا ثبوت بھی فی الواقع دستیاب نہیں کہ ابن زیاد نے کربلا میں جو رویہ حضرت حسینؓ کے خلاف اختیار کیا جس سے تاریخ میں کربلا کا المیہ ثبت ہو گیا۔ اس میں یزید کی مرضی بھی شامل تھی اور نہ اس کا کہ اس نے باقیاتِ اہلِ بیت سے ان کو دمشق پہنچنے پر ناشائستہ برتاؤ بھی کیا۔ اس کی بھی روایتیں ہیں اور اس کے خلاف بھی۔

ان دونوں باتوں کے بارے میں ہم نے اپنے موقف کی ضروری وضاحت اس ایڈیشن کے آخری باب "اختتامیہ" میں کی ہے وہ انشاء اللہ قارئین کی نظر سے گزرے گی۔ یہاں البتہ اتنی بات یاد دلانی مناسب ہوگی کہ یزید کے بارے میں ایسی جو بات بھی لکھی گئی ہے جس سے اس کی روایتی شبیہ میں فرق پڑتا ہے وہ خود ہی بے دھڑک ہو کر نہیں بلکہ واقعی معنیٰ میں "ڈر ڈر کر" لکھی گئی ہے چنانچہ ایسے ایک موقع پر یہ الفاظ بھی قلم سے نکل ہی گئے ہیں کہ:

> "یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ اس کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔" (ص ۱۳۱ طبع اول)

مگر تحقیقِ واقعہ کی نیت سے کیے جانے والے مطالعے میں جو بات واقعی نظر آتی ہے اسے ایک فریق کے حق میں اس لیے دبا جانا کہ شاید کچھ لوگ ناراض یا بدگمان ہو جائیں، یہ کوئی ایماندارانہ بات تو نہیں ہو سکتی۔ اس لیے "ڈرتے ڈرتے" بھی بات تو کہنی لازم ہو جاتی ہے۔ اور نہ ہی حضرت حسینؓ کی عزت اس پر موقوف ہے کہ یزید کے بارے میں ہر برائی آنکھ بند کر کے مان لی جائے۔

جن دلوں نے مخالفانہ ردِّ عمل ظاہر کیا ان میں سے خاص طور سے ایک کا اظہار اس بات کا ایک مثالی نمونہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے روایتی تصوّر سے محبّت نے ہمارے خوب اچھے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی تبرائی شیعیت سے کس درجہ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہ ہماری ایک نامور دینی درسگاہ میں نظامِ تعلیم کی نگرانی کا منصب رکھنے والے ایک عالم و فاضل تھے، جنہوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب اور صاحبِ کتاب کو توجو کچھ کہا وہ اپنی جگہ رہا[1]، صاف صاف لکھا کہ واقعہ کربلا بدر کی شکست کا بدلہ تھا۔ اصلی الفاظ یہ تھے:

"... انھوں (مصنف) نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کر کے ایک اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا، کربلا کا واقعہ بنوامیہ اور بنوہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE) تھا، وہ عداوتیں جو ظہورِ اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے ۲۱ سال تک شدومد سے قائم رہیں غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اسکے سربراہ ابوسفیان تھے اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہیدؒ کے استسلام[2] کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہندہ نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب و غم اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔

.... اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے

[1] اس کے ایک پہلو کا کچھ تذکرہ "اختتامیہ" میں آیا ہے وہاں آپکی نظر سے گزریگا۔ [2] فی الواقع اسلام نہیں قبول کیا بلکہ تسلیم شکست کی۔

کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔ مگر جس طرح انگریزوں کے ... صلیبی جنگوں کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا[*]۔"

اور پھر چند سطروں میں مصنف کو صحیح طریق تحقیق کا مشورہ دیتے ہوئے ان الفاظ پر اسے ختم کیا گیا ہے:

"اس حادثہ کا سرا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بجائے نہیں غزوۂ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے تو تاریخی احداث کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی۔"[1]

اگر شیعی تبرائیت دل و دماغ پر حاوی نہ ہو چکی ہو تو آدمی اور بھی کچھ اگر نہ سوچ سکے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں! وہ لوگ جنھیں اہل سنت کے یہاں بلا شک و شبہ صحابہ اور صحابیات کا درجہ حاصل ہے ان کے بارے میں فتویٰ دے رہا ہوں کہ ان کے دل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے صاف نہ تھے! کہہ رہا ہوں کہ بدر کے انتقام کی آگ ان کے سینوں میں بھڑکتی رہی تھی اور ان کے اسی جذبۂ انتقام نے کربلا کے حادثے کی شکل اختیار کرلی! (یہ کچھ بھی آدمی اگر نہ سوچے) تب بھی غزوۂ احد کا نام قلم پر آجانے کے ساتھ تو اُسے خیال آ ہی جانا چاہیے تھا کہ بدر کا انتقام تو اس دوسرے غزوے میں اِن لوگوں نے حالتِ کفر ہی میں لے لیا تھا اور اتنا لے لیا تھا کہ کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے!

ہم نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

"واقعۂ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، شیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا دھیے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔" (مقدمہ ص ۲۲)

[*] گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ [1] تعمیر حیات۔ لکھنؤ۔ ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء

لیکن یہ بات کہ شیعیت کے اثرات ہماری بڑی بڑی دینی درس گاہوں تک میں اس حد تک داخل ہو گئے ہیں اس کا اندازہ مقدمہ کی اس تحریر کے وقت بھی نہ تھا۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

مصنّف کے لیے نہایت اطمینان و مسرت کا مقام ہے کہ محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس) جیسے صاحبِ علم و فضل نے کتاب کو اپنی دلچسپی کے اظہار سے نوازا اور بعض گراں قدر مشورے بھی مصنّف کو تحریر فرمائے۔

اس قابلِ مسرّت بات کا ذکر بطورِ شکرِ نعمت یا تحدیثِ نعمت، طبیعت کا تقاضہ تھا۔ مگر اس کے نتیجے میں ضرور قارئین کی طبیعت کا تقاضہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب زید لطفھم کی تحریر بھی اُن کے سامنے آئے۔ اس لیے اس سلسلے کے دو خط بھی نذرِ قارئین ہیں۔ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں[1]۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۶ء

نوٹ: گذشتہ سال بعض حلقوں میں کسی غلط فہمی سے ڈاکٹر صاحب کی خبر وفات شائع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بحمداللہ تا ایں دم (۱/۶/۹۹) حیات ہیں۔ البتہ پیرانہ سالی کے عوارض کے ساتھ۔ قارئین سے دعائے خیر کی درخواست ہے۔

---

[1] ان دونوں خطوط کا بعینہٖ عکس شائع کیا جا رہا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کاغذ بےحد ہلکا اور بادامی رنگ کا استعمال فرماتے ہیں۔ نتیجے میں عکس اچھا نہ آسکا اسلئے متعدد الفاظ کو پڑھنے کے قابل بنانے کیلئے ہلکا سا ٹچ (TOUCH). بھی دینا پڑا۔ خاص طور سے پہلے خط میں اس کی خاص ضرورت پڑی ہے۔

مکاتیب گرامی

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس)

①

باسمہ تعالیٰ حامدًا و مصلیًا

9 Rue de Tournon
Paris - 6 / France

۱۴ ربیع الاولیٰ ۱۴۱۳ھ

مخدوم و محترم مد ظلکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

چند دن ہوئے گراں قدر تحفہ "واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر" ملا۔ سرفراز کیا۔ بعض دیگر فوری مشغولیتوں کے باعث رسید میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیں۔

ماشاء اللہ کتاب معلومات سے بھری ہے۔

دو چیزیں عرض کرتا ہوں، ضرورت سمجھیں کہ میری رائے بہتر ہو:

۱) کاش کتاب میں اشاریہ (انڈکس) بھی ہوتا تاکہ تلاش میں سہولت ہو

۲) حضرت عثمانؓ کی شہادت کے سلسلے میں ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کی کارروائیوں کا ذکر مناسب ہوتا کہ اس کے نتائج میں سے ایک واقعہ کربلا ہے۔ خاص کر حضرت عثمانؓ کا خط مصر کے والی کے نام کہ محمد بن ابی بکرؓ وہاں پہنچیں تو ان کو قتل کر دیا جائے (جعلی) یہ ابن سبا کا کام تھا۔

متعکم اللہ و عافاکم

خادم

محمد حمید اللہ

دیباچہ طبعِ دوم

یہ کتاب امسال جنوری میں شائع ہوئی تھی، مصنف کسی بنیاد پر بھی یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ صرف چھ ماہ کے اندر اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آجائے گی۔ یہ محض اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ جولائی میں دوبارہ پریس کو جا رہی ہے۔

ناشرین نے مجھ سے چاہا کہ اگر پہلے ایڈیشن کی طباعت میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں یا کوئی ضروری ترمیم معمولی قسم کی ہو تو اس کی فہرست انھیں مہیا کر دی جائے۔ میری نظر میں جو ایسی چیزیں آئی تھیں ان کی فہرست تیار تھی، وہ ناشرین کے حوالے کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ دوسرا ایڈیشن ان تصحیحات اور ترمیمات کے ساتھ قارئین تک پہنچے گا۔ بعض کچھ ضروری اضافے بھی ذہن میں تھے لیکن اس وقت جو عجلت ناشرین کے پیشِ نظر ہے اس کی بنا پر یہ کام آئندہ کے لیے مؤخر رہے گا۔

شکر اور اعترافِ کرم کے ساتھ اللہ ہی سے شکوہ بھی ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف سے کتاب کے خلاف محاذ آرائی ہوئی ہے جن کے بارے میں محاذ آرائی تو کیا سادہ سی مخالفت کا اندیشہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ چیز جہاں رنج و الم کی ہے وہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب کی جو ضرورت اس کے مقدمے میں بتائی گئی تھی وہ نہ صرف واقعی تھی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے اور وسیع درجے کی تھی جس درجے کی مقدمے میں ظاہر کی گئی تھی۔ انشاء اللہ اس پر مزید روشنی

(۲)

باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیاً

4, Rue de Tournon
Paris - 6 / France

۱۹۹۳/۸/۱۲

مخدوم محترم دام ظلکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ کافی عرصہ ہوا، آپ نے واقعہ کربلا نامی تالیف مجھے بھیج کر میری عزت افزائی فرمائی تھی۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اب تو مجھے یاد نہیں کہ رسید بھیجی یا نہیں۔ میں بیمار رہا۔ تین مہینے شفاخانے میں رہا۔ آپریشن ہوا۔ ابھی چند دن ہوئے ہیں کہ گھر آنے کی اجازت ملی لیکن علاج اب تک جاری ہے۔ ان حالات میں ادب سے التماس ہے کہ میرا قصور معاف فرمائیں۔ اب آہستہ آہستہ پرانے قرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ کی اہم کتاب کو بڑی دلچسپی سے شروع کیا ہے۔

کیا آپ میرے رسالے "جنگ جمل و صفین میں یہودیوں کا کردار" سے واقف ہیں؟ اگر ضرورت ہو تو اس کے انگریزی پاکستانی ایڈیشن کا عکس تو شاید روانۂ خدمت کر سکوں گا۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

کتاب کے کسی اگلے ایڈیشن میں ڈالی جاسکے گی۔

والسلام!

عتیق الرحمٰن سنبھلی

یکم محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

مطابق ۳؍جولائی ۱۹۹۲ء

۱۱/۴۸ حوض رانی ایکسٹینشن۔ نئی دہلی ۱۷

افتتاحیہ

از والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

یہ کتاب جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا، راقم مصنف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کا نتیجہ ہے۔ کتاب مکمل ہوجانے پر راقم نے گزارش کی کہ اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو چند دعائیہ کلمات املا فرما دیئے جائیں جن سے کتاب کا آغاز ہو، ذیل کی املائی تحریر میری اسی خواہش کا نتیجہ ہے ــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی]

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ حمداً وسلاماً

اس عاجز (محمد منظور نعمانی) کا وطن سنبھل (مرادآباد، یوپی) ہے ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) سن پیدائش ہے۔ سنبھل مسلمانوں کی غالب اکثریت کی بستی ہے اور یہ سب سُنّی حنفی ہیں۔ صرف ایک محلے میں جو شہر کے کسی کنارے پر ہے اور جسے میں نے آج تک دیکھا بھی نہیں ہے شیعہ صاحبان کی بھی کچھ آبادی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں کم و بیش سبھی جگہ سُنّیوں کے اندر بھی تعزیہ داری کا رواج سرایت کیے ہوئے ہے۔ لیکن میرا خیال ہے ــــ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے ــــ کہ سنبھل کے سُنّیوں میں جس شان سے عزاداری منائی جاتی ہے اس شان کی عزاداری شاید ہی کہیں اور ہوتی ہو۔

بچپن کی باتیں

مجھے ۶-۷ سال کی عمر سے پورا شعور ہوگیا تھا اور اُن چند برسوں کو چھوڑ کر جو تعلیم کے سلسلے میں باہر گزرے تقریباً تیس سال کی عمر تک زیادہ تر قیام وطن ہی میں رہا۔ ہمارا محلہ خالص سُنّی مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس کے اندر ۲۰-۲۵ گھروں میں تعزیے رکھے جاتے تھے، جن پر محرم کی پہلی

سے دسویں تک برابر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ جن گھروں میں بچے کم زندہ رہتے تھے ان گھروں میں امام حسینؑ کا فقیر بنایا جاتا تھا اور ہرے کپڑے پہنائے جاتے تھے، ہمارا ننیہال اس معاملے میں بہت آگے تھا۔ ایک قریبی رشتے کے ماموں فقرو کے نام سے مشہور تھے۔ میں بڑا ہو کر بھی ایک مدت تک یہ سمجھتا رہا کہ ان کا نام اصل میں فخرالدین یا فخرالحسن ہوگا اور فقرو کہا جانے لگا، بعد میں معلوم ہوا کہ اصل نام تو انوار حسین ہے لیکن بچپن میں امام حسینؑ کے فقیر بنا دیئے گئے تھے اسی سے فقرو کہے جاتے ہیں۔

سنبھل کے ڈھول

سنبھل کی تعزیہ داری کی دو خصوصیتیں شاید اپنا جواب نہ رکھتی ہوں گی۔ ایک تعزیوں کی اونچائی (بعض تو تقریباً چالیس فٹ اونچے ہوتے تھے) اور دوسرے ڈھولوں کا سائز۔ بعض ڈھول تو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان کے لیے گائے یا بھینس کی بہت بڑی کھال تلاش کرنا پڑتی تھی۔ ان میں سے بعض کے اندر سے آدمی کھڑا نکل آتا تھا اور بچے تو تقریباً سبھی ڈھولوں کے اندر سے اسی طرح نکل جاتے تھے۔ ہمارے خاص محلے میں کئی ایسے ڈھول تھے مگر ایک ڈھول جو چوک کا ڈھول کہلاتا تھا وہ ان میں سب سے بڑا تھا اور چونکہ ہمارے نانا کا مکان چوک میں واقع تھا اس لیے اس کو ہم اپنا ڈھول سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

عشرۂ محرم کے معمولات

محرم کا مہینہ آیا اور ہر ذی استطاعت گھر میں لازم ہو گیا کہ پہلی سے دسویں تک روزانہ کوئی میٹھی چیز پکے۔ عموماً میٹھے چاول یا حلوہ یا مالیدہ۔ اور مغرب کی نماز سے کچھ پہلے یا بعد میں گھر کا کوئی آدمی گھر کے دروازے پر وہ میٹھا پکوان لے کر کھڑا ہوتا اور بچوں میں تقسیم کرتا۔ روزمرہ کے اس دس روزہ عمل سے چند ہی گھر محلے میں مستثنیٰ ہوں گے، انھیں میں سے ایک ہمارا گھر بھی تھا۔ ہمارے

گھر جو کچھ ہوتا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

محلے کا ایک گھرانہ رافضیوں کا گھرانہ ہی کہلاتا تھا۔ اگرچہ تھے وہ سُنّی۔ ان کے یہاں امام باڑہ تھا جس میں ایک کاٹھ کا تعزیہ رہتا تھا۔ ان کے یہاں اِن دس دنوں میں رات کو مجلس ہوتی تھی اختتامِ مجلس پر حاضرین کو قیمہ رکھی ہوئی ایک (یا دو) تندوری روٹی بطور تبرک ملتی تھی۔ دسوں دن برابر یہ سلسلہ چلتا تھا۔ اس دس روزہ مجلس کے علاوہ کم از کم ایک دن تو اس طرح کی مجلس اکثر گھروں میں ہی ہوا کرتی تھی۔ خود ہمارے گھر میں بھی یہ مجلس ۹ر اور ۱۰ر کی درمیانی شب (یعنی شبِ شہادت) میں ہوتی تھی۔

ہمارے گھر کی مجلس

والد ماجد مرحوم تعزیہ داری کے سلسلے کی چیزوں میں تو شرکت نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک اسے صحیح بھی نہیں سمجھتے تھے مگر ۹ر محرم کو شب کی مجلس بڑے اہتمام سے کراتے تھے جیسے کہ ۱۱ر یا ۱۲ر ربیع الاول کو مجلسِ میلاد شریف اہتمام سے ہوتی تھی۔ میلاد میں تو مٹھائی (جلیبی یا لڈو) گھر ہی پر حلوائی بلوا کر بنوائی جاتی تھی۔ بازار سے اس موقع کے لیے مٹھائی خریدنا والد ماجد پسند نہیں فرماتے تھے اور مجلسِ شہادت کے لیے ایک بکرا خود خرید کر لاتے تھے اور اس کا پلاؤ پکوایا جاتا تھا جو اہلِ مجلس میں تبرک تقسیم ہوتا۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے یہاں بکرے کے گوشت کا رواج شادیوں تک میں بھی نہ تھا، عام طور سے گائے کا گوشت ہی استعمال ہوتا تھا لیکن مجلسِ شہادت کے لیے ہمارے گھر خصوصی اہتمام برتا جاتا تھا۔ ایام عزا کی یہ مجلسیں ہمارے حقیقی ماموں حافظ سعید احمد مرحوم (اپنی پارٹی کے ساتھ) پڑھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں کا ایک شعر اب تک یوں یاد ہے کہ ؎

خدا کے نور سے پیدا ہوئے یہ پنجتن محمدؐ علی و فاطمہ حسین و حسن

کچھ اپنا رونا رُلانا

جیسا کہ اوپر عرض کر آیا ہوں، مجھے ۶، ۷ سال کی عمر میں پورا شعور آگیا تھا، مجلسوں میں جو کچھ

سنتا تھا اسے سمجھتا تھا۔ واقعۂ شہادت کو سُن کر خوب رویا کرتا تھا بلکہ اتنی دلچسپی اس واقعہ سے ہوگئی تھی کہ عشرۂ محرم کے علاوہ بھی جو اس دلچسپی کا خاص موسم ہوتا ہے میں نانا کے گھر جاتا اور جس کتاب سے ماموں صاحب شہادت کے واقعات پڑھا کرتے تھے اُس کتاب کو لے کر پڑھتا اور روتا جاتا تھا۔ یہ بات ۹، ۱۰ سال کی عمر کی ہے۔

جہاں تک یاد کرتا ہوں میرا حال یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ وغیرہ اصحاب کرام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ دنیا کی اور اسلام کی سب سے بڑی شخصیت بس حضرت حسینؓ کو سمجھتا تھا اور سب سے بڑا خبیث یزید کو جانتا تھا۔ اس سلسلے کا ایک لطیفہ بھی ہے۔ غالباً عمر کا آٹھواں سال تھا جبکہ میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ رہا تھا؛ پندرہویں پارہ میں سورۂ بنی اسرائیل کی جب وہ آیت آئی جس میں وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا آتا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ اوّوہ! یزید ایسا خبیث تھا کہ اللہ میاں نے اس کو ظالمین ۔۔۔ یعنی بہت بڑا ظالم ۔۔۔ کہا ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ اس پر دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت حسین کی شہادت کا واقعہ تو بہت بعد کا ہے، قرآن مجید میں اس کا ذکر کیسے آگیا؟ اور پھر اس کا جواب بھی دل میں یہ آگیا کہ اللہ میاں تو سب کچھ جانتے ہیں، انھیں خبر تھی کہ یزید اتنا بڑا ظالم ہوگا اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو پہلے ہی سے خبردار کردیا۔

تبدیلی کا آغاز

میرے ایک قریبی رشتے کے نانا حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور صاحب درس تھے۔ میری عمر جب ۱۴۔۱۵ سال ہوئی تو تعلیم کے سلسلے میں مجھے ان کے سپرد کردیا گیا اور پھر تین سال تک جہاں وہ اپنی تدریسی ذمہ داری کے سلسلے میں رہے میں ان کے ساتھ ہی رہا۔ یہ پہلی صحبت تھی جس کی بدولت مجھے دین کی کچھ سمجھ آئی اور جو باتیں ماحول کے اثر سے خواہ مخواہ دین بن کر ذہن میں جم گئی تھیں ان کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد تعلیم کی تکمیل کے لیے دو سال دارالعلوم دیوبند میں رہنا نصیب ہوا۔ الحمدللہ کہ میری

تعلیم کے اس پانچ سالہ دور میں والد ماجد کے خیالات میں بہت کافی تبدیلی آگئی۔ اب ہمارے گھر میں رسمی مجلسِ میلاد کی جگہ بیانِ سیرتِ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس ہوتی تھی اور عاشورہ کی مجلس میں شہادت ناموں کے بجائے ہمارے بڑے بھائی مولوی محمد حسن صاحب مرحوم تاریخ ابن خلدون کے اردو ترجمے[1] سے واقعۂ کربلا کا بیان پڑھتے اور میں کچھ زبانی بیان کیا کرتا تھا ۔۔۔ لیکن واقعہ کے سلسلے میں تصوّر وہی تھا جو سنی سنائی باتوں سے قائم ہوگیا تھا۔ کبھی خود براہ راست تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرکے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ قصّے کی واقعی حقیقت کیا تھی۔

شہرتِ عام کی تاثیر

۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی میں قیام اختیار کرکے الفرقان جاری کیا۔ الفرقان کے ربیع الاول کے شمارہ میں اکثر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ لکھا جاتا اور اس کے لیے میں سیرت اور احادیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا ۔۔۔ لیکن واقعۂ کربلا کے سلسلے میں جہاں تک یاد ہے میرا سب سے بڑا ماخذ بس مولانا آزاد کا مضمون شہید کربلا تھا جو الہلال کے فائل میں میرے پاس موجود تھا۔ اس سے زیادہ تاریخی مطالعہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ شہرت عام کے اثر سے جو ذہن اس مسئلہ میں بن گیا تھا اُس نے یہ ضرورت محسوس ہی نہ ہونے دی اور واقعہ یہ ہے کہ شہرت عام ایسی ہی طاقتور چیز ہے خواہ وہ کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔

اس کی ایک بہت قریبی مثال شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (متوفّی سنہ ۱۲۰۶ھ) اور ان کی جماعت کے بارے میں بہت سے نہایت قابل احترام اکابر علماءِ حق کا رویّہ ہے۔ ان میں سرفہرست

[1] میری یادداشت کے مطابق مترجم الٰہ آباد کے کوئی صاحب تھے اور انہوں نے لکھا تھا کہ اس واقعے (واقعۂ کربلا) کے بیان میں اصل کتاب (تاریخ ابن خلدون) کے اندر کچھ نہ تھا بلکہ چند صفحات خالی چھوٹے ہوئے تھے اور ترجمہ میں واقعہ کا بیان جو بہت طویل تھا مترجم نے دوسری کتابوں کی مدد سے از خود لکھا ہے۔ اب مولوی عتیق الرحمٰن نے اصل کتاب دیکھ کر بتایا ہے کہ ابن خلدون نے ۶ صفحات خالی چھوڑے تھے جن کی کمی کو مترجم نے ۶۵ صفحے لکھ کر پورا کیا ہے اور مترجم کا نام حکیم احمد حسین الٰہ آبادی (مرحوم) ہے۔

ہیں مکہ مکرمہ کے مشہور عالم و محدث اور محقق شیخ احمد زینی دحلانؒ ۔ نیز خود ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ـــــ شرک و بدعت کے خلاف شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے بے لاگ موحدانہ جہاد نے (نیز سیاسی میدان میں آل سعود کے لیے ان کی حمایت نے) مخالفانہ پروپیگنڈہ کا وہ طوفان اٹھایا کہ ہر بری سے بری بات ان کے حق میں لائق یقین بن گئی ـــــ اس کی تفصیل کے لیے اس عاجز کی کتاب "شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات" دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شیخ احمد زینی دحلانؒ نے اپنی کتاب "خلاصۃ الکلام" اور "الدرر السنیۃ فی رد الوہابیۃ" میں ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں جن کی بنیاد پر ان کو یہود و نصاریٰ وغیرہ کافروں سے بھی بدتر درجہ کا کافر قرار دینا صحیح اور برحق ہوگا ۔ اور اسی طرح کی باتیں ہمارے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ "رجوم المذنبین" میں تحریر فرمائی تھیں لیکن بعد میں حضرت مدنیؒ نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اعتراف فرمایا کہ انہوں نے "رجوم المذنبین" میں جو کچھ اس سلسلے میں لکھا تھا وہ عام شہرت ہی کی بنیاد پر لکھا تھا ۔

الفرقان ۷۳ھ کا مضمون

الغرض واقعۂ کربلا کے سلسلے میں اپنا ذہن پرانا ذہن چلتا رہا جو اس عام اور روایتی تصور سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا جس کا کچھ ذکر اوپر کی سطروں میں آیا ہے حتیٰ کہ شوال یا ذیقعدہ ۷۳ھ کی بات ہے کہ میں کسی لمبے سفر پر جانے کی تیاری کررہا تھا جبکہ اجین (مدھیہ پردیش) کے ایک صاحب کا خط آیا جو الفرقان کے بہت قدرداں تھے' انہوں نے لکھا تھا کہ محرم کا مہینہ آنے والا ہے' اس میں الٹے سیدھے شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں اور غلط سلط روایتیں دہرائی جاتی ہیں ۔ جی چاہتا ہے الفرقان میں اس موضوع پر کوئی مستند قسم کا مضمون آجائے اور ہم کوشش کریں کہ ہمارے یہاں مجلسوں میں وہی پڑھا جانے لگے ۔ میں یہ ذمہ داری مولوی عتیق الرحمٰن کے سپرد کرکے اپنے سفر پر روانہ ہوگیا تھا مولوی عتیق الرحمٰن نے "واقعۂ کربلا" کے عنوان سے یہ مضمون لکھا اور ذی الحجہ ۷۳ھ کے الفرقان میں شائع

ہوگیا، میں سفر سے واپس آیا اور یہ مضمون پڑھا تو اس کی دو باتوں کی وجہ سے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی، غصے سے میرا دماغ کھول اٹھا۔ ان باتوں میں سے ایک یہ تھی کہ سیدنا حسینؓ کے اقدامات کے لیے بغاوت کا لفظ اس مضمون میں استعمال کیا گیا تھا ـ دوسری بات مضمون کا یہ بیان تھا کہ جب حضرت حسینؓ کوفے کے قریب پہنچ کر اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ کوفے والے غداری کرگئے ہیں اور پھر یزیدی لشکر کے پہنچ جانے سے آپ کے لیے واپسی کا راستہ بھی نہ رہا تو یزیدی سالار عمر بن سعد کے سامنے آپ نے تین شکلیں رکھی تھیں کہ ان میں سے کسی کو قبول کرلیا جائے جن میں سے ایک یہ تھی کہ "انھیں یزید کے پاس جانے دیا جائے تاکہ وہ براہ راست اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں ۔"

میں یزید کو جتنا بڑا ظالم خبیث اور ناہنجار ساری عمر سے جانتا آرہا تھا اس کی بنا پر میرے نزدیک یہ ناممکن بات تھی کہ حضرت حسینؓ ایسی پیش کش فرمائیں' حضرت حسینؓ کے لیے یہ بات سوچنی بھی میرے لیے محال تھی ۔ میں غصہ میں اٹھا اور مولوی عتیق کے گھر کی طرف کو روانہ ہوا تاکہ ان سے بازپرس کروں کہ یہ کیا لکھ دیا ہے ؟

تو قدم کے قریب چلا ہوں گا کہ لفظ بغاوت کے بارے میں یہ بات ذہن میں آئی کہ بغاوت ہر جگہ تو معیوب نہیں ہے' بلکہ اگر ایک ظالمانہ اور کافرانہ نظام کے خلاف ہو تو ایک طرح کا جہاد ہے ـــ آخر ۱۸۵۷ء میں ہمارے بزرگوں نے انگریزوں کے خلاف جو کچھ کیا تھا وہ بغاوت ہی تو تھی جس پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں ـــــ البتہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی بات ویسی ہی ناقابل قبول بنی رہی' میں اسی حال میں مولوی عتیق کے گھر پہنچا اور بڑے غصے کے ساتھ ان سے پوچھا کہ تم نے یہ بات کیسے اور کہاں سے لکھ دی ؟ ـــ مولوی عتیق کے پاس اس طرح کے غصے کے کچھ خطوط پہلے ہی آچکے تھے اور وہ اس سلسلے میں ایک دوسرے مضمون کی تیاری کرچکے تھے ۔ اس کے لیے انہوں نے تاریخ کی متعدد کتابوں سے عبارتیں اور حوالے نقل کرکے رکھے ہوئے تھے انھیں دیکھ کر مجھے بھی ماننا پڑ گیا کہ پھر تو غلط نہیں لکھا ہے ۔

یہ کتاب اس واقعے پر تقریباً تیس سال گزر گئے تھے کہ آج سے ۸ ۔ ۷ سال پہلے جب میری

کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" شائع ہوئی تو بعض مخلص دوستوں نے توجہ دلائی کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی ہے اسی مقصد کی خدمت کے لیے یہ بھی مفید رہے گا کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کا مضمون "واقعۂ کربلا" اور اس کے بعد کا وضاحتی مضمون بابت محرم ۷۴ھ بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے اس رائے کو پسند کیا اور ۸۷ء میں جب مولوی عتیق الرحمٰن کا ہندوستان آنا ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ وہ پرانی فائل سے اپنے وہ دونوں مضمون نکلوا کر ایک نظر ڈال لیں اور کتب خانہ الفرقان کے حوالے کر دیں۔ مگر ان کی رائے یہ ہوئی کہ اس مسئلہ پر تو اب بالکل از سر نو لکھا جانا چاہیئے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس کی اساس تو وہی ۷۳ء اور ۷۴ء کے مضامین ہیں لیکن عزیز مصنف نے اس پر نظر ثانی میں جو نئی محنت کی ہے اس نے اسے ایک بالکل نئی چیز بنا دیا ہے۔ کتاب کے مشتملات میں سے مجھے خاص طور پر اس کے آخری باب میں آنے والے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے اقتباس کی بابت یہ عرض کرنا ہے کہ اس اقتباس نے خود مجھے بڑا اہم فائدہ پہنچایا ہے۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی خبر پانے پر واپسی کے ارادے کے بعد بھی صرف بعض برادران مسلم بن عقیلؓ کی دلداری میں حضرت حسینؓ کے سفر جاری رکھنے پر مجھے ایک خلش تھی۔ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام کو اور اس کتاب کے عزیز مصنف کو جزائے خیر دے کہ شیخ الاسلام کے اس اقتباس میں اس خلش کے رفع ہونے کا سامان مل گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے اور اگر اس میں کوئی بات غلط آ گئی ہو تو اس کے اثر سے بندوں کی حفاظت فرمائے نیز عزیز مصنف کو اس سے رجوع کی توفیق بخشے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

مقدمہ[۱]

(طبعِ اوّل)

مصحفیؔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

۷۳ھ م ۵۳ء کی بات ہے۔ ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) کی ترتیب و ادارت کی نئی نئی ذمہ داری اٹھائی تھی[۲]۔ ایک ایجنسی کی فرمائش آئی کہ محرم کا مہینہ قریب آرہا ہے سانحۂ کربلا (شہادت حضرت حسین ابن علیؓ) کے سلسلے میں غلط سلط روایات والے شہادت نامے اس ماہ مسلمانوں میں پڑھے جاتے ہیں، جن سے کتنے ہی ناروا خیالات و عقائد پھیلتے ہیں۔ الفرقان میں اگر ایک مستند مضمون اس موقع پر واقعۂ کربلا کے موضوع پر آجائے تو مفید ہوگا۔ غالباً یہ فرمائش الفرقان کے مدیر اعلیٰ میرے والد ماجد (مولانا محمد منظور نعمانی) کے نام آئی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ لکھو۔

والد ماجد کے کتب خانے ہی میں ایسی کتابوں کی جستجو شروع کی جن کی مدد سے یہ فرمائش پوری کی جاسکے۔ ایک مصری مصنف کی کتاب ہاتھ آئی جو بہت قابلِ اعتماد اور قابلِ بھروسہ محسوس ہوئی (نام نہ اب کتاب کا یاد ہے نہ مصنف کا) اس کتاب کی روشنی میں "واقعۂ کربلا" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کر کے ذی الحجہ ۷۲ھ اگست ۵۳ء کے الفرقان میں دے دیا گیا۔

مضمون میں کوئی بہت خاص بات نہ تھی۔ واقعے کا سادہ سا بیان تھا اور اس معاملے میں جو فکری اور عملی بے اعتدالیاں شیعیت کے اثر سے یا اس کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہو گئی ہیں اُن کے سلسلے میں اپنے

---

[۱] نظر ثانی کے بعد۔ [۲] ماہنامہ الفرقان مصنف کے والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے معروف شہر بریلی سے جاری کیا تھا۔ ۴۶ء میں اسکو لکھنؤ منتقل کر دیا اور آج بھی شائع ہوتا ہے۔

فہم کے مطابق نقطۂ اعتدال واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاہم ایک بات نے اس کو معرکہ انگیز" بنا دیا اور وہ ایک روایت تھی، جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے میدانِ کربلا میں یہ صورتِ حال دیکھ کر کہ کوفہ کے جن لوگوں کی خواہش اور باصرار دعوت پر آپ نے ادھر کا سفر کیا تھا، ان میں کتنے ہی لوگ اس فوج میں تو شریک ہیں جو آپ کے خلاف کارروائی کے لئے کوفہ کے یزیدی گورنر ابن زیاد نے بھیجی ہے مگر آپ کی حمایت کے لئے نکل کر آنے والا کوئی نہیں ہے، یزیدی فوج کے سردار عمر بن سعد کو تین باتوں کی پیش کش کی تھی، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ کو دمشق جانے دیا جائے جہاں آپ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دیدیں۔"

"یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی" یہ بات بہت سے لوگوں کے لیے ناگواری کا باعث ہوئی جیسے کہ اپنی طرف سے گھڑ کر کہدی گئی ہو۔ چنانچہ بہت سے خطوط، کچھ استعجابی اور کچھ احتجاجی، اس سلسلے میں آئے۔ اور ان کی بنا پر الفرقان کی آئندہ اشاعت میں اس مسئلے پر باقاعدہ تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیل سے لکھنا پڑا، جس سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہوئی کہ حضرت حسینؓ کی پیش کش کے بیان میں کوئی ذرا سی بھی غلط بیانی یا بے احتیاطی نہیں تھی بلکہ یہ ایک حقیقت تھی جو شیعی اثرات کے ماتحت کچھ دبی ڈھکی چلی آرہی تھی۔ خطوط لکھنے والے بعض حضرات نے اس دوسرے مضمون کے بعد یہ لکھ کر اپنا اخلاقی فرض بھی ادا کیا کہ بے شک تم نے حضرت حسینؓ کی پیش کش کے بیان میں کوئی بے احتیاطی یا غلط بیانی نہیں کی تھی۔

اس قصے پر ۳۲-۳۴ برس گذر گئے تھے اور مجھے اب وداسنہ نے لکھنؤ سے اٹھا کر لندن میں بسا دیا تھا، کہ سنہ ۸۶ء میں لکھنؤ جانا ہوا تو والد ماجد نے ان دونوں مضامین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا مضمون "واقعۂ کربلا" کتابی شکل میں چھپ جانا چاہیے، کچھ نظرِ ثانی کی ضرورت سمجھو تو ایک نظر ڈال لو اور کتب خانہ الفرقان کے حوالے کر دو۔ مضمون پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ نئے سرے سے لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ۲۷ برس پہلے کے مقابلے میں اپنا علم اور اپنے خیالات دونوں بہت بدل چکے ہیں۔ مگر یہ لمبا کام ان دنوں ممکن نہ تھا۔ مناسب

وقت کے لیے مؤخر کرنا پڑا، حتیٰ کہ گذشتہ سال (سنہ ۸۹ء میں)، والد ماجد کے ضعف و اضمحلال کی اطلاعات پر لکھنؤ کے سفر کا خیال پیدا ہوا تو یہ مؤخر کردہ کام بھی یاد آیا اور مضمون کی نئے سرے سے تسوید کے لیے تاریخ طبری وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعے نے اس نتیجے پر پہنچایا جس کا اظہار سرنامے کے شعر میں ہوا ہے کہ اس پرانے مضمون کا معاملہ کچھ تبدیل و ترمیم کے عمل کا طالب نہیں ہے بلکہ وہ جس ضرورت کے ماتحت لکھا گیا تھا اس کا واقعی حق ادا ہونے کے لیے تاریخ کے اس حصے کے مکمل پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے جو حصہ واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر والے واقعات کی روایتوں پر مشتمل ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں یہ کتاب تیار ہوئی جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔

تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال

میں نہ تاریخ کا طالب علم رہا نہ کسی اور حیثیت سے تاریخ دانی کا دعویٰ۔ بالکل ممکن ہے کہ میں نے اس مطالعے میں جو کچھ محسوس کیا اور جو نتائج نکالے وہ اہلِ فن کی نگاہ میں قابلِ اتفاق نہ ہوں۔ مگر میرا احساس بالکل اسی نوعیت کا احساس ہے جیسے کسی بدیہی چیز کا احساس ہوتا ہے اور اس نوعیت کے احساسات کو آدمی نہ رد کر سکتا ہے نہ خواہ مخواہ شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ ہماری تاریخ کا ایسا نازک حصہ جس قدر احتیاط اور جس قدر احساس ذمہ داری کے ساتھ قلمبند کیے جانے کی ضرورت تھی اسی قدر بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری یہاں کارفرما نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

طبری ج ۶ ص ۲۳۲ پر ایک روایت بتاتی ہے کہ حضرت حسینؓ کربلا میں اترے تو وہ جمعرات کا دن اور محرم سنہ ۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی۔ پھر ص ۲۳۷ پر ایک روایت آتی ہے کہ جمعرات کا دن اور محرم کی ۹ تاریخ تھی کہ مخالف لشکر کے سالار عمر بن سعد، عبید اللہ بن زیاد کے ایک فوری حکم کے ماتحت، عصر کے بعد اپنے کیمپ سے اٹھ کر حضرت حسینؓ پر چڑھائی کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ مگر پھر مفاہمت ہو گئی اور

آئندہ صبح تک کے لیے کارروائی روک دی گئی۔ ظاہر ہے ہے کہ اس کے بعد آئندہ صبح جو آئے گی تو وہ جمعہ کی صبح ہوگی۔ جب ۲ محرم کو بھی جمعرات بتائی گئی پھر ۹ محرم کو بھی جمعرات ہی بتائی گئی تو ۱۰ محرم کو سوائے جمعہ کے اور کوئی دن نہیں ہو سکتا۔ مگر آگے ص۲۴۰ پر دوسری صبح کو عمر بن سعد کی کارروائی (یعنی اپنے لشکر کو حرکت میں لانے) کا بیان آتا ہے تو ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ :-

قال فلما صلی عمر بن سعد لغداۃ	راوی کہتا ہے پھر جب ہفتہ کو عمر بن سعد
یوم السبت وقد بلغنا ایضاً انہٗ	نے فجر کی نماز پڑھ لی ـــــ اور ہمیں یہ بھی روایت
کان یوم الجمعۃ وکان ذالک	ملی ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور وہ دن
الیوم یوم عاشوراء خرج فیمن	عاشوراء (۱۰ محرم) کا تھا تو ابن سعد
معہ من الناس۔	اپنے لوگوں کو لے کر نکلا۔

فرمائیے کہ ص۲۳۲ اور ص۲۳۷ والی روایتوں کے پس منظر میں جن میں ۲ تاریخ کو جمعرات کا دن اور پھر ۹ تاریخ کو جمعرات کا دن بتایا گیا ہے، کوئی تُک اس طور پر ص۲۴۰ کی اُس روایت کو لینے کی ہے جس میں ۱۰ تاریخ کو ہفتے کا دن بتایا گیا ہے؟

ہمیں نہیں معلوم کہ "وقد بلغنا ایضاً" (اور ہمیں یہ بھی روایت ملی ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا) یہ الفاظ طبری کے ہیں، یا راوی کے۔ اگر راوی کے ہیں اور طبری نے کچھ کہا ہی نہیں، تب تو کہنا ہی کیا؟ اور اگر راوی کے نہیں طبری کے ہیں ـ تب بھی ایک مؤرخ کی ذمّہ داری کے لحاظ سے اس اندازِ کلام کو کوئی ذمّہ دارانہ انداز نہیں کہا جا سکتا جس سے ۱۰ محرم کو جمعہ کا دن ایک مشکوک دن بن جاتا ہے۔ حالانکہ گذشتہ بیانات کی رو سے وہ قطعی جمعہ کا دن ہے، کہنے کی بات یہ تھی کہ "یہ دن ہفتے کا نہیں جمعہ کا ہونا چاہیے، اور اگر ہفتہ ہی ثابت ہے تو پھر اگلے دونوں بیانات غلط ہیں۔"

طبری کا اپنا اعتراف

یہ مثال سامنے لا کر ہم طبری کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر

ان کی زندگی میں کہی جاتی تو شاید وہ کوئی صفائی دے سکتے۔ اُن کا خود اپنا اعتراف ہے کہ اُن کے قاری کو ایسی روایات مل سکتی ہیں جو کسی طرح صحیح نہ ہو سکتی ہوں، جو کسی طرح سمجھ میں نہ آ سکتی ہوں۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیانات پر رہا ہے نہ کہ عقل و فکر کے نتائج پر۔ کسی قاری کو اگر میری جمع کردہ خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز بایں وجہ ناقابلِ فہم اور ناقابلِ قبول نظر آئے کہ نہ کوئی اس کی تُک ملتی ہے نہ کوئی معنی بنتے ہیں تو اُسے جاننا چاہیے کہ ہم نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات ہمیں جس طرح پہنچی ہے ہم نے اسی طرح نقل کر دی ہے۔" (جلد اول ص۵)

پھر کونسی بات بعید ہے؟

مؤرّخ کا دامن جب اتنا وسیع ہو کہ اتنی موٹی اور دور سے نظر آنے والی اعجوبگی کے ساتھ بھی، جیسی کہ مذکورہ بالا مثال میں پائی جاتی ہے۔ ایک روایت کو اس کے یہاں بے چون و چرا جگہ مل سکتی ہے تو پھر راویوں کی کون سی غلطی، مبالغہ آرائی یا غلط بیانی رہ جاتی ہے جس کی توقع ہمیں اپنے ان مؤرخین کی کتابوں میں نہیں کرنی چاہیئے؟ خاص کر کربلا کے جیسے واقعات میں کہ جن سے جذبات متعلق ہوتے ہیں۔ تعصّبات متعلق ہوتے ہیں اور مثبت و منفی (POSITIVE & NEGATIVE) مفادات بھی متعلق ہو جاتے ہیں[1]

---

[1] تاریخ تو پھر تاریخ ہے کہ جس میں بہت سی گنجائشیں مانی گئی ہیں، طبری کی تو تفسیر میں بھی اسی درجہ کی اعجوبہ روایتیں ایسے معاملات تک میں پائی جاتی ہیں جن میں ادنیٰ درجہ کی بھی گنجائش نہیں مانی جا سکتی۔ سورۂ النجم کی تلاوت کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر معاذ اللہ مشرکین کے بتوں کی تعریف و توثیق میں "تلك الغرانیق العلیٰ" والے شیطانی کلمات جاری ہونے کی روایت کئی کئی سندوں سے بلا کسی نقد و نظر کے اس تفسیر میں دی گئی ہے۔

چنانچہ اس واقعے (واقعۂ کربلا) اور اس کے پس منظر کے واقعات کے سلسلے میں جہاں بظاہر صحیح اور قابلِ قبول روایات موجود ہیں، وہیں نہایت منکر اور ناقابلِ قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے۔ اور فی الواقع یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی روایت کو صحیح مانتے ہوئے بھی یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گو عقلاً صحیح نظر آتی ہے مگر ہو سکتا ہے کہ واقعہ میں یہ بھی صحیح نہ ہو۔ روایات کی اس صورت حال کا اندازہ آپ کو آگے بڑھ کر کتاب میں ہوگا۔ خاص کر کربلا کے میدان والی روایات میں۔ اور اسی لیے ہم نے اگرچہ کچھ روایات کو عقل، عادت، حالات و ماحول اور دوسرے قابلِ لحاظ پہلوؤں کی روشنی میں قابلِ قبول اور کچھ کو ناقابلِ قبول ٹھیرایا ہے۔ کچھ کو ترجیح دی ہے اور کچھ کو رد کر دیا ہے، مگر جس کو صحیح ٹھیرایا ہے اور جس کو ترجیح دی اس کو بھی فی الواقع اور سو فیصد صحیح کہنے کی ذمہ داری ہم نہیں اٹھا سکتے۔ جھوٹ اور سچ اور من گھڑت روایات کی وہ آمیزش نظر آتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔

کربلا کے واقعے میں غلط بیانی کے اسباب

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ کربلا کا سانحہ (چاہے جس شکل میں ہوا ہو) اول تو بجائے خود بہت جذبات انگیز ہے اور پھر اس کے پیچھے سیاسی صف آرائی کی ایک لمبی (کم از کم ۲۵ سالہ) تاریخ ہے جو ناگزیر طور پر دوطرفہ تعصبات کو بھی جنم دے چکی ہے اور مفادات میں دلچسپی رکھنے والے حلقے بھی بنا چکی ہے۔ مزید کوفیوں کی جس بے وفائی اور غداری نے یہ سانحہ کرایا اس کا بھی تقاضہ ہے کہ (قبائلی رقابتوں کے ماتحت) ایک دوسرے کو الزام دینے اور اپنے آپ کو اندر سے باوفا دکھانے والی روایتیں گھڑی جائیں، خاص کر جبکہ واقعہ کے چند سال بعد ہی یزید کی وفات سے حالات نے ایک دم پلٹا کھا لیا تھا۔ پھر ان سب باتوں سے اوپر، بہت سے راویوں اور مقتل نگاروں کا وہ "شیعی" جذبہ جو اگر اس نہایت "قیمتی" موقع کو ایمانداری کی نذر کر دیتا اور شیعیت کے مفاد کے لیے حسبِ ضرورت اور حسبِ استطاعت

رنگ آمیزی اور روایت آفرینی کی خدمت انجام نہ دیتا تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ غرض ان مختلف قسم کے محرکات و عوامل نے مل کر واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے واقعات کے بیان میں وہ غضب ڈھایا ہے کہ حقیقت کی یافت مشکل بن گئی۔ نہایت بے لاگ طریقے سے روایتوں کا تجزیہ کیا جائے تبھی ممکن ہے کہ صداقت تک رسائی ہو سکے۔

کام مشکل بھی اور ضروری بھی

اس قصے میں صداقت تک رسائی اور اس کا اظہار کس قدر مشکل (یعنی پُرخطر) کام ہے، اس کا اندازہ کسی اور کو ہو یا نہ ہو، اس راقم کو تو اُس وقت سے ہے جب اس موضوع پر ۲ سال پہلے والے مضمون میں بغیر یہ جانے ہوئے کہ کسی چھپائی گئی صداقت کا اظہار ہو جا رہا ہے، وہ روایت نقل کر دی گئی جس کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ آمادگی ظاہر کی تھی کہ:-

(اور یا) میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں پھر وہ جو مناسب سمجھے میرے اور اپنے معاملے میں فیصلہ کرے۔[1]

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس بیان کی بنا پر یہ مضمون بڑا ہنگامہ خیز ہو گیا اور آئندہ ماہ کے الفرقان میں جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے سے یہ بیان مدلل کر دیا گیا تب بات قابو میں آئی۔ لیکن وہ بھی صرف سچے علم دوست اور صداقت پسند لوگوں کی حد تک۔ باقی جن لوگوں کیلئے ایک تاریخی حقیقت کے مقابلے میں یہ شاعری جزو ایمان بن چکی تھی کہ ع

سر داد و نداد دست در دستِ یزید

وہ اپنے بے دلیل ایمان پر اس کے بعد بھی قائم اور سرگراں رہے۔

---

[1] تاریخ طبری جزو ۶ صفحہ ۲۳۵ ۔ البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۰

ایک ناگزیر ضمنی بحث

اگرچہ یہ موقع کسی بحث اور تفصیل کا نہیں ہے تاہم اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ آج کی ان سطروں کو پڑھ کر بھی ایسے تمام حضرات کو گرانی لاحق ہو، اس قدر بات یہاں کہدینا مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور فیصلہ اس پر چھوڑنے کی بات طبری، ابن اثیر اور البدایہ والنہایہ وغیرہ سب کے صفحات میں اس قدر روشن حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے بیان پر ناراض ہوتے ہیں وہ سچائی سے ناخوش ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ طبری نے اس واقعہ کی سلسلے کی سب سے پہلی روایت یہ دی ہے کہ حضرت حسینؓ نے عمر بن سعدؓ سے ملاقات کی اور کہا کہ دونوں لشکروں کو یہیں کربلا کے میدان میں چھوڑ کر ہم تم دونوں یزید کے پاس چلیں۔ مگر عمر بن سعد نے اس کو قبول کرنے سے عذر کیا، اس کے بعد طبری میں دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے :-

قال ابو مخنف واما ما حدّثنا به	ابو مخنف نے کہا۔ لیکن مجالد بن سعید
المجالد بن سعيد والصُقعب بن	اور صُقعب بن زہیر وغیرہ محدثین کا قول
زُهير الازدى وغيرهما من المحدثين	وہ ہے جو محدثین کی جماعت کا قول ہے
فهو ما عليه جماعة المحدّثين	وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے کہا تھا
قالوا انهٗ قال اختاروا مِنّی خصالاً	کہ میری تین باتیں قبول کرو، یا میں
ثلاثاً اِمّا ان ارجع الى المكان الّذى	اس جگہ کو لوٹ جاؤں جہاں سے آیا
اقبلت منهٗ واِمّا ان اضع يدى فى	ہوں یا یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے
يد يزيد بن معاويه فيرىٰ فيما بينى	دوں پھر وہ میرے اور اپنے بارے میں
وبينهٗ رأيهٗ واِمّا ان تسيّرونى	جو سمجھے فیصلہ کرے اور یا تم مجھے مسلمانوں
الى ثغر من ثغور المسلمين شِئتُمْ	کے کسی سرحدی مقام پر جہاں بھی تم
فاكون رجلاً من اهله لى	چاہو، پہنچا دو، وہاں میں وہیں کا ایک

مالهم وعلىّ ما عليهم.[1]	آدمی ہو کر رہوں گا جیسے وہ سب ویسا ہیں۔

سب سے پہلی روایت بھی طبری نے ابو مخنف ہی سے لی تھی۔ اور وہ ابو مخنف نے ایک فرد واحد، ہانی بن ثُبیت کے بیان کے طور پر دی تھی، بعد ازاں یہ دوسری روایت دی جس پر وہ محدثین کا اتفاق بتاتا ہے۔ اس کے بعد اسی ابو مخنف کی ایک تیسری روایت طبری میں آتی ہے، جو حضرت حسینؓ کے قافلے کے ایک باقی ماندہ فرد اور خاندانی غلام عُقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ میں اول سے آخر تک آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے کہیں کوئی اُس طرح کی بات نہیں فرمائی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ :-

دعونى فلاذهب فى هذه الارض	مجھے چھوڑ دو کہ کہیں بھی اس لمبی چوڑی
العريضة حتى ننظر ما يصير	زمین میں نکل جاؤں حتیٰ کہ یہ بات واضح
امر الناس[2]	ہو کر سامنے آجائے کہ لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں

اور پھر چوتھی روایت اسی ابو مخنف سے (دوسری روایت کی تکمیل کے طور پر) ہے کہ عمر بن سعد سے آپ کی ملاقات (جو معاملے کے سُلجھاؤ کے لیے آپ نے شروع کی تھی) تین یا چار بار ہوئی، اور اس کے نتیجے میں عمر نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ اللہ کا شکر ہے معاملات سدھرنے کی صورت نکل آئی ہے اور حسینؓ نے پیش کش کی ہے کہ

ان يرجع الى المكان الذى منه	یا تو وہ اسی جگہ کو لوٹ جائیں جہاں سے
اتى اوان نسيّرهٗ الى ثغر من	آئے تھے یا ہم ان کو مسلمانوں کے جس
ثغور المسلمين شئنا فيكون رجلاً	کسی سرحدی مقام پر چاہیں بھیجدیں اور
من المسلمين لهٗ ما لهم وعليه	وہاں وہ ایک عام مسلمان کی طرح رہیں
ما عليهم اوان يأتى يزيد	گے اور یا پھر وہ امیر المومنین یزید کے
	پاس چلے جائیں اور اپنا ہاتھ ان کے

---

[1] جزو ۶ ص ۲۳۵ ۔ [2] ایضاً

امیر المؤمنین فیضع یدہ فی	ہاتھ میں دے دیں پھر وہ ان
یدہ فیری فیما بینہ و بینہ	کے اور اپنے معاملے میں جو مناسب
رأیہ [١]	سمجھیں کریں۔

عُقبہ بن سمعان کا بیان اگر اس معاملے میں مان لیا جاتا تو اس سے قضیے کی ایک بڑی گتھی حل ہو سکتی تھی۔ جو عقبہ کے بیان کے برخلاف یہ دوسرا بیان ماننے سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت حسینؓ نے تین باتوں کی پیش کش کی تھی، جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس بیان کو ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ابن زیاد کو کیا مصیبت آئی تھی کہ خود اپنے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مطالبہ کر کے بے ضرورت قتال کی صورت پیدا کی؟ تاریخ کی روایات میں اس کا صرف ایک جواب ملتا ہے کہ شمر بن ذی الجوشن نے چڑھا دیا (طبری ص ۲۳۶) مگر یہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے۔ ابن زیاد کوئی ایسا ہلکا اور سطحی آدمی تو نظر نہیں آتا جو ایسی حماقت کسی کے چڑھانے سے کر لے۔ خاص طور سے جبکہ اسی روایت کا یہ بیان بھی سامنے رکھا جائے کہ عمر بن سعد کے اس خط پر ابن زیاد کا اپنا ردِ عمل نہایت مسرت اور قبولیت کا تھا۔[٢] بہرحال راقم سطور کی نظر میں اس گتھی کا کوئی معقول اور تشفی بخش حل نہیں ہے۔ البتہ عقبہ بن سمعان کا بیان مان لیا جائے تو پھر سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قتال کی بات بالکل سمجھ میں آتی ہے۔ اور ابن زیاد کیلئے یہ کہنے کا موقع ہوتا ہے کہ "اچھا اب وہ ہمارے ہاتھ میں آکر ہاتھ سے نکل جانا چاہتے ہیں؟" لیکن اس سہ گانہ پیش کش والی روایت کا پلڑا اتنا بھاری ہے اور اتنے شواہد اس کے حق میں پائے جاتے ہیں کہ چار و ناچار اسی کو ماننا پڑتا ہے اور عقبہ بن سمعان کی شہادت کے بارے میں وہ کہنا پڑتا ہے جو جسٹس امیر علی نے (تشیعت کے باوجود اپنی معقول پسندی کی بنا پر) کہا ہے کہ عُقبہ کا یہ انکار شاید اس بنا پر تھا کہ سہ گانہ پیش کش والی روایت میں اُنکو

[١] طبری جزو ۶ ص ۲۳۵-۳۶ [٢] جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا۔

حضرت حسینؓ کی توہین نظر آتی تھی[١]

اس روایت کے وزن کی سب سے پہلی وجہ تو ابو مخنف کا یہ بیان ہی ہے کہ "جماعتِ محدثین کا اس پر اتفاق ہے"۔ دوسرے یہ کہ ابو مخنف اور طبری دونوں عقبہ بن سمعان کی بات نقل کرنے کے بعد آگے چوتھی روایت پانچویں روایت اور چھٹی روایت میں مسلسل وہ باتیں بیان کر کے جو سہ گانہ پیش کش کے نتیجے میں پیش آتی چلی گئیں۔ گویا ابن سمعان کی بات کو ناقابلِ اعتنا قرار دے دیتے ہیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ۔ از تاریخ کے واقعات میں حضرت حسینؓ کے ساتھیوں کی زبان پر ابن سعد اور اس کے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے بار بار یہ بات ملتی ہے کہ:۔

اَفَمَا لَکُمْ فِی واحدۃٍ من الخصال	کیا حضرت کی پیش کی ہوئی باتوں میں سے
التی عرض علیکم رضیً ؟	کوئی ایک بھی تم کو قبول نہیں ؟

طبری جزو ۶ کے صرف دو صفحوں (ص ۲۴۴ اور ۲۴۵) میں تین جگہ یہ بات آتی ہے اور اس کے بعد بھی آتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس روایت کو نہ مانا جائے۔

اصل بات جو کہنا تھی

یہ ضمنی بات ناگزیر سمجھ کر عرض کی گئی، ورنہ اصل بات یہ کہی جا رہی تھی کہ اس قصے میں اصل حقیقت اور صحیح واقعات کی یافت بھی مشکل اور اس سے زیادہ اس کا اظہار مشکل۔ اس لیے کہ اس میں لوگوں کو یا حضرت حسینؓ کی (معاذ اللہ) توہین نظر آتی ہے، اور یا یزید و ابن زیاد کی طرفداری۔ لیکن ہے یہ ایک ضروری کام۔ اس لیے کہ یہ "توہین" نظر آنا اور "طرفداری نظر آنا" یہ دونوں باتیں ہم سب کی نظروں میں (اِلّا ماشاء اللہ) شیعیت کا رنگ آجانے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ رنگ کوئی اچھا رنگ نہیں ہے۔ واقعۂ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا

1— SPIRIT OF ISLAM P.301 Delhi (1978)

نہ ہوا ہو، شیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سنّی معاشرے پر شیعیّت کے اثرات

میں اور کسی کا کیا کہوں، اپنے والد ماجدؒ کا ایک اعتراف اور ایک بیان نقل کرتا ہوں۔

ذی الحجہ سنہ ۷۳ھ کے الفرقان میں میرا مضمون "واقعۂ کربلا" شائع ہوا تو والد ماجد لکھنؤ سے باہر کہیں سفر میں تھے۔ میری عادت یہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی لکھتا بالعموم اُن کو دکھا کر ہی الفرقان میں دیتا تھا۔ مگر یہ مضمون اُن کی حالتِ سفر کی وجہ سے نہیں دکھایا جا سکا تھا۔ واپس آکر پڑھا تو میرے یہاں تشریف لائے۔ بقولِ خود بہت غصّے میں گھر سے نکلے تھے۔ اولاً تو اس بات پر کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کو "بغاوت" سے تعبیر کر دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ "یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دیدینے" (یعنی بیعت یا سپردگی منظور کر لینے) کی "لغویات" نہ جانے کہاں سے لکھدی! لفظ "بغاوت" کی خلش کے بارے میں تو خود ہی فرمایا کہ وہ آتے آتے راستے ہی میں دور ہو گئی کہ یہ لفظ ہمارے فقہاء کے یہاں بے شک بُرا لفظ ہے لیکن آج کل کا ہندوستانی تو اس لفظ کو اپنے یہاں کے آج کے استعمال کے مطابق بولے گا اور آج کے استعمال میں، خصوصاً تحریکِ آزادیٔ ہند کے پسِ منظر میں، تو یہ لفظ ایک پسندیدہ اور فخر سے بولا جانے والا لفظ ہے نہ کہ کوئی مکروہ و مذموم لفظ، لیکن دوسری خلش باقی رہی اور وہ اس وقت دور ہوئی، جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے میں نے پیش کیے جو ایک دوسرا وضاحتی مضمون لکھنے کے لیے جمع کیے گئے تھے۔

یہ بات تو آج سے ۲۷ برس پہلے ہوئی۔ زیرِ نظر کتاب کا جب وہ باب تیار ہوا اور والد ماجدؒ نے سنا جو "حضرت مغیرہ بن شعبہ اور یزید کی ولی عہدی" کے متعلق ہے، تو بیان فرمایا کہ ہمارے بچپن میں عشرۂ محرم میں ہمارے گھر مجلس ہوتی تھی، ہمارے بڑے بھائی صاحب تاریخ ابن خلدون

(مترجم) سے حضرت حسینؓ کی شہادت کا بیان سناتے تھے، جس میں حضرت مغیرہؓ کا ذکر بھی آتا تھا، تو بعض بڑے بوڑھوں کا ان کے متعلق یہ کہنا یاد ہے کہ "ہاں شیرے کی بوند تو مغیرہ ہی نے لگائی تھی" یعنی فساد کا بیج تو انہوں نے ہی بویا تھا۔ ایک صحابی (اور وہ بھی صاحبِ فضائل و مناقب صحابی) کے متعلق کس بے تکلفی سے کتنی بڑی بات کہدی جاتی تھی! ــــ اور یہ ہمارے وطن سنبھل کے پرانے بڑے بوڑھوں ہی میں نہیں کہدی جاتی تھی، جن کے پاس کوئی خاص علم نہ تھا اور جن کے زمانے تک اس موضوع پر کوئی بڑا اصلاحی کام ہندوستان میں نہ ہوا تھا بلکہ ہمارے زمانے کے ایسے اہلِ علم تک جن کے متعلق اس طرح کے کسی تبصرے کا خیال بھی اُن کے علمی اور تنقیدی مذاق کی بنا پر نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ ان کے قلم سے ہم بعینہٖ یہی "شیعیت" ٹپکتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ یزید کی ولی عہدی کے قضیے میں اُس فضول سی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے جو کہتی ہے کہ حضرت مغیرہ نے اپنی گورنری بچانے کے لیے یزید کی ولی عہدی کا خواب حضرت معاویہؓ کو دکھایا، جو ان کے لیے اتنا خوش کن تھا کہ حضرت مغیرہ سے لی جانے والی گورنری بحال کر دی[1]۔ کس طنزیہ انداز میں لکھا ہے کہ:۔

> "یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تجویز کسی صحیح جذبے سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا۔[2]

حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابلِ صد لحاظ اور واجب الاحترام شئی ہے۔ وہ آدمی بد نصیب ہے جو آپؐ کی قرابتوں کا لحاظ اور احترام نہ کر سکے۔ لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے اور معصومین محض کا درجہ کسی کو دینا الگ چیز ہے۔ شیعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

[1] زیرِ نظر کتاب میں ایک پورا باب اس روایت پر آپ کو ملے گا۔ [2] خلافت و ملوکیت ۱۹۷۴ء از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۵۱

کے ساتھ حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرات حسن وحسین (رضی اللہ عنہم) اور اپنے دیگر ائمہ کو بھی عصمت کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ نتیجے میں ان محترم حضرات سے کسی خطا اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ان سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کرنے والا لازماً ہی خطا کار و گنہ گار قرار پائے گا۔

ہم اہل سنت بطور عقیدہ یہ بات نہیں مانتے مگر بہت تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ہمارا عمل اسی ذہنی رویے کی شہادت دیتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے سے حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے معاملات میں بعض دوسری اعتقادی قسم کی رکاوٹیں ہمیں اس رویّے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہی جو نیا دور شروع ہوتا ہے تو ہمارے اس رویّے کے اظہار کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی کہانی میں ہم ذرا بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے، انصاف کے بجائے حضرت معاویہؓ کو بس کچھ رعایت بمشکل دیتے ہیں۔ اگر ہم سچ مچ انصاف پر آمادہ ہو سکتے تو اس قضیے کی صورت ہماری نظروں میں آج بہت کچھ مختلف ہوتی، ہم اپنے اس رویّے کو کتاب و سنّت پر مبنی کچھ اعتقادات سے مربوط کرتے ہیں مگر واقعے میں اس کا ربط ان شیعی اثرات سے زیادہ ہے جن سے اہلِ سنّت کا کوئی طبقہ بھی بمشکل بچ سکا ہے۔

بے انصافی کی ایک مثال

بے انصافی کی صرف ایک مثال لیجئے ـــــ اس لیے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی ـــــ کہ جن تاریخی کتابوں سے ہم حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ پر "سب و شتم" کی روایتیں پاتے ہیں انھیں کتابوں کی شہادت یہ بھی ہے کہ :-

"وکان علی اذا صلی الغداة	اور (واقعہ تحکیم کے بعد) علیؓ جب فجر کی
یقنت فیقول : اللھم العن	نماز پڑھتے تو قنوت پڑھتے اور کہتے

معاویة وعمرًا وابا الاعور وحبیبًا	کہ اے اللہ لعنت کر معاویہ پر، عمرو بن العاص
وعبد الرحمٰن بن خالد والضحاک	پر، ابو الاعور پر، حبیب (ابن مسلمہ) پر،
بن قیس والولید فبلغ ذالک	عبد الرحمٰن بن خالد (بن ولید) پر، ضحاک بن
معاویة فکان اذا قنت لعن	قیس پر اور ولید پر۔ پس یہ بات جب معاویہ
علیًّا وابن عباس والحسن	کو معلوم ہوئی تو وہ بھی جب قنوت کرتے تو
والحسین والاشتر۔[1]	علیؓ، ابن عباس، حسن، حسین اور اُشتر پر لعنت کرتے۔

لیکن اس صاف و صریح بیان کے باوجود ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتے تھے[2] یہ نتیجہ حضرت علیؓ کے اس احترام کا نہیں ہے جو از روئے کتاب و سنت ہم پر واجب ہے کیونکہ کتاب و سنت بے انصافی نہیں سکھاتی بلکہ اس "احترام کا نتیجہ ہے جو شیعیت والے عقیدۂ معصومیت سے لازم آتا ہے" اہلِ سنت کے اصل مذہب کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر یہ روایت حضرت علیؓ کے حق میں قابلِ یقین یا قابلِ بیان نہیں تھی تو ایسا ہی حضرت معاویہؓ کے حق میں سمجھا جاتا کہ وہ بھی صحابی ہیں۔

تاہم حضرت علیؓ کے مقابلے میں جیسے کچھ بھی تھے حضرت معاویہ بہرحال ایک صحابی تھے۔ اس لیے ہم اپنے علم کلام کے ماتحت مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ رعایت برتیں۔ لیکن جب ان کے بیٹے یزید کا دور آتا ہے تو اس کے اور حضرت حسین ابن علیؓ کے معاملے میں ہم میں اور شیعوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے کہ یزید کو ایسا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا جیسا کہ اس کے والد حضرت معاویہ کو حاصل تھا۔ شیعوں نے "مثلاً" کہا کہ وہ فاسق و فاجر تھا اور کسی طرح اس لائق نہ تھا کہ تختِ خلافت پر اس کو جگہ ملتی۔ تو چونکہ یہ بات حضرت حسینؓ کی حمایت میں کہی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۴۰ [2] اور یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ طبری کی روایت میں جیسا کہ نقل کیا گیا دونوں جگہ "لعنت" کا لفظ ہے۔ اسی کو ابن اثیر نے اپنی کتاب میں دوسری جگہ یعنی حضرت معاویہ کے ساتھ "سب" کے لفظ سے بدل دیا ہے جس کا ترجمہ ہم "سب و شتم" کرتے ہیں۔

گئی تھی اس لیے بالکل بآسانی ہم نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ پھر بعض کو خیال آیا کہ اس سے تو حضرت معاویہؓ پر بڑا الزام آتا ہے۔ تب یوں کر دیا گیا کہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تو وہ ایسا نہیں تھا لیکن بعد میں ہوا۔ حد یہ ہے کہ ابن خلدون جیسا آدمی جس نے یزید کی ولی عہدی کی زبردست وکالت اپنے مقدمۂ تاریخ میں کی ہے، وہ بھی ذرا سا آگے چل کر جب یزید اور حضرت حسینؓ کے قضیے پر آتا ہے تو ٹھیک یہی بات کہنی شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ وہ فاجر و فاسق ہوگیا تھا۔ کب ہوگیا تھا؟ اور کب اس بات کا پتہ چلا؟ تاریخ تو کوئی سی بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے، ہر جگہ ایک ہی بیان ہے کہ جیسے ہی مدینے کے گورنر نے حضرت حسینؓ کو یہ اطلاع دی کہ حضرت معاویہ انتقال فرما گئے اور ان کے ولی عہد یزید بن معاویہ آپ سے بیعت چاہتے ہیں، ویسے ہی حضرت حسینؓ نے مدینہ چھوڑ دینے کا ارادہ فرما لیا اور آنے والی رات میں مع تمام خاندان کے مکے کی راہ لی — اس کے بعد جب اس کی اطلاع شیعانِ علی کو پہنچی تو وہ بھی اپنے مشاورتی جلسے کر کے عازمِ مکہ ہوئے اور صرف سوا مہینے کی مدت میں یہ مرحلہ آگیا کہ عراق میں حالات کی جانچ پڑتال اور ضروری پیشگی تیاریوں کے لیے مسلم بن عقیل کوفے کو روانہ کر دیئے گئے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ یزید نے تختِ خلافت بعد میں سنبھالا والد کے انتقال کی خبر پاتے ہی فسق و فجور کا وہ عالم برپا کیا کہ حضرت معاویہ کے انتقال کی خبر سے پہلے یزید کے فسق و فجور کی خبریں پھیل گئیں؟ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اس بات کے لیے سوا مہینہ بالکل ناکافی تھا، کم از کم ایک سال تو گزرتا۔ "بیچاری مے" کی طرح فسق و فجور "مفت میں" بدنام ہوا ہے[1]

لکیر کی فقیری یا طلبِ علم و تحقیق؟

اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب ابن خلدون جیسے آدمی نے بھی یہی لکھ دیا تو پھر ثبوت ہو یا نہ ہو، سمجھ میں آئے نہ آئے، نہ ماننے کی کیا گنجائش ہے؟ یہ وہ طریقہ اور وہ طرزِ فکر ہے

[1] کتاب میں اس مسئلے پر قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

جس نے سچی بات یہ ہے کہ ہمارا خانہ خراب کیا ہے اور علم کے نام سے علمی جمود ہمارا شعار بن گیا ہے۔ اگلوں کی توقیر و تعظیم کے نام پر طلبِ علم و تحقیق کی راہ بند کرنے والا یہ طرزِ فکر اگر ہمارے یہاں عام نہ ہوا ہوتا تو ہمارا عالم آج کے عالم سے بہت مختلف ہوتا۔ منجملہ اس کے یہ جو شیعیت ہمارے یہاں اُس وقت گھس آئی تھی جب اس نے ایک باقاعدہ متوازی مذہب کی شکل اختیار نہیں کی تھی، یہ بعد کے دور میں قطعی طور سے نکالی جا سکتی تھی، اور نکال دی جاتی اگر طالب علمانہ کی جگہ یہ "منصوفانہ" ذہنیت ہم پر حاوی نہ ہو چکی ہوتی کہ جو اوپر والوں نے جس معاملہ میں کہہ دیا اور لکھ دیا وہ حرفِ آخر اور پتھر کی لکیر ہے اور اس لکیر کی فقیری ہم کو کرنا ہی ہے ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

اللہ ہی جانے کہاں سے یہ طرزِ فکر اس دینِ اسلام میں آیا جس کا خمیر ہی ذاتی غور و فکر کی دعوت سے اٹھایا گیا تھا اور آباء و اجداد اور رہبان و احبار (مشائخ) کی اندھی تقلید کو ضلال و خسران بتایا گیا تھا؟ کھلی ہوئی بات ہے اور ہم سبھی جانتے و مانتے ہیں کہ کوئی آدمی عالمِ کُل نہیں ہوتا، پھر ہر ایک کا کچھ نہ کچھ خاص زاویۂ نظر ہوتا ہے، ہر ایک اپنے زمانے اپنے ماحول اور ماحول پر غالب چیزوں سے متأثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی کتنا بھی بڑا عالم اور محقق ہو کہیں نہ کہیں ٹھوکر ضرور کھائے گا، کسی نہ کسی لاعلمی یا غلط فہمی کا شکار ضرور ہوگا (اِلّا ماشاءَ اللہ) اس لیے اگر اس کے احترام کے ساتھ ساتھ علم کے حق کا احترام بھی منظور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی باتوں کو تقلیداً لینے کے بجائے تحقیقاً لینے میں کوئی حرج سمجھا جائے اور خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِر (جو ٹھیک ہے وہ لے لو جس میں گڑبڑ ہے وہ چھوڑ دو) کے دانشمندانہ مقولے پر عمل نہ کیا جائے۔ کسی بڑے آدمی کے حوالے ہی کی ضرورت اگر اس کھلی ہوئی بات کو بھی قبول کرنے میں ہو تو حضرت امام مالکؒ کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

کل یوخذ منہ و یرد علیہ — سوائے اس قبر والی ذات گرامی کے ہر ایک کا

قول جس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے، قابلِ رد بھی ہو سکتا ہے، ۔۔۔ إلّا صاحب هٰذا القبر۔

ہر انسان کی اس محدودیت اور انفعالیت کے علاوہ ایک دوسری کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ کسی گذشتہ زمانے کو ہم اخلاق وکردار اور عادات واطوار کے لحاظ سے اس کے بعد والے زمانوں کے مقابلے میں خواہ کیسا ہی بہتر سمجھیں مگر وسائل کے معاملے میں ہر بعد والا زمانہ پہلے زمانوں کو پیچھے چھوڑتا آرہا ہے۔ وسائلِ علم کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر ترقی پذیر ہیں۔ کتنے ہی علوم جو اگلی صدیوں میں یا تو مدوّن نہ تھے اور مدوّن ہو گئے تھے تو ان کے مجموعے آسانی سے دستیاب نہ تھے، جبکہ زمانے کی ترقیوں نے اُن کو اب نہایت منقّح شکلوں میں ہر کہہ ومہ کی دسترس میں کر دیا ہے، پھر علمی تحقیقات کو آسان بنانے کا فن الگ نئے نئے طریقے اور وسیلے ایجاد کر کے اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نتیجے میں نئی علمی تحقیقات کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ ایسے حال میں ہمارا علم جوں کا توں اور جمودِ مطلق کا نمونہ بنا رہے۔ جس معاملے میں جو بیان اگلے لوگ دے گئے تھے اور جو رائے ظاہر کر گئے تھے، اسے نئے اور بہتر وسائل کی روشنی میں پرکھ کر دیکھنے اور پھر رد کر دینے یا قبول کیے رہنے کا اپنا فیصلہ کرنے کی جرأت کے بجائے ہم جوں کے توں اُسی رائے پر قائم رہنے میں اور ہر نئی آواز اور نئی رائے سے لڑ جانے میں اپنی سعادت سمجھیں۔ بے شک (حسنِ نیت کے ساتھ) اُخروی سعادت ضرور ہو سکتی ہے مگر دنیوی سعادت کی قیمت پر ہو گی ـــــ اور ہو رہی ہے ـــــ جبکہ ہمارا دین بیک وقت دونوں سعادتوں کا کفیل ہے اور دونوں کی بیک وقت طلب ہی وہ ہمیں سکھاتا ہے[1]۔

دوسرا طریقہ جو ابن خلدون جیسے اہلِ علم کا اصلًا طریقہ ہے، یہ ہے کہ ہمیں اگر حضرت حسینؓ کی زندگی میں یزید کے فسق و فجور کی کوئی معتبر شہادت نہیں

---

[1] بلا تکلف اعتراف ہے کہ جو چیز آج قطعًا ناقابلِ فہم معلوم ہو رہی ہے، بہت کچھ نافدار ذہن رکھنے کے باوجود ایک زمانے میں ایک حد تک وہ اپنا حال بھی رہی ہے۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش عمر کا وہ قیمتی حصہ اس کم فہمی کی نذر نہ ہوتا۔ [2] ان الفاظ کو یاد رکھیے کیونکہ گفتگو حضرت حسینؓ کی زندگی کے دور تک کی ہی ہے۔

ملتی[1] تو پھر ساری دنیا کہے، بشمول ابن خلدون کہے، تب بھی اس قول اور بیان کو بس اس پر محمول کرنا چاہیے کہ بعض باتیں اپنی شہرت کی بنا پر اس درجہ یقینی اور قطعی بن جاتی ہیں اور ایک زمانے تک بنی رہتی ہیں کہ ان کی واقعیت میں کسی شک اور ان کے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت کا سوال ہی ذہن میں نہیں آتا۔ اور یہی چیز اس معاملے میں پیش آئی ہے۔ حضرت حسینؓ جیسی شخصیت کا یزید کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل اور پھر شیعہ پروپیگنڈہ مشینری (جس نے پروپیگنڈہ کے زور پر حضرت عثمانؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی کو ایک کافر ومرتد باور کرا دیا تھا) ان دو چیزوں کی طاقت مل کر یزید کے بارے میں کیا کچھ نہیں باور کرا سکتی تھی؟ اس شہرت کا پردہ جب تک چاک نہ ہوا تھا اور پروپیگنڈے کا سحر ٹوٹا نہ تھا تب تک جس طرح بات چلتی رہی چلتی رہی۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ہمیشہ یوں ہی چلتی رہے اور حقیقت کھل جانے پر بھی اس کے ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ نہ کیا جائے؟

مومن کا معیار اور اس کی ذمہ داری

یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں، اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذاتِ اقدس کی طرف یہ تمام رشتہ داریاں لوٹتی ہیں ان کی مبارک تعلیم نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کر دیا ہے باقی تمام رشتہ داریوں کا درجہ

---

[1] صرف ایک شہادت ہمارے علم کی حد تک یہ ملتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے معاملے میں اپنے حاکمِ بصرہ زیاد سے مشورہ مانگا تو اس نے یزید کے شوقِ شکار اور کچھ آزاد روی وسہل انگاری کا اندازہ کر کے یہ مشورہ دیا کہ یہ کام کچھ مؤخر کر دینا مناسب ہوگا اور ساتھ ہی یزید سے کہلوایا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کرے۔ چنانچہ اسی روایت کے مطابق اس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی (طبری ج ۶ ص۱۷۰) یعنی جو کچھ تھا وہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تھا اور اسی زمانے میں ختم ہو گیا۔

اس کے بعد رکھا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ	اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف کے
بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ	ساتھ گواہ بن کر اللہ کے۔ اگرچہ گواہی تمہارے
أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ [1]	اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں
	کے خلاف ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ	اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ کیلئے
لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	انصاف کے گواہ بن کر۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں
شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا	بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف ہی
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ [2]	کرو کہ یہ قرین تقویٰ ہے۔

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یزید کے لیے اور حضرت حسینؓ کے لیے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ ہوں بلکہ:

العین تدمع والقلب یحزن	آنکھوں میں نم ہے اور دل میں غم مگر زبان
ولا نقول الا ما یرضیٰ بہ ربنا۔ [3]	سے بس وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا مطالعہ اگر اللہ و رسول کی ان تعلیمات کی روشنی میں اسی اسپرٹ سے کیا جائے جس اسپرٹ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک یہودی ملزم کے ساتھ برابری کی سطح پر اپنے قاضی کی عدالت میں حاضری قبول فرمائی۔ جس اسپرٹ کے ساتھ قاضی نے حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ دیا (اور صرف اس ٹیکنیکل بنیاد پر دیا کہ گواہی معتبر شرائط پر پوری نہیں اترتی) اور جس اسپرٹ کے ساتھ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ بلا تامّل قبول فرمالیا۔ انصاف

---

[1] القرآن۔ سورۃ النساء (۴) آیت ۱۳۵۔ [2] القرآن سورۃ المائدۃ (۵) آیت ۸۔

[3] یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع کا ارشاد ہے جب صاحبزادہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے ہاتھوں میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر رہے تھے اور آپ پر غم کا عالم طاری تھا۔

کی اس اسپرٹ کے ساتھ ہم اگر معاملے کو جانچنے کی کوشش کریں تو اس قضیے میں اب تک جو تصور چلا آرہا ہے اس کے باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اگر واقعی ایک ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اس تصور اور تاثر کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو اس معاملے میں اب تک عام طور سے رہا ہے تو پھر یقیناً یہ ایک ایماندارانہ فریضہ ہے کہ اس مطالعے کو سامنے لایا جائے اور ان تمام حلقوں تک اسے پہنچانے کی امکان بھر سعی کی جائے جو اب تک کے تصور کو ایک ایمانی سعادت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس طرح حقائق کے ساتھ بے انصافی جیسی غلط چیز ایمان کا تقاضہ بن جاتی ہے۔

اس کام کی ضرورت

راقم کو پورا احساس بلکہ تجربہ ہے جس کا اوپر اظہار ہو چکا ہے کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق نازک قسم کے جذبات سے جُڑ گیا ہو ایک صدیوں اور نسلوں سے جمے ہوئے تاثر اور تصور کو چھیڑنا ایک پُرخطر کام ہے۔ مزید یہ اس لیے بھی ایک دشوار کام ہے کہ خود اپنے جذبات کی دنیا بھی اس "ایمانداری" کے ہاتھوں جگہ جگہ آزمائش میں پڑتی ہے۔ اس لیے کہ اب تک کا عمومی تصور کچھ نہ کچھ ہم سبھی کو ورثے میں ملا ہے۔ مگر یہ معاملہ جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے، ان معاملات میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دینی زاویۂ نظر کو مجموعی طور سے بہت متاثر کیا ہے، یہ ان معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے شعور کو مدھم کیا ہے، جن معاملات نے انصاف پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے اور حقیقت بینی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی دین تھی اُس سے اُمّت کو بحیثیت مجموعی محروم کیا ہے، اُمّت کا ہر حلقہ (خاص طور سے ہر دینی حلقہ) جو آج اپنے آپ کو معیارِ حق بنائے ہوئے ہے، اور اس طرح حق سب سے زیادہ مشتبہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے، یہ ایسے ہی معاملات کا رفتہ رفتہ اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے اوّلین اسلامی اور انسانی تقاضوں

کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قربان کر دیا جاتا رہا۔ ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش پرانے حلقوں کے باہمی بُعد میں اضافہ اور ان میں سے ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے نئی باہمی تقسیمیں، یہ سب عذاب اسی انصاف پسندی، حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کے فقدان کا ہے، اس عذاب سے اُمّت کے نکلنے کی کوئی صورت اس کے بغیر نہیں ہے کہ جہاں جہاں سے اس فساد کی ابتدا ہوتی نظر آتی ہے وہاں وہاں سے اصلاح کے کام کی ہمّت کی جائے۔

پیش نظر کتاب اصلاً تو والد ماجدؒ کے ایماء کی تعمیل ہے، مگر جس خاص شکل میں اور جس انداز پر تیار ہوئی ہے وہ میرے انہی مذکورہ بالا احساسات کا نتیجہ ہے، برسہابرس سے بڑی شدّت کے ساتھ احساس ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی اور انصاف پسندی جس پر تمام دینی اور دنیوی سعادتوں کا مدار ہے ایک عنقا صفت شئی ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سعادت بھی ہمارے یہاں عنقا ہو گئی ہے عاقبت کی خبر تو خدا جانے۔ ہم پر وہاں کا حال وہیں جا کے کھلے گا۔ دنیا کی ہر سعادت سے بحیثیت قوم و ملت محرومی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو قوم بھی حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرے گی اور مزعومات کو عقائد بنا لے گی وہ لازماً پسماندگی اور محرومی ہی کو اپنا مقدر بنائے گی۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اپنا یہ حال بدلے اور یہ کتاب اس تبدیلیٔ حال میں مددگار ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

کچھ حوالوں کے سلسلے میں

کتاب کی تسوید کا بیشتر کام فروری سنہ ۹ء سے جولائی سنہ ۹ء تک ہندوستان کے قیام میں ہوا، مگر اس کی شروعات لندن ہی میں ہو چکی تھی، لندن میں البدایہ والنہایہ اور تاریخ ابن اثیر کے جو ایڈیشن سامنے رہے تھے اور جن سے لیے ہوئے کچھ نوٹس وغیرہ بھی ساتھ تھے ہندوستان

میں کام کرتے وقت یہ ایڈیشن دستیاب نہ ہو سکے، اس کی بنا پر ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشنوں کے حوالے کتاب میں آ گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ حوالے میں ایڈیشن کا امتیاز ہو جائے مگر امکان ہے کہ کہیں کچھ التباس ہو گیا ہو۔ اگر کوئی صاحب ان دونوں کتابوں کا کوئی حوالہ ملائیں اور اس میں کوئی دقت پیش آئے تو سمجھ لیا جائے کہ صفحہ کا نمبر دوسرے ایڈیشن ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کا سنہ وار ذکر ہے اس لیے سنہ کے حساب سے ہر واقعہ بآسانی ہر ایڈیشن میں پایا جا سکتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

تشکّر و امتنان

کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جن اصحاب کی مدد کا میں ممنون ہوں ان میں سرِفہرست نام جناب مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظم کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا ہے جن کی عنایت و کرم فرمائی سے ضرورت کی ہر وہ کتاب جو کتب خانہ میں تھی بروقت اور بہ آسانی دستیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس مہربانی کا بہترین اجر میری طرف سے دے۔ افسوس کہ وہ اس تیسرے ایڈیشن کے وقت ہماری دنیا میں نہیں ہیں۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں اپنے محبِ قدیم مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی اور ایک نئے محب مولانا عتیق احمد صاحب بستوی کو بھی میں نے کئی دفعہ بعض چیزوں کی تلاش کے لیے تکلیف دی جسے ان حضرات کے علمی ذوق و نظر نے آسان کر دیا۔ ہر وقت کے اور حسبِ ضرورت مددگاروں میں میرے عزیز برادر خورد میاں خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی رہے۔ اللہ ان کو سلامت بعافیت رکھے۔ کتابت کی تصحیح وغیرہ کی ذمہ داری

(۱)

جبکہ اس کام کو مکمل کیے بغیر لندن چلا آیا تھا، انھیں کے اوپر رہی۔ اور اس کے بعد کتاب کی طباعت اور اشاعت کے اہتمام کے لیے ان سے بڑے بھائی میاں محمد حسان نعمانی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اُس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن ۴؍ اگست ۹۰ء

باب اوّل

شہادت عثمانؓ — خانہ جنگی — صلح حسنؓ

شہادت عثمانؓ اور خانہ جنگی

حضرت عثمانؓ کی شہادت (۳۵ھ) کے وقت سے مسلمانوں میں باہم تلوار چلنے کا جو دروازہ کھلا تو پھر اس پر حرام ہو گیا کہ بند ہو، اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

اذا وُضع السیف فی امتی	میری امت میں جب ایک دفعہ
لم یُرفع عنها الیٰ یوم القیامة[1]	آپس میں تلوار کھنچ جائے گی تو پھر
	وہ قیامت تک رکھی نہ جائے گی۔

یہی بات حضرت عبداللہ بن سلامؓ (صحابی) نے اُن کوفیوں، بصریوں اور مصریوں سے فرمائی تھی جو حضرت عثمانؓ کے درپے قتل تھے[2]۔ مؤرخ ابن اثیر نے ان کے الفاظ نقل کئے ہیں

یا قوم لا تسلّوا سیف اللہ فیکم	اے لوگو، اللہ کی تلوار کو آپس میں مت
فواللہ ان سللتموہ لا تغمدوہ	کھینچو، خدا کی قسم اگر تم نے اسے بے نیام
ویلکم ان سلطانکم الیوم یقوم	کر دیا تو پھر یہ واپس نیام میں جانے والی

---

[1] مشکوٰۃ۔ کتاب الفتن۔ فصل ثانی۔ بحوالہ ابو داؤد، ترمذی۔ [2] انہی لوگوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی۔ یہ کون لوگ تھے؟ اس کی کچھ تفصیل انشاءاللہ باب دوم میں آئے گی۔

بالدّرة، فان تقتلتموه لا یقوم الاّ بالسّیف۔ [1]	نہیں ہے۔ دیکھو، سمجھو، آج تک تمھاری حکومت فقط دُرّے سے چلتی رہتی ہے اگر تم نہ مانے اور عثمانؓ کو قتل کر دیا تو پھر یہ تلوار ہی سے چلے گی۔

اورخود حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں سے اس بات کو یوں کہا تھا:۔

" اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر آئندہ کبھی باہم محبّت سے نہ رہ سکو گے، ایک ساتھ نماز نہ پڑھ پاؤ گے اور ایک جان ہو کے دشمن سے نہ لڑ سکو گے[2]۔

جنگ جمل اور صِفّین

یہ تلوار آپس میں چلی اور ایسی چلی کہ الامان الحفیظ! شہادت عثمانؓ پر ایک سال بمشکل گزرا کہ مسلمانوں نے آپس میں دو جنگیں جنگ جَمل اور جنگ صِفّین کے نام سے لڑیں اور اپنے ہزاروں بہترین افراد ان باہمی جنگوں کی نذر کر دیئے۔ دونوں جنگوں کے مقتولین کی تعداد تراسیؔ ہزار تک بتائی گئی ہے اور جنگ جمل کی تیرہؔ ہزار تک۔

جنگ جمل جمادی الاخری ۳۶ھ میں ہوئی۔ اس میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے۔ دوسری طرف ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ۔ اس کو جنگ جمل اس اونٹ کی وجہ سے کہا گیا ہے جس پر حضرت عائشہؓ سوار تھیں اور اس جنگ کا فیصلہ اس اونٹ کے کھڑے رہنے یا گر جانے پر ٹھہر گیا تھا۔ (عربی میں اونٹ کو جمل کہا جاتا ہے) حضرت علیؓ کے فوج کے دباؤ سے حضرت عائشہؓ کے حمایتی اگر پیچھے ہٹتے تھے تو اس اونٹ کے پاس جا کر بہر حال رک جاتے تھے اور اس کی حفاظت میں پروانہ وار جانیں دیتے۔ سینکڑوں آدمی بتائے

---

[1] الکامل فی التاریخ از ابن اثیر ج ۳ ص ۸۹۔ دار الفکر۔ بیروت۔

[2] تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از ابن جریر طبری ج ۳ جزو ۵ ص ۱۱۸ ۔ دار القلم بیروت۔

گئے ہیں جو اس اونٹ کے اردگرد شہید ہوئے۔

اس جنگ کا مختصر قصّہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت موسم حج (ذی الحجہ) میں ہوئی جبکہ اہل مدینہ کی بھاری تعداد حج کے لیے گئی ہوئی تھی۔ منجملہ ان کے حضرت عائشہؓ اور بعض دیگر امہات المومنین تھیں۔ یہ واپس ہو رہی تھیں کہ مدینے سے بہت سے لوگ مکہ پہنچے جن سے حضرت عثمانؓ کے قتل کر دیئے جانے کی خبر ملی۔ حضرت عائشہؓ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور مکے ہی میں ٹھہر کر قاتلوں کے خلاف کاروائی کی منصوبہ بندی کا فیصلہ کیا۔ اس دوران میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مدینے سے پہنچ گئے۔ جو یہ خبر لائے تھے کہ مدینہ بالکل اُنہی اوباشوں کے قبضے میں ہے جن کے ہاتھوں خلیفۂ سوم قتل ہوئے۔ ہم بھی جان بچا کر بھاگے ہیں۔ علیؓ کو انہی لوگوں نے خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ان اوباشوں کے خلاف کاروائی کے سلسلے میں آخری فیصلہ یہ ہوا کہ براہِ راست مدینہ نہ جایا جائے بلکہ بصرے اور کوفے کا رخ کیا جائے جہاں سے ان اوباشوں کی ٹولیاں نکل کر مدینہ پہنچی ہیں۔ ان دونوں مقامات کو قابو میں کر کے (جہاں طلحہؓ اور زبیرؓ کے ماننے والے بھی بکثرت ہیں) ان اوباشوں کے خلاف کاروائی آسان ہوگی۔ اس منصوبے کے ساتھ وہ تمام لوگ جو حضرت عثمانؓ کے حامی یا کم از کم قاتلوں کے مدینے پر قبضے سے ناخوش ہونے کی بنا پر مکے پہنچ گئے تھے، امّ المومنین حضرت عائشہؓ کی قیادت میں بصرے کے لیے روانہ ہو گئے۔

حضرت علیؓ اگرچہ خود دیکھ رہے تھے کہ ان کے اردگرد بھاری تعداد میں قاتلان عثمانؓ ہیں مگر آپ کی حکمت عملی یہ تھی کہ اس وقت ان کی حمایت کو قبول کیا جائے کیونکہ ان کو اس وقت چھیڑنا نقصان دہ ہوگا۔ بلکہ حضرت معاویہؓ (حاکم شام) جن کو آپ برطرف کرنا چاہتے ہیں ان کے خلاف کاروائی میں تو یہی لوگ سب سے زیادہ کار آمد بھی ہو سکتے تھے۔ اس بنا پر آپ پہلی ترجیح کے طور پر حضرت معاویہ کے خلاف کاروائی کی تیاری کر رہے تھے کہ مکے سے حضرت عائشہؓ اور زبیرؓ و طلحہؓ کی قیادت میں یہ بصرے کے لیے ایک لشکر کی روانگی کی خبر ملی۔

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی وجہ سے بظاہر یہ یقینی ہے کہ اس مہم کو حضرت علیؓ نے نہ صرف قاتلانِ عثمانؓ کے بلکہ خود اپنے خلاف بھی جانا ہوگا۔ کیونکہ حضرت علیؓ کی بیعت کے سلسلے میں ان حضرات کے درمیان بدگمانی کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ بہرحال حضرت علیؓ نے فوری طور پر مدینے سے کوچ کر کے ان لوگوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مگر وقت گزر چکا تھا۔ اس لیے بصرے کی مہم بلا رکاوٹ بصرے پہنچ گئی۔ حضرت علیؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ وہیں پہنچے۔ اور پھر طرفین میں مذاکرات شروع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں اس شرط پر صلح کی صورت بن گئی کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو قاتلانِ عثمانؓ سے آزاد اور بے تعلق کر لیں۔ ان لوگوں نے اس صلح کی سُن گُن پالی۔ جس میں ان کی قطعی موت تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے مشاورت کر کے فوری فیصلہ یہ کیا کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر پر شب خون مار کر کے جنگ کی آگ بھڑکا دی جائے اور اس میں یہ لوگ کامیاب ہو گئے۔ پھر جو جنگ چھڑی تو اس وقت رکی جب حضرت علیؓ نے اس جنگ کے جاری رکنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ دیکھی کہ اونٹ کو نشانہ بنایا جائے اور وہ بیٹھنے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ یہ ہوا اور یہیں پر جنگ ختم ہو گئی یعنی یہ بس یک روزہ جنگ تھی۔ حضرت عائشہؓ بالکل سلامت رہیں اور پوری طرح باعزت سلوک کے ساتھ مکے کو روانہ کر دی گئیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے البتہ شہادت پائی۔ اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ قاتلانِ عثمانؓ کے گروہ سے حضرت علیؓ کی آزادی اور بے تعلقی اب مشکل تر ہو گئی۔ اور اس کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی کسی مصالحت کا امکان گویا بالکل ختم ہو گیا۔ کیونکہ اس میں ان قاتلوں کی موت یقینی تھی۔ وہ حضرت معاویہ کو اور حضرت معاویہ انکو نہیں برداشت کر سکتے تھے۔

جنگ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا دار الخلافہ قرار دے لیا اور یہاں سے پھر حضرت معاویہؓ کے ساتھ نامہ و پیام شروع کیا کہ وہ بیعت کریں اور اپنی معزولی قبول کر لیں۔ اُن کی شرط تھی کہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لیا جائے۔ جو ظاہر ہے کہ کم از کم فوراً تو ناممکن بات تھی۔ چنانچہ جنگ کی ٹھن گئی اور شام و عراق کے درمیان صفین کے مقام پر ذی الحجہ ۳۶ھ میں طرفین کا آمنا سامنا ہوا اور تقریباً دو ماہ یہ جنگ چلی جس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب حضرت معاویہ کے لشکر سے نیزوں پر قرآن اٹھا لئے گئے کہ قتل و قتال کی حد ہو گئی، اسے بند کرو اور قرآن کو حَکَم بنالو۔ اسی کو واقعہ تحکیم کہا جاتا ہے۔ مقتولین کی تعداد ستر ہزار تک بتائی گئی ہے۔

حضرت علیؓ کی شہادت

حضرت علیؓ نے تحکیم کی پیش کش پر جنگ اپنی مرضی کے خلاف بعض اہم ساتھیوں کے دباؤ پر بند کی تھی۔ ورنہ آپ اس پیش کش کو ایک جنگی چال سمجھتے تھے اور واقعی اسکو قبول کرنے سے آپ کے محاذ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ منجملہ اس کے یہ تھا کہ آپ کی فوج کا ایک حلقہ اسی تحکیم کی بنا پر آپ سے ایسا برگشتہ ہوا کہ کافر ہی قرار دے دیا۔ اور آپ سے برسرِ جنگ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو تاریخ اسلام میں خارجی اور "خوارج" کہلائے۔ انہی میں کے ایک نے رمضان سنہ ۴۰ھ میں آپ کو شہید کر دیا۔[1]

حضرت حسنؓ کی خلافت

آپ کی شہادت کے بعد ساتھیوں نے آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ کو جانشین بنایا۔ حضرت حسنؓ نے باہمی خون خرابے کا ماحول ختم کرنے کے لیے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری کا فیصلہ کیا۔ یہ سنہ ۴۱ھ کی بات ہے جب کہ آپ کی خلافت کو چھ مہینے ہوئے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اس کے لیے آپ کے منہ مانگے شرائط منظور کیے اور ربیع الاول سنہ ۴۱ھ میں یہ مصالحانہ دست برداری پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اس طرح یہ پانچ سال کا تفرقہ مٹ کر اسلامی وحدت پھر سے بحال ہوئی۔ چنانچہ اس سال کو مسلمانوں

[1] اور یہ لوگ ان میں سے تھے جنھوں نے حضرت علیؓ کو مجبور کیا کہ تحکیم کو قبول کر لیں مگر بعد میں جب تحکیم کی عملی صورت یہ بنی کہ دو آدمی حَکَم بنائے جائیں تو یہ احمق بگڑ گئے کہ آدمی کو حَکَم بنانا قرآن کے خلاف ہے۔

نے "عام الجماعت" اجتماعیت واپس آنے کا سال قرار دیا ۔

عالی مقام بیٹا

حضرت حسنؓ کے بارے میں ایک ارشاد نبویؐ صحیح بخاری میں روایت ہوا ہے کہ آپؐ نے حضرت حسنؓ کی طرف اشارہ کرکے (جبکہ وہ بچّے ہی تھے) فرمایا کہ

انّ ابنی ھٰذا سیّد ولعل اللّٰہ	میرا یہ بیٹا سید (عالی مقام) ہے
ان یُصلح بہٖ بین فئتین عظیمتین	امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں
من المسلمین [1]	کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین (جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے آپس میں لڑیں) سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ یہ اور ان کے ساتھ بہت سے حضرات اس اختلاف اور خانہ جنگی کو وہ فتنہ سمجھتے تھے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈرایا تھا۔ طبری نے جلیل القدر تابعی امام شعبیؒ (م ۱۰۴ھ) سے روایت کی ہے کہ :-

باللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو ما نھض	قسم خدائے وحدہٗ لاشریک کی۔ اس واقعہ
فی تلک الفتنۃ الا ستّۃ بدریین	میں بدری صحابہ (جن کا درجہ سب سے اعلیٰ مانا
ما لھم سابع او سبعۃ ما لھم ثامن [2]	جاتا ہے) میں چھ کے سوا کوئی ساتواں
	یا سات کے سوا کوئی آٹھواں نہ تھا جو شریک ہوا ہو۔

---

[1] مشکوٰۃ (بحوالہ البخاری) باب مناقب اہل بیت [2] طبری جزو ۵ ص ۱۶۵ روایت میں چھ اور سات کا جو شک ہے اس کی وجہ طبری کی اگلی روایت کے مطابق حضرت ابوایوبؓ انصاری کے بارے میں امام شعبی کا شک ہے کہ وہ شریک تھے یا نہیں اور تاریخی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ شریک نہیں تھے ۔

حضرت حسنؓ کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اگرچہ اتنی نہ تھی کہ وہ "فتنہ" کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات اور تنبیہات سے واقف ہوسکتے جیسے ارشادات حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے مقابلتاً بزرگ صحابہؓ کو اس موقع پر یاد آرہے تھے [1] اور اس لیے وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ جنگ جمل اور جنگ صفّین دونوں میں اگرچہ شریک ہوئے۔ مگر ان کی طبیعت جس سانچے میں ڈھلی تھی اس کے زیر اثر ان کی ابتدائی کوشش یہی رہی تھی کہ ان کے والد ماجد حضرت علی جنگ سے گریز فرمائیں۔ طبری اور ابن اثیر دونوں میں ہے کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے جب یہ جواب آگیا کہ وہ قصاص عثمانؓ کا مطالبہ پورا ہونے سے پہلے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے والے نہیں ہیں (اور حضرت علیؓ اس وقت تک مدینے ہی میں تھے) تو اہل مدینہ کو فکر ہوئی کہ پتہ چلے کہ اب علیؓ کا ارادہ کیا ہے؟ وہ معاویہؓ کے خلاف لشکر کشی کریں گے اور اس طرح اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھائیں گے [2] یا اس سے رک جائیں گے۔ اور تجسس خاص کر اس لیے ہوا تھا کہ انہیں پتہ چلا تھا کہ حسنؓ اپنے والد کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ وہ کوئی اقدام

---

[1] مثلاً حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے لوگوں کو یاد دلایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ عنقریب ایک فتنہ (آزمائش اور غیر واضح معاملہ) رونما ہوگا جس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے رہنے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا (یعنی پیدل چلنے والا) سواری پر چلنے والے سے (ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۷) اسی فتنہ کا حوالہ ان تمام لوگوں کی گفتگوؤں میں ملتا ہے جنھوں نے حضرت علیؓ کی خلافت قبول کی مگر جنگ میں ان کا ساتھ قبول نہیں کیا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی تو خود کسی سے کم تر بزرگ صحابی نہ تھے، انھیں کیوں یہ فتنے کی حدیثیں یاد آرہی تھیں؟ اس سلسلے میں کوئی قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی لیکن بظاہر آپ خلافت کی بیعت لے لینے کی وجہ سے نظم و ضبط کو اہم تر ذمہ داری سمجھ رہے تھے اور یہ کہ فتنہ فرو ہونے کی یہی صورت ہے۔ واللہ اعلم ۔

[2] "اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھانے کے الفاظ طبری اور ابن اثیر کی روایت ہی کے ہیں۔ "دا بۃ فی قتال اھل القبلۃ، أیجرأ علیہ ام ینکل عنہ"؟ طبری ج ۵ ص ۱۶۵ ۔

نہ کریں۔ روایت میں ہے:

وقد بلغهم ان الحسن بن علی	اور انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسن بن علیؓ
دعاه الی القعود و ترك	اپنے والد کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ آپ کوئی اقدام
الناس [1]	نہ کریں اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں

ابن کثیر نے اس موقع پر حضرت حسنؓ کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ ان الفاظ میں آپ نے اپنے والد ماجد کو کسی اقدام کے خلاف رائے دی۔

یا ابتِ دع هذا فان فیه سفك	ابا جان! یہ نہ کیجیے' یہ ارادہ ترک کر دیجیے'
دماء المسلمین و وقوع	کیونکہ اس میں مسلمانوں کی خونریزی
الاختلاف بینهم۔ [2]	اور باہم اختلاف انگیزی ہے۔

ابن اثیر ہی میں ایک دوسری جگہ آتا ہے [3] (اور طبری اور البدایہ والنہایہ میں بھی ہے) کہ اہل شام پر (یعنی حضرت معاویہؓ کے خلاف) فوج کشی کی تیاری ہو رہی تھی کہ پتہ چلا مکہ سے حضرت عائشہؓ کی سرکردگی اور حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کی رہنمائی میں ایک فوج حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی طرف سے (جن میں قاتلان عثمانؓ اور ان کے ہمنوا شامل تھے) بے اطمینانی کے ماتحت بصرہ کی طرف روانہ ہو گئی ہے تاکہ ان کے خلاف کارروائی کر کے حضرت علیؓ کو ان کے چنگل سے نکالا جائے تو حضرت علیؓ نے بجائے شام جانے کے یکایک مدینے سے نکل کر ان لوگوں کو راستے میں روکنے کا فیصلہ کیا۔ روایت سے ایسا لگتا ہے کہ حضرت حسنؓ ساتھ نہیں تھے لیکن بعد میں پہنچ کر ربذہ کے مقام پر ملے[4]۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انکے روکنے سے حضرت علیؓ رکے نہیں تو وہ خود ان کے ساتھ روانہ نہیں ہوئے مگر پھر کچھ خیال

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۰۴ [2] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۲۵ مطبعۃ الاصمعی۔ ریاض

[3] کیونکہ ابن اثیر کی اصل طبری ہی کی روایتیں ہیں اور اسی طرح البدایہ والنہایہ کی بھی اصل وہی ہے۔

[4] مدینے سے مکے کے راستے میں تین میل پر ایک مقام ہے۔

آیا تو پیچھے سے چل کر ربذہ پہنچے اور وہی گفتگو پھر کی جس کا اشارہ اوپر کی روایت میں ملتا ہے۔

واتاه ابنه الحسن فی الطریق	آپ کے بیٹے حسنؓ راستے میں آپ کے پاس آئے
فقال له لقد امرتك فعصیتنی فتقتل	اور کہا کہ میں نے کچھ آپ سے کہا تھا جو آپ نے
غدًا بمضیعة لا ناصر لك	نہیں مانا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل کو آپ بے یار
فقال له علی... وما الذی	و مددگار مارے جائیں گے۔ حضرت علیؓ
امرتنی فعصیتك قال امرتك	نے کہا کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا جو میں نے
یوم اُحیط بعثمان ان تخرج	نہیں مانا؟ کہا کہ جس دن عثمانؓ محصور کیے
عن المدینة فیقتل ولست	گئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ مدینہ سے
بها ثمّ امرتك یوم قُتِلَ اَنْ لاّ	باہر چلے جائیں تاکہ آپ کی موجودگی میں کچھ نہ
تُبایع حتیٰ تأتیك وفود العرب	ہو' پھر جب عثمانؓ قتل کر دیے گئے تو میں نے
وبیعة اهل کلّ مصر فانهم لن	آپ سے کہا کہ آپ بیعت مت لیجیے' حتیٰ کہ
یقطعوا امرًا دونك فابیتَ علیّ	تمام عرب کے وفود آپ کے پاس آویں اور ہر شہر
وامرتك حین خرجت هٰذه	کے لوگوں کی بیعت آجائے۔ اسلیے کہ
المرأة وهٰذان الرجلان ان	یہ لوگ آپ کے سوا کسی کو منتخب کر ہی نہیں
تجلس فی بیتك حتیٰ یصطلحوا	سکتے' آپ نے یہ بات بھی نہیں مانی اور پھر
فان کان الفساد کان علیٰ ید	جب عائشہؓ اور زبیرؓ و طلحہؓ نکلے تو میں نے کہا کہ آپ
غیرك فعصیتنی فی ذالك	گھر بیٹھے حتیٰ کہ یہ آمادۂ مصالحت ہو جائیں اور
کلّه۔ [1]	اگر فساد ہوتا ہے تو وہ آپ کے نہیں دوسرے
	کے ہاتھ سے ہو' مگر آپ نے میری کوئی بھی بات نہیں مانی۔

حضرت علیؓ کی رائے میں صاحبزادے حسنؓ کا مشورہ صحیح نہ تھا اس لیے انھوں نے جس بات

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۴

کو صحیح سمجھا اس پر عمل فرمایا اور پھر باہمی جنگ اور خونریزی کا ایک طویل سلسلہ چلا جس میں حضرت حسنؓ بھی والد ماجد کے دوش بدوش شامل رہے مگر جب ۴۰ھ میں ایک خارجی کے ہاتھ سے حضرت علیؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا اور آپ کی جانشینی کا بار حضرت حسنؓ کے کاندھوں پر رکھا گیا تو اس وقت یہ حقیقت بالکل آئینہ ہو چکی تھی کہ اس اختلاف سے مسلمانوں کا بے پناہ نقصان ہو گیا تھا اور اب بھلائی اسی میں تھی کہ یہ باب بند کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ کے حامیوں میں انتشار حکم عدولی اور شکست خوردگی کا مسلسل تجربہ بھی سامنے تھا' اس لیے گروہی نقطۂ نظر سے بھی بہتری باعث مصالحت ہی میں تھی' چنانچہ حضرت حسنؓ کے حصہ میں یہ سعادت آئی کہ ان کی پیش قدمی کی بدولت مسلمانوں کا پانچ سالہ تفرقہ مٹے اور وہ پھر سے ایک جماعت بن جائیں' اور اس طرح وہ پیشنگوئی بھی پوری ہوئی جو بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے فرمائی تھی کہ "میرا یہ بیٹا بڑا عالی مقام ہوگا اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کا تفرقہ مٹے گا۔

امن و یکجہتی کے بیس سال

حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی بدولت حضرت معاویہؓ کے بارے میں کسی کی کچھ بھی رائے ہو مگر ایک بات سے انکار کسی انصاف پسند کے لیے ممکن نہیں ہے کہ انکے اندر عرب سرداری کی اعلیٰ ترین خصوصیات تھیں۔ ایک طرف وہ اپنے زمانے کی عرب دنیا کے پانچ دور اندیشوں اور دیدہ وروں (دُھاتِ عرب) میں سے ایک مانے جاتے تھے' اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان پانچ میں وہ سب سے بڑھ کر تھے[1] دوسری طرف سخاوت اور حلم کے بادشاہ' داد و دہش میں ہاتھ نہیں رکتا تھا اور بُردباری کی انتہا نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کی ان صفات نے

---

[1] باقی چار کے نام ہیں: حضرت عمرو بن العاص' مغیرہ بن شعبہ' قیس بن سعد اور عبد اللہ بن بُدیل۔ ان میں سے ۱ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے ۲ غیر جانبدار اور ۳ و ۴ حضرت علیؓ کے ساتھ' طبری ج ۳ جزو ۶ صـ ۹۳۔

تفرقہ کی جلیجوں کو پاٹنے اور اُس زمانے کی تلخ یادوں کو بھلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا بیس سالہ دورِ حکومت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) بالعموم امن و عافیت اور مسلمانوں کی یکجہتی کے ساتھ گزرا اور مسلمان آپس کی جنگ سے چھٹی پا کر ان محاذوں کی طرف واپس چلے گئے جہاں وہ دشمنانِ اسلام کے خلاف مصروفِ جنگ ہوتے اور نئی فتوحات حاصل کرتے تھے۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں آپ کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"خلافتِ عمری اور خلافتِ عثمانی میں معاویہؓ کے ہاتھوں شامی محاذ پر جہاد اور فتوحات کا جو شاندار سلسلہ چلتا رہا تھا وہ اُس وقت بالکل رک گیا جب ان کے اور علیؓ کے درمیان معرکوں کا دور چلا۔ ان دنوں میں نہ اِن کے ہاتھ پر کوئی نئی فتح ہوئی نہ اُن کے ہاتھ پر۔ ۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ حسنؓ کے ساتھ صلح ہوئی اور معاویہؓ کی خلافت پر جیسا کہ گزر چکا ہے ۴۱ھ میں' پوری اسلامی دنیا نے اتفاق کر لیا۔ اُس وقت سے لے کر اپنے سن وفات (۶۰ھ) تک وہ بے غل و غش حکمراں رہے۔ اس شان کے ساتھ کہ دشمن کی سرزمین پر جہاد ہو رہا ہے' حق کا پرچم بلند ہے' چاروں طرف سے مالِ غنیمت آ رہا ہے اور مسلمان ان کے ساتھ آرام' انصاف اور عفو و درگزر کی فضا میں رہ رہے ہیں"[1]

حضرت معاویہؓ اور حضراتِ حسنینؓ

شیعہ علماء و مصنفین پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے حُبِّ علیؓ کے نام پر معاویہؓ دشمنی میں حضرت معاویہؓ کی مسلّم صفات حلم' سخاوت و سماحت اور ان پر مبنی تاریخی حقائق کو بھی جھٹلانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ انہوں نے تو وہ وعدے بھی پورے نہیں کیے جو حضرت حسنؓ کے ساتھ شرائطِ صلح کے طور پر طے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کا معاملہ حضرت

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ ۱۲۹

حسنؓ ہی نہیں حضرت حسینؓ کے ساتھ بھی اس حد تک حسن سلوک اور رواداری کا تھا کہ اعلیٰ درجے کے حلم، تدبر اور کریم النفسی کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے لئے خود انہی حضرات کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ یمن سے دمشق کو ایک سرکاری قافلہ بہت سا قیمتی سامان مثلاً یمنی چادریں، عنبر اور دیگر خوشبوئیات لے کر حسب معمول مدینے سے گزر رہا تھا۔ حضرت حسینؓ نے روک کر اس کا تمام مال اتروالیا اور حضرت معاویہؓ کو یہ خط لکھ کر بھیج دیا کہ "ایسا ایسا قافلہ جو دمشق میں تمہارے خزانے بھرنے اور تمہارے باپ کی اولاد کا سامانِ عیش بننے کے لیے جا رہا تھا میں نے اُسے روک کر اس کا مال لے لیا ہے کیونکہ مجھے ضرورت تھی"۔[1] ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت حسینؓ نے ایسی نامناسب زبان اپنے خط میں استعمال فرمائی ہوگی، گمان غالب ہے کہ خط کو یہ زبان ان حضرات کی عطا کردہ ہے جو اس بات کے روادار نہیں کہ حضرت حسینؓ کو حضرت معاویہؓ کے ساتھ اس سے بہتر زبان میں مخاطب ہوتا ہوا دیکھیں۔ بہرحال ان حضرات کی روایت کے مطابق یہ خط حضرت حسینؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا۔ اب دیکھیے کہ اس کا کیا اور کس انداز کا جواب حضرت معاویہؓ نے انہی حضرات کی روایت کے مطابق دیا:۔

"اللہ کے بندے معاویہ کی طرف سے حسین بن علی کے نام۔ تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ یمن سے [illegible] ہوا قافلہ روک کر اس کا سامان تم نے لے لیا ہے۔ لیکن تمہیں یہ چاہیے نہیں تھا جبکہ وہ میرے نام سے آرہا تھا۔ کیونکہ یہ حق صاحب حکومت

---

[1] حیات الامام حسین بن علیؓ ـــ از باقر شریف القرشی۔ مطبوعہ مؤسسۃ الوفا بیروت ج ۲ ص ۲۳۲۔ نیز مقتل الحسینؑ از عبدالرزاق الموسوی المقرم، مطبوعہ دارالکتب اسلامی بیروت حاشیہ ص ۱۷۳ بحوالہ شرح نہج البلاغۃ لابن حدید ج ۴ ص ۳۲۷ طبع اول۔ احتیاطاً خط کے عربی الفاظ کو بھی یہاں پڑھ لیجئے:۔
من الحسین بن علی الی معاویۃ بن ابی سفیان اما بعد! فانّ عیراً مرّت بنا من الیمن تحمل مالاً وحُللاً وعنبراً وطیباً الیک، لتودعها خزائن دمشق وتعلّ بها بعد النھل بنی ابیک وانی احتجت الیھا فاخذ تُھا۔ والسّلام۔

والی) کا ہے کہ مال اس کے ہاتھ میں آوے اور پھر وہی اسکو تقسیم کرے، اللہ جانتا ہے کہ اگر تم اسکو میرے پاس آنے دیتے تو میں اس میں سے تمہارا حصہ دینے میں کوئی کمی نہ کرتا، لیکن بھتیجے! بات یہ ہے کہ تمہارے دماغ میں ذرا تیزی ہے، کاش کہ یہ بس میرے ہی زمانے تک رہے کیونکہ میں تمہاری قدر و قیمت جانتا ہوں اور ایسی باتوں سے درگذر کر لیتا ہوں، ڈر لگتا ہے کہ (بعد میں) تمہارا واسطہ کسی ایسے سے نہ پڑ جائے جو تمہیں کوئی چھوٹ دینے کو تیار نہ ہو"۔[1]

اس چھوٹی سی خط و کتابت سے کیا کیا بات ثابت ہوتی ہے، اس وقت اس سب کے احاطہ کا موقع نہیں صرف اتنی بات یہاں کہنا مقصود ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ جواب دیکھ کر کسی ادنیٰ انصاف پسند کے لیے شبہ کی بھی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ حضراتِ حسنین کے ساتھ پاس و لحاظ اور کریم النفسی کے سوا کوئی دوسرا معاملہ کرتے ہوں گے، چہ جائیکہ وہ وعدے بھی پورے نہ کریں جس پر حضرت حسنؓ نے خلافت کی جنگ سے دستبرداری دی تھی۔[2]

یہ دعوے (یا یہ کہیے کہ حضرت معاویہؓ پر بدعہدی کا الزام) یوں تو شیعہ حضرات کے یہاں عام ہے، لیکن بہت تعجب اس وقت ہوا جب اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں لکھنؤ کے

---

[1] حوالہ سابق۔ [2] حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ کی یہ خط و کتابت اور جس واقعہ کے سلسلے میں یہ خط و کتابت ہوئی وہ واقعہ، یہ سب کچھ شیعہ کتب کے حوالے سے درج کیا گیا ہے اور خاص طور سے اسلیے درج کیا گیا ہے کہ انہی لوگوں کے بیان سے انکا یہ الزام غلط ثابت ہو جائے کہ حضرت معاویہؓ کا حضرت حسن حسین کے ساتھ معاملہ اچھا نہیں تھا اسکے سوا اس واقعہ اور خط و کتابت کو یہاں درج کرنے کا کوئی دوسرا مقصد کوئی معقول آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ مگر کتاب کا پہلا ایڈیشن (اردو) شائع ہوا تو کچھ لوگ جن کو کتاب کا ٹھیٹہ روایتی انداز سے ہٹا ہوا ہونا ناگوار گزرا ہے انھوں نے اس واقعہ اور خط و کتابت کو بیان کرنے کا یہ مطلب بھی نکال لیا ہے کہ مصنف حضرت حسینؓ کو (نعوذ باللہ) ایک لٹیرا بتانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جواب تو کہاں دیا جا سکتا ہے، ہاں دعائے خیر ان کے لیے کی جا سکتی ہے۔

شیعہ عالم جناب سید علی نقی (المعروف بہ نقن صاحب) کی تصنیف "شہید انسانیت" دیکھتے ہوئے اس دعوے کی دلیل میں تاریخ طبری کا حوالہ نظر سے گزرا، بہ حوالہ جزو ۶ صہ ۹۳ کا ہے[1] طبری کے اس مقام پر واقعتہً یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ "فَلَمْ يُنْفِذْ لِلْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الشُّرُوطِ شَيْئًا"۔ جن کا ترجمہ اگر کوئی چاہے تو بے شک ان الفاظ میں کرسکتا ہے کہ "جتنی شرطیں طے کی گئی تھیں ان میں سے کوئی ایک بھی (معاویہؓ نے) پوری نہیں کی"۔ لیکن اہل علم سے بعید ہے کہ وہ طبری کے اس جملہ کا حوالہ اس مقصد کے لیے دیں کیونکہ اسی تاریخ طبری میں ایک صفحہ پہلے صہ ۹۲ پر گزر چکا ہے کہ:-

وقد صالح الحسن معاوية على	اور حسنؓ نے معاویہؓ سے صلح اس شرط پر
ان جَعَلَ لہ ما فی بیت مالہ	کی تھی کہ کوفے کے بیت المال میں جو
وخراج دار ابجرد على ان لا	کچھ ہے وہ ان کا ہوگا نیز داراب گرد[2]
یُشْتَمَ علیٌّ وھو یسمع ناخذ ما	کا خراج ان کو ملا کرے گا اور ان کے سامنے
فی بیت مالہ بالکوفۃ وکان فیہ	حضرت علیؓ پر سب و شتم نہیں ہوا کریگا پس
خمسۃ آلاف الف۔	انھوں نے وہ تمام رقم لے لی جو کوفے کے بیت المال
	میں تھی اور وہ پچاس لاکھ (درہم) تھی۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کی گئی۔

ایک صفحہ آگے چل کر یعنی صہ ۹۳ پر طبری نے جن شرائط کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پوری نہیں کی گئیں، ان کا قصہ دوسرا تھا۔ وہ قصہ طبری ہی کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ یہ شرائط جن کا بیان آیا، یہ تو وہ تھیں جو حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی خواہش کرتے ہوئے ان کو لکھ کر بھیجی تھیں۔ ادھر حضرت معاویہؓ خود نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان

[1] شہید انسانیت صہ ۲۳،۲۴۔ سید العلماء اکادمی لکھنؤ۔ [2] شہر کا نام ہے عربی میں اسکو دار ابجرد لکھا گیا ہے مگر مولانا شبلی کی الفاروق سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں اس کا اصل نام داراب گرد ہے۔

کشت و خون کا سلسلہ چلتا رہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ حضرت حسنؓ کا مراسلہ ان تک پہنچے انہوں نے خود دو آدمی ایک سادہ کاغذ پر دستخط کرکے اس پیغام کے ساتھ بھیجے تھے کہ حسنؓ جو شرائط صلح چاہیں اس کاغذ پر لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ چنانچہ حضرت حسنؓ نے اس کاغذ پر کچھ نئے شرائط بھی بڑھا کر لکھ دیئے۔ یہ تھے وہ شرائط جن کے بارے میں طبری کی صہ ۹۳ کی روایت بتا رہی ہے کہ:-

فاختلفا فی ذالك فلم ینفذ	ان شرائط کے بارے میں اختلاف ہوا
للحسن علیہ السلام۔ الخ	اور ان میں سے کوئی شرط معاویہؓ نے پوری نہیں کی۔

مولانا نقن صاحب نے اس پورے واقعہ کو قلم انداز کردیا ہے اور افسوس ہے کہ اسی ایک جگہ نہیں اور بھی بہت سی جگہوں پر موصوف نے اسی طرح کا معاملہ شیعہ مزعومات کو نباہنے کیلئے اپنی اس تصنیف میں کیا ہے۔ جن میں سے بعض کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا

بہرحال شرائطِ صلح پورے نہ کیے جانے کی بات بڑی زیادتی ہے، ایک شرط کے بالکل نقد ایفاء کا ذکر تو طبری کی مذکورہ بالا روایت میں آگیا ہے، دوسری شرط داراب گرد کا خراج، اس کے بارے میں طبری کے اندر کوئی مزید روایت نہیں ملتی۔ لیکن دوسرے ذرائع مثلاً ابن اثیر کی تاریخ کامل اور ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داراب گرد جس کا تعلق بصرہ کی ولایت سے تھا اس کے خراج والی شرط پر بصرہ کے لوگ معترض ہوئے کہ یہ خراج تو ہمارا حق ہے یہ کسی اور کو نہیں دیا جانا چاہیے۔ ابن اثیر نے بس اتنی ہی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اس کے بدلے میں ان کو سالانہ ہر چھ ہزار کے بدلے میں ایک ہزار دینار منظور کیے جو حضرت حسنؓ اپنے حین حیات دمشق کے سالانہ سفر میں علاوہ دیگر عطیات و تحائف کے وصول فرماتے رہے[1]

[1] فعوضہ معاویۃؓ عن کل سنۃ آلاف الف درھم فی کل عام فلم یزل یتناول مع مالہ فی کل زیادۃ من الجوائز والتحف الی ان توفیؓ۔ البدایہ والنہایۃ ج ۸ صہ ۴۵۔

رہی تیسری شرط کہ (کم از کم) حضرت حسنؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ پر سب وشتم نہ کیا جائے اس کے بارے میں ابن اثیر کا بیان ہے کہ یہ شرط پوری نہیں کی گئی[1]۔ اور تنہا یہ ایک بیان یہ تاثر دینے کے لیے کافی ہے کہ ابن اثیر بھی انہی مؤرخین میں سے ہیں جن پر حضرت علیؓ حسن وحسین (رضی اللہ عنہم) اور حضرت معاویہؓ ویزید کے درمیان والے معاملات میں آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ بیان اگر صداقت پر محمول کر لیا جائے تو ہمیں یہ ماننے کے لیے تیار ہونا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) حضرت حسنؓ کو غیرت اور عزتِ نفس کی کوئی ادنیٰ مقدار بھی دربارِ حق تعالیٰ سے عطا نہیں ہوئی تھی، ان کے والد ماجد کو حضرت معاویہؓ اور ان کے لوگ منہ پر برا بھلا کہتے تھے اور حضرت حسنؓ اس کے باوجود کبھی ایک حرفِ شکایت بھی منہ پر لائے بغیر ہر سال دمشق جا کر مقررہ وظائف و تحائف انہی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ سے وصول کیا کرتے تھے! کیسے ممکن ہے کہ اتنی نامناسب بات، جو شرائطِ صلح کے بھی خلاف تھی، حضرت معاویہؓ اور ان کے حکام کے طرزِ عمل میں شامل رہے اور حضرت حسنؓ ۹-۱۰ سال تک[2] اسے خاموشی سے برداشت ہی نہ کرتے رہیں بلکہ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں سالانہ حاضری بھی دیتے رہیں اور ان سے تحائف و وظائف لینا گوارا کرتے رہیں۔؟

ابن اثیر ہی نے داراب گرد کے خراج کے سلسلے میں اہل بصرہ کے اعتراض کی بابت یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس میں خود حضرت معاویہؓ کا اشارہ بھی شامل تھا مگر اس کا کوئی ثبوت؟ ثبوت ہے نہ حوالہ۔ حالانکہ اگر اس بیان میں کچھ واقعیت ہوتی تو نہ تو یہ ممکن تھا کہ حضرت حسنؓ کو مصالحت کے وقت سے لیکر اپنی وفات تک (۹-۱۰ سال کے عرصے میں) اس کا پتہ نہ چلتا، جبکہ بصرہ بھی کوفے کی طرح آپ کی اور آپ کے والد ماجد کی عملداری کا حصہ رہا تھا، اور نہ ہی یہ بات قابلِ تصوّر ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ چھ ہزار سالانہ کی جگہ ایک ہزار سالانہ پر خاموشی سے راضی رہتے ــــ اور حضرت حسینؓ کے بارے میں اگر کسی

[1] ج ۳ ص ۲۰۳ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۹۸۰ء۔ [2] صلح ۴۱ھ میں ہوئی اور حضرت حسنؓ کی وفات ۵۰ھ میں۔

طرح ان کی نرم طبیعت وغیرہ کے حوالے سے شرائطِ صلح کی یہ سب مبیّنہ کھلی اور چھپی خلاف ورزیاں قابلِ تحمل بھی مان لی جائیں تو حضرت حسینؓ کے بارے میں تو یہ تصوّر قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے ــــ اُن کا مزاج بالکل مختلف تھا وہ سرے سے صلح کے ہی روادار نہ تھے۔ بس حضرت حسنؓ کے فیصلے سے مجبور ہو گئے تھے، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:-

"جب خلافت حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں آئی اور انھوں نے مصالحت کا فیصلہ کیا تو حضرت حسینؓ کو یہ فیصلہ بہت شاق گذرا۔ وہ اپنے بھائی کی رائے کو بالکل صحیح نہیں سمجھتے تھے اور مُصر تھے کہ اہلِ شام سے قتال جاری رہے (ان کا اصرار اور صلح کی مخالفت یہاں تک تھی کہ) حضرت حسنؓ کو کہنا پڑا کہ میں سوچتا ہوں کہ تمھیں گھر میں بند کر دوں اور جب تک مصالحت کی کاروائی سے پوری طرح فارغ نہ ہو جاؤں باہر نہ نکالوں۔"[1]

ایک روایت میں اس اختلاف رائے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ نے صلح کی بات سن کر حضرت حسنؓ سے کہا کہ "میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اپنے باپ کو جھوٹا اور معاویہ کو سچا مت ٹھہرایئے اس پر حضرت حسنؓ نے یہ کہہ کر ان کو خاموش کیا کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"[2]

الغرض حضرت حسینؓ کا مزاج بالکل مختلف تھا، ان کے لیے کسی بھی طرح نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ ایسے حالات اور معاملات کے ہوتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا گوارا کر سکتے تھے، حالانکہ اسی البدایہ والنہایہ میں مذکورہ بالا بیان کے بعد مذکور ہے کہ:-

"حسن کا یہ رویّہ دیکھ کر حسین نے خاموشی اور موافقت اختیار کر لی اور پھر جب خلافت کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں آگئی تو اپنے بھائی حسن کے ساتھ حسین

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳ [2] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳۔

بھی معاویہ کے پاس آتے جاتے تھے اور معاویہ دونوں کا غیر معمولی اکرام فرماتے تھے

مرحبا و اہلا سے استقبال فرماتے اور بڑے بڑے عطیات دیتے۔"[1]

حتیٰ کہ حضرت حسن کا انتقال (۵۰ھ میں) ہو گیا تب بھی حضرت حسین نے حضرت معاویہ کے پاس سالانہ تشریف بری کا معمول تن تنہا ہی قائم رکھا۔[2]

الغرض حضرت معاویہ اور حضرات حسنین کے درمیان جو حسن تعلق کی صورت اور بالخصوص حضرت معاویہ کی طرف سے اکرام و عطا کی جو روش ان کی خلافت کے پورے عرصے میں برقرار رہی، وہ نہ صرف اس الزام کی قطعی تردید کرتی ہے کہ حضرت معاویہ نے شرائط صلح کا احترام نہیں کیا تھا بلکہ ان بیانات کے لیے ایک تصدیق بھی فراہم کرتی ہے جو حضرت معاویہؓ کے حلم و عفو اور داد و دہش کے غیر معمولی اوصاف کے سلسلے میں مؤرخین کے یہاں ملتے ہیں۔[3]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۳۔ [2] ولما توفی الحسن کان الحسین یفد الی معاویۃ فی کل عام فیعطیہ۔ دیکھو ص، حوالہ سابق۔ [3] مثلاً حضرت علیؓ کے دست راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے جو طبری نے نقل کیا ہے کہ "میں نے حکومت کے لیے معاویہؓ سے بڑھ کر موزوں آدمی نہیں دیکھا کہ لوگوں کے ساتھ بے حد کشادہ دلی کا برتاؤ کرتے تھے" (ج ۶ ص ۱۸۸) یا خود حضرت معاویہؓ کا قول اپنے بارے میں جو حلم و عفو کی ایک آزمائش کے موقع پر انکی زبان پر آیا کہ "مجھے گوارا نہیں کہ کوئی خطا میرے عفو سے بڑھ جائے اور کوئی جہالت میرے حلم سے یا کسی کی کوئی کمزوری ایسی بھی ہو جائے جس کی میں پردہ داری نہ کر سکوں اور کسی کی بدسلوکی ایسی جس کا جواب میں حسن سلوک سے نہ دے سکوں۔" (ایضاً ص ۱۸۷) ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ج ۸ میں پورے ایک صفحے (۱۴۸) پر حضرت معاویہؓ کے انہی اوصاف میں متعدد بیانات اور واقعات نقل کیے ہیں اور اپنے طور پر ان الفاظ میں ان کی ثنا بیان کی ہے کہ... "یعنی انہ کان جید السیرۃ حسن التجاوز جمیل العفو کثیر الستر رحمہ اللہ" مختصر یہ کہ وہ عمدہ سیرت کے مالک، نہایت اعلیٰ عفو درگذر کرنے والے اور عیوب کی بہت ہی پردہ داری کرنے والے تھے۔ (ج ۸ ص ۱۲۷)

باب دوم

کوفی مزاج ـــــ ریشہ دوانیاں ـــــ اور حضرت حسینؓ

حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہ تھوڑی سی گفتگو بالکل ضمناً آگئی ورنہ اصل مدعا تو ان حالات اور اسباب کی تحقیق تھی جن کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کا بیس سالہ پُرامن و پُرسکون دور ختم ہوتے ہی واقعہ کربلا جیسا سانحہ وجود میں آگیا۔ اسی تحقیق کے سلسلے میں اہل کوفہ کے مزاج و کردار کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

اہل کوفہ

کوفہ کی بنیاد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کے دور میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں سے پڑی تھی جو کسریٰ (فارسی) حکومت کے خلاف اسلامی جہاد کے کمانڈر تھے۔ وہ مختلف عرب قبائل جو عراق کے محاذ پر مصروف جہاد تھے انہی کے خاندانوں سے یہ نیا شہر آباد کیا گیا۔ اور اس طرح یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی چھاؤنی اور ان کی جنگی طاقت کا مرکز بن گیا۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ اس شہر کی یہ خصوصیت بھی رہی کہ اس کے شہریوں میں بڑی تلوّن مزاجی اور بے سرے پن کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اپنے حکام سے بے حد جلدی ناراض ہو جاتے اور مرکز سے شکایتیں کرکے

نئے حاکم کا مطالبہ کرنے لگتے تھے۔ یہ حال حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پورے زمانے میں رہا۔ بلکہ عثمانی خلافت کے آخری دنوں میں تو ان کا مرض بڑھ کر اس کھلی سرکشی اور شوریدہ سری تک پہنچا کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت ہی نہیں اُن کی جان بھی اسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اور اپنے ہی جیسے مصری اور بصری مفسدوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں خوف و دہشت کی وہ فضا قائم کی کہ خلیفۃ الرسول کی تدفین بھی بمشکل تین دن بعد رات کے اندھیرے میں مسلمانوں کے عام قبرستان جنت البقیع سے الگ ایک احاطے میں کی جاسکی ـــ جسے عہد اموی میں جنت البقیع سے ملایا گیا۔

حضرت عثمان کی شہادت سے دو سال پہلے کے واقعات میں تاریخ کچھ کوفیوں کا نام لے کر بتاتی ہے کہ انہوں نے حکام کے خلاف شکایتوں کے اظہار سے بڑھ کر خود ادارۂ خلافت کو "قریشی سلطنت" کا نام دینا شروع کر دیا۔ امیر کوفہ سعید بن العاص نے اس فتنہ پردازی کے خلاف کاروائی کی اجازت یا جو کچھ اور مناسب سمجھا جائے اس کی ہدایت مانگی۔ حضرت عثمانؓ نے مناسب سمجھا کہ ان کو شہر بدر کر کے حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق بھیجدیا جائے کہ وہ شاید ان کا کچھ علاج کر سکیں گے۔ مگر ان کے مرض کے مقابلہ میں حضرت معاویہ کی حکمت اور مہارت بھی کام نہ دے سکی۔ تب یہ لوگ حمص میں جہاں عبدالرحمٰن بن خالدؓ بن ولید امیر تھے، بھیجے گئے اور ان کے طریقۂ علاج (سختی) سے بظاہر یہ لوگ ٹھیک اور تائب ہو گئے مگر واقعے میں ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ جیسے ہی کوفے میں کچھ اور لوگ ان کی والی صدا بلند کرنے کو کھڑے ہوئے تو یہ فوراً ہی نمودار ہو گئے اور پھر جب مصر اور بصرے میں انہی کی طرح سے مرکزی حکومت کے خلاف شکایتیں پالنے والے لوگ بھی ابن سبا کی سازشی تحریک کے ذریعہ ایک رابطے میں مربوط ہو گئے تب یہ سب ۳۵ھ میں حج کے سفر کا ڈھونگ رچا کر مدینے

پر جا چڑھے اور ۱۸ ذی الحجۃ کو حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ دو ڈھائی ہزار کے قریب ان سب کی تعداد بتائی گئی ہے[1] یہ سب، جھوٹ یا سچ، حضرت علیؓ کا دم بھرتے تھے۔ چنانچہ بعد میں حضرت علیؓ کی بیعت بھی کی اور پھر جنگ جمل اور جنگ صفین میں آپ کے ساتھ نکلے اور جب جنگ جمل سے پہلے فریقین کی نیک نیتی کی بنا پر صلح کی شکل پیدا ہو گئی تو سبائیوں نے اس صلح کو تباہ کرنے کی وہ کوشش کی جس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے' تاریخ کے بیان کے مطابق اس میں شب خون مارنے کا اصل کردار کوفیوں ہی نے ادا کیا (ملاحظہ ہو ابن اثیر) اور پھر انہی کی بدولت صفین میں حضرت علیؓ جنگ بند کرنے پر مجبور ہوئے اور بعد میں آپ کا ہر دن ایسا گذرا کہ کہا جاسکتا ہے' آپ نے باقی وقت ان کے ساتھ رو رو کر پورا کیا۔ آپ کے اس دور کے خطبوں میں بار بار ایسے جملے ملتے ہیں کہ "سب سے بڑا دھوکہ کھانے والا وہ ہے جو تمہارے دھوکہ میں آیا۔"[2]

ایک خطبہ میں ہے:-

ایها الفرقة التی اذا امرتُ	اے وہ گروہ کہ جب بھی میں نے کسی بات
لم تطع واذا دعوت لم تجب	کا حکم دیا اس نے نافرمانی کی، اور جب
ان اُمهلتم خضتم وان حوربتم	کسی کام کی طرف بلایا لبیک نہ کہی، ذرا
خرتم وان اجتمع النّاس علیٰ	مہلت مل جاتی ہے تو فضولیات میں لگ
امام طعنتم..........	جاتے ہو اور جب دشمن حملہ آور ہو تو
لا ابا لغیرکم۔[3]	بردلی دکھاتے ہو اور جب لوگ کسی
	امام پر جمع ہو جائیں تو تم کیڑے نکالتے
	ہو۔۔ ہائے افسوس تم پر۔

[1] مزید تفصیل کیلئے دیکھیے تاریخ ابن اثیر اور تاریخ طبری۔ [2] نہج البلاغۃ ج ا ص۱۰۲ دار المعرفۃ [3] ایضاً ج ۲ ص۱۰۱ نہج البلاغۃ ایسے ارشادات سے بھری پڑی ہے اگر کوئی چاہے تو جلد اول ہی کا مطالعہ کافی ہوگا۔

یہی لوگ تھے کہ حضرت علیؓ کی زندگی میں جنگ سے جی چراتے اور آپ کے احکام سے سرتابی کرتے رہے اور جب حضرت حسنؓ نے مصالحت کی تو ان کے خیمے پر حملہ کر دیا۔ سامان بھی لوٹا اور زخم بھی لگایا۔[1] ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا حضرت معاویہؓ کے ساتھ کیسے گزارا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے حلم نے اگر کہیں جواب دیا تو یہ کوفہ والوں ہی کے ساتھ ہوا۔

الغرض اس امن وامان اور اسلامی جمعیت کی بحالی کے دور میں اگر کہیں سے کچھ خلفشار پیدا کرنے کی خواہش اور جستجو ہوتی رہی تو وہ کوفہ ہی کی سرزمین سے تھی۔ حضرت حسینؓ کے متعلق ان لوگوں کو معلوم تھا کہ مصالحت سے وہ خوش نہ تھے۔ بس حضرت حسنؓ کے دباؤ سے مجبور ہو گئے تھے جیسا کہ اس سلسلے میں اوپر تاریخی بیان گزر چکا ہے۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد ان لوگوں نے سمجھا کہ اب حضرت حسینؓ کو آمادۂ جنگ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ البدایہ والنہایہ کی روایت کے مطابق:۔

وقدم المسیّب بن عتبہ	مُسیّب بن عُتبہ فزاری حضرت حسنؓ
الفزاری فی عدۃ معہ	کی وفات کے بعد مع کئی اور آدمیوں
الحسین بعد وفاۃ الحسن	کے حضرت حسینؓ کے پاس آیا اور ان
فدعوہ الی خلع معاویۃ۔[2]	لوگوں نے آپکو حضرت معاویہ کی بیعت
	توڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت کا قصہ کھڑا ہوا تب ان لوگوں نے ازسرِ نو یہی کوشش کی۔

لمّا بایع الناس معاویۃ	جب لوگوں نے (عام طور پر) یزید کیلئے
لیزید کان حسین ممّن لم	معاویہؓ سے بیعت کرلی تو حضرت حسینؓ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۹۳ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳ [2] ج ۸ ص ۱۷۵۔

یبایع لہ۔ وکان اھل الکوفۃ	ان لوگوں میں تھے جنھوں نے نہیں کی
یکتبون الیہ یدعونہٗ الی	اور (اسی بناپر) اہل کوفہ معاویہؓ کے زمانے
الخروج الیھم فی خلافۃ	میں حسینؓ کو لکھتے رہے تھے کہ مدینے سے
معاویۃ۔[1]	نکل کر ان کے پاس آجائیں۔

آگے ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

کل ذالک یأبیٰ علیھم۔[2]	حسینؓ نے ہر بار ہی ان کی اس بات
	کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

حضرت حسینؓ کی رائے

لیکن حضرت حسینؓ کے اس انکار سے یہ سمجھ لینے کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ کی اس رائے میں تبدیلی آگئی تھی جس رائے کی بنا پر آپ نے اپنے برادرِ بزرگ حضرت حسن کی مصالحت پسندی سے اختلاف فرمایا تھا۔ بلکہ دوسرے تاریخی بیانات کی روشنی میں نظر آتا ہے کہ آپ کی رائے میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ جو بیعت آپ حضرت حسن کے ساتھ حضرت معاویہ سے کر چکے تھے یا تو اس کا احترام آپ کو کسی ایسے اقدام سے مانع تھا جس کی طرف اہلِ کوفہ بلاتے تھے یا آپ کی رائے میں اب وہ قابلِ احترام تو نہیں رہی تھی مگر مصلحت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ایسا اقدام کیا جائے۔ تاریخ کے بیانات سے دونوں ہی امکانات سامنے آتے ہیں۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ جب کوفیوں نے حضرت حسین کے پاس فتنہ انگیز آمد و رفت شروع کی تو مدینے کے گورنر مروان نے حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے خطرات کی پیش بندی کی طرف توجہ دلائی اس پر حضرت معاویہ نے حضرت حسین کو لکھا کہ:

انّ من اعطی اللہ صفقتہ	جس شخص نے اللہ کو قول و قرار دیا ہو

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۶۲ [2] ایضاً

یمین وعہد ہ لجدیر بالوفاء وقد أنبئت ان قوماً من اهل الکوفة قد دعوك الی الشقاق واهل العراق من قد جرّبت قد افسد وا علی ابیك واخیك فاتق الله واذکر المیثاق فانك متی تکدنی اکدك [1]

(یعنی بیعت کی ہو) اسکو لائق ہے کہ وفائے عہد کرے، مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے تمھیں فتنہ آرائی کی دعوت دی ہے حالانکہ یہ اہل عراق وہ ہیں جنکو تم خوب جانتے ہو کہ انھوں نے تمھارے باپ اور بھائی کو کس فساد میں ڈالا پس اللہ سے ڈرو، عہد یاد رکھو اور یہ کہ اگر تم نے میرے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو میں بھی اٹھاؤنگا۔

اس خط پر حضرت حسین کا جواب یہ نقل کیا گیا ہے

اتانی کتابك وانا بغیر الذی بلغك عنّی جدیرٌ والحسنات لا یهدی لها الّا الله وما اردت لك محاربةً ولا علیك خلافاً وما اظن لی عند الله عذراً فی ترك جهادك وما اعلم فتنةً اعظم من ولایتك امر هذهٖ الامّة۔ [2]

تمھارا خط ملا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ میرا حال اس سے مختلف ہے جو تمھیں میرے متعلق معلوم ہوا ہے۔ اور یہ بس اللہ کا فضل ہے جسکے سوا نیکیوں کی ہدایت دینے والا اور کوئی نہیں میں تمھارے خلاف کسی محاذ آرائی اور مخالفت کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔ اگرچہ میں نہیں جانتا کہ تمھارے خلاف جہاد نہ کرنے کیلئے میرے پاس اللہ کے سامنے کیا عذر ہوگا اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ تمھارے ہاتھ میں اس امت کی سربراہی ہو۔

[1] ج ۱ ص ۱۷۵ [2] ایضاً۔

اس جواب کے سخت لہجے کے باوجود یہی اندازہ ہوتا ہے ـــــ خاص کر پہلے فقرے کی روشنی میں ـــــ کہ حضرت حسین کے لیے اصلاً یہی بیعت مانع تھی۔ اور اس کو توڑ ڈالنے کا خیال آپ نے اپنے آپ سے بعید اور اپنے لیے نازیبا قرار دیا تھا۔ لیکن کوئی شخص آخری فقروں کا سہارا لیکر کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ بیعت کا خیال مانع نہیں تھا بلکہ بات مصلحت وقت کی تھی جو مانع ہو رہی تھی۔ یعنی حضرت معاویہ کے اقتدار کے استحکام کو دیکھتے ہوئے کسی مخالف اقدام کی کامیابی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور شیعہ حضرات یہی کہتے ہیں، کیونکہ وہ توسرے سے بیعت ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ حیاۃ الامام الحسین، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، کے شیعہ مصنف باقر شریف القرشی لکھتے ہیں کہ:-

ولم یکن من رائ الامام الخروج علی معاویة، وذالك لعلمه بفشل الثورة وعدم نجاحها [1]

امام حسین کی رائے میں معاویہ کے خلاف خروج مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کامیابی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد الاخبار الطوال ص ۲۰۳ اور انساب الاشراف (ج ا ق ا) کے حوالے سے آپ کا یہ خط بھی نقل کیا ہے جو اہل کوفہ کی طرف سے خروج کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا تھا:-

.... واما انا فلیس رأی الیوم ذالك، فلصقوا رحمکم الله بالارض واکمنوا فی البیوت واحترسوا من الظّنّة ما دام معاویة حیًّا فان یحدث الله به حدثاً

اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو فی الحال میری رائے اس کی (خروج کی) نہیں ہے۔ پس تم لوگ، جب تک کہ معاویہ زندہ ہیں، زمین سے چپکے رہو، گھروں میں قرار پکڑو اور کسی طرح کے شک و شبہ کا ماحول مت پیدا کرو۔ ہاں

[1] حیاۃ الامام حسین ج ۲ ص ۲۳۰۔

وانا حیٌّ کتبت الیکم برأئ ۔[1]	اگر معاویہ کو کچھ ہو گیا اور میں اس وقت زندہ ہوا تو میں تمہیں اپنی رائے سے آگاہ کروں گا۔

اس خط کا انداز بظاہر اُن لوگوں کی تائید میں جا رہا ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کا عدم خروج بر بنائے حالات و احتیاط تھا نہ کہ اُس بیعت کے احترام میں جو آپ نے حضرت حسنؓ کے ساتھ حضرت معاویہ کے ہاتھ پر کی تھی۔

بہر حال جو بھی واقعہ ہو، اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت حسینؓ کا یہ رویہ بس حضرت معاویہؓ کی زندگی تک کے لیے تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد کے لیے جب بطور ولی عہد اپنے بیٹے یزید کا تقرر کیا اور چاہا کہ لوگ اُسے قبول کر لیں تو حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے اور یزید کے لیے بطور ولی عہد بیعت کرنے سے انکار اسی بات کی ایک علامت تھی کہ وہ اپنے آپ کو آئندہ کسی اقدام کے لیے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور اس میں کچھ نہ کچھ دخل کوفیوں کا بلاشبہ تھا جیسا کہ مذکورہ بالا تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔

باب سوم (۳)

یزید کی ولی عہدی کی تجویز اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ

مؤرخین (طبری، ابن اثیر، ابن کثیر وغیرہ) کے بیان کے مطابق ۵۶ھ میں (یعنی اپنے انتقال سے ۴ سال پہلے) حضرت معاویہؓ نے طے کیا کہ اپنے بعد زمام خلافت سنبھالنے کے لیے یزید کو نامزد کر جائیں اور اس نامزدگی کے لیے رعایا سے رضامندی بھی حاصل کر لیں جس کی شکل اس زمانے میں بیعت تھی۔ تاکہ بعد میں کوئی جھگڑے قضیے کی صورت نہ پیدا ہو۔ حضرت معاویہ کی اس کوشش کی بابت آتا ہے کہ:۔

وفیہا دعا معاویۃ الناس الیٰ البیعۃ لیزید ولدہٖ ان یکون ولیّ عہدہٖ من بعدہٖ .... فبایع لہٗ الناس فی سائر الاقالیم الّا عبد الرحمٰن بن ابی بکر وعبد اللہ بن عمر والحسین بن علی وعبد اللہ بن زبیر وابن عباس[1]	اور اسی سنہ (۵۶) میں معاویہ نے تحریک کی کہ لوگ انکے بعد کیلئے انکے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کریں...... پس تمام اقلیموں میں لوگوں نے اس کیلئے بیعت کر لی سوائے عبد الرحمٰن بن ابی بکر کے اور سوائے عبد اللہ بن عمر حسین بن علی، عبد اللہ بن زبیر اور عبد اللہ بن عباس کے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۸۶۔

جہاں تک یزید کی ولی عہدی کے لیے نامزدگی کا تعلق ہے وہ ایک یقینی واقعہ ہے اسی طرح حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے سے انکار بھی ایک قطعی واقعہ ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کی جو تفصیلات ہماری تاریخی کتابوں میں آتی ہیں ان میں ایک بڑا حصہ ناقابلِ یقین ہے۔ یہ تفصیلات چونکہ خوب شہرت پا چکی ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس موقع پر تھوڑی سی گفتگو ان تفصیلات پر ہو جائے۔ اس باب میں ہم پہلے واقعے کی تفصیلات پر گفتگو کریں گے۔

ولی عہدی کی تجویز

یزید کو ولی عہد بنائے جانے کی تجویز کے سلسلے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ تجویز صحابیِ رسولؐ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے پیش کی تھی اور اس کا پسِ منظر خالص ایک خود غرضانہ اور نفس پرستانہ پس منظر تھا۔ ایسی خود غرضی اور نفس پرستی کہ اس میں اسلام اور ملّتِ اسلام کی بدخواہی بھی انھیں بخوشی منظور ہوئی[1] (العیاذ باللہ)

حضرت مغیرہؓ کا مقامِ صحابیت

یہ مغیرہؓ بن شعبہ کون ہیں؟ ان اصحابِ کرام میں سے ہیں جنھیں ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعتِ رضوان[2] میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے[3]۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اصحابِ نبیؐ کی وہ بیعت ہے جس کے بارے میں قرآن پاک نے بشارت دی کہ

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ	بیشک اللہ راضی ہوا ان مسلمانوں سے جب کہ (اے نبیؐ)
يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح آیت ۱۸)	وہ درخت کے نیچے تمھارے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے

[1] روایت کی تفصیل آگے آتی ہے۔ [2] یعنی وہ بیعت جس پر رضائے الٰہی کی بشارت نازل ہوئی۔ [3] الاصابہ لابن حجر ج ۶ ص ۱۳۱، سیر اعلام النبلاء از حافظ ذہبی ج ۳ ص ۱۲۱ (بیروت)، البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۴۸-۵۲

اور پھر اس صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت مغیرہ صرف شرکاء بیعت ہی میں نہ تھے بلکہ ان کا ایک اور خاص قابلِ ذکر کردار بھی اس موقع پر تھا جو ان کے ایمانی مرتبے کا اظہار کرتا ہے، وہ کردار یہ ہے کہ اس صلح کے موقع پر قریش مکہ کی طرف سے جو صاحب سفیر ہو کر گفتگو کے لیے آئے تھے وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے چچا عروہ بن مسعود ثقفی تھے۔ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ان کا ہاتھ بڑھ بڑھ کر بار بار آنحضرت کی ریش مبارک تک پہنچتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ تلوار لیے اور آہنی خود پہنے، جس میں چہرہ بھی چھپا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے چچا کے اس طرزِ گفتگو پر تڑک کر بولے کہ "اپنا ہاتھ روک لو قبل اس کے کہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھو" عروہ بن مسعود جو طائف اور مکہ کی نہایت مؤثر شخصیت تھے، اس جملے پر سناٹے میں آگئے۔ آنحضرت سے مخاطب ہو کر بولے کہ محمد! یہ کون شخص ہے؟ کس قدر بے تکی زبان میں بات کرتا ہے! آنحضرتؐ نے فرمایا "آپ ہی کا بھتیجا ہے[1]" ——— اور یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کوئی ایسے چچا بھتیجے تھے جن کے آپس کے تعلقات اچھے نہ رہے ہوں گے۔ نہیں ان کے آپس کے تعلقات نہایت اچھے تھے جس کی شہادت عروہ کا اگلا جملہ دیتا ہے۔ عروہ آنحضرتؐ کا جواب سنکر حضرت مغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "اچھا یہ تم ہو، دھوکہ باز! جس کے کیے کو کل ہی میں نے بھرا ہے[2]" ——— یہ اشارہ تھا اس واقعے کی طرف کہ حضرت مغیرہ جو ابھی کچھ دن پہلے اسلام لائے تھے، اس سے متصلاً پہلے انھوں نے ایک سفر میں اپنے ساتھیوں کی کسی بات پر خفا ہو کر ان سب کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ عروہ بن مسعود نے ان سب کی دیت اپنے پاس سے ادا کر کے معاملے کو ختم کیا تھا۔

حضرت مغیرہؓ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ جب ان کے شہر طائف والے (۹ھ میں) مسلمان ہوئے تو ان کے مخصوص بُت "لات" کا بُت خانہ توڑنے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۵۔ [2] ایضاً۔

نے جن دو اشخاص کو بھیجا تھا ان میں سے ایک یہی مغیرہ بن شعبہ تھے[1] (دوسرے ابوسفیان بن حرب تھے)

سنہ ۹ میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ، غزوۂ تبوک ہوا ہے یہ غزوہ اپنی چند در چند سختیوں اور دشواریوں کی وجہ سے "غزوۂ عسرت" بھی کہلاتا ہے۔ اور اسی حوالے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے شرکاء پر اپنی عنایت خاص کا اعلان بھی قرآن پاک کی سورۂ ۹ (التوبہ) میں بایں الفاظ فرمایا ہے:-

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ	اور اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی نبیؐ پر
وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ	اور مہاجرین وانصار پر کہ جنہوں نے تنگی
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ	کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا تھا جبکہ
الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ	ان میں سے بعض کے دل کج ہوئے جا رہے
قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ	تھے پھر اللہ نے ان پر بھی نظر رحمت
عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ	فرمائی بے شک وہ ان کے لیے رؤف
رَّحِيْمٌ ۝ (آیت ۱۱۷)	اور رحیم ہے۔

حضرت مغیرہ کو اس غزوہ میں شرکت کا بھی شرف حاصل تھا اور وہ مہاجرین کے زمرے میں تھے۔ حضرت مغیرہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سَو سے اوپر احادیث مروی ہیں۔ اسی غزوۂ تبوک کے موقع کی بھی ایک روایت چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مؤطا امام مالک وغیرہ میں مروی ہوئی ہے، کہیں غزوۂ تبوک کے ذکر کے ساتھ اور کہیں بغیر اس کے ذکر کے[2]

حضرت مغیرہؓ خلفائے راشدینؓ کے دور میں

دورِ نبویؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں بھی وہ ایک معتمد شخصیت اور

[1] الاصابہ ج ۶ ص ۱۳۲ [2] دیکھیے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۲ مع حاشیہ۔

مہمات میں نمایاں رہے[1] شجاعت میں بھی مرد تھے اور تدبیر وحکمت اور فطانت وذہانت میں بھی فرد، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:-

من کبار الصحابہ اولی	بڑے درجے کے صحابہ میں سے تھے
الشجاعۃ والمکیدۃ شہد	صاحب شجاعت بھی اور صاحب حکمت و
بیعۃ الرضوان۔[2]	تدبیر بھی۔

غیر معمولی ذہانت اور اصابتِ رائے کی بنا پر "مغیرۃ الرائی" کہلاتے اور مدبرترین عرب میں شمار ہوتے تھے[3] حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں بھی وہ معتمد رہے۔ بحرین کے گورنر بنائے گئے، بصرے کی گورنری پر رہے اور پھر کوفے کی[4] بصرے کی گورنری کے زمانے میں ان پر ایک سنگین اخلاقی الزام لگا۔ حضرت عمرؓ نے معزول کر کے شہادت طلب کی۔ شہادت ناکام ہوئی تو روایت میں ہے کہ:-

فکبّر عمر۔	حضرت عمرؓ نے (خوشی سے) تکبیر کہی[5]

اور اس کے بعد جب پھر ایک موقع آیا کہ کوفے کی گورنری کے سلسلے میں حضرت عمرؓ سخت پریشان تھے، جس آدمی کو بھی وہاں بھیجتے وہ ناکام ہوتا۔ اس لیے کہ جیسا کہ اوپر گزرا وہ سخت بے سرے لوگ تھے۔ اِدھر کوئی حاکم پہنچا اور اُدھر انہوں نے اس کے خلاف شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ تو اس موقع پر آپ نے گہرے غور وفکر اور مشاورت کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ ہی کا انتخاب کیا۔

[1] حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے کہ یمامہ کے معرکے میں شامل تھے یعنی وہ شدید جنگ جو مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی ص ۱۳۱، اس کے بعد سوادِ عراق میں حیرہ کا مشہور مقام اسلامی حکومت کے دائرہ میں آیا تو وہاں حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے بکارِ سرکار بھیجے گئے ص ۱۳۲۔ [2] سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۱۔ [3] اصابہ ج ۴ ص ۱۳۱ اعلام ج ۳ ص ۲۲ [4] اصابہ ص ۱۳۱-۱۳۲۔ [5] اعلام ج ۳ ص ۲۸۔

فاروقی انتظامیہ کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہؓ

اس مشاورت اور انتخاب اور اس کے پس منظر کی تفصیل بجائے خود بڑی بصیرت افروز ہے اور فاروقی بلکہ اسلامی انتظامیہ (ADMINISTRATION) کا ایک نہایت اہم اصول اس کے ذریعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عمار بن یاسر کو کوفے کی گورنری پر بھیجا۔ حضرت عمارؓ ان سابقین اوّلین میں ہیں جنھوں نے بڑی مصیبتیں اسلام کی راہ میں اٹھائی ہیں، مگر کوفے والے تو بس کوفے والے، فوراً ہی شکایتیں شروع کردیں۔ نہ صرف یہ شکایت تھی کہ نااہل ہیں بلکہ یہ بھی کہ امانت و دیانت سے بھی خالی ہیں[1]۔ حضرت عمرؓ نے واپس بلالیا اور کہا کہ عمار میں جانتا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہ ہوگا مگر میرا دھیان اس آیت کی طرف گیا جس میں ارشادِ حق ہے کہ:۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔
(سورہ ۲۸ قصص، آیت ۵)

اور ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جن کو کمزور بنا کر رکھ لیا گیا ہے پس ان کو سربراہی دیں اور زمین کی وراثت بخشیں۔

اس لیے میں نے تم کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو واپس بلانے کے بعد حضرت عمرؓ نے کوفے کے وفد سے پوچھا کہ اچھا تم بتاؤ کس کو چاہتے ہو۔ انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کا نام لیا۔ یہ بھی بڑے پائے کے صحابی تھے اِن لوگوں کے اپنے بھی تھے۔ یمن سے تعلق تھا اور یمن کے بہت سے قبیلے کوفے میں آبسے تھے۔ مگر سال بھر مشکل سے گزرا کہ ان کے خلاف بھی شکایت شروع ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے ان کو کوفے سے ہٹا کر بصرے بھیج دیا[2] اور اب اس خالی جگہ کے لیے فکرمند تھے کہ کیا کریں، کس کو بھیجیں، مسجد میں جاکر

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶ ۔ [2] ایضاً۔

لیٹے اور نیند آگئی۔ اسی حالت میں حضرت مغیرہ بن شعبہ وہاں پہنچ گئے، حضرت عمرؓ بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنی قیافہ شناسی کے ماتحت کہا کہ آپ کچھ زیادہ ہی فکرمند معلوم ہو رہے ہیں خیریت تو ہے۔ حضرت عمرؓ نے قصہ بتایا۔ اسی دوران میں اہلِ شوریٰ بھی آگئے ان کے دریافت کرنے پر کہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ:۔

ان اهل الكوفة قد عضلوني — اہلِ کوفہ نے مجھے بڑے مخمصے میں ڈال دیا ہے۔

اور پھر نئے تقرر کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتے ہوئے ان حضرات سے فرمایا کہ مسئلہ میرے سامنے یہ ہے کہ حکام اور والیان کے تقرر کے سلسلے میں کیا اصول برتوں؟ اعلیٰ اسلامی صفات والے کو ترجیح دوں اگرچہ وہ انتظامی لحاظ سے کمزور ہو؟ یا انتظامی لحاظ سے مضبوط اور اہل افراد کو ترجیح دی جائے اگرچہ وہ اسلامی صفات کے لحاظ سے اعلیٰ مقام کے نہ ہوں بس میانہ رَو ہوں۔ آپ کے الفاظ جو روایت میں نقل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

ما تقولون في تولية رجلٍ ضعيفٍ مسلمٍ او رجلٍ قويٍ مسددٍ؟

اس پر جواب دینے والے حضرت مغیرہ تھے انھوں نے فرمایا کہ:۔

امّا الضعيف المسلم فانّ اسلامه لنفسه وضعفه عليك وعلى المسلمين واما القوي المسدّد فانّ سداده لنفسه وقوته لك وللمسلمين[1]

امیر المومنین! جہاں تک (انتظامی اعتبار سے) کمزور مگر اسلامی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان کا سوال ہے تو اسکی اسلامیت کا فائدہ تو اسکی ذات کو پہنچے گا مگر اسکی کمزوری کا نقصان آپکو اور مسلمانوں کو، اسکے برعکس بس میانہ رو مگر مضبوط فرد ہو تو اسکی میانہ روی اسکے لیے ہوگی اور مضبوطی آپکے اور عامۃ المسلمین کے لیے۔

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مذکورۂ بالا سوال اہلِ مشورہ کے سامنے رکھا تھا تو ان کا اپنا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ اور وہ جو شکایت ان سے مروی ہے کہ یا اللہ کیا کروں متقی ملتا ہے تو منتظم نہیں ہوتا اور جو منتظم ہوتا ہے اُس میں تقویٰ نہیں ملتا۔ اس شکایت اور تجربے کے نتیجہ میں بالآخر وہ یہی طے کرنے پر مائل ہو گئے تھے کہ تقویٰ کو کم اور انتظام کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر جو کہ آپ کی وفات سے دو ڈھائی سال پہلے یعنی ۲۱ھ کا واقعہ ہے، حضرت مغیرہ کا جواب سننے کے بعد آپ نے گویا اسی کو قبول کر لیا اور حضرت مغیرہ ہی کے لیے طے کر دیا کہ وہ کوفے کی ذمہ داری سنبھالیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:

فولّى المغيرة الكوفة فبقي عليها حتى مات عمر وذالك نحو سنتين او زيادة۔[1]

پس آپ نے کوفہ کی ولایت مغیرہ ہی کے سپرد کر دی اور وہ اس عہدے پر رہے حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے وفات پائی اور یہ کوئی دو سال یا کچھ زیادہ کی مدت ہوئی۔

حضرت مغیرہؓ کی دوسری عظمت

حضرت مغیرہؓ کی ایک عظمت وہ تھی جو سورۂ توبہ اور سورۂ فتح کی اُن قرآنی آیات سے ثابت ہوتی ہے جن کا حوالہ اوپر گزرا اور جن کی رو سے حضرت مغیرہ ایک طرف اُن (چودہ سو) سرفروش انسانوں میں سے ہیں جن سے پروردگارِ عالم نے اپنی خوشنودی کا اعلان صلح حدیبیہ کے موقع پر فرمایا۔ اور دوسری طرف ان تیس ہزار فرمانبرداروں کی فہرست میں بھی اُن کا نام ثبت ہے جن کو پروردگار نے غزوۂ عسرت کی صعوبتیں اٹھانے پر مہر و کرم کی ایک خصوصی نظر سے سرفراز فرمایا۔ یہ ان کی ایک اور سب سے بلند تر عظمت تھی۔ دوسری عظمت اوپر کے واقعہ سے سامنے آتی ہے کہ حدیبیہ اور تبوک کی سرفرازیاں حاصل ہونے کے باوجود ان کے لئے

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶ ۔

یہ بات ذرا بھی پریشان کن نہیں ہوئی کہ حضرت عمرؓ جس گفتگو کے سیاق و سباق میں ان کو کوفے کی حکومت دے رہے ہیں اس کی رو سے اُن کا درجہ ایک ذرا کم متقی مسلمان کا ہو جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ انھوں نے تو گویا اپنے ہی ہاتھ سے اپنے اوپر "کم متقی مسلمان" کا لیبل لگا لیا۔ ظاہر ہے کہ سب صحابۂ کرامؓ ایک درجہ کے نہیں تھے۔ تقویٰ و طہارت میں بھی ان کے درجات مختلف تھے۔ اور اسے بس اُن کی عظمت کی بات کہا جا سکتا ہے کہ ایسی ایسی قرآنی بشارتوں سے سرفرازی کے باوجود اُن میں سے اگر کوئی اپنے آپ کو تقویٰ اور طہارت اور تدیّن میں مقابلۃً کمتر دیکھتا تھا تو بے تکلّف اپنے آپ کو کمتر ہی جاننا اور کمتر سمجھے جانے پر راضی ہوتا تھا۔ اللہ کی طرف سے ملے خوشنودیوں کے تمغے پر نظر کر کے غرّے میں نہیں مبتلا ہوتا تھا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ... "ولکن سدّدوا وقاربوا"[1] پر نظر کر کے اللہ سے آخرت میں عفو و عنایت کی امید رکھتا تھا۔

بدنام کن روایت کا متن

شیعہ حضرات سوائے تین چار کے تمام اصحابِ نبیؐ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے تھے بلکہ سابقین اولین ابوبکر و عمر اور عثمان وغیرہ تو شروع ہی سے معاذ اللہ منافق تھے۔ ایسا گمان رکھنے والوں کے لیے ٹھیک ہے کہ وہ ان حضرات کی شان میں جو بھی چاہیں سوءِ ادب کریں مگر جو شخص اصحابِ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسے گمان کو اپنے لیے بدبختی کی بات سمجھتا ہو وہ کیسے مان سکتا ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے اسلام کے لیے ایسی جاں نثاریاں اور فرمانبرداریاں کیں کہ خدائے پاک نے بھی سندِ قبولیت

[1] حدیث نبوی ہے "ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ فسددوا وقاربوا وابشروا۔ الحدیث" اللہ کا دین آسان ہے جو کوئی اس میں شدت پسندی کریگا بالآخر مغلوب ہو جائیگا پس میانہ روی سے کام لو، اور رضائے حق کی خوشخبری پاؤ۔ (مشکوٰۃ باب الاقتصاد فی العمل بحوالہ البخاری)

عطا فرمادی وہ اسلام کی جڑ کھودنے کا کام کریں گے اور فخر سے کہیں گے کہ "میں نے اسلام اور امت اسلام کے لیے تباہی کی داغ بیل ڈالدی ہے"۔ یہی بدبختانہ بات ہے جو یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں حضرت مغیرہ جیسے صاحب فضائل صحابی رسولؐ کی طرف ہماری تاریخی کتابوں میں منسوب کی گئی ہے اور جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ تفصیل آگے آئے گی۔ تاریخ کی جو کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ان میں سب سے زیادہ غضب ابن اثیر کی کتاب "الکامل فی التاریخ" میں ڈھایا گیا ہے۔ اور یہ بیان دیا گیا ہے کہ:-

اور اس سنہ (۵۶) میں لوگوں نے یزید بن معاویہ سے ولی عہدی کی بیعت کی۔ اور اس معاملے کی ابتداء مغیرہ بن شعبہ سے ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ معاویہ نے کوفے کی امارت سے مغیرہ کو معزول کر کے سعید بن عاص کو مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے طے کیا کہ مجھے معاویہ کے پاس جا کر خود ہی اپنا استعفا پیش کر دینا چاہیئے تاکہ لوگوں کو یہ ظاہر ہو کہ مجھے اس عہدہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پس یہ طے کر کے وہ معاویہ کے پاس گئے اور وہاں (دمشق) پہنچ کر اپنے دوستوں سے کہا کہ میں نے آج ولایت اور امارت حاصل نہیں کر لی تو پھر کبھی بھی نہیں کر سکوں گا۔ یہ کہہ کر سیدھے یزید کے پاس پہنچے اور اس سے بولے کہ میاں، بڑے بڑے اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور بزرگان قریش گزر چکے اب صرف ان کی اولاد رہ گئی ہے اور تم ان میں سے سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی اور سنت و سیاست کے، علم کے اعتبار سے بھی افضل لوگوں میں ہو، میں نہیں جانتا کہ آخر امیر المومنین کو کیا چیز مانع ہے کہ وہ تمھارے لیے (ولی عہدی کی) بیعت لے لیں! یزید یہ سن کر بولے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی؟ مغیرہ نے کہا کیوں نہیں؟ پس یزید اپنے باپ کے پاس پہنچے اور یہ گفتگو بتائی۔ معاویہ نے بات سنکر مغیرہ کو بلایا اور پوچھا کہ یہ یزید کیا کہہ رہا ہے؟

انہوں نے کہا کہ ہاں امیر المومنین! ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے سامنے اس اختلاف اور خونریزی کا منظر ہے جو عثمانؓ کے قتل کے بعد رونما ہوا (میں نہیں چاہتا کہ یہ دوبارہ ہو) یزید کی شکل میں آپ کے بعد ذمہ داریوں کو سنبھالنے والا ایک فرد موجود ہے۔ پس اس کا تقرر کر دیجیے، تاکہ آپ کو کچھ ہو تو لوگوں کے لیے ایک جائے پناہ اور آپ کا خلف موجود ہو اور کوئی فتنہ و فساد رونما نہ ہونے پائے۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اس کام کی صورت کیا ہوگی؟ مغیرہ نے جواب دیا کہ کوفے والوں کو (متفق کرنے کے لیے) میں کافی ہوں، بصرے کے لیے زیاد موجود ہے، اور ان دو بڑے شہروں کے بعد کوئی نہیں رہ جاتا جو آپ کی مخالفت کرے۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اچھا تم اپنے منصب پر واپس جاؤ اور اپنے بھروسے کے لوگوں سے بات چیت کرو، پھر دیکھیں گے۔ یہ کہہ کر معاویہ نے ان کو رخصت کیا اور یہ لوٹ کر اپنے دوستوں میں پہنچے اور بولے کہ میں نے معاویہ کا پاؤں ایسی رکاب میں پھنسایا ہے کہ اب نکلنے والا نہیں ہے اور امت محمدیہ میں پھوٹ کا وہ سامان کیا ہے کہ اب ابد تک اس میں جوڑ کی صورت نہ ہوگی[1]

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اور بھی ہے لیکن جتنا اوپر آیا اس کا آخری (خط کشیدہ) جملہ ایسا ہے کہ اس کے بعد کچھ اور سنانے کی ضرورت نہیں[2]

کیا کوئی گنجائش اس بات کی ہے کہ ہم اصحاب بیعت رضوان کے لیے اور مجاہدین غزوۂ تبوک کے لیے خدائے ذوالجلال کی وہ خوشنودی اور کرم فرمائی بھی مانیں جس کا نہایت بلند آہنگ اعلان قرآن پاک میں ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ ماننے کو بھی تیار ہو جائیں کہ اس نے دنیا کی ایک حقیر غرض

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۹۔ [2] اصل عربی الفاظ یہ ہیں: "لقد وضعت رجل معاویۃ فی غرز بعید الغایۃ علی امۃ محمد وفتقت علیھم فتقا لا یرتق ابدا"۔

کے لیے دیدہ و دانستہ نہ صرف اسلام دشمنی کا ایک کام کیا بلکہ اس کا فخر سے اعلان بھی دوستوں میں کیا؟ خدا کی پناہ اور ہزار بار پناہ۔ ہم یہ لغویات (بلکہ کفریات) مان کر قرآن اور اس کے اعلان کو جھٹلانے کا کام کیسے کر سکتے ہیں؟

کچھ اور اس سے بڑھی ہوئی روایتیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ان قابلِ فخر مؤرخین کا معیار روایات کے قبول کرنے میں کیا تھا اور انھوں نے کیسے رافضیت سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ایسی روایت کو بلا نقد و تبصرہ لے لیا؟ لیکن ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد ہم بہرحال نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے یہاں تو اس سے بھی زیادہ ناقابلِ یقین اور ایمان سوز روایتیں موجود ہیں۔

حضرت مغیرہ ہی کے بارے میں ایک روایت طبری میں ہے اور ابن اثیر نے بھی اسکو حسبِ عادت من و عن لے لیا ہے۔ سنیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ کیا اس کو مانا جا سکتا ہے روایت ہے کہ:۔

"سنہ ۴۰ھ میں حج مغیرہ بن شعبہ کی امارت میں ہوا۔"

اس کی تفصیل ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"جب اس سال میں کہ جس میں علی قتل کیے گئے، موسم حج آیا تو مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو سنہ ۴۰ھ کا حج کرایا۔ اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے یومِ ترویہ (۸ر ذی الحجہ) میں وقوفِ عرفہ کرایا (جو ۹ر تاریخ کو عرفات میں ہوتا ہے) اور عرفہ کے دن یعنی ۹ر تاریخ کو قربانی کرائی (جو ۱۰ تاریخ کو ہوتی ہے) اور یہ اس ڈر سے کرایا کہ کہیں ان کی جعل سازی کا پتہ نہ چل جائے۔ اور ایک بیان اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ یہ جلدی جلدی کی کاروائی انہوں نے اس لیے کی کہ انھیں اطلاع مل گئی تھی کہ کل صبح کو عتبہ بن ابی سفیان امیرِ حج کی حیثیت سے مکہ پہنچنے والے ہیں۔"

آپ ذرا غور کیجئے مغیرہ دشمنی میں کیسی کیسی خرافات تیار کرنے والوں نے تیار کی ہیں۔ اور ہماری تاریخی کتابوں میں ان کو جگہ مل گئی ہے۔ مان لیجئے مغیرہ بن شعبہ اُن فضائل سے آراستہ ہونے کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس حد تک بھی (معاذ اللہ) گر سکتے تھے کہ جعلی تقرر نامہ بنا کے حج کی امیری ہی نہ کریں بلکہ اس امیری کی خاطر حج کا حلیہ بھی بگاڑیں۔ یعنی ۹ر ذی الحجہ کے بجائے ۸ر کو حج (وقوفِ عرفہ) کرا دیں اور ۱۰ر کے بجائے ۹ر کو قربانی کرا دیں۔ لیکن کیا اس وقت کے اور وہ تمام مسلمان بھی اندھے ہو گئے تھے جو حج کرنے آئے تھے، ان میں سے کسی کو خبر نہیں رہی کہ مغیرہ کیا غضب کر رہے ہیں، یا کسی کے بھی منہ میں زبان نہ تھی جو اُنھیں ٹوکتا؟ آخر کون اس بیہودہ روایت کو مان سکتا ہے؟ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ تنہا طبری ہی نے نہیں اس کو قابلِ بیان نہیں سمجھا بلکہ ابن اثیر نے بھی بلا چون و چرا نقل کر دیا ہے۔ خدا بھلا کرے ابن کثیر نے ضرور اسے نقل کرنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت سمجھی ہے کہ "یہ روایت باطل ہے، حضرت مغیرہ کے بارے میں ایسے گمان کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ صحابۂ کرام ایسی باتوں سے بالاتر تھے، یہ روایت دراصل شیعیت کا شوشہ ہے۔"

حاصل کلام

بہرحال اس کا امکان تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت مغیرہ نے ایک صاحبِ رائے اور دور اندیش انسان کی طرح جس کے لیے وہ مشہور تھے۔ حضرت معاویہ کے بعد اختلاف کے اندیشے سے یہ رائے قائم کی ہو کہ اس کی پیش بندی کے لیے یزید کی ولی عہدی مناسب رہے گی۔ لیکن یہ بات کہ انھوں نے محض کوفے کی اپنی امارت بچانے کے لیے یہ داؤں کھیلا اور اس بات کا پورا شعور رکھتے ہوئے کھیلا کہ اس تجویز کے ذریعہ وہ امتِ مسلمہ کو

لہ البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ ۱۶

تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال رہے ہیں۔ یہ قطعاً ناقابلِ قبول بات ہے۔ قرآن پاک کی صاف صاف شہادت ہے کہ "اللہ ان سے راضی ہوا" — "اللہ نے ان پر رحمت کی نظر کی"۔ اس قرآنی شہادت کے مقابلے میں کوئی بھی ایسی روایت کیسے قابلِ قبول ہوسکتی ہے جو حضرت مغیرہ کو ایسے کردار کا حامل دکھائے جس کے ساتھ اللہ کی رحمت و رضامندی ہرگز جمع نہیں ہوسکتی؟ اور پھر روایت بھی وہ جس کی کوئی سند تک ہمارے سامنے نہیں ہے[1]۔

ایک اور پہلو

اتنی ہی بات نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے لیے حضرت مغیرہ کی تجویز کی یہ روایت از روئے درایت لائقِ تسلیم نہیں ہے بلکہ روایتی حیثیت سے بھی اس کی خامی یہ ہے کہ ابن اثیر تو اپنی بلا سند روایت میں واقعہ کی صورت یہ بیان کرتے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا کہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ کو کوفے کی امارت سے معزول کر کے سعید بن عاص کو ان کی جگہ لانے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو پتہ چلا تو وہ اس ارادے سے سیدھے عازمِ دمشق ہوئے کہ عہدے سے اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے لیے خود جا کر استعفےٰ دیدیں الخ — جبکہ طبری میں سند کے ساتھ صورتِ واقعہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مغیرہ اپنے ضعف کا عذر لے کر معاویہ کے پاس پہنچے کہ ان کا استعفےٰ قبول کر لیا جائے۔ جس پر حضرت معاویہ نے قبول کر لیا اور ان کی جگہ پر سعید بن العاص کو لانے کا ارادہ کیا۔

دونوں روایتوں میں صورتِ واقعہ بالکل مختلف ہے۔ ابن اثیر کی روایت میں حضرت معاویہ ارادہ کرتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کو ہٹا کر سعید بن عاص کا تقرر کر دیں اور اس کو سن کر حضرت مغیرہ استعفےٰ دینے جاتے ہیں جبکہ طبری کی روایت میں حضرت مغیرہ خود سے استعفےٰ کے خواہش مند ہوتے ہیں اور نتیجۃً حضرت معاویہؓ ارادہ کرتے ہیں کہ سعید بن عاص

---

[1] تاریخ ابن اثیر میں سند کی روایت درج نہیں ہوتی۔

کا تقرر کر دیا جائے۔ اس اختلاف کی صورت میں طبری کی با سند روایت کو قدرتی طور پر ابن اثیر کی بے سند روایت پر ترجیح ہونی چاہیے۔ طبری کی روایت آگے ایسی کوئی بات نہیں بیان کرتی جس کو حضرت مغیرہ جیسے ایک صحابیٔ رسول کے حق میں ماننا ہمارے لیے ممکن نہ ہو۔

طبری کی روایت کا سقم

لیکن طبری کی روایت میں بھی ایک جھول ہے، یعنی آگے جو صورتِ واقعہ انھوں نے بیان کی ہے وہ عقلاً کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کا استعفےٰ منظور ہونے اور سعید بن عاص کا ان کی جگہ پر نام آنے کی بھنک جو حضرت مغیرہ کے سکریٹری (کاتب) کے کان میں پڑی تو وہ (سعید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے) ایک دم سعید کے پاس جا پہنچے اور خوشخبری سنائی۔ اس کا پتہ حضرت مغیرہ کو چل گیا اور یہ چیز جو انھیں ناگوار ہوئی تو ایک دم یزید کو ولی عہدی کا خواب دکھانے کی اسکیم تیار کر کے یزید کے پاس پہنچ گئے یزید یہ سنہرا خواب لے کے اپنے والد کے پاس پہنچے اور والد نے اس کی خوشی میں حضرت مغیرہ کو ان کی جگہ پر بحال کر کے کوفے واپس بھیجدیا کہ جائیں اور اس خواب کو واقعہ بنانے کی تدابیر کریں۔

مغیرہ بن شعبہ خود سے استعفےٰ دینے کو جاتے ہیں ضعیف العمری کا تقاضہ ہے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ جو شخص ان کا سکریٹری تھا وہ نئے ہونے والے امیر کو خوش کرنے کیلئے اس کے پاس خوشخبری لے کر پہنچ گیا تو آپ نہ صرف اس سے بگڑ گئے بلکہ اپنا استعفےٰ ہی الغظ کرنے کی ٹھان لی۔ یہ تو ایک بچوں والا مزاج ہوا۔ حالانکہ مغیرہ مانے ہوئے صاحب رائے اور دانشمند اور سن کے پیٹے میں ہیں! بظاہر روایت کا یہی ناقابلِ فہم پہلو ہے جس کی بنا پر ابن کثیر نے اسے طبری ہی کے حوالے سے درج کرنے کے باوجود اس کا پتہ چکا نہ پن

والا جزو نکال کر بس یوں بیان کیا ہے کہ :-

"...... استعفیٰ منظور ہونے اور سعید بن عاص کا تقرر کیے جانے کی خبر سننے سے مغیرہ کو شاید کچھ پچھتاوا سا ہوا جس کی بنا پر وہ یزید کے پاس گئے۔ الخ[1] ......"

اور چونکہ ابن اثیر نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں صراحتہً لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی بنیاد اصلاً طبری کی روایات پر رکھی ہے اور بعد میں وہ دوسری کی روایات سے مناسب اضافے کرتے ہیں اس لیے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ اصل روایت تو ان کے سامنے بھی طبری ہی کی ہے مگر ابن کثیر کی طرح انہوں نے بھی اس کو اصل صورت سے پیش کرنے میں دقت محسوس کی تو اس کی اصلاح انہوں نے ابن کثیر سے بھی زیادہ کر دی۔ اور خود ہی استعفیٰ دیکر خود ہی نادم ہونے کو بھی حضرت مغیرہ جیسے ہوشمند اور پختہ کار سے بعید دیکھ کر واقعہ کو یوں بیان کیا کہ اصل ارادہ معاویہ کی طرف سے ہوا تھا کہ مغیرہ کو معزول کر کے سعید کا تقرر کر دیا جائے۔ مغیرہ کو اس کی بھنک پڑی تو وہ اس کی کاٹ کے لیے اپنا استعفیٰ لے کر پہنچ گئے۔ اور استعفیٰ کے ساتھ ساتھ یزید کے کان میں ولی عہدی کا افسوں بھی پھونک دیا جس کے نتیجے میں معاویہؓ کو خود ہی ضرورت محسوس ہوئی کہ مغیرہ کو ان کے عہدے پر باقی رکھا جائے۔[2]

سوال یہ ہے کہ ایسی روایت کی وقعت کیا ہے جو اتنی ناقابل فہم ہو کہ طبری کا نام لیکر بیان کرنے والے بھی اس کو کافی ردّ و بدل کے بغیر بیان کے قابل نہ سمجھتے ہوں ؟

ایک اور سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا انتقال معتبر روایات کے مطابق ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶ ۔ [2] ابن اثیر کی بیان کردہ روایتوں کا پورا ترجمہ اوپر گذر چکا ہے۔

ہو جاتا ہے[1] اب ذرا غور کیجیے کہ طبری کی روایت بھی ہے اگرچہ بہت مختصر طور پر[2] اور ابن اثیر نے تو بڑی تفصیل سے۔ بیان کیا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ جب کوفے واپس گئے تو حضرت معاویہ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق یزید کی ولی عہدی کے لیے زمین ہموار کرنے میں لگ گئے اور پھر وفود تیار کر کے دمشق بھیجے جو حضرت معاویہ سے جاکر درخواست کریں کہ اپنے بعد کیلئے یزید کی ولی عہدی کی شکل میں بندوبست کر جائیں[3]۔ لیکن یہ ساری روایتیں ہمیں ۵۶ھ کے واقعات کے ذیل میں ملتی ہیں بایں طور کہ ۵۶ھ میں یزید کو ولی عہد سلطنت بنایا گیا اور اس کی تجویز دراصل مغیرہ بن شعبہ نے رکھی تھی اور اِس اِس طرح قصہ پیش آیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہ قصہ پیش آیا کب تھا ؟ کون سے سنہ کی بات ہے ؟ اور جس سنہ میں یہ قصہ پیش آیا کہ مغیرہ بن شعبہ نے استعفیٰ دیا یا وہ معزول کیے گئے اور پھر انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت معاویہؓ کو خوش کر کے اپنا عہدہ بچایا اِس کا ذکر اسی سنہ کے واقعات میں کہیں کیوں نہیں ملتا جس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا؟ (جو کہ ۴۹ھ یا اس سے پہلے ہی کا کوئی سنہ ہو سکتا ہے جبکہ حضرت مغیرہ زندہ تھے) طبری اور ابن اثیر کے صفحات حکّام کی معزولیوں، تقرریوں، استعفوں اور ترقیوں کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ خود مغیرہ بن شعبہؓ ہی کا بالکل اسی طرح کا ایک استعفیٰ دینے کا واقعہ بھی ۴۵ھ کے واقعات میں موجود ہے[4] لیکن جس معزولی اور دوبارہ تقرری کا تعلق یزید کی ولی عہدی جیسے اہم واقعہ سے ہے اور پھر اس کے ساتھ حضرت مغیرہ کے بھیجے ہوئے وفود کا دمشق آنا جانا بھی جڑا ہوا ہے، اس کا ذکر اور اس کے اہم متعلقات اور نتائج کا ذکر ہمیں سنہ وقوعہ کے اندر نہیں ملتا! اس کے بعد اس ولی عہدی سے لوگوں کے اختلاف کی باتیں چلتی ہیں۔ بات حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر کے خروج اور محاذ آرائی تک

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۴۸، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۲۸ بیان واقعات ۵۰ھ [2] طبری ج ۷ ص ۱۶۹
[3] پوری تفصیل کے لیے دیکھیے ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۹ [4] دیکھیے طبری ج ۶ ص ۱۴۳-۱۲۳

پہنچتی ہے۔ طرح طرح کی گفتگوئیں ہیں، تبصرے ہیں، تنقید ہے، تائید ہے کسی ذیل میں بھی ہمیں حضرت مغیرہؓ کا نام اس سلسلے میں سننے کو نہیں ملتا۔ حالانکہ بالکل قدرتی بات تھی کہ کبھی حضرت معاویہؓ کے ہی منہ پر اپنی پوزیشن کی صفائی کے سلسلے میں یہ نام آتا کہ بھائی یہ تو ایک غیر اموی کا تجویز کیا ہوا نام ہے، اور وہ بھی ایسے ایسے اوصاف و فضائل رکھنے والا، اسی طرح عادۃً غیر ممکن تھا کہ اس ولی عہدی کی مخالفت کرنے والے اور پھر ولی عہد سے لڑائی لڑنے والے اس کو اور اس کے باپ کو برا بھلا کہنے کے ساتھ دو چار نام اس تجویز پیش کرنے والے کو بھی نہ رکھتے۔ ۵۶ھ کی ان روایتوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا کہیں سے کہیں تک آپ کو حضرت مغیرہ کا ذکر اس قضیے سے جڑا ہوا نہیں ملے گا۔ کیا معاملے کا یہ پہلو ان روایتوں کی واقعیت میں شک پیدا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اور اب سند کی بات

اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایت کوئی قابلِ اعتناء درجہ کی نہیں ہے۔ اسکے ایک راوی علی بن مجاہد کے بارے میں ابن معین کا قول ہے کہ "کان یضع الحدیث" حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ (میزان الاعتدال ج ۳ صـ ۱۵۲) جو شخص حدیثیں گھڑ سکتا ہو وہ تاریخی روایات میں کیا کچھ نہیں کرسکتا؟ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ "متروک ہیں" اور "لیس فی شیوخ احمد اضعف منہ" (امام احمد کے شیوخ (اساتذہ) میں ان سے زیادہ ضعیف کوئی دوسرا نہیں ہے) (ج ۱ صـ ۲۷۴)

باب چہارم

ولی عہدی کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟

یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں جو راوی یہ بتاتے ہیں کہ یہ تجویز کوفے کے اموی گورنر مغیرہؓ بن شعبہ کے دماغ سے نکلی تھی، اور نہایت بچکانہ حرکت کے طور پر نکلی تھی، وہی راوی ایک مزید بات اس سلسلے میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے اپنے ایک دوسرے اہم گورنر زیاد سے بھی اس سلسلے میں رائے مانگی تھی اور اس نے رائے یہ دی کہ اس معاملے میں عجلت مناسب نہیں ہے، فی الحال اسکو التواء میں رکھنا اور موزوں حالات کا انتظار کرنا مناسب ہوگا۔ حضرت معاویہ نے یہ رائے بلا چون و چرا قبول کرلی[1]، اس کے

---

[1] طبری ج ۶ صـ ۱۷۰۔ زیاد بصرے کا گورنر تھا۔ اس کو زیاد بن ابیہ، زیاد بن سمیہ، زیاد بن ابی سفیان وغیرہ کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی نسب کے اعتبار سے ایک کمزور آدمی تھا۔ مگر نہایت باصلاحیت طائف کے قبیلہ ثقیف میں ہجری سنہ ۱ میں پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی صلاحیتیں کھلنا شروع ہوئیں اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھاوا دیا۔ بصرہ میں گورنروں کا سکریٹری رہا۔ حضرت علیؓ کا عہد آیا تو آپ نے اسے فارس کی گورنری دی۔ اور حضرت حسنؓ کی صلح کے بعد بھی ایک گورنر تھا جس نے سال بھر تک حضرت معاویہ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا بالآخر سنہ ۴۲ھ میں اطاعت قبول کرلی اور کوفے میں رہائش کی اجازت حاصل کی۔ حضرت معاویہ اس سے اتنے خائف تھے (باقی آئندہ صفحہ پر)

بعد انہی راویوں کی یہ بھی روایت ہے کہ:- جب زیاد کا انتقال ہو گیا تو معاویہ نے

لما مات زیاد دعا بکتاب	یزید کو خلیفہ نامزد کرنے کی ایک دستاویز
بکتاب فقرأ علی النّاس	تیار کرا کے لوگوں کے سامنے پڑھی جو
باستخلاف یزید۔ ان حدث	یہ تھی کہ معاویہ کی موت واقع ہو جائے
بہ حدث الموت فیزید	تو یزید جانشین ہوگا جس پر سب لوگوں
ولی عهد فاستوثق لہ الناس	نے سوائے پانچ افراد کے
علی البیعۃ لیزید الا خمسۃ	یزید کی ولیعہدی کے لیے اپنا اقرار
نفر۔[1]	دیا۔

روایت کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت معاویہ کو بس زیاد کی موت کا انتظار تھا۔ چنانچہ ابن اثیر اور ابن کثیر دونوں نے بھی جو واقعات کو طبری کی طرح الگ الگ روایات میں توڑ کر نہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، زیاد کا مشورہ اور حضرت معاویہ کے یہاں اس کی قبولیت نقل کرنے کے بعد استخلافِ یزید کی ازسرِ نو تحریک کو زیاد کی موت کے ساتھ بالکل اسی طرح جوڑ کے بیان کیا ہے جیسے بس زیاد کا وجود اس راہ میں رکاوٹ تھا وہ ہٹا اور حضرت معاویہ ازسرِ نو سرگرم ہو گئے[2] حالانکہ زیاد کا انتقال باتفاقِ مؤرخین ۵۳ھ میں

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) کہ کوفے کے گورنر حضرت مغیرہ کو لکھا کہ زیاد اور اس کے ساتھ فلاں فلاں نمایاں شیعانِ علی کو پابند کرو کہ نماز باجماعت مسجد میں پڑھیں (یعنی تاکہ نگاہ میں رہیں) مگر نہ تو زیاد جیسا آدمی ایسی زندگی پر راضی رہ سکتا تھا نہ حضرت معاویہؓ ایسے کارآمد آدمی کو اپنا بنائے بغیر چھوڑ سکتے تھے۔ بالآخر دونوں قریب آئے اور ۴۵ھ میں زیاد کو بصرے کی گورنری مل گئی اور پھر مسلسل ترقیاں پاتا ہوا ۵۳ھ میں انتقال کر گیا۔ (طبری ج ۶ ۔ ابن اثیر ج ۳ ۔ سیر اعلام النبلاء ج ۳۔

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۰ [2] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۰ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶۔

ہو گیا تھا[1] جبکہ حضرت معاویہ کی ازسرِ نو سرگرمی کا وقت ۵۶ھ میں بتایا جا رہا ہے۔ ۵۶ھ کے واقعات کے عنوان کے تحت طبری کے الفاظ ہیں:-

وفیها دعا معاویۃ النّاس	اور اسی سنہ میں معاویہ نے لوگوں کو
الی بیعۃ ابنہ یزید من بعدہ	اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کی بیعت کی دعوت
وجعلہ ولی العهد[2]	دی اور اسے ولی عہد بنا دیا۔

اور تقریباً یہی الفاظ ابن کثیر اور ابن اثیر کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

پس اول تو کوئی وجہ ایسی سامنے نہیں ہے جس کی بنا پر یہ سمجھنا معقول ہو کہ حضرت معاویہ زیاد کے ڈر سے اپنی دلی خواہش دبائے بیٹھے رہے۔ دوسرے اگر یہی واقعہ تھا تو زیاد کا انتقال ۵۳ھ میں ہو جانے کے بعد ۵۶ھ تک مزید کون چیز انھیں روکے رہی؟ اور پھر کیا تک ہے کہ ۵۶ھ میں ہونے والے واقعہ کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ جیسے وہ زیاد کی موت کے فوراً بعد ہی پیش آ گیا تھا جو کہ تین[3] سال قبل ۵۳ھ میں ہو چکی تھی؟

قرینِ قیاس بات

جہاں تک زیاد سے مشورے کا سوال ہے وہ تو عین ممکن بلکہ قرینِ قیاس ہے، کیونکہ زیاد کا تعاون ناگزیر تھا، لیکن تجویز کے اِحیاء کو زیاد کی موت سے خواہ مخواہ مربوط کرنا جس سے یہ تأثر ہوتا ہے کہ بس زیاد کا وجود رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ولی عہدی کی تجویز ۸-۱۰ سال سرد خانے میں پڑی رہی۔ چنانچہ وہ راستے سے ہٹا اور

[1] طبری ابن اثیر اور ابن کثیر تینوں کے یہاں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن ابن کثیر ۵۶ھ کے واقعات میں جہاں انہوں نے زیاد کی وفات کے بعد حضرت معاویہ کا سرگرمِ عمل ہونا بیان کیا ہے وہاں پتہ نہیں کیسے یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ زیاد کی وفات اسی سنہ میں ہوئی تھی "فلما مات زیاد وکان ھذہ السنۃ شرع معاویۃ الخ" ظاہر ہے یہ کوئی بھول چوک ہے اسلیے اس سے کسی کو خلجان نہیں ہونا چاہیے۔ [2] ج ۶ ص ۱۶۸

معاویہ پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ ربط ایک زبردستی کا ربط ہے اور قابلِ قبول نہیں نظر آتا۔ اس کے مقابلے میں قابلِ قبول یہ بات ہو سکتی ہے کہ ۵۶ھ میں اپنی عمر اور صحت کے تقاضے سے حضرت معاویہ کو یہ خیال غالب ہوا ہو کہ انھیں اپنے بعد کے لیے انتظام میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس وقت ان کی عمر ستّر سے اوپر ہو چکی تھی اور چار سال بعد ۶۰ھ میں ان کا انتقال ہی ہو گیا[1]۔ حضرت معاویہ کی سرگرمی کی جو تفصیلات اہلِ تاریخ نے لکھی ہیں ان میں صاف طور سے اس کا اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ بعض کے بیانات میں تو صراحت کا درجہ ہے۔ مثلاً طبری میں ہے کہ جو پانچ آدمی یزید کی ولی عہدی سے متفق نہیں ہوئے تھے۔ جس کا ذکر اوپر دی ہوئی طبری کی روایت میں آگیا ہے۔ ان کو ہموار کرنے کے لیے حضرت معاویہ نے حجاز کا ایک سفر کیا تو ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ بات چیت میں انہوں نے کہا کہ :-

اِنّی ارھب ان ادع امّۃ محمد بعدی کالضأن لا راعی لھا۔[2]	مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بعد بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح نہ چھوڑ جاؤں جس کا کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

اور ابن اثیر میں ہے کہ انہوں نے (اپنے سفر سے پہلے) مدینے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی کو نامزد کر جاؤں، سو تم اس سلسلے میں اہلِ مدینہ کی رائے معلوم کرو۔ اس خط کا مضمون ابن اثیر میں اس طرح دیا گیا ہے کہ :-

[1] حضرت معاویہ کی عمر ۷۳ سال سے لیکر ۸۵ سال تک بتائی گئی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ان کی عمر اس وقت (موت کے وقت) ۷۸ سال تھی اور کہا گیا ہے کہ اسّی سے اوپر تھی اور یہی زیادہ مشہور ہے" البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۴۳۔ [2] طبری ج ۶ ص ۱۷۰۔

انّی قد کبرت سِنّی و دَقّ عظمی وخشیت الاختلاف علی الامۃ بعدی وقد رأیت ان اتخیّر لھم من یقوم بعدی وکرھت ان اقطع امرًا دون مشورۃ مَن عندك فاعرض ذالك علیھم واَعلمنی بالّذی یردّون علیك۔[1]	میری عمر بہت ہو چکی ہے اور ہڈیاں گھل رہی ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ امت میں میرے بعد اختلاف ہو۔ اس لیے ضروری سمجھ رہا ہوں کہ اپنے بعد کیلئے کسی آدمی کو طے کر دوں۔ لیکن تمہارے پاس جو لوگ ہیں (یعنی اہلِ مدینہ) انکے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کر دینا مجھے پسند نہیں۔ پس تم میری یہ بات اُن لوگوں پر پیش کرو اور ان کے جواب سے آگاہ کرو۔

ایک اور فائدہ

ابن اثیر کی اس عبارت سے جہاں ہمارے اس قیاس کو دلیل ملتی ہے کہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کے لیے جو سرگرم ہوئے وہ اس لیے نہیں تھا کہ زیاد کا، انتقال ہو جانے سے راستہ صاف ہو گیا تھا بلکہ ضعیف العمری اور اپنے وقت کے قریب ہو جانے کا احساس اس کا باعث ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ ابن اثیر کی بیان کردہ ان روایتوں کی تردید یا تضعیف کا سامان بھی، ابن اثیر کی اس (مذکورہ بالا) روایت میں پایا جاتا ہے جو یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے متعلق ان کی کتاب میں ایک ہی صفحہ پہلے درج ہوئی ہیں اور اس جلیل القدر صحابی کی مضحکہ خیزی کا سامان بن رہی ہیں گزشتہ صفحات میں ہم نے اُن روایتوں کی طرف اشارہ کیا تھا تفصیل نہیں دی تھی، ان روایتوں کے مطابق حضرت مغیرہ جب یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵

معاویہ کو خوش کر کے کوفے کی عمارت پر اس وعدے کے ساتھ واپس ہوئے کہ کوفے والوں کو اس تجویز سے متفق کرنا میرا کام ہے تو پھر انھوں نے وہاں سے ایک وفد بھی تیار کر کے حضرت معاویہ کے پاس اپنے لڑکے کی سرکردگی میں دمشق بھیجا تھا جو تیس[30] یا چالیس[40] آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے یزید کے بڑے گیت گائے اور حضرت معاویہ پر زور دیا کہ ولی عہدی کا تاج بس یزید کے سر پر رکھ ہی دیں۔ تو ان کو مناسب جواب دینے کے بعد حضرت معاویہ نے ابن مغیرہ سے پوچھا کہ تمھارے باپ نے کتنے میں ان سب کا دین خریدا؟ صاحبزادے نے جواب دیا "تیس ہزار[30000] میں"۔۔۔۔ یا دوسری روایت کے مطابق "چار سو[400] دینار میں"۔

یہ مضحکہ خیز واقعات ہو چکے ہوں اور پھر بھی حضرت معاویہؓ مروان کو ایسے انداز میں خط لکھیں جیسے کہ ولی عہدی کے سلسلے میں کوئی بات کبھی اس سے پہلے ہوئی ہی نہیں ہے کیا یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ مروان تو اندرون خانہ کے آدمی تھے۔ اگر یزید کی ولی عہدی کی تجویز پہلے کسی طرف سے ہو چکی ہوتی اور اس کی تائید کیلئے کہیں سے وفود بھی آ چکے ہوتے تو کہاں ممکن تھا کہ حضرت معاویہ اس معاملے میں مروان کو بالکل انجان سمجھ کر خط لکھتے؟

بابِ پنجم ۵

ولی عہدی کی بیعت اور اسکے مخالفین کا قصہ

اوپر طبری کی روایت گزری ہے کہ یزید کی ولی عہدی پر پانچ حضرات کے سوا اور سب نے اتفاق کر لیا تھا۔ اس کے بعد کی روایت میں ان پانچ حضرات کے نام طبری نے یہ دیئے ہیں:۔

حسین بن علی۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر
عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

مگر اس ایک ابتدائی روایت کے سوا حضرت عبداللہ بن عباس کا نام اس اختلاف کے سلسلے میں کہیں نہیں ملتا۔ صرف باقی چار نام مختلف موقعوں پر ادھر ادھر آ کر آتے ہیں[1] حتیٰ کہ خود اس روایت میں جو آگے بیان ہوا ہے کہ حضرت معاویہ نے ان میں سے ہر ایک سے مل کر یہ بات کی اور وہ بات کی۔ اس میں چار کے بعد پانچویں عبداللہ بن عباس سے حضرت معاویہ کی کوئی بات نقل کرنے کے بجائے یہ لکھا ہوا ہے کہ "قال ولم یذکر ابن عباس" جس کا مطلب ہے کہ روایت کے اصل اور بنیادی راوی جو ایک مجہول اور نامعلوم الاسم

---

[1] مثلاً حضرت معاویہ کی جو وصیت یزید کے لیے بیان کی گئی ہے اس میں یہی چار نام اس حیثیت سے مذکور ہیں کہ ان لوگوں کی طرف سے تم کو اختلاف کا سامنا ہو سکتا ہے۔ طبری ج ۶ ص ۱۸۰-۱۷۹۔

شخصیت "رجل بنخلۃ"[۱] ہیں۔ ان سے روایت کرنے والے صاحب جن کا نام ابن عون ہے وہ کہتے ہیں کہ نخلہ والے صاحب نے بات چیت کے بیان کے سلسلے میں ابن عباس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یعنی بیان کے شروع میں اختلاف کرنے والوں کے جو نام انہوں نے گنائے تھے' ان میں تو ابن عباس کا نام تھا۔ مگر ان حضرات سے حضرت معاویہ کی گفتگو کا جو قصہ بیان کیا اُس میں پھر حضرت ابن عباس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام کسی غلطی سے آگیا ورنہ آنا نہیں چاہیے تھا۔ اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ ابن اثیر جو طبری کے حرف بحرف مقلد ہیں انھوں نے بھی اس قصے کے بیان میں چار ہی نام لیے ہیں حضرت ابن عباس کا نام ان کے بیان میں نہیں ملتا۔ ابن کثیر نے البتہ ان کا نام بھی طبری کی پیروی میں باقی رکھا ہے۔ واللہ اعلم کیونکر ؟

نہ صرف ابن عباسؓ بلکہ ابن ابوبکرؓ بھی !

بہر حال ابن عباس کا ذکر اس فہرست میں قطعی طور پر غلط ہے اور صرف ابن عباسؓ کا نام نہیں غلط ہے بلکہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا نام بھی محلِ غور ہے کہ آیا تاریخی اعتبار سے یہ نام ۵۶ھ کے واقعات کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں ؟ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا سنِ وفات عام طور پر ۵۳ھ مانا گیا ہے۔ خود ابن اثیر کی یہی روایت ہے[۲] چنانچہ اختلافی گفتگوؤں کا لمبا چوڑا قصہ پورے ڈھائی صفحے میں بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ :۔

و ذکر عبد الرحمٰن بن ابی بکر	اور اس قصے میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ
لا یستقیم علیٰ قول من یجعل	کا ذکر ان لوگوں کے قول کے مطابق

[۱] یعنی مقام نخلہ کے ایک صاحب۔ معجم البلدان میں نخلہ نام کے دو مقام ہیں۔ ایک نخلۂ شامیہ اور دوسرا نخلۂ محمود (ج ۵ ص ۲۷۶ جدید اڈیشن) واللہ اعلم یہاں کونسا نخلہ مراد ہے۔ [۲] ج ۳ ص ۲۴۶ ۔

وفاتہٗ سنۃ ثلاث وخمسین	ٹھیک نہیں بیٹھتا جو اُن کا سنہ وفات
وانما یصح علیٰ قول من یجعلھا	۵۳ھ بتاتے ہیں۔ یہ صرف ان لوگوں
بعد ذالک الوقت[۱]	کے قول پر ٹھیک بیٹھے گا جو اُن کا سن وفات اسکے بعد بتاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جو کتابیں ہیں ان میں صرف ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ میں یہ قول ملتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا سن وفات ۵۸ھ ہے اور اس کو وہ "کثیر من علماء التاریخ" کا قول بتاتے ہیں مگر نام کسی ایک کا نہیں لیتے۔ جب کہ اس کے مقابل ۵۳ھ کے قول میں واقدی کا نام ہے' محمد بن سعد کا نام ہے اور ابو عبید وغیرہ کا نام ہے[۲] اس "وغیرہ" میں ہم ابن قتیبہ کی المعارف کا اضافہ کرتے ہیں[۳]۔

اور خود ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ہی میں اس کا ایک وزنی قرینہ پایا جاتا ہے کہ ۵۸ھ کا قول صحیح نہیں ہے۔ اور وہ قرینہ یہ ہے کہ ۵۸ھ کے وفیات (OBITUARIES) ہی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام بھی آتا ہے۔ چنانچہ بھائی بہن کے یہ دونوں نام البدایہ والنہایہ میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور اسی کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن کے تذکرۂ وفات میں یہ بتاتے ہوئے کہ ان کی وفات مکے کے راستے میں مکے سے ۶۔ یا ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہوئی تھی جہاں سے ان کو مکے لے جایا گیا اور بالائی مکہ میں دفن کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ :۔

فلما قدمت عائشۃ مکۃ	پس جب حضرت عائشہ مکہ آئیں تو قبر
زارتہٗ وقالت لو شھدتک	پر گئیں اور کہا کہ میں اگر (تمھاری
لم ابک علیک ولو کنت عندک	موت کے وقت) موجود ہوتی تو نہ

[۱] ج ۳ ص ۲۵۲ [۲] ج ۸ ص ۸۹ طبع مطبعۃ السعادۃ۔ مصر [۳] ص ۷۶ طبع اول مطبعۂ اسلامیہ ازہر' قاہرہ۔

لما انقلك من موضع الذی مت فیہ[1]	روتی اور تم کو اس جگہ سے منتقل بھی نہ کرتی جہاں تمہاری موت واقع ہوئی تھی۔

اس عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی خبر وفات سن کر مکے گئی تھیں بلکہ عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ مکہ ان کا جانا ہوا تو وہ بھائی کی قبر پر بھی گئی تھیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات کا مکے جانا اگر ہوتا تھا تو وہ صرف حج کے لیے ہوتا تھا ۵۸ھ میں، حج کا موسم حضرت عائشہؓ نے پایا نہیں۔ اس لیے کہ ان کی وفات کا مہینہ رمضان اور بقول بعض شوال قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں مذکور ہے[2]۔ پس اگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر پر گئیں تو ضروری ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی موت ۵۷ھ کے حج سے پہلے کا واقعہ ہو۔ بس اس لیے ۵۸ھ سن وفات نہیں ہو سکتا۔

بہرحال یہ بات مشکوک ہے کہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والے حضرات میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ہوں۔ ہاں اگر الاصابہ فی تمییز الصحابہ (از ابن حجرؒ) کی روایت صحیح ثابت ہو جائے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن کا سن وفات ۵۶ھ ہوتا ہے اور وفات کا واقعہ حضرت معاویہ سے گفتگو کے بعد پیش آیا ہو[3] تو پھر یہ بیان صحیح ہوگا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ان حضرات میں شامل تھے جنھوں نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا۔ مگر اس گنجلک کا کیا کیا جائے کہ اس روایت کے متصلاً بعد ابن حجر اس روایت کی تائید میں مؤرخ ابن سعد وغیرہ کا جو بیان پیش کرتے ہیں اس میں جہاں یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کا انتقال اسی سال ہوا جس سال

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۹ [2] ج ۸ ص ۹۴ [3] اصابہ ج ۴ ص ۱۶۹ مطبع شرفیہ۔ ابن حجر کی بیان کردہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ کے سفر مکہ کی بابت یہ صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ یہ سفر حج کا سفر تھا۔

حضرت معاویہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حجاز آئے تھے، وہیں یہ بھی ہے کہ:-

وماتت عائشۃ بعدہٗ بسنۃٍ سنۃ تسع وخمسین۔	اور عائشہؓ کا انتقال ان کے سال بھر بعد ۵۹ھ میں ہوا۔

یعنی اب حضرت معاویہ کے سفر کا سنہ ۵۶ کے بجائے ۵۸ ہو گیا حالانکہ وہ متفقہ طور پر ۵۶ھ ہے۔

بہتر ہے کہ اس گنجلک مسئلے کو اب چھوڑ ہی دیا جائے کیونکہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اس اختلاف میں شریک تھے یا نہیں شریک تھے۔ مسئلے میں چونکہ شک کا پہلو سامنے آگیا تھا اس لیے ایک طالب علمانہ خواہش یہ تھی کہ صفائی ہو جائے مگر معلوم ہوا کہ آسان نہیں ہے۔ مزید کافی وقت لگ سکتا ہے جس کی گنجائش سردست نہیں۔ اس لیے اس ضمنی مسئلے کو چھوڑ کر اب ہم اصل مسئلے پر آتے ہیں، یعنی اختلاف کی جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک صداقت ہے۔

ابن کثیر کا بیان

اختلاف کی کہانی کا بیان اس روایت میں بھی ہے جس کا ذکر ابھی اوپر اس حوالے سے گزرا ہے کہ اس کے بنیادی راوی ایک نامعلوم شخص ہیں جنھیں "مقام نخلہ کے ایک صاحب" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس روایت والی کہانی میں ایک تشنگی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کہیں بیچ سے شروع کر دی گئی ہے، شروع کی کچھ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اس تشنگی کو ابن کثیر کا بیان دور کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں اختصار ہے اس لیے ہم ابن کثیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ زیاد کے مشورے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

" پس جب زیاد کا انتقال ہو گیا ——— اور یہ اسی سن کی

بات ہے[1] تو معاویہ نے ولی عہدی کے لیے کارروائی شروع کر دی۔ یزید کے لیے بیعت طے کی اور تمام اطراف میں اس کے لیے لکھا۔ پس مملکت کی تمام اقلیموں میں لوگوں نے بیعت کر لی، سوائے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ، حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کے۔ اس پر معاویہ نے عمرے کے عنوان سے مکہ کا سفر کیا اور مکہ سے لوٹتے ہوئے جب ان کا گزر مدینے میں ہوا تو انہوں نے ان پانچوں میں سے ہر ایک کو الگ الگ بلایا اور ڈرایا دھمکایا۔ ان سب میں سب سے زیادہ سخت اور بے باکانہ جواب دینے والے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ تھے، اور سب سے زیادہ نرم کلام والے عبداللہ بن عمرؓ۔ پھر معاویہ نے ایک خطبہ دیا اور اس وقت یہ پانچوں ان کے منبر کے نیچے موجود تھے۔ اس خطبہ کے بعد لوگوں نے یزید کی (ولی عہدی کی) بیعت کی۔ یہ پانچوں بیٹھے رہے، نہ انہوں نے موافقت کی اور نہ کوئی اختلاف ظاہر کیا۔ اس لیے کہ یہ ڈرائے دھمکائے جا چکے تھے۔ پس ساری مملکت میں یزید کی باقاعدہ بیعت ہو گئی اور تمام علاقوں سے وفود (اس کی توثیق کے لئے) یزید کے پاس پہنچے۔"[2]

طبری کی روایت

طبری کی روایت میں اس بیان کا اول و آخر نہیں ہے۔ صرف وہ مکالمہ ہے جو حضرت معاویہ اور ان اختلاف کرنے والے حضرات کے درمیان ہوا، جس کی تفصیل ابن کثیر نے نہیں دی محض حوالہ دیا ہے۔ وہ مکالمہ یہ تھا:-

"جب معاویہ آئے تو انھوں نے حسین بن علی کو بلوایا اور کہا کہ بھتیجے، سوائے

[1] یہ عبارت اوپر گزر چکی ہے اور ہم وہاں تنبیہہ کر چکے ہیں کہ یہ سہو ہے زیاد کا سن وفات ۵۳ھ ہے۔

[2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶ -

اُن پانچ آدمیوں کے جن کی قیادت تم کرتے ہو، اور سب لوگ اِس معاملے میں متفق ہو چکے ہیں، تو بتاؤ کہ اس اختلاف کی تمھیں کیا ضرورت پیش آ رہی ہے؟ حسینؓ نے جواب میں پوچھا: "میں ان کی قیادت کر رہا ہوں؟" کہا "ہاں تم قیادت کر رہے ہو۔" حسین نے کہا "اچھا تو ان کو آپ بلا لیجئے۔ وہ اگر بیعت کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں بھی ان میں کا ایک ہو جاؤں گا، ورنہ پھر آپ میرے بارے میں تیز نہ ہوں۔" معاویہ نے کہا "تم ایسا کرو گے؟" کہا "ہاں بالکل۔" اس پر معاویہ نے ان سے اقرار مانگا کہ وہ اس بات چیت کو کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ حسین نے بچنے کی کوشش کی۔ مگر بالآخر قول دے دیا۔ وہ نکلے تو راستے میں ابن زبیر نے ایک آدمی بٹھا رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کے بھائی ابن زبیر پوچھتے ہیں کہ بڑے میاں سے کیا بات ہوئی ہے؟ حسین نے بچنا چاہا مگر اس آدمی نے پیچھے پڑ کے کچھ نہ کچھ ان سے نکلوا ہی لیا۔ حسین کے بعد معاویہ نے ابن زبیر کو بلوا بھیجا اور ان سے بعینہٖ یہی بات ہوئی۔ جو حسین سے معاویہ نے کہا تھا وہی ابن زبیر سے کہا اور جو جواب حسین نے دیا تھا بالکل وہی ابن زبیر نے دیا۔ معاویہ نے ان سے بھی اقرار مانگا کہ کسی کو بتاؤ گے نہیں۔ ابن زبیر نے اس پر کہا کہ امیر المؤمنین ہم آپ حرمِ الٰہی میں ہیں[1] اور یہاں آپ سے اقرار گویا اللہ سے اقرار ہے اور یہ بڑی بھاری بات ہے، یہ میں نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد وہ گئے تو عبداللہ بن عمر کو بلوا گیا۔ ان سے معاویہ نے ذرا نرم بات کی اور یہ کہا کہ "دیکھو میں ڈرتا ہوں کہ اپنے بعد امتِ محمدؐ کو ان بکریوں کی طرح چھوڑ جاؤں جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔" اور تمھیں معلوم ہے کہ سب لوگ بیعت کر چکے ہیں

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے۔

صرف وہ پانچ نفر باقی ہیں جن کی قیادت تم کرتے ہو۔ آخر تمھیں کیا ضرورت پیش آ رہی ہے"؟ ابن عمر نے جواب دیا کہ میں تمھیں اس مقصد کی ایسی صورت بتاؤں کہ جس سے کوئی برائی بھی نہ آوے اور امت میں فتنہ و فساد کا سدباب بھی ہو جائے، کہا ضرور بتاؤ۔ کہا تم مجمع میں بیٹھو میں آؤں گا اور اس بات پر تمھاری بیعت کروں گا کہ تمھارے بعد جس شخص پر بھی امت متفق ہو گی، میں اس سے بیعت کر لوں گا اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو" معاویہ نے کہا تم ایسا کرو گے؟ کہا بے شک۔ اس کے بعد (حرم سے) گھر یعنی قیام گاہ پر آ گئے اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو بلوایا اور کہا کہ ابن ابی بکر تم کس برتے پر میری مخالفت کے درپے ہو؟ ابن ابی بکر نے جواب دیا میں اس میں خیر دیکھتا ہوں کہا میں تمھیں قتل کر دوں گا، جواب ملا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر دنیا میں اللہ کی لعنت ہو گی اور آخرت میں دوزخ تمھارا ٹھکانہ۔" ابن عون کہتے ہیں خبر والے آدمی نے (پانچویں شخص) ابن عباس کا کوئی ذکر اس مکالمے کے سلسلے میں نہیں کیا۔[1]"

ایک سوال اور اس کا حل

طبری کی اس روایت کو پڑھ کر لازماً یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان سے حضرت معاویہ نے بہت کڑے اور کڑوے انداز میں بات کی۔ جب کہ دیگر افراد کے ساتھ ان کا انداز گفتگو یہ نہیں تھا؟ اس سوال کا کچھ حل شاید ابن اثیر کے بیان سے نکلے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب زیاد کی موت کے بعد معاویہ نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت حاصل کرنے کا عزم کر لیا تو سب سے پہلے تو انھوں نے

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۰۔

عبداللہ بن عمر کو ہموار کرنے کی کوشش کی جس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ بعد ازاں مدینے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ:

"میری عمر بہت ہو گئی ہے، ہڈیاں گھل رہی ہیں اور میں ڈرتا ہوں کہ میرے بعد امت میں (اقتدار کے مسئلے پر) اختلاف رونما ہو۔ اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی آدمی کو نامزد کر جاؤں، لیکن میں یہ نہیں پسند کرتا کہ یہ کام ان لوگوں کے مشورے کے بغیر کر لوں جو تمھارے پاس ہیں (یعنی اہل مدینہ) پس تم یہ میری بات ان کے سامنے رکھو اور ان کے جواب سے مجھے آگاہ کرو۔ چنانچہ مروان نے یہ مسئلہ اہل مدینہ کے سامنے رکھا اور ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہاں بالکل مناسب بات ہے ہم بھی پسند کریں گے کہ وہ ہمارے لیے کسی کو نامزد کر دیں اور اس میں کوتاہی نہ کریں۔ مروان نے یہ روداد حضرت معاویہ کو بھیج دی۔ وہاں سے جواب میں یزید کا نام آیا۔ مروان نے لوگوں کو جمع کر کے بتایا کہ امیر المومنین نے آپ کے لیے پوری خیر خواہی کے ساتھ اپنے فرزند یزید کو اپنے بعد کے لیے انتخاب کیا ہے۔ یہ سن کر عبدالرحمٰن بن ابی بکر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ مروان تم بھی جھوٹے اور معاویہ بھی جھوٹے۔ تم دونوں کی نیت اس انتخاب میں امت محمدیہ کے ساتھ بھلائی کی نہیں بلکہ تم لوگوں کی نیت یہ ہے کہ خلافت کو ہرقلیت بنا دو۔ کہ ایک ہرقل[1] مرا تو دوسرا آ گیا...... اسی طرح حسین ابن علی، عبداللہ بن زبیر اور ابن عمر نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی۔ اور مروان نے پھر اس کی اطلاع معاویہ کو دی۔[2]"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ حضرت معاویہ کی شدت کے پس منظر میں حضرت عبدالرحمٰن کی یہ شدت تھی "..." کی مذکورہ بالا روایت میں نظر آتی ہے۔

[1] یہ شاہان روم کا لقب تھا۔ [2] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵

جبکہ دوسروں (حضرت حسین وغیرہ) نے یہ شدت نہیں اختیار کی تھی۔ یہ واقعہ پہلے پیش آچکا تھا اس کے بعد حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کیا ہے۔ شاید اسی لیے حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ ان کا اندازِ گفتگو مختلف تھا۔

وفود کی کہانی

ابن اثیر ہی کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مروان کو جب حضرت معاویہ نے یزید کا نام اپنے ولی عہد کی حیثیت سے مدینہ بھیجا تھا کہ اس کے لیے اہلِ مدینہ کی منظوری حاصل کریں تو ساتھ میں یہ بھی ہدایت کی تھی کہ مدینے سے کوئی وفد بھی اس منظوری کے اظہار کے طور پر دمشق آنا چاہیے۔ اور اسی طرح دوسرے گورنروں کو بھی ان کے علاقے سے متعلق لکھا تھا[1] چنانچہ یہ وفود پہنچے۔ ابن اثیر نے ان میں سے خاص طور پر دو[2] کا ذکر کیا ہے۔ ایک اہل مدینہ کا وفد جس میں سے محمد بن عمرو بن حزم کا نام دیا گیا۔ دوسرا اہل بصرہ کا وفد جس میں احنف بن قیس کا نام مذکور ہوا ہے۔

ابن اثیر نے ان وفود کے اجتماع کی کاروائی جس طرح دی ہے اس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ اس اجتماع سے جو مقصد حضرت معاویہ کا تھا کہ یزید کی ولی عہدی پر تمام مملکت کے نمائندوں کی مہرِ اتفاق ثبت کرالی جائے۔ یہ مقصد اس اجتماع سے تو حاصل نہیں ہو سکا بلکہ ایک انتشاری کیفیت کے ساتھ اجتماع برخاست ہوا۔ البتہ بعد میں حضرت معاویہ نے لطف وعطا اور مدارات کے ذریعہ لوگوں کو ہموار کیا اور اکثریت سے یزید کی ولی عہدی پر بیعت حاصل کرلی[2] اور اس کے بعد حجاز کا سفر کیا تاکہ وہاں جو لوگ بیعت سے انکار کر رہے ہیں ان کا انکار ختم کرایا جائے۔ انھیں سمجھایا جائے کہ اب جب کہ اور سب ہی لوگ متفق ہو چکے تو کچھ کا اختلاف جاری رہنا مناسب نہیں

---

[1] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۵ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۱

یہی وہ سفر ہے جس کی روداد طبری کے نیز البدایہ والنہایہ کے حوالے سے اوپر پڑھی جا چکی ہے۔

سوالیہ نشان؟

یہ بات کوئی ناممکن نہیں ہے کہ وفود کا اجتماع ناکام رہا ہو اور نہ یہ کہ اس کا تدارک حضرت معاویہ نے مدارات وعطیات اور تالیفات سے کیا ہو۔ ایک آدمی اگر حضرت معاویہ سے حسن ظن رکھتا ہے تو وہ اس بارے میں بلا کسی دقت کے یوں سوچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے نیک نیتی سے اور اچھے مقصد سے کیا تھا۔ لیکن اجتماع کی جو روداد ابن اثیر نے بیان کی ہے اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ اجتماع اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب رہا ہو، نہ کہ ناکام۔ جبکہ مدارات وعطیات سے کام لینے کی بات جو انہوں نے بلا کسی ثبوت، مثال اور حوالے کے صرف ایک فقرے میں بیان کردی ہے وہ اپنے لیے کسی وزن کا تقاضہ نہیں کرتی۔ بلکہ داد و دہش کا جو تنہا ایک واقعہ انھوں نے اس قصّے کے بالکل شروع میں بیان کیا ہے وہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ داد و دہش سے کچھ کام نہیں بنا[1]۔

اجتماع کی روداد جو ابن اثیر نے بیان کی ہے وہ یہ ہے:۔

ثمّ ان معاویۃ قال للضحّاک بن قیس الفھری لمّا اجتمع	پھر جب وفود جمع ہوگئے تو معاویہ نے ضحاک[2] بن قیس سے کہا کہ میں اوّلاً

---

[1] لکھا ہے کہ زیاد کی موت کے بعد یزید کی ولی عہدی کا تہیّہ کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک لاکھ درہم بھیجے جو انہوں نے پر شبہ ہونے کے بعد لینے سے انکار کر دیا کہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں ہیں۔ صفحہ ۲۵

[2] کم عمر صحابہ میں سے ہیں۔ بعض احادیث کی روایت بھی ان سے ہے۔ حضرت معاویہ کے خاص الخاص حامیوں میں تھے۔ سنہ ۵۶ھ کے اجتماع کے وقت کوفہ کے گورنر تھے۔ بعد میں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۴ پر)

الوفود عندہٗ: انی متکلم فاذا سکتُ فکن انت الذی تدعوالی بیعۃ یزید وتحثنی علیھافلما جلس معاویۃ للناس تکلم فعظم امرالاسلام وحرمۃ الخلافۃ وحقھا وما امراللہ بہ من طاعۃ ولاۃ الامر ثم ذکر یزید وفضلہٗ وعلمہ بالسیاسۃ وعرض بیعتہ فعارضہ الضحاک فحمد اللہ واثنیٰ علیہ ثم قال: یا امیرالمؤمنین انہٗ لابد للناس من والی بعدك وقد بلونا الجماعۃ والالفۃ فوجدناھما احقن للدماء واصلح للدھماء وآمن

کچھ کہوں گا پھر جب میں خاموش ہوں تو تم کھڑے ہو، یزید کی بیعت کی تحریک کرو اور مجھے اس کے لیے ترغیب دو پس جب معاویہ خطاب کرنے بیٹھے تو اسلام کی عظمت، خلافت کی حرمت (SANCTITY) اور اس کا حق اور اولوالامر کی اطاعت کے بارے میں اللہ کے احکام بیان کیے، پھر یزید اور اس کی خوبیوں کا بالخصوص اس کے سیاسی شعور اور آگاہی کا تذکرہ کرکے اسکی بیعت کا مسئلہ پیش کیا۔ اس کے بعد ٹھیک اسی انداز سے ضحاک بولے، حمد و ثنا کے بعد کہا کہ امیرالمومنین لازم ہے کہ آپ کے بعد کے لیے صاحب امر کا تقرر ہوجائے تاکہ جماعت اور یکجہتی قائم رہے جس کی برکتیں ہم نے

(بقیہ حاشیہ ص۱۰۳ کا) حضرت معاویہ نے ان کو دمشق میں انتظامیہ کی سربراہی سپرد کی۔ حضرت معاویہ کی نماز جنازہ انہی نے پڑھائی، یزید کے زمانے میں یہ اپنے منصب پر برقرار رہے یزید کی موت کے بعد انکی رائے تھی کہ سب لوگ عبداللہ بن زبیر کی بیعت کرلیں اور قریب تھا کہ لوگ بات چل جاتی اور اسلامی جمعیت پھر سے بحال ہوجاتی مگر ابن زیاد نے مروان کو امیدوار بنا کے کھڑا کر دیا۔ سنہ ۶۴ھ میں مروان کے مقابلے میں عبداللہ بن زبیر کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

اصابہ ج ۳ ص ۲۶۴ سیراعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۴۱ تا ۲۴۵ ۔

للسبل وخیرًا فی العاقبۃ والایام عوجٌ رواجع واللہ کل یوم ھو فی شأن ویزید بن امیرالمؤمنین فی حسن ھدیہ وقصد سیرتہ علیٰ ما علمت وھو من افضلنا علمًا وحلمًا وابعدنا رأیًا فولہ عھدك واجعلہ لنا علمًا بعدك ومفزعًا نلجأ الیہ ونسکن فی ظلّہٖ۔ وتکلم عمرو بن سعید الاشدق بنحو من ذالك، ثم قام یزید بن المقنع العذری فقال

آزمائی ہیں کہ اس میں جانوں کی حفاظت ہے، راستوں کا امن ہے اور عاقبت کی بھلائی ہے۔ زمانہ کی کج رفتاری ہم سب پر روشن ہے اور اللہ کی شان بے نیازی بھی، میں سمجھتا ہوں کہ یزید بن امیرالمومنین اس کام کے لیے نہایت موزوں ہیں، ان کے حسن سیرت کا حال آپ پر عیاں ہے نیز علم، حلم اور رائے میں وہ ہم سب سے فائق ہیں۔ پس ان کو اپنے بعد کیلئے نامزد کرکے ہمارے لیے ایک نشان وعلم اور ایک پناہ گاہ کا انتظام کیجیے۔ کہ جس کی پناہ اور سائے میں ہم قرار پکڑیں پھر عمرو بن سعید الاشدق[1] بولے

[1] کبار تابعین میں ہیں۔ بعض نے صحابہ میں شمار کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں (اصابہ ابن حجر) ابن کثیر انکے تذکرے میں لکھتے ہیں کان من سادات المسلمین ومن الکرماء المشھورین الخ (ج ۸ ص ۳۱۱) اور یہی اوصاف انکے والد ماجد سعید بن العاص کے تھے جو حضرت عثمانؓ کی تربیت میں رہے تھے اور حضرت عثمان کے زمانے میں کوفے کے گورنر رہے پھر حضرت معاویہ کے زمانے میں بھی اولاً کوفے کی پھر مدینے کی گورنری پر رہے (اصابہ ج ۲) عمرو بن سعید اس اجتماع کے وقت کسی عہدے پر تھے یا نہیں یہ معلوم نہیں ہوسکا البتہ بعد میں وہ مکے اور مدینے کی گورنری پر رہے ہیں۔ حادثۂ کربلا کے وقت وہ پورے حجاز کے گورنر تھے۔ واقعہ کے بیان میں ان کا ذکر آئے گا۔ غالب گمان یہ ہے کہ سنہ ۵۶ھ کے اس اجتماع کے وقت بھی وہ برسرعہدہ ہوں اور جیسا کہ دستور تھا ان کے والد سعید کے سنہ ۵۳ھ یا سنہ ۵۴ھ میں انتقال کے بعد انھیں کوئی جگہ دے دی گئی ہو۔

هذا امیر المومنین واشار الی معاویة فان هلك فهذا واشار الی یزید ومن ابی فهذا واشار الی سیفه فقال معاویة اجلس فانت سید الخطباء وتکلم من حضر من الوفود فقال معاویة لاحنف ما تقول یا ابا بحر فقال نخافکم ان صدقنا ونخاف الله ان کذبنا وانت یا امیر المؤمنین اعلم بیزید فی لیله ونهاره وسرّه وعلانیته ومدخله ومخرجه فان کنت تعلمه لله تعالیٰ وللامة رضًا فلا تشاور فیه وان کنت تعلم فیه

اور کچھ یہی باتیں انہوں نے بھی کہیں۔ اس کے بعد یزید بن مقنع عذری[1] کھڑے ہوئے اور معاویہ کی طرف اشارہ کرکے بولے یہ امیر المومنین ہیں ان کو اگر کچھ ہو جائے تو یزید کی طرف اشارہ کرکے بولے کہ۔ پھر یہ ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی تلوار کی طرف اشارہ کیا کہ جو انکار کرے اس کے لیے یہ ہے۔ معاویہ نے کہا بس بیٹھ جاؤ تم سب سے بڑے خطیب ہو۔ اس طرح تمام وفود نے اظہار خیال کیا۔ احنف[2] نہیں بولے تھے۔ معاویہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ ابو بحر (یہ کنیت ہے) تم بھی تو کچھ کہو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر سچ کہوں تو آپ لوگوں کا خوف ہے اور جھوٹ میں اللہ کا خوف۔ امیر المومنین مختصر یہ ہے کہ

[1] ان صاحب کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ [2] احنف بن قیس بصری تابعین میں ہیں فتنے کے وقت میں حضرت علی کے خاص حامیوں میں تھے، اپنی نیک سیرت، حلم، وقار اور دانش کی وجہ سے حضرت معاویہ کے دور میں بھی محترم اور معزز رہے۔ ابو بحر کنیت تھی اور کنیت سے مخاطب کرنا عرب میں تعظیم کی علامت تھی (ابن اثیر ج ۳، اصابہ ج اول)

غیر ذالك فلا تزوّده الدنیا وانت صائر الی الآخرة وانما علینا ان نقول سمعنا واطعنا، وقام رجل من اهل الشام فقال ما ندری ما تقول هذه المعدیة العراقیة وانما عندنا سمع وطاعة وضرب وازدلاف نتفرق الناس یحکون قول الاحنف[1]

آپ یزید کے لیل و نہار اور ظاہر و باطن سے واقف ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے انتخاب میں اللہ اور امت کی رضا ہے تو کسی سے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں سمجھتے تو پھر اب جب آپ کا چل چلاؤ ہے اس کی محض دنیا کا بندوبست مت کیجئے۔ اور ویسے آپ جو بھی طے کریں گے ہمارا فرض تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ہے، اور اس پر ایک شامی کھڑا ہوا اور بولا ہم نہیں سمجھے کہ یہ عراقی زبان کہنا کیا چاہتی ہے۔ ہم تو بس سمع وطاعت جانتے ہیں اور سیدھی سیدھی باتیں۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے اس طرح کہ احنف کا قول ان کی زبان پر تھا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ وفود کا اجتماع حضرت امیر معاویہ منعقد کر رہے ہیں۔ وفود بھیجے ہوئے ان کے گورنروں کے ہیں۔ ماحول دمشق کا ہے۔ سب تقریریں یزید کی ولی عہدی کی حمایت میں ہو رہی ہیں۔ بعض تقریروں میں بڑی صفائی، صراحت اور سنجیدگی سے اسے اسی سیرت اور ان صفات کا حامل بتایا جا رہا ہے جو منصب خلافت کو درکار ہیں۔ ایسے

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱ - ۲۵۰۔

ماحول میں صرف ایک تقریر، نہایت مختصر حضرت احنف بن قیس کی ہوتی ہے، جو بہت محتاط اور بند بند طریقے پر کچھ مختلف رائے دیتے ہیں[1] مگر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو بھی فیصلہ امیر المومنین کر دیں گے ہم اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ فرمانبرداری کریں گے۔ پھر اس تقریر کے بعد ایک شامی کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ یہ کیا "نیمے دروں نیمے بروں" کا انداز ہے۔ ہم شامی صرف ایک اور سیدھی بات جانتے ہیں، سمع اور طاعت!

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے ماحول میں یہ اجتماع بلا کسی فیصلے کے انتشار پر ختم ہوا ہو گا جیسا کہ ابن اثیر بتاتے ہیں؟ بظاہر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اور اس لیے وہ نتیجہ جو ابن اثیر بتاتے ہیں کہ:-

استوثق اکثر الناس — لوگوں کی اکثریت نے توثیق کر دی

وبایعہ[2] — اور بیعت کر لی۔

یہ نتیجہ اسی اجتماع کا ہونا چاہیے جو اسی مقصد کے لیے بلایا گیا تھا نہ کہ اس خیالی مدارات وعطا کا جس کا کوئی ثبوت اور حوالہ دیئے بغیر ابن اثیر اس نتیجہ کو اسی کا کرشمہ ٹھیراتے ہیں۔

دمشق کے اس اجتماع کی کاروائی کے ذکر سے ہمارا مقصد صرف اُس کمی کو پورا کرنا تھا جو طبری کی روایت میں رہ گئی تھی۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس روایت کے مطابق حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کر کے حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ سے جو یہ کہا کہ سب لوگ یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کر چکے ہیں تم ہی لوگ کیوں مخالفت کر رہے ہو؟ تو اس کا پس منظر کیا تھا، کب اور لوگوں نے بیعت کر لی تھی اور کس طرح یہ کاروائی ہوئی تھی؟

---

[1] کچھ اسی طرح کی بات وفد مدینہ کے محمد بن عمرو بن حزمؒ سے بھی منسوب کی گئی ہے مگر اسے وفود کے اجتماع کی کاروائی میں نہیں، اس کاروائی سے باہر دکھایا گیا ہے، اجتماع میں انکی شرکت نہیں دکھائی گئی۔ اس لیے ہم نے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا ہے۔

[2] ایضاً صـ ۲۵۱

ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفر حجاز

ابن اثیر کے بیان میں معاملہ کی ایک اچھی خاصی — یا کم از کم فی الجملہ — معقول صورت کو جس طرح خواہ مخواہ بدصورت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ابھی ہم نے دیکھی اور یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے ہماری تاریخ کے اس باب کو قطعی یکطرفہ اور نامنصفانہ رنگ دیدیا ہے۔ اب اس کے بعد ابن اثیر کی زبانی حضرت معاویہ کے سفر حجاز کی روداد بھی سن لیجئے، اس میں ابن کثیر کے اس مجمل بیان کی، جو ہم اوپر دے آئے ہیں۔ تفصیل ہے کہ جو — چار یا پانچ — اصحاب مخالفت کر رہے تھے ان کو حضرت معاویہ نے ڈرا دھمکا کر خاموش کیا اور اسی تفصیل کے اجزاء کافی مشہور ہوئے ہیں حالانکہ ان کے بے تکے پن کی انتہا نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کی شہرت و قبولیت کو ہم صرف اپنی روایات پرستی کی معراج کہہ سکتے ہیں[1]

ابن اثیر بتاتے ہیں کہ جب "لطف وعطا ومدارات" کے ذریعہ "اکثر الناس" کی اور خصوصاً اہل عراق و شام کی بیعت یزید کی ولی عہدی کے لیے حاصل کر لی گئی تو معاویہؓ نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ حجاز کا رخ کیا چلتے چلتے مدینے کے پاس پہنچے تھے کہ اوّل آدمی جو نظر پڑا وہ حسین بن علیؓ تھے۔ معاویہ انھیں دیکھ کر بولے:-

لا مرحبًا ولا اھلاً بدنة — استغفر اللہ، یہ کون نظر آیا، قربانی کا بکرا

یترقرق دمھا واللہ مھریقھا۔ — ہے جس کا خون اچھل رہا ہے اور اللہ اسے بہائے گا۔

حسینؓ نے جواب دیا:-

---

[1] اسی روایت پرستی کا ماتم اقبال نے کیا ہے ؎

یہ امت روایات میں کھو گئی — حقیقت خرافات میں کھو گئی

مهلاً فانی واللہ لست باھلٍ   ایسی درشتی مت کیجئے، میں واللہ
لهذه المقالة ۔   ایسی بات کا مستحق نہیں ہوں۔

معاویہ بولے، "اس سے بھی بڑی بات کے مستحق ہو"۔۔۔ پھر ابن زبیر ملے اُنکو دیکھ کر بولے "مکار گوہ جو اپنا سر بل میں گھسا لیتی ہے اور دُم پٹکا کرتی ہے لیکن قریب ہے کہ دُم سے پکڑ لی جائے گی اور کمر توڑ دی جائے گی، اسے مجھ سے دور کرو۔" چنانچہ ان کی سواری پر دو ہنٹر مار کر راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ملے معاویہ بولے "لا مرحباً ولا اھلاً۔ بوڑھا ہے جو سٹھیا گیا اور عقل سے پیدل ہوا"۔ یہ کہہ کر ان کو بھی راہ سے ہٹا دیا گیا۔ اور یہی سلوک ابن عمر کے ساتھ کیا گیا۔ تب یہ لوگ معاویہ کے ساتھ ساتھ مدینے کی طرف کو چل دیئے۔ درانحالیکہ وہ ان کی طرف کوئی التفات نہیں کر رہے تھے[1] مدینہ پہنچ کر یہ لوگ معاویہ کے پیچھے پیچھے ان کی اقامت گاہ پر بھی پہنچے۔ جہاں ان کا ان کی حیثیت کے مطابق استقبال نہیں ہوا۔ تب یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر مکے چلے گئے۔ معاویہ نے مدینے میں ایک تقریر کی جس میں خلافت کے لیے یزید کی اہلیت اور دوسروں پر اس کی فوقیت بیان کر کے مخالفت کرنے والوں کو دھمکایا کہ اسے اب برداشت نہیں کیا جائیگا اس کے بعد ام المومنین حضرت عائشہؓ کے یہاں حاضری دی۔ جہاں ام المومنین نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے حسینؓ وغیرہ کو قتل کی دھمکی دی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ام المومنینؓ یہ لوگ فی الواقع اس سے بالاتر ہیں۔ لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں یزید سے بیعت کر چکا ہوں اور ان لوگوں کے ماسوا سب بیعت کر چکے ہیں، تو کیا اب یہ بیعت توڑ دی جائے؟ حضرت عائشہؓ نے

[1] یہاں ایک بار پھر نوٹ کر لیجئے کہ ابن عباسؓ کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔

جواب دیا کہ نہیں، مگر ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، مجھے امید ہے کہ جو تم چاہتے ہو وہی ہو جائے گا۔ معاویہ بولے بہت اچھا میں ایسا ہی کروں گا۔ پھر کچھ دن ٹھہر کر مکہ روانہ ہوئے۔ اور اب خواہش کہ ان چاروں (حضرت حسینؓ وغیرہ) سے ملیں، جو کہ مکے ہی میں تھے۔ اس خواہش کا علم ان لوگوں کو ہوا تو وہ بطن مرّ (مرّ الظہران[1]) میں آکر ملے۔ سب سے پہلے ملنے والے حضرت حسینؓ تھے۔ انھیں دیکھ کر معاویہ بولے "مرحباً و اھلاً یا ابن رسول اللہ وسید شباب المسلمین" اور حکم دیا کہ ان کے لیے سواری لائی جائے۔ پس اب وہ سوار ہو کر معاویہ کے ساتھ ساتھ چلے۔ علیٰ ہذا باقی تین کے ساتھ بھی معاملہ کیا۔ اور اب ان چاروں کے جلو میں اس طرح چلے کہ کوئی پانچواں اس زمرے میں شامل نہیں تھا۔ اور اسی شان کے ساتھ ان چاروں کو لے کر مکے میں داخل ہوئے، پھر جتنے دن رہے ہر دن نیا اکرام، نیا احسان تھا۔ اور دوسری کوئی بات نہیں تھی، حتیٰ کہ عمرے کے ارکان ادا ہو گئے اور چل چلاؤ کا وقت آنے لگا۔ تو ان چاروں نے آپس میں کہا کہ کسی دھوکے میں نہ آجانا۔ یہ سب جو ہو رہا ہے ہماری محبت میں نہیں ہو رہا ہے۔ "مطلب سعدی دیگر است" لہٰذا جواب سوچیے کہ جب مطلب کی بات ہم سے کہی جائے گی تو کیا کہنا ہے۔ پس ان لوگوں نے طے کیا کہ بڑے میاں مطلب کی بات کہیں گے تو ابن زبیرؓ ان کو جواب دیں گے۔ چنانچہ وہ وقت آگیا اور معاویہ نے ان کو طلب کر کے کہا کہ تمھارے ساتھ جو میرا رویہ رہا ہے وہ تم جانتے ہو، تم سے رشتہ داریوں کا جو پاس و لحاظ مجھے رہا ہے وہ بھی تم پر عیاں ہے اور اس کے مقابلے میں جو تم لوگوں کی روش رہی ہے اس کے لیے میرا تحمل بھی تم سے مخفی نہیں۔ اب اس وقت بات یزید کی ہے۔ وہ تمھارا بھائی ہے،

[1] مکے سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام (معجم البلدان) اسکو وادی فاطمہ بھی کہتے ہیں۔

تمھارا ابن عم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ خلافت کے عہدے کے لیے تم اسے آگے بڑھاؤ، رہے خلافت کے اختیارات، عزل و نصب، تحصیلِ خراج و تقسیمِ دولت، وہ سب تمھارے ہاتھ میں ہو گا۔ یزید تمھارے آڑے نہیں آئے گا۔ یہ لوگ خاموش رہے، کچھ بولے نہیں۔ معاویہ نے دوبارہ کہا کہ تم کچھ جواب نہیں دیتے، پھر ابن زبیر سے مخاطب ہوئے کہ تم بولو۔ تم ہی ان کے خطیب ہو۔ ابن زبیر نے جواب دیا کہ میں تین باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ اپنے بعد کے لیے ایسے چھوڑ جائیے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے کہ کسی کا تقرر نہیں کیا، لوگوں نے ابوبکرؓ کو منتخب کر لیا۔

معاویہ بولے کہ آج تم میں کوئی ابوبکرؓ جیسا نہیں ہے پس اختلاف ہو گا۔

۲۔ ابن زبیرؓ نے کہا کہ اچھا پھر ابوبکرؓ کی طرح کیجئے کہ خلیفہ نامزد کیا مگر اپنی اولاد یا خاندان کا نہیں۔

۳۔ یا عمرؓ کی طرح کیجئے کہ انتخاب خلیفہ کے لیے شوریٰ نامزد کر دی۔ مگر اس میں اپنی اولاد یا خاندان کے کسی فرد کو نہیں رکھا۔

معاویہ نے کہا اور کوئی صورت تمھارے پاس پیش کرنے کو نہیں ہے! ابن زبیرؓ بولے کہ نہیں۔ باقی لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

معاویہ نے کہا اچھا اب بات چیت ختم ہوئی۔ میں نے چاہا تھا کہ تم لوگوں کی رضامندی حاصل کر لوں۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ نہیں ہو سکے گا۔ پس حجت تمام ہوئی۔ اب کوئی مجھے الزام نہ دے۔ اب تک میرا معاملہ یہ تھا کہ میں تقریر کرنے کھڑا ہوتا اور تم میں سے کوئی بھی برسرِ عام میری تکذیب کرنے کھڑا ہو جاتا تو میں اسے برداشت کر لیتا اور درگزر کر جاتا تھا۔ لیکن آج مجھے لوگوں میں کچھ کہنا ہے۔ اس موقع پر اگر تم میں سے کسی نے میری تکذیب کی تو

بخدا دوسرا کلمہ نکالنے سے پہلے تلوار اس کے سر پر پہنچ چکی ہو گی۔ یہ کہہ کر اپنے محافظ دستے کے سربراہ کو بلایا اور کہا کہ ان میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے دو آدمی شمشیر بکف مسلط کرو۔ اور ہدایت کرو کہ اگر میری تقریر کے دوران ان میں سے کوئی کچھ بولے تو اس کی گردن اڑا دیں۔ اس کے بعد معاویہ اور ان کے ساتھ میں یہ چاروں بھی چلے حتیٰ کہ معاویہ منبر پر پہنچے اور حمد و ثنا کے بعد کہا کہ یہ (حسین، ابن زبیر، ابن عمر ابن ابوبکر) سادات مسلمین اور عمائدین ملت ہیں۔ جن کے مشورے ہی سے تمام کام انجام پاتے ہیں، انہوں نے یزید کی ولی عہدی قبول کی اور بیعت کر لی ہے۔ بس اب آپ سب لوگ بھی اللہ کا نام لے کر بیعت کریں۔ چنانچہ سب اہلِ مکہ نے بیعت کر لی۔ اور معاویہ نے اسی وقت سواری کھنچوائی اور مدینہ کو روانہ ہو گئے اب اہلِ مکہ نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ آپ لوگ تو کہتے تھے کہ ہم ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ یہ کیا ہوا؟ ان لوگوں نے کہا کہ بخدا ہم نے بیعت نہیں کی ہے۔ لوگوں نے کہا پھر آپ نے تردید کیوں نہیں کی۔ اس آدمی کو بولنے کیوں دیا! بولے اس نے ہمارے ساتھ داؤں کھیلا اور ہم ڈر کے مارے نہیں بول سکے۔ اُدھر معاویہ مدینے پہنچ گئے اور مدینے والوں نے بھی بیعت کر لی۔ یہ کام کر کے معاویہ شام روانہ ہو گئے اور بنی ہاشم کے ساتھ اپنے برتاؤ میں سختی شروع کی۔ (یعنی وظائف وغیرہ روک دیئے) اس پر ابن عباس دمشق پہنچے اور کہا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ معاویہ نے کہا قصہ کیا ہوتا۔ وہ تمھارے حسین صاحب بیعت نہیں کر رہے ہیں اور تم لوگ ان سے کچھ نہیں کہہ رہے۔ ابن عباس نے کہا: معاویہ تم جانتے ہو کہ میں اگر چاہوں تو بعض ساحلی علاقوں میں جا کر ڈیرا ڈال دوں، اور وہاں کے لوگوں کو تمھارے خلاف کھڑا کر دوں۔ بولے نہیں نہیں ابن عباس تمھیں تمھارے وظائف دیئے جائیں گے۔ تمھیں راضی رکھا جائے گا۔

بلکہ پہلے سے زیادہ دیا جائے گا۔"[1]

ایک لمحۂ فکریہ

ذرا غور کیا جانا چاہیے کہ اس پورے بیان میں سوائے ان دو تین جملوں کے جن کا تبادلہ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور امیر معاویہ کے درمیان ہوا اور یا پھر سوائے اس مختصر گفتگو کے جو حضرت ابن زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان انتخاب خلیفہ کے موضوع پر ہوئی کوئی اور بات ہے جس کا کوئی سنجیدہ آدمی یقین کر سکے؟ امیر معاویہؓ کے لیے تو ہر بُری اور گری بات ہم نے لائق یقین فرض کر رکھی ہے۔ اس لیے انکے مسلّمہ اخلاق، حلم، مدارات، رکھ رکھاؤ وغیرہ کے علی الرغم مان لیجئے کہ وہ مدینہ کے پاس حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے ساتھ ایسی ہی بدخلقی سے پیش آئے جیسی بدخلقی مذکورۂ بالا بیان میں دکھائی گئی ہے مگر کیا ایسی ہی آسانی سے یہ بھی ماننے کی چیز ہے کہ یہ معززین مدینہ امیر معاویہؓ کے ہاتھوں نہ صرف اس آخری درجے کی تذلیل و تحقیر کا نشانہ بننے پر بے چون وچرا راضی ہو گئے بلکہ ھل من مزید کہتے ہوئے پھر اُنہی کے پیچھے لگے رہے، اور بار بار ان کے ہاتھوں تذلیل ہی کے جام پی کر کہیں ان کی سیری ہوئی یعنی ناراض ہو کر یا شرمندہ ہو کر مکے چلے جانے کا خیال ان کو آیا — لیکن یہ ناراضگی یا شرمندگی بھی پھر کچھ دیرپا ثابت نہ ہوئی جیسے ہی مکے کے قریب پہنچ کر امیر معاویہؓ نے ان کو یاد فرمایا یہ پھر دوڑ کے مکے سے باہر ہی ان کے استقبال کو پہنچ گئے اور پھر ان کی عنایتوں اور عطاؤں سے سرفراز ہونے کو یہ جانتے بوجھتے تیار ہو گئے کہ یہ سب بناوٹ اور یزید کے لیے خواہش بیعت کی تمہید ہے!

استغفر اللہ۔ یہ وہی ابن عمرؓ، ابن ابوبکرؓ، ابن علیؓ اور ابن زبیرؓ ہیں جن کی عظمتوں کے کلمے

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۲-۲۵۱

ہم پڑھتے ہیں؟ یا جنس عظمت سے عاری ان کے ہم نام چند بونے اور بالشتیے — یا مسخرے؟ معاویہ دشمنی کا یہ اندھا پن تو دیکھئے۔!

اور ابھی بس کہاں ہے؟ ہم نے تو اس قصے میں یہ بھی پڑھا کہ یہ جن کے ناموں کی دھوم ہے کہ ان کا مرنا اور جینا حق کے لیے تھا، انسانی، روحانی اور اخلاقی رفعتوں کے لیے تھا ؏

وہ ہم سے بھی زیادہ کُشتۂ تیغِ ستم نکلے

وہ حسین ابن علیؓ جنھوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی اور اپنے اہل خاندان کی گردنیں کربلا میں کٹوا دیں۔ مگر عبیداللہ بن زیاد کے جبر کے آگے کسی قیمت پر جھکنا گوارا نہ کیا۔ وہ ابن زبیرؓ جو شیروں کی موت مرے ذلت کی زندگی قبول نہیں کی، وہ ابن عمرؓ جنھیں حق بات کہنے سے کبھی کوئی روک نہ سکا اور ہر جابر ان کے رعب حق پرستی کے آگے جھکا۔ اور وہ ابن ابی بکرؓ جو حسب روایات ولی عہدئ یزید کی مخالفت میں ہمیشہ سب سے آگے، سب سے تیز اور صاف گو رہے۔ ان شیرانِ خدا کے بارے میں اس روباہی کا یقین ہمیں دلایا جا رہا ہے کہ امیر معاویہ نے جو دھمکی دی کہ "خبردار اگر زبان کھولی" تو ان سب کے پورے وجود پر وہ لرزہ اور سکتہ طاری ہوا کہ معاویہ خانۂ خدا میں مجمع کے سامنے ان کی موجودگی میں اِن کے بارے میں "یہ غلط بیانی" کرتے رہے کہ یہ چاروں یزید کی بیعت کر چکے ہیں، اور ان میں سے کسی کے لب کو جنبش نہیں ہو سکی!

کیسی ناقابلِ تصوّر باتیں ہیں! مگر ہمارے یہاں ٹکسالی سکّوں کی طرح چل رہی ہیں۔ ابن کثیر جیسا محتاط مؤرخ بھی معاویہ دشمنی کی اندھی دباء کے اس زہر سے نہیں بچ پایا اور تفصیل سے گریز کے باوجود اتنا بہرحال لکھ دیا — جیسا کہ گزر چکا — کہ:

"معاویہ نے ان میں سے ہر ایک کو الگ بلا کے ڈرایا دھمکایا........ پھر ان کی موجودگی میں منبر پہ جا کے تقریر کی جس پر لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی

اور یہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے کیونکہ انھیں ڈرایا دھمکایا جا چکا تھا۔ "

اسے اگر معاویہؓ دشمنی کا اندھا پن نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ معاویہ کا چہرہ (معاذ اللہ) سیاہ کرنے کے جوش میں اس بات کا ہوش بھی کھو یا گیا کہ اُن کے چمکدار چہروں پر بھی سیاہی پھری جا رہی ہے جن کی خاطر معاویہ سے دشمنی ٹھیرائی ہے!

اور ذرا یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ واقعہ کس جگہ کا بیان کیا جا رہا ہے؟ ابن اثیر کے بیان کے مطابق حرم مکی (مسجد حرام) کا اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق حرم مدنی (مسجد نبوی) کا۔ کیا کسی "معاویہ" کی واقعی یہ جرأت تھی کہ ان دونوں حرموں میں سے کسی حرم کے اندر شمشیر بدست لوگوں کو اِن حضرات کے سروں پر مسلّط کرتا کہ حکم عدولی پر گردن اڑا دی جائے۔؟

سچی بات یہ ہے کہ اگر واقعہ میں یہ سب کچھ ہوا تھا اور یہ حضرات، خصوصاً حسین ابن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اس وقت جرأت دکھانے اور جان پر کھیلنے کے بجائے ڈر سہم کر بیٹھ گئے تھے تو پھر یزید کی خلافت کے قیام کی ذمّہ داری میں یہ شریک ہوئے اور تینؓ چارؓ سال اسی خاموشی میں گزار کر ۶۰ھ میں وفات معاویہ کے بعد جو کھڑے ہوئے تو بے جواز بھی کھڑے ہوئے اور بے وقت بھی۔

علیٰ ہٰذا، یہ اضطراب بیان کس بات کی چغلی کھا رہا ہے؟ ابن اثیر کہتے ہیں کہ واقعہ حرم مکی کے اندر پیش آیا۔ جبکہ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حرم مدنی میں پیش آیا؟ ایسی روایت پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

غرض کوئی ایک نہیں، سبھی کلیں اس روایت کی ٹیڑھی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ اسلام اور مشاہیر اسلام کا مضحکہ اڑانے کے لیے یہ روایت بنائی گئی ہو[۱]

[۱] اس سلسلے میں روایت کا آخری جزو حضرت ابن عباسؓ کی دھمکی والا بھی دیکھ لیجیے اور پھر حضرت معاویہؓ کا جواب بھی۔ کیا اسے مسخروں کی لڑائی کے سوا کچھ اور کہا جائے گا؟ اور یہی وہ معاویہ (بقیہ صــــ پر)

مگر ہمارے مؤرخین نے اسے ایک "تاریخی امانت" کے طور پر محفوظ رکھنا ضروری سمجھا۔ واللہ اعلم ان حضرات کے سامنے ـــ جو کہ علم دین کے بھی ماہرین میں سے ہوئے ہیں ـــ کیا چیز تھی جس نے حدیث نبویؐ "کفیٰ للمرأ کذباً ان یحدث بکل ما سمع" (آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے (بلا تحقیق کئے) نقل کر دے۔ اور آیت قرآنی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا	اے ایمان والو جب کوئی فاسق کوئی خبر تم کو پہنچائے تو ذرا اس کی تحقیق کر لیا کرو۔

کو تاریخی واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں قابلِ اطلاق نہیں سمجھا جبکہ حدیث کی روایات کے سلسلے میں ان ہدایات کا خیال ضروری مانا گیا۔؟

واقعہ کی قرینِ قیاس صورت

اوپر کی بحث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سرے سے کسی ایسے واقعے کے وجود ہی کا انکار کر دیا جائے جس میں حضرت معاویہؓ نے رفعِ اختلاف کی خاطر حجاز کا کوئی سفر کیا ہو اور ان حضرات (حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ) سے ملے ہوں جن کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے اِبا (انکار) تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارے خیال میں تو یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہو گا کہ ان ملاقاتوں میں کوئی تلخی ترشی ہی نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے ہرگز نہیں پیش آئے جو ابن اثیر کی تاریخ نے سنائے ہیں۔ واقعہ کی تمام روایات و بیانات کو دیکھتے ہوئے اور مذکورہ بالا بحث میں اٹھائے گئے نکات و سوالات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے روایات کے جو اجزاء قابلِ قبول نظر آتے

(حاشیہ صــــ کا بقیہ) ہیں جو حجاز میں جا کر حجازیوں پر شیر ہو گئے اور اپنے پایۂ تخت دمشق میں بالکل بھیگی بلی۔ فانا للہ ثم انا للہ۔

ہیں ان کی روشنی میں سارے قصے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت امیر معاویہؓ، جیسا کہ ابن کثیر کا بیان ہے، عمرے کی نیت کر کے شام سے حجاز کے لیے نکلے اور عمرے سے فراغت پاکر مدینۂ منورہ میں قیام کیا۔ یہاں انھوں نے مدینے کے ان حضرات سے بات کر کے جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے اس اُلجھن کو دور کرنا چاہا جو ان کی مخالفت کی وجہ سے اس معاملے میں پڑ رہی تھی۔ یہ لوگ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ ان حضرات سے حضرت معاویہؓ کی گفتگو کی روداد کے سلسلے میں طبری کی روایت زیادہ قرین قیاس تھی جو ص ... پر گزر چکی ہے۔ کیونکہ:

(الف) یہ چاروں افراد میں سے ہر فرد کے ساتھ علیحدہ گفتگو دکھاتی ہے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے مدبّر اور سیاست داں سے ایسے حالات میں کہ ایک مخالفت کا محاذ انھیں توڑنا ہے۔ یہی بات قرین قیاس ہے کہ وہ ہر فرد سے الگ اور تنہا گفتگو کریں۔

(ب) یہ ان چار افراد کو تین خانوں میں بانٹتی ہے۔ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کا ایک خانہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا الگ خانہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا ایک تیسرا خانہ۔ اور یہ بالکل واقعی تقسیم ہے۔ یہ چاروں حضرات اسی طرح کی تقسیم کے مستحق تھے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے صاحبِ نظر اور صاحبِ بصیرت آدمی سے یہی توقع کی جانی چاہیے کہ وہ ان حضرات کی اسی طرح زمرہ بندی کریں۔ اور ہر ایک سے اس کے زمرے کے مطابق گفتگو کریں۔ چنانچہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ سے انھوں نے بالکل ایک بات کی اور دونوں نے ایک ہی جواب بھی دیا۔ اور یہی دونوں حضرات تھے جنھوں نے حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کی خلافت اور طاقت کو چیلنج کرنے کی یکساں روش اختیار کی۔ یہ گفتگو دونوں طرف سے بالکل سیاسی انداز کی اور نہایت ناپ تول والی نظر آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی پوری زندگی کی روشنی میں یہ اطمینان کیا جا سکتا تھا

کہ وہ خود اپنے لیے خلافت کے دعویدار نہیں ہو سکتے۔ ان معاملات میں ان کی سب سے بڑی دلچسپی امت کا اتحاد ہے۔ وہ بالآخر یزید پر راضی ہو جائیں گے، چنانچہ ان کی گفتگو بھی یہی تأثر دیتی ہے اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے بات میں بھی ایک کھلاپن اور اعتماد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ (اگر ۵۶ھ میں زندہ تھے تو) خلافت کے دعویدار نہ ہونے میں تو بظاہر حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کے زمرے کے آدمی تھے مگر یزید کی مخالفت میں سب سے زیادہ متشدّد پائے جاتے تھے اور اسلامی نظام خلافت میں باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی گفتگو دیکھی جائے تو دونوں ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت نظر آتے ہیں۔ نہ سمجھنے کی کوئی امید پائی جاتی ہے، نہ سیاسی مکالمے کی کوئی گنجائش! یہ بات کتنی ہی ناخوشگوار ہو لیکن طرفین کی پوزیشن کے پیشِ نظر سمجھ میں آنے والی ہے۔ طرفین دو انتہاؤں پر تھے۔

طبری کی روایت کے یہ دو پہلو (الف اور ب) ایسے ہیں جو ہمیں آمادہ کرتے ہیں کہ اس رودادِ گفتگو کو بطور واقعہ تسلیم کر لیں[1]۔ مگر روایت کی دو یا تین کمزوریوں کی وجہ سے ہم اس پر زور نہیں دے سکتے۔

ا۔ روایت کا بنیادی راوی قطعی نامعلوم شخصیت ہے "رجل بنخلة" (نخلہ کا ایک آدمی) اور پیچھے جہاں روایت گزری وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ نخلہ بھی کوئی ایک متعین جگہ نہیں ہے۔ اس نام کی دو بستیوں کا ذکر معجم البلدان میں ہے لیکن دونوں میں سے ایک کا تعین بھی ہو جائے تب بھی مجہولیت تو برقرار ہی رہے گی۔

---

[1] جبکہ ابن اثیر کی روایت میں جو گفتگو بیان کی گئی ہے اس میں مخالفین کی طرف سے حضرت ابن زبیرؓ کی گفتگو تو قرین قیاس ہو سکتی ہے مگر حضرت معاویہؓ کی طرف سے منسوب باتیں بالکل بچکانہ اور خلاف قیاس ہیں۔ اتنے سخت مخالفین سے ایسی بچکانہ بہلاوے کی باتیں حضرت معاویہؓ کے متعلق نہیں سوچی جا سکتیں۔

۲- یہ روایت مخالفین میں پانچ آدمیوں کا شمار کرتی ہے۔ اور پانچواں نام حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دیتی ہے مگر جیسا کہ اوپر ایک جگہ بحث آچکی ہے، اس نام کا شمار قطعاً غلط ہے اور اس کی ایک دلیل — یا قرینہ — خود روایت ہی میں موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ کوئی گفتگو روایت میں نہیں دکھائی گئی۔

۳- اس میں گفتگو کی جگہ کا نام تو نہیں لیا گیا کہ مکہ تھا یا مدینہ، مگر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے گئے ہیں کہ "یا امیر المؤمنین نحن فی حرم اللہ عزّوجل" (امیر المومنین ہم اس وقت حرم الٰہی میں ہیں) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات چیت مکہ مکرمہ میں ہو رہی تھی جبکہ جن لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو اس گفتگو کے وقت تک زندہ بتایا ہے انھوں نے یہ بھی کہا ہے — جیسا کہ پیچھے اس سلسلے کی بحث میں گزر چکا ہے — کہ وہ حضرت معاویہؓ کے اس سفر ہی کے دوران میں یزید کے لیے ان کی مہم سے ناراض ہو کر مکے چلے گئے تھے اور اس سفر ہی میں مکہ سے آٹھ دس میل دور رات کو سوتے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کا اگر سنہ ۵۳ھ میں انتقال نہیں ہو چکا تھا (جو کہ عام طور پر ان کا سنہ وفات مانا گیا ہے) اور وہ سنہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے اس سفر کے وقت بقید حیات تھے تو لازماً حضرت معاویہؓ سے ان کی ملاقات کی جگہ مدینہ ہے نہ کہ مکہ۔

ان تین موٹی موٹی باتوں کی وجہ سے طبری کی روایت کے متعلق ہم یہ اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ فی الواقع یہی گفتگو ان حضرات کے درمیان پیش آئی ہوگی۔ مگر اس کے حق میں جانے والے قرائن کو دیکھتے ہوئے اور ابن اثیر وغیرہ کے بیانات کے سلسلے میں یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک طرف تو وہ قطعاً ناقابل تصور ہیں جیسا کہ تفصیلی بحث کر کے دیکھا جا چکا۔ اور دوسری طرف سرے سے کوئی سند ہی اپنے ساتھ نہیں رکھتے ہمیں رودادِ گفتگو کی حد تک طبری کا بیان بہرحال قابلِ ترجیح اور واقعیت سے قریب تر

معلوم ہوتا ہے۔

اور اس گفتگو کے بعد جس میں کوئی خاص امید افزا بات نہیں تھی ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس نتیجہ پر پہنچ جانا تھا کہ یہ لوگ فی الحال بیعت کرنے والے نہیں ہیں۔ جبکہ اور سب جگہ بیعت ہو چکی ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بیعت اور ولی عہدی توڑی جائے گی کہ رکھی جائے گی؟ اسے مضبوط اور مکمل کیا جائے گا یا ایک غیر منفصل اور غیر یقینی حالت میں رکھا جائیگا؟

حضرت معاویہؓ جیسے ایک مضبوط ارادے کے شخص سے — ایک انتہائی ذمہ دار حیثیت کے شخص سے یہ توقع غالباً نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ایسے علاقے کے تین چار افراد کے اختلاف کی بنا پر جس کا سیاسی وزن حضرت علیؓ کے مدینے کو چھوڑ کر کوفہ کو دار الخلافہ بنا لینے کے بعد سے ختم ہو گیا تھا۔ اپنی اب تک کی ساری کارروائی لپیٹ کر رکھ دیں گے اور اپنے بارے میں ایک کمزور اور کوتاہ بیں حکمران ہونے کا تأثر دیں گے، جبکہ وہ اپنی کارروائی کو ملّت کی ایک ناگزیر ضرورت کی نظر سے بھی دیکھ رہے تھے۔ جیسا کہ آگے آئیگا۔

ہمارے نزدیک قرین قیاس ہے کہ انھوں نے ان حضرات کو (ان کی ذاتی حیثیتوں کے باوجود) نظر انداز کر کے دیگر اہل مدینہ کو خطاب کرنے اور اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اور یہی وہ خطاب رہا ہوگا جس کا ذکر ابن اثیر کی روایت میں گزرا۔ جس کا خلاصہ ان کے بیان کے مطابق یہ تھا:-

وخطب معاویۃ بالمدینۃ	اور معاویہؓ نے مدینے میں خطاب کیا
فذکر یزید ومدحہٗ	جس میں یزید کا ذکر کر کے اس کی
وقال من احق منہٗ بالخلافۃ	خوبیاں بیان کیں اور باعتبار عقل
فی فضلہٖ وعقلہٖ وموضعہٖ	فضل اور حیثیت اسے خلافت کے
وما اظن قوماً بمنتھین حتیٰ	لیے موزوں تر بتاتے ہوئے کہا کہ

تصیبھم بوائق تجتث اصولھم	جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں میں
وقد انذرت ان اغنت	سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو تباہ
النذر[1]	کیے بغیر باز آنے والے نہیں ہیں۔

ابن اثیر کے اس بیان کی بھی ایسی کوئی سند نہیں ہے کہ اس کو رد کرنا مشکل ہو۔ بلکہ سرے سے سند ہے ہی نہیں۔ لیکن اس وقت کے جو حالات ہمارے سامنے آرہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نظر نہیں آتی کہ حضرت معاویہؓ ان حضرات کے اختلاف سے تنگ آرہے ہوں اور اپنی ذمہ داری کا تقاضہ سمجھ رہے ہوں کہ سختی کا انداز اختیار کر کے اس اختلاف کو دبایا جائے چنانچہ انہوں نے اپنے اس خطاب میں اس طرح کے جملے بھی کہے ہوں، جن کی ترجمانی ابن اثیر نے مذکورہ بالا الفاظ سے کی ہے۔ مگر سختی کا وہ انداز کہ ان لوگوں کو جلسے میں شریک کر کے زبان بند رکھنے کا حکم دیا جائے اور شمشیر بکف سپاہی ان کے سر پر مسلط کیے جائیں تاکہ خوف کا عالم ان پر طاری رہے۔ یہ قطعی ناقابلِ یقین بات ہے۔ نہ حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ دور میں اس جبر و ستم کی ـــــ اور خاص طور سے اِن مؤقر حضرات کے ساتھ ـــــ کوئی مثال ملتی ہے نہ اہل مدینہ سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جبر کا یہ مظاہرہ دیکھتے ہوئے خاموش رہ جاتے۔ اور نہ ہی اِن بزرگوں کے متعلق تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے بزدل اور پست ہمت تھے کہ مالک بن انسؒ، احمد بن حنبلؒ اور ابو حنیفہؒ کی مثال بھی پیش کرنے کے اہل نہ ہوتے اور مزید برآں یہ جبر بالکل بیکار تھا۔ اگر ان حضرات کو اس کے بعد پابند نہ کیا جاتا ـــــ ـــــ کہ اب یہ اپنا اختلاف کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔ مگر اس جبر کے قصّے ہی میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جیسے ہی معاویہؓ جلسہ ختم کر کے رخصت ہوئے

[1] ابن اثیر ج ۳ صـ ۲۵۱ ۔

ویسے ہی ان حضرات نے اس بات کی اظہار بھی کر دیا کہ ان کے متعلق جھوٹ بولا گیا ورنہ انھوں نے نہ بیعت کی ہے نہ وہ اس سے راضی ہیں۔

فیصلہ کن بات

واقعہ یہ ہے کہ اس جبر و دباؤ والے قصّے کی روایتیں اتنی مختلف قسم کی ہیں کہ اول تو ان کا اختلاف ہی ان کو ناقابل توجہ بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ اور وہ کافی نہ ہو تو جبر و دباؤ کے قصّے پر جو اشکالات وارد ہوتے اور سوالات اٹھتے ہیں اُن کی تاب یہ قصّہ کسی طرح نہیں لا سکتا۔ اور اس سب پر مزید آخری درجے کی اور نہایت واضح فیصلہ کن بات یہ ہے کہ یہ سب ہی مختلف روایتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جبر کا عمل کر کے بیعت حاصل کرنے کے بعد معاویہ فوراً ہی دمشق کے لیے روانہ ہو گئے اور ان مجبور حضرات کی زبانی سب اہل مدینہ کے سامنے اس جبر کا راز کھل گیا جس میں (ان حضرات پر جبر کے ساتھ) باقی اہل مدینہ سے جھوٹ اور غلط بیانی بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ:- کیا کوئی عقل باور کر سکتی ہے کہ اہل مدینہ سے جو بیعت ان کی لاعلمی میں ایسے جبر اور جھوٹ کے بل پر لی گئی اس کے خلاف ان کے اندر کوئی ردّ عمل اس وقت نہیں ہوا ہو گا جب انھیں (فوراً ہی) پتہ ہوا ہو گا کہ ان کے امیر المومنین معاویہ ان کے ساتھ کیسا فریب (معاذ اللہ) کر کے گئے ہیں؟ کیا کوئی امکان سوچا جا سکتا ہے کہ ایسی بیعت جوں کی توں قائم رہ جائے ـــــ ایک آدمی بھی نہ نکلے جو اپنی گردن سے اس دھوکے کی بیعت کو نکال کر پھینکتا ہوا بتایا جائے؟

سب روایتیں بتاتی ہیں کہ جبر کا ماحول فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ معاویہ اپنے "مسلح سواروں" کو ساتھ لے کر واپس جا چکے تھے۔ لیکن ایک روایت بھی یہ نہیں بتاتی

کہ ادنیٰ شورش اور ادنیٰ ردعمل بھی مدینے کی آبادی میں اس "جبر و فریب" کے خلاف ہوا ہو۔ تب کیا یہ جبر اور جھوٹ کے قصتے سوائے جھوٹ کے اور کچھ ہو سکتے ہیں اور ان پر کان دھرنا چاہیے؟ مگر افسوس یہ خرافاتی باتیں آج کے تحقیق پسند دور میں بھی ٹکسالی سکّوں کی طرح چل رہی ہیں۔ کیونکہ ہم ان باتوں کے دہرانے یا سننے کے پشتہا پشت سے عادی ہو گئے۔ اور جس چیز کے ہم قدیم سے عادی چلے آرہے ہوں وہ ایک تو عادت کی وجہ سے نہیں چھوٹتی۔ دوسرے اس کی قدامت جیسے ایک طرح کا تقدس اور ایک وزن اسے بخش دیتی ہے۔ اے اللہ تو ہی مدد فرما۔

باب ششم ۶

یزید کی ولیعہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟
اور
دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟

اصرار اور اس کی بنیاد

ہمارے سامنے ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر قطعی انداز میں کہا جا سکے کہ امیر معاویہ کو کیوں اصرار تھا کہ اپنے بعد کے لیے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنائیں ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:۔

وذالك من شدة محبة الوالد لولده ولما كان يتوسم فيه من النجابة الدنيوية وسيما اولاد الملوك ومعرفتهم بالحروب وترتيب الملك القيام بأبهته وكان يظن	اور یہ بات اس شدید محبت کی وجہ سے تھی جو ایک باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے۔ نیز اس کی دنیوی شرافت و اصالت کی بنا پر اور خاص کر وہ جو بادشاہوں کی اولاد میں فنون جنگ اور نظم مملکت سے واقفیت

ان لا یقوم احدٌ من ابناء الصحابۃ فی هٰذا المعنی ولهٰذا قال لعبد الله بن عمر فیما خاطبہٗ بہٖ انّی خفت ان اذر الرعیۃ من بعدی کالغنم المطیرۃ لیس لها راعٍ [1]

اور شاہانہ کروفر کی اہلیت ہوتی ہے۔ نیز معاویہ سمجھتے تھے کہ اس معنیٰ میں صحابہ کی اولاد میں کوئی دوسرا نہیں ہے جو کاروبار مملکت سنبھال سکے۔ ..... چنانچہ عبد اللہ بن عمر سے انہوں نے کہا تھا کہ میں (اگر یزید کو نہ بناؤں) تو ڈرتا ہوں کہ رعیت کو اپنے بعد ایسے چھوڑ جاؤں گا جیسے بارش میں بکریاں کہ جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

اسی ذیل میں ابن کثیر نے امیر معاویہؓ کی وہ گفتگو بھی نقل کی ہے جو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے بیٹے سعید بن عثمانؓ سے اس معاملہ میں کی تھی۔ ابن کثیر نے تو لکھا ہے کہ سعید نے یزید کے مقابلے میں اپنا استحقاق جتایا تھا اس پر امیر معاویہ نے وہ بات کہی تھی، مگر طبری اور ابن اثیر کے مطابق اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے میں جب کہ یزید کی ولی عہدی کا قصہ چھڑا ہوا تھا، سعید آئے اور خواہش کی کہ انہیں خراسان کی ولایت دیدی جائے، امیر معاویہؓ نے معذرت کی کہ وہ علاقہ تو ابن زیاد کی تحویل میں ہے۔ اس پر سعید بگڑ گئے اور کہا کہ تم جو کچھ ہوئے میرے باپ کی وجہ سے ہوئے اور آج تم مجھے اس طرح کا جواب دیکر ٹال رہے ہو، جبکہ اپنے بیٹے کے لیے تم خلافت کا بندوبست کر رہے ہو۔ حالانکہ میں کیا اپنی ذات سے اور کیا اپنے ماں باپ سے، ہر لحاظ سے یزید پر فائق ہوں، اس پر امیر معاویہؓ کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ ابن کثیر نے اپنے مذکورہ بالا بیان ہی کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے جواب میں کہا کہ :-

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶۔

بے شک تمہارے والد کے احسانات ناقابلِ انکار ہیں اور تمہارے باپ بیشک یزید کے باپ سے بڑھ کر بھی تھے، تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے اس بناء پر فائق کہ وہ قریشی تھیں اور یزید کی ماں بنی کلب کی۔ لیکن تم جو اپنے بارے میں کہتے ہو تو سنو کہ تمہارے جیسے اگر اتنے بھی ہوں کہ غوطۂ دمشق بھر جائے تب بھی یزید مجھے تم سے محبوب تر رہے گا۔[1]

گویا ابن کثیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ امیر معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبت پدری کا بھی دخل تھا مگر تنہا یہ بات نہیں تھی، بلکہ وہ یزید کو کاروبار مملکت کے لیے اہل تر بھی جانتے تھے۔ اسی سیاق میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ :-

وروینا عن معاویۃ انہٗ قال یومًا فی خطبتہٖ : اللّٰھم ان کنت تعلم انّی ولّیتہٗ لانّہٗ فیما اراہُ اھلٌ لذالك فاتمم لہٗ ما ولّیتہٗ وان کنت ولّیتہٗ لانّی احبّہٗ فلا تتمم لہٗ ما ولّیتہٗ [2]

ہم معاویہ کے سلسلے میں نقل کر چکے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اپنے خطبے میں کہا تھا کہ اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اس کو (یزید کو) اس کی اہلیت کی بناء پر ولی عہد بنایا ہے تو اس ولایت کو تو تکمیل تک پہنچا دے اور اگر میرا یہ کام اس لیے ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے، تو پھر اسے تو پورا نہ ہونے دے۔

اس دعا کے پیش نظر جو منبر پر اور مجمع میں کی گئی بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اس بدگمانی کی گنجائش نہیں رہتی کہ یزید کی ولی عہدی بربنائے محبت تھی نہ کہ بربنائے اہلیت[3] اور واقعہ یہ ہے کہ اس دعا کے ثبوت میں اگر کوئی کلام نہ ہو تو پھر بدگمانی واقعی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

[1] البدایہ والنہایہ ص ۸۷ [2] ایضًا۔ [3] حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق۔ از مولانا تقی عثمانی۔

الغرض ابن کثیر کے مذکورہ بالا بیان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کو یزید کی ولی عہدی پر اصرار اس لیے نہیں تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے بلکہ بنائے اصرار یہ تھی کہ وہ اسے کارِ خلافت کے لیے موزوں ترجان رہے تھے۔ گزشتہ باب (۵) میں بھی دو موقعوں پر ہم دیکھ آئے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے ایک تو وفود کی طلبی میں، دوسرے اہل مدینہ سے خطاب میں صاف طور پر یزید کی اہلیت اور افضلیت کا حوالہ دیا ہے جس کو بالکل نظر انداز کرنا تو بہرحال مناسب نہیں ہو گا۔

ابن خلدون کا کلام

ابن خلدون نے اپنے شہرۂ آفاق "مقدمہ" میں اس مسئلۂ ولیعہدی پر بہت شرح و بسط سے کلام کیا ہے۔ آئیے دیکھیں اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"امامت اور خلافت کے معنی اصل میں امت کی دینی و دنیاوی مصالح کی نگرانی اور حفاظت کے ہیں۔ پس امام لوگوں کی مصالح کا امین اور ان کی بہبود کا ذمہ دار ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی میں اس کا ذمہ دار ہے اور اسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود عزیز ہے تو قدرتی طور پر اس کی خواہش بھی ہونی چاہیے اور اس کا اخلاقی فریضہ بھی ہے کہ اپنی موت کے بعد کے لیے بھی ان کی بھلائی کی فکر کرے اور کسی ایسے آدمی کو قائم مقام کر جائے جو اسی کی طرح ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والا ہو اور لوگ اس سے اسی طرح مطمئن رہیں جیسے اس کے پیشرو سے مطمئن تھے (اسی کا نام ولایتِ عہد ہے) اور یہ شرعاً بالکل جائز ہے کیونکہ اس کے جواز پر اور اس طرح امامت کے انعقاد پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کی موجودگی میں عمرؓ کو اسی طرح قائم مقام بنا دیا تھا جس کو صحابہؓ نے جائز ٹھہرایا اور عمرؓ کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی۔ بعد ازاں جب

حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو آپؓ نے اپنا بار عشرۂ مبشرہ میں کے باقی ماندہ چھ اصحاب کو سونپ دیا کہ وہ مشورہ کر کے خلافت کسی ایک کے سپرد کر دیں۔ پھر ان میں سے بعض بعض پر فیصلہ چھوڑتے چلے گئے یہاں تک کہ عبد الرحمن بن عوفؓ کو اختیار کلی دیدیا گیا پس انھوں نے بہتر سے بہتر کوشش کی اور عام مسلمانوں کے خیالات کا جائزہ لیا تو عثمانؓ اور علیؓ پر سب کو متفق پایا۔ اب ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا تو انھوں نے عثمانؓ کی بیعت کو ترجیح دی کیونکہ وہ نہایت سختی کے ساتھ شیخینؓ (ابو بکرؓ و عمرؓ) کی اقتدا پسند کرتے تھے اور اس باب میں عبد الرحمنؓ کے ہم خیال تھے کہ ہر ایک موقع پر اپنی رائے کے بجائے شیخینؓ کی اقتدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ عثمانؓ کی خلافت منعقد ہو گئی۔ اور سب نے ان کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی ـــــ ان دونوں موقعوں پر صحابۂ کرامؓ کی کافی تعداد موجود تھی مگر کسی ایک نے بھی اس بات پر انکار و اعتراض نہیں کیا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ تمام صحابۂ کرام ولی عہدی کے جواز پر متفق تھے، اور اجماع جیسا کہ معلوم ہے حجتِ شرعی ہے پس امام اس معاملہ میں متہم نہیں) ہو سکتا اگرچہ وہ یہ کاروائی اپنے باپ یا بیٹے ہی کے حق میں کیوں نہ کرے۔ اس لیے کہ جب اس کی خیر اندیشی پر اس کی زندگی میں اعتماد ہے تو موت کے بعد تو بدرجۂ اولیٰ اس پر کوئی الزام نہیں آنا چاہیے (کیونکہ جو زندگی بھر اپنے آپ کو خیر خواہ ثابت کرے گا مرتے وقت وہ بدخواہی کا الزام اپنے سر لے کر جانا کبھی گوارا نہ کرے گا) بعض لوگوں کی رائے ہے کہ باپ اور بیٹے کو ولی عہد بنانے میں امام کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا ہے اور بعض صرف بیٹے کے حق میں یہ رائے رکھتے ہیں۔ مگر ہمیں ان دونوں سے اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں کسی صورت میں بھی بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور خاص کر ایسے مواقع پر کہ جہاں ضرورت

اسی کی داعی ہو مثلاً کسی مصلحت کا تحفظ یا کسی مفسدہ کا ازالہ اس میں مضمر ہو، تب تو کسی طرح کے سوءِ ظن کی کوئی وجہ ہی نہیں! جیسے کہ معاویہؓ کا اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا واقعہ ہے، تو اوّلاً تو معاویہؓ کا لوگوں کے عمومی

اتفاق کے ساتھ ایسا کرنا اس باب میں بجائے خود ایک حجت ہے،

اور پھر انھیں متہم یوں بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے پیش نظر بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ امت میں اتفاق و اتحاد قائم رہے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اہلِ حل و عقد میں اتفاق ہو۔ اور اہلِ حل و عقد صرف یزید ہی کو ولی عہد بنانے میں متفق ہو سکتے تھے کیونکہ وہ عموماً بنی امیہ میں سے تھے اور بنی امیہ اس وقت اپنے میں سے باہر کسی کی خلافت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، (اور ان کی ناراضامندی سخت افتراق و اختلاف کا باعث ہوتی۔) کیونکہ وہ قریش بلکہ پوری ملت کا سب سے بڑا بااثر اور طاقتور گروہ ان نزاکتوں کے پیش نظر معاویہؓ نے یزید کو ولی عہدی کے لیے ان حضرات پر ترجیح دی جو اس کے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے اور افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا تاکہ مسلمانوں میں جمعیت اور اتفاق باقی رہے جس کی شارع کے نزدیک بیحد اہمیت ہے [1]

مزید لکھتے ہیں کہ:۔

خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں اور معاویہؓ کے دور میں ایک بہت بڑا فرق ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ خلفائے اربعہ کے دور میں (بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شیخین کے دور میں) مسلمانوں کی طبیعتوں پر دین کی گرفت بہت سخت تھی، ان کی پسند و ناپسند اور رضا و عدم رضا کا معیار صرف دین تھا اور ان کا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ولی عہدی کا بیان ص ۱۷۶-۱۷۵ مطبوعہ مصر۔

دینی ضمیر انھیں ہر اُس بات سے باز رکھنے کے لیے کافی تھا جو دینی نقطۂ نظر سے نامناسب تھی اور ہر اُس بات پر آمادہ کر دیتا تھا جس میں دینی بھلائی ہوتی۔ پس ان حضرات میں سے جس نے اپنے بعد کے لیے خلیفہ کے طور پر کسی کو منتخب کیا تو ایسے کو منتخب کیا جو دینی نقطۂ نظر سے منتخب ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ ترجیح ان کے یہاں نہیں تھی، بس یہی کچھ دیکھ کر وہ اپنا بارِ امانت کسی کو سونپ دیتے اور پھر اس شخص کو اس کے دینی ضمیر کے سپرد کر دیتے (جو اس وقت بہت ہی حساس اور قابل اعتماد تھا) لیکن ان کے بعد حالت یہ نہ رہی، بلکہ معاویہ کا دور جب سے شروع ہوا تو دو تغیر جو تدریجی طور پر آ رہے تھے اس وقت اچھی طرح ظاہر ہو گئے تھے۔ ایک تو وہ عصبیت جو دین کے تقاضوں میں دب گئی تھی بلکہ دینی عصبیت میں تبدیل ہو گئی تھی، اس دباؤ سے نکل کر اپنی طبعی انتہا یعنی ملوکیت پر پہنچ گئی تھی اور دوسرے دینی ضمیر کی روک ٹوک کمزور پڑ گئی لہٰذا اب (امت کی شیرازہ بندی اور جماعت و اطاعت کی بقا کے لیے) شخصی حکومت اور عصبیت کا سہارا لینا ضروری ہو گیا (یعنی یہ کہ سارا اقتدار ایک ایسے فرد واحد کے ہاتھ میں دیدیا جائے جس کو وقت کی سب سے بڑی عصبی طاقت کی پشت پناہی حاصل ہو) پس اگر معاویہ کسی ایسے شخص کو اپنا جانشین بنا جاتے جس کو (بنو امیہ کی) عصبیت نہ چاہتی ہوتی (خواہ دین اسے کتنا ہی پسند کرتا) تو ان کی یہ کارروائی یقیناً الٹ دی جاتی، نظم خلافت درہم برہم ہو جاتا اور امت کا شیرازہ بکھر جاتا .... تم نہیں دیکھتے کہ مامون رشید (عباسی خلیفہ) نے زمانے کی تبدیلی کا یہ حکم نظر انداز کر کے علی بن موسیٰ بن جعفر الصادقؒ کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا تھا تو کیا نتیجہ ہوا۔ عباسی خاندان نے پورے معنی میں بغاوت کر دی نظام خلافت درہم برہم ہونے لگا اور مامون کو خراسان سے بغداد پہنچ کر معاملا کو قابو میں کرنا پڑا۔" [1]

---

[1] ایضاً ص ۱۷۶

اس کلام پر ایک تنقیدی نظر

ابن خلدون کے کلام سے معلوم ہوا کہ ان کی نظر میں معاملہ کی نوعیت یہ تھی کہ ملت کے جس دور میں یزید کے لیے ولی عہدی کا فیصلہ کیا جا رہا تھا اس دور میں ملت کے اتحاد اور اس کی اجتماعیت کے بقاء کے نقطۂ نظر سے اس کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اس دور میں دینی ضمیر اصل اجتماعی طاقت نہیں رہا تھا بلکہ قبائلی عصبیت نے پھر سے اصل اجتماعی طاقت کا مقام حاصل کر لیا تھا اور حالات کے اس نقشے میں بنی امیہ کی عصبیت سب سے بڑی عصبی طاقت تھی اور یزید بنی امیہ کا وہ فرد جس کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا کہ یہ عصبی طاقت اس کی اطاعت گزار ہو کر ادارۂ خلافت کی پشتی بان ثابت ہو گی۔

اجتماع و عمران کے معاملے میں ابن خلدون کے تجزیوں اور فیصلوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے ان کا یہ تجزیہ کسی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں بلکہ سنجیدگی کی بنا پر لائق اعتناء ہونا چاہیے کہ یزید کی ولی عہدی کے پیچھے کوئی اور چیز نہیں بلکہ صرف اس اجتماعی مصلحت کا شعور کام کر رہا تھا کہ اس کے انتخاب کے ذریعہ خلافت کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے گا۔ اور اس تجزیے کی روشنی میں ہمیں پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھنے کی گنجائش ہے کہ حضرت معاویہؓ کو جو اپنی تجویز پر اصرار تھا اس کی اصل وجہ ملت کی مصلحت ہی تھی ـــــــ لیکن یہ سمجھنا کہ یہ مصلحت اندیشی بالکل بجا بھی تھی، اور اس میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ بظاہر ابن خلدون کا نقطۂ نظر ہے، سو یہ صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم ابن خلدون کا یہ بیان بھی تسلیم کر لیں کہ یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والی صرف ایک شخصیت عبداللہ بن زبیر کی تھی[۱]۔

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون، بیان ولایت عہد ص ۱۷۶

بے شک اگر واقعہ میں ایک عبداللہ بن زبیرؓ کے علاوہ کوئی قابل ذکر شخصیت نہ تھی جس کو یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے اختلاف ہو رہا ہو تو پھر ابن خلدون کی اس رائے سے اتفاق ہی کرنا پڑے گا کہ "ایک آدھ آدمی" کے اختلاف سے بھلا کہاں بچا جا سکتا ہے اور کیونکر اسے کوئی بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے[۱]۔ مگر ابن خلدون کا یہ بیان تو بالکل ایک نادر بیان ہے۔ چار اہم شخصیتیں (عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم) تو ہر تاریخی بیان کے مطابق اس سلسلے میں مخالفت کرنے والی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ابن خلدون نے خود اپنی تاریخ میں ان چاروں کا نام دیا ہے، اور واقعہ کی اس صورت میں کہ یہ چار شخصیتیں بہت صاف اور نمایاں طور پر مخالف تھیں یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو کچھ از راہ مصلحت اندیشی کیا تھا، وہ واقعہ میں بھی پوری طرح مصلحت اندیشانہ بات تھی۔ کیونکہ ان چار آدمیوں کا اختلاف ہوتے ہوئے یہ بات ماننا مشکل ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے ذریعہ ملت کو شقاق و انتشار سے بچانے کا اطمینان کیا جا سکتا تھا۔

یہ کیسے چار آدمی تھے؟ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر تو اس مرتبے کے لوگ تھے کہ جب حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان "تحکیم" کا قصہ پیش آیا کہ دو حَکَم بیٹھ کر قرآن کی رو سے فیصلہ کریں کہ اس اختلاف کا حل کس طرح ہونا چاہیے؟ اور ان دو حَکَموں (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کا اجلاس اس فیصلے کے لیے منعقد ہوا تو اس کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اور اس بنا پر کہ بظاہر اسباب اس کے نتیجہ خیز ہونے پر امت کی فلاح و بقا کا انحصار تھا، جن اہم لوگوں کو حَکَمین نے اس موقع پر بلوانے کی اور ان سے درخواست کرنے کی ضرورت سمجھی کہ وہ ضرور اس موقع پر موجود ہوں تو ان میں یہی دو (عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) تھے جن کا نام کے ساتھ تاریخ ذکر کرتی ہے۔

---

[۱] ایضاً

فلما اجتمع الحکمان باذرح وافاهم المغیرۃ بن شعبۃ فیمن حضر من الناس فارسل الحکمان الی عبد اللہ بن عمر بن الخطاب وعبد اللہ بن الزبیر فی اقبالھم فی رجال کثیر[2]

جب حکمین اَذرُح[1] کے مقام پر جمع ہوئے تو بہت سے لوگ وہاں پہنچے جن میں مغیرہ بن شعبہ بھی تھے نیز ان حکمین نے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کے پاس بلاوا بھیجا کہ وہ اس موقعہ پر ضرور آجائیں۔

طبری کی روایت کے یہ الفاظ ذرا الجھے ہوئے ہیں۔ مصنّف عبدالرزاق[3] میں عبارت بہت صاف ہے لہٰذا ہم اسے بھی نقل کرتے ہیں:۔

فلما حکم الحکمان فاجتمعا باذرح وافاھما المغیرۃ بن شعبۃ وارسل الحکمان الی عبد اللہ بن عمرو الی عبد اللہ بن الزبیر ووافا رجال کثیر من قریش[4]...

پس جب دو آدمی حکم بنادیئے گئے اور وہ اذرح میں جمع ہوئے تو مغیرہ بن شعبہ بھی وہاں پہنچ گئے اور ان حکمین نے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو (بطورِ خاص) بلاوا بھیجا اور ان کے علاوہ قریش کے بہت سے لوگ پہنچے۔

---

[1] یہ شام کے حدود میں ایک مقام کا نام ہے۔ [2] طبری جلد ۶ ص ۳۲۔ [3] یہ امام ابوبکر عبدالرزاق الصنعانی (م ۲۱۱ھ) کا مرتب کردہ مجموعۂ احادیث و آثار ہے۔ امام عبدالرزاق امام بخاریؒ کے استاذ ہیں۔ اس کتاب کے نسخے اب تک قلمی تھے ۱۹۷۲ء میں پہلی بار یہ مطبوعہ شکل میں سامنے آئی ہے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔ گیارہ جلدوں میں تمام ہوئی ہے۔
[4] ج ۵ ص ۴۶۳۔ مزید برآں صحیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے جس سے حضرت عبداللہ بن عمر کا اس موقع پر بلایا جانا معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق کی بارہویں حدیث ہے۔ عن سالم عن ابن عمر، نیز عن عکرمۃ عن ابن عمر۔ صاحب العواصم والقواصم (۴۱۰-۸) ابوبکر ابن العربی نے یہ حدیث ان واقعات کے سلسلے میں نقل کی ہے جن کا تعلق یزید کی (باقی ص ۱۳۵ پر)

حضرت عبداللہ بن عمر کی مزید برآں ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر حکمین کے درمیان ایک متبادل شخصیت کی تلاش میں سب سے پہلا نام عبداللہ بن عمرؓ ہی کا آیا کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو چھوڑ کر ان کو خلیفۂ اسلام مان لیا جائے:۔

قال عمرو یا ابا موسیٰ أأنت علی ان نسمّی رجلًا یلی امر ھٰذہ الامّۃ فسمّ لی فان اقدر علی ان اتابعک فلک علیّ ان اتابعک والّا فلی علیک ان تتابعنی، قال ابو موسیٰ اسمّی لک عبد اللہ بن عمر وکان ابن عمر فیمن اعتزل[1]۔

عمرو بن العاص نے دوسرے حکم ابو موسیٰ اشعری سے (جبکہ وہ دونوں تنہائی میں گفتگو کو بیٹھے) کہا کہ ابو موسیٰ کیا تم پسند کرتے ہو کہ ہم امت کی سربراہی کے لیے کسی ایک شخص کو نامزد کر دیں! اگر پسند کرتے ہو تو نامزد کرو، میرے لیے اگر ممکن ہوا کہ تمہارا دیا نام قبول کر لوں تو میں قول دیتا ہوں کہ قبول کر لوں گا ورنہ پھر میں جو نام دوں تم اسی پر راضی ہو جانا۔ ابو موسیٰ اشعری نے کہا میں عبداللہ بن عمر کا نام تجویز کرتا ہوں۔۔۔ اور ابن عمر ان لوگوں میں سے تھے جو اس دور کے اختلاف سے الگ رہے تھے۔

الغرض جن افراد کا یہ مقام ہو کہ مسئلہ خلافت کی پیچیدہ گتھی سلجھائے جانے میں ان کی موجودگی بطورِ خاص ضروری سمجھی جا رہی ہو، دونوں طرف کے حکم ان کا انتظار کر رہے ہوں

(بقیہ ص ۱۳۴ کا) ولی عہدی کیلئے حضرت معاویہ کی کوششوں سے ہے لیکن یہ کوئی غلط فہمی ہے ورنہ اس حدیث کا تعلق ۳۷ھ میں حکمین کے اجلاس سے ہے جیسا کہ مصنّف عبدالرزاق کی مذکورہ بالا عبارت کے اگلے حصے سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیے مصنّف ج ۵ ص ۴۶۶ اور فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۳ (مطبوعہ سعودیہ)
[1] طبری ج ۶ ص ۳۲۔ مصنّف ج ۵ ص ۴۶۵۔ **ایک اہم فائدہ** — اس فائدہ کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ اس باب کے خاتمے پر۔

اور مزید برآں ان میں سے ایک کا یہ درجہ بھی ہو کہ اس کی ذات میں مسئلہ خلافت کی پیچیدگی کا حل دیکھا جا رہا ہو ایسے اشخاص کے اختلاف کے ساتھ کیسے قطعی اُمید کی جاسکتی تھی کہ یزید کے ماتحت نظمِ خلافت استوار رہ سکے گا؟ پھر یہ دو ہی نہیں، حضرت حسین بن علیؓ بھی اختلاف کے لیے حتمی طور پر موجود تھے۔ اور تنہا انہی کا اختلاف اس بات کا اندیشہ رکھنے کے لیے کافی تھا کہ یزید کے لیے خلافت کا کاروبار آسان نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ولی عہدی کی کارروائی کے دنوں میں بقیدِ حیات تھے تو وہ تو بالکل شمشیرِ بے نیام تھے۔ خود حضرت معاویہ کا جو وصیت نامہ یزید کے لیے نقل کیا گیا ہے وہ اگرچہ بعض وجوہ سے مشکوک ہے تاہم اس میں بھی یزید کو ان چار آدمیوں کے اختلاف سے آگاہی اور مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

بہرحال یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے حالات میں یزید کے ماتحت ادارۂ خلافت کو کم سے کم خطرہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ بات جو ابن خلدون نے کہی ہے کہ یزید کی ولیعہدی کے ذریعہ ادارۂ خلافت کو گویا خطرات سے تحفّظ عطا کر دیا گیا، یہ کچھ زیادہ ہی بات ہے۔ بیشک عبداللہ بن عمر نے اپنی رائے کے اختلاف کو عملی شکل دینا پسند نہیں کیا جیسا کہ ان کا مزاج تھا اور جیسا کہ ان کے بارے میں حضرت معاویہؓ کا اندازہ تھا اور بے شک حضرت حسینؓ کے معاملے میں بھی حضرت معاویہ کا اندازہ صحیح ہوا کہ اگرچہ کوفی انھیں حرکت میں لائے بغیر نہ چھوڑینگے مگر وہی یزید کی طرف سے ان کے لیے کافی بھی ہو جائیں گے، جیسا کہ ان کی پرانی عادت رہی ہے۔ مگر عبداللہ بن زبیر کی سرگرم اور پرزور محاذ آرائی جس سے حضرت معاویہؓ کو سچ مچ خطرہ تھا حضرت حسین کی شہادت کے اثرات سے مل کر بالآخر یزیدی خلافت کے لیے موت کا پیام بن ہی گئی۔ ایسی موت کہ پھر اس گھرانے میں سے خلافت نکل گئی۔ اس لیے اگرچہ یہ تسلیم کہ حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا ملّی مصلحت اندیشی ہی کے ماتحت تھا نہ کہ جذبۂ پدری کے ماتحت، مگر یہ تسلیم کرنا مشکل کہ ایسے اہم افراد کے اختلاف کے

ساتھ، یہ تجویز مصلحت اندیشی کا بہترین نمونہ بھی تھی۔

اہلِ اختلاف کے اختلاف کی بنیاد

یزید کی ولی عہدی سے جن حضرات نے نمایاں اختلاف کیا اور آخر تک اختلاف جاری رکھا، یعنی حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ ان کے اختلاف کے سلسلے میں یہ بات بُری طرح مشہور ہو گئی ہے کہ یزید ایک فاسق و فاجر انسان تھا اس لیے اِن حضرات کو یہ بات قبول نہیں تھی کہ اُسے اسلامی خلافت جیسا مقدس اور محترم منصب دیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو حضرات حضرت معاویہ کی زندگی میں سرگرم اختلاف فرما رہے تھے، ان کی زبان سے ہمیں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس شہرتِ عام کی تصدیق ہو سکتی ہو۔ اِن حضرات کا صرف ایک اختلاف ریکارڈ پر ہے کہ "یہ اسلام میں قیصریت و کسرویت کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے کہ باپ مرے تو بیٹا حکومت سنبھال لے، خلفائے راشدینؓ کے انتخاب کے طرز سے اس کی تائید نہیں ہوتی"۔ باب ۵ میں وہ گفتگوئیں طبری اور ابن اثیر وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہیں جن میں ان اختلاف کرنے والے حضرات نے حضرت معاویہؓ اور ان کے نمائندوں مروان بن الحکم وغیرہ سے اپنے اختلاف کی بنیاد بیان کی ہے۔ ان گفتگوؤں اور بیانات میں اس بنائے اختلاف کے ماسوا کوئی دوسری بات نہیں۔ مگر جن لوگوں کے طفیل یہ بے بنیاد اور بے اصل بات پھیلی اور بالکل ایک تاریخی واقعہ بن گئی ہے کہ حضرت حسینؓ اور ابن زبیرؓ وغیرہ کے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ یزید ایک زبردست فاسق و فاجر تھا، ان کی جراتوں کا عالم تو یہ ہے کہ جو افسانہ چاہیں تراشیں اور پروپیگنڈے کے فن سے حقیقت بنا دیں کیونکہ صحابۂ کرامؓ کو مطعون کرنا ان کا دین و ایمان ہے اور اس کام کا بہت آسان راستہ حضرت معاویہؓ کی ذات میں پایا جاتا ہے کہ یزید کو ابتدائے عمر ہی سے فاسق و فاجر بتا کر یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں ڈالا جائے کہ ایسی نالائق اولاد کو اس شخص نے جسکو

صحابیٔ رسول کہا جاتا ہے تخت خلافت پر بٹھایا اور اس وقت موجود کتنے ہی اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بھی دو چار کے سوا کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی مخالفت کرے۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی کی کتاب "شہید انسانیت" کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے۔ ایک افسوسناک غلط بیانی کی مثال وہاں دی گئی تھی اسی طرح کی ایک دوسری مثال اس باب کی یہاں ملاحظہ فرمایئے۔ باب ۵ میں ابن اثیر کے حوالے سے یہ روایت گزری ہے کہ گورنر مدینہ مروان بن الحکم نے حضرت معاویہ کی ہدایت پر اہلِ مدینہ کے سامنے یزید کی ولی عہدی کی تجویز منظوری کے لیے رکھی جس کو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے نہایت سختی سے رد کرتے ہوئے کہا کہ کیا یہ کسرویت و قیصریت کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے؟ اس تجویز میں ہرگز دین و ملت کا مفاد ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ حضرت عبدالرحمٰن کا کوئی تبصرہ نہیں تھا، یزید کے کسی فسق و فجور کا ذکر نہیں تھا۔ مگر جناب علی نقی صاحب نے اسی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عبدالرحمٰن کے منہ میں یہ الفاظ بھی ڈالے ہیں کہ:۔

"ہم ہرگز اس شرابی اور زانی کی بیعت نہ کریں گے۔" ص ۱۵۶ ۔

بھلا کون سمجھے گا کہ قبلہ اپنی طرف سے ایک جھوٹ کا اضافہ کر رہے ہیں؟ مگر واقعہ یہی ہے کہ بالکل خالص جھوٹ ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ حضرت ابن ابی بکر نے یہ الفاظ نہیں فرمائے۔ کچھ سنی سنائی باتوں پر اپنا خواہ مخواہ ایک گمان یہ تھا کہ قبلہ علی نقی صاحب ایک علمی شخصیت ہیں (اب یہ قصۂ ماضی ہے، انتقال ہو چکا ہے) اس گمان میں مزید اضافہ لندن کے "مدرسہ سید خوئی" کے لائبریرین صاحب نے کیا جن کے پاس راقم السطور کچھ کتابوں کی تلاش میں پہنچا تھا۔ لائبریرین صاحب (جن کا میں ممنون ہوں کہ چند کتابیں انہوں نے مجھے چند ہفتے کے لیے مستعار دیں، انھوں) نے مجھے کچھ زیادہ ہی اصرار سے یہ مشورہ بھی دیا کہ اس موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے میں مولانا سید علی نقی صاحب کی "شہید انسانیت" ضرور دیکھ لوں۔ یہ مشورہ چونکہ موصوف کے اس خوف و خطر کے پس منظر میں صادر ہوا تھا کہ پتہ نہیں یہ شخص (راقم)

کیا "ستم" ڈھانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے قدرتی طور پر گمان ہوا کہ "شہید انسانیت" ضرور شیعی نقطۂ نظر کے سلسلے میں کوئی علمی وزن کی کتاب ہوگی۔ اس لیے بطور خاص اس کو باہر سے منگانے کا اہتمام کیا گیا مگر اس کا جو حال نکلا وہ اس کتاب سے دی گئی، ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

بہرحال پروپیگنڈے کے فن سے کام لے کر یہ بالکل بے اصل بات ایک "واقعی حقیقت" بنا دی گئی ہے کہ حضرت حسین وغیرہ کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار اس کے فسق و فجور کی وجہ سے تھا۔ حالانکہ تاریخ کے بیانات میں اس کا دور دور کہیں بھی پتہ نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا ولی عہدی کی بیعت کے چار سال بعد (سنہ ۶۰ھ میں) جب حضرت معاویہؓ کے انتقال پر یزید نے خلافت سنبھالی اور حضرت حسینؓ نے اس کے خلاف کھڑے ہونے کا فیصلہ فرمایا، تب بھی یزید کے ذاتی فسق و فجور کی بات آپ کی زبان پر کبھی نہیں آئی، حتیٰ کہ کوفہ کا سفر اور شہادت، ساری منزلیں گزر گئیں۔ کہیں یہ بات "زانی ہے، شرابی ہے" آپ کی زبان پر نہیں آئی۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی ولی عہدی ان حضرات کے نزدیک اسلامی اصولِ خلافت کی رو سے صحیح نہیں تھی، یا مصلحت نہیں تھی۔ مزید برآں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے (جس کے واضح شواہد و قرائن موجود ہیں) کہ یہ سب حضرات وہ تھے جو دراصل حضرت معاویہ ہی کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر انھیں گوارا کرتے رہے تھے[1] بلکہ صاف کہا جائے تو ان میں سے شاید ہر ایک اپنے آپ کو اُن (حضرت معاویہؓ) کے مقابلے میں فیما بینہ و بین اللہ بہتر سمجھتا تھا۔ حد یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر جن کے ورع و تقویٰ اور کسی بھی منافست سے

---

[1] یہ بات کہ یہ حضرات حضرت معاویہ کی داد و دہش سے استفادہ کرتے اور ان کے ماتحت جہاد کرتے رہے ہمارے اس بیان کے خلاف نہیں جانی چاہیے۔ جہاد تو امام فاجر کے ماتحت بھی کیا جائے چہ جائیکہ ایک صحابی امام۔ اور داد و دہش ان کی ذاتی نہ تھی مملکت کے مال اور جہاد کے غنائم سے تھی۔

دوری کی بنا پر یہ سمجھنا مشکل ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں بہتری اور برتری کا احساس رکھتے ہوں ان کے بارے میں بھی خود ان کا اپنا بیان بخاری شریف کی اس روایت میں موجود ہے جس کا ذکر ابھی چند صفحات پہلے ایک حاشیہ میں العواصم والقواصم کے حوالے سے گزر چکا ہے اس روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر نے حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان "تحکیم" کے موقع پر حکمین کے اجلاس میں اپنے جانے کا قصہ بیان کرتے فرمایا:۔

فلما تفرق الناس خطب معاویۃ	اور جب لوگ منتشر ہو گئے[1] (یعنی تحکیم کا
قال من کان یرید ان یتکلم فی	کا قصہ ختم ہو گیا اور خاص طور سے حضرت
ھٰذا الامر فلیطلع لنا قرنہ	علیؓ کے لوگ چلے گئے) تو (ایک وقت میں)
فلنحن احق بہ منہ ومن ابیہ	معاویہؓ نے (باقی لوگوں سے) خطاب کیا
قال حبیب بن مسلمۃ فھلا اجبتہ	اور کہا کہ اگر کسی کو اس معاملۂ خلافت میں
قال عبد اللہ فحللت حبوتی	دعویٰ ہو تو اپنا دعویٰ سامنے لائے۔ ہم
وھممت ان اقول احق بھٰذا	ہر دعویدار سے اور اس کے باپ سے زیادہ
الامر منک من قاتلک وآباک	حق دار نکلیں گے۔ ابن عمرؓ کا یہ بیان سن کر حضرت
علی الاسلام فخشیت ان اقول	معاویہ کے ایک طرفدار) حبیبؓ بن مسلمہ
کلمۃً تفرق بین الجمع وتسفک	بولے "تم نے کچھ جواب نہ دیا؟ میں نے
الدم ویحمل عنی غیر ذالک	کہا کہ: ہاں میں نے اپنی نشست بدلی
فذکرت ما اعد اللہ فی	تھی اور چاہا تھا کہوں کہ: "تم سے زیادہ حقدار
الجنان[2]۔	وہ ہے جس نے تم سے اور تمہارے باپ سے اسلام کیلئے
	جنگ کی" لیکن مجھے فوراً خیال ہوا کہ یہ بات

[1] مصنف عبدالرزاق میں "تفرق الحکمان" ہے اور یہی تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی بیان مفہوم میں مصنف کے الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ [2] کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔

اس وقت کی اجتماعیت میں تفرقہ ڈال سکتی ہے[1]
خونریزی کی آگ بھڑکا سکتی ہے اور خود میرے
بارے میں غلط فہمی پھیلا سکتی ہے اور اسکے
بعد میں نے اللہ کے وہ انعام واکرام یاد کیے
جن کا ایسی باتوں سے گریز پر جنت میں دیے جانے کا وعدہ ہے[2]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو جواب دینا چاہا تھا مگر پھر روک لیا اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو بھی اسلام میں سابقیت اور اس کے لیے قربانیوں کا فخر حاصل ہے وہ منصبِ خلافت کے زیادہ حقدار ہیں جن میں خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی داخل ہوتے تھے۔ لیکن اسی واقعہ کی ایک دوسری روایت بحوالہ الطبرانی کے بارے میں حافظ ابن حجر شارحِ بخاری بتلاتے ہیں کہ اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ:۔

فما حدثتنی نفسی بالدنیا	یہ پہلا دن تھا کہ میرے دل میں دنیا طلبی کی بات
قبل یومئذ۔ (فتح الباری ج بحدیث ۴۱۸)	آئی۔ (یعنی حکومت کے حق کا دعویٰ پیدا ہوا)

ان الفاظ کی رو سے حضرت معاویہؓ کے مقابلے میں حضرت ابن عمرؓ کے دل میں آنے والی یہ بات (اس وقت) تنہا ان کی اپنی ہی ذات سے متعلق ہو جاتی ہے۔

ان کے علاوہ حضرت حسینؓ جیسے خیالات حضرت معاویہؓ کے بارے میں رکھتے تھے وہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات ہی نہیں ہے باب دوم میں ان کا ایک خط خود حضرت معاویہ ہی کے نام گزر چکا ہے جو صاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ وہ ان کی حکومت کو کیا سمجھتے تھے۔

بہرحال یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ ان حضرات نے اگرچہ حضرت معاویہ سے بیعت کر لی تھی، مگر ایک مجبوری کے درجے میں کی تھی، پوری طرح اہل سمجھ کر نہیں کی تھی۔ اور بنیادی وجہ

[1] یہ بڑا اہم جملہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحکیم کا معاملہ کسی ایسی صورت پر ختم ہوا تھا جس سے اجتماعیت کے بحال ہونے کی امید ہو گئی تھی۔ مگر افسوس کہ اس کی کوئی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ [2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔

وہی تھی جس کا اظہار حضرت ابن عمرؓ کے مذکورہ بالا بیان سے ہوتا ہے کہ وہ سابقین اور سابقین اولین کے ہوتے ہوئے متأخرین کے لیے خلافتِ اسلامی کا حق نہیں مانتے تھے اِلّا یہ کہ دوسرے مصالح کی وجہ سے ان کو مجبوراً قبول کر لیا جائے۔ پس کیا گنجائش تھی کہ وہ یزید کو اپنی اور اپنے جیسوں کی موجودگی میں خلیفۂ اسلام ماننے کے لیے تیار ہو جاتے؟ لٰہذا علاوہ ان حضرات کے اس صریح موقف کے کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی (اور گویا خلافت بطور وراثت) ایک غیر اسلامی طریقہ ہے۔ یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ وہ یزید کو اس بنا پر بھی منصبِ خلافت کیلئے ناقابلِ قبول سمجھتے تھے کہ وہ اپنے والد معاویہؓ سے بھی قطعی طور پر مفضول تر تھے۔ لیکن یہ بات قطعی جھوٹ اور افترا ہے کہ یزید کے بارے میں کسی فسق و فجور کا مسئلہ بھی اٹھایا جاتا تھا، یہ مسئلہ اگر اٹھا ہے تو حضرت حسینؓ کی شہادت کے تین سال بعد کچھ اہلِ مدینہ کی طرف سے اٹھا ہے اور اُسے رد کرنیوالے بھی اسی مدینے میں حضرت حسنؓ و حسینؓ کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ بن حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسے حضرات بھی تھے جن کے رد کا وزن نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یزید اپنے ایک خطبے کے آئینے میں

حضرت معاویہؓ کی وفات کے وقت تک یزید کے مزاج و کردار کا ایک اچھا آئینہ ہمارے خیال میں اُن کا وہ مختصر سا خطبہ ہے۔ جو اہلِ تاریخ کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد دیا تھا۔ اس خطبے کے آئینے میں ان کی شخصیت ایک سنجیدہ باوقار اور ذی علم انسان کی نظر آتی ہے نہ کہ شراب و کباب، رقص و سرود اور لہو و لعب کے ایک رسیا کی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "معاویہ کا انتقال ہوا تو یزید حوارین[1] میں تھے۔ ضحاکؓ بن قیس کوتوال شہر نے اطلاع کرائی تب وہ آئے۔ ضحاکؓ نے شہر سے باہر اُن کا استقبال کیا، یزید نے وہاں سے اندرون شہر میں جانے کے بجائے قبرستان کا رُخ کیا۔ والد کی قبر پر نمازِ جنازہ ادا کی یہاں

[1] یہ مقام شام کے علاقۂ حلب میں ہے۔

سے فارغ ہو کر شہر میں آئے حکم دیا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" کی ندا کرائی جائے۔ پھر اپنی اقامت گاہ خضرا میں داخل ہو کر غسل کیا۔ لباس بدلا۔

ثم خرج نخطب الناس اول خطبۃ	پھر باہر آئے اور بحیثیت امیر المومنین
وھو امیر المومنین فقال بعد	لوگوں سے پہلا خطاب کرتے ہوئے حمد و ثنا کے
حمد اللہ والثناء علیہ: ایھا	بعد کہا کہ لوگو، معاویہ اللہ کے بندوں میں سے
الناس! ان معاویۃ کان عبدًا	ایک بندے تھے، اللہ نے انکو اپنی نعمتوں سے
من عبید اللہ انعم اللہ علیہ	نوازا اور پھر اپنے حضور میں بلا لیا وہ اپنے بعد
ثم قبضہ الیہ وھو خیر ممن	والوں سے بہتر اور پیشرؤوں سے کمتر تھے۔
بعدہ ودون من قبلہ ولا ازکیہ	لیکن یہ میں اللہ کے سامنے انکا تزکیہ کرنے
علی اللہ عز وجل فانہ اعلم	(بھلائی کی سند دینے) کیلئے نہیں کہہ رہا، اسلیے
بہ، ان عفی عنہ فبرحمتہ وان	کہ وہ انکو زیادہ بہتر جانتا ہے اگر ان سے
عاقبہ فبذنبہ وقد ولیت الامر	درگذر فرمائے تو یہ اس کی رحمت سے ہوگا اور اگر
من بعدہ ۔۔۔۔۔۔[1]	گرفت فرمائے تو یہ انکے گناہوں کی وجہ سے
	ہوگا۔ اور آپ سب جانتے ہیں کہ ان کے بعد
	خلافت کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے الخ[1]

ہمارا خیال ہے کہ اس خطبے کی عبارت، اس کا مضمون اور اس کا لہجہ ہر چیز اس شخص (یزید) کے بارے میں اس عام خیال کی تردید کرتی ہے جو کسی واقعی بنیاد کے بغیر صرف اس لیے پھیلنے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ اس شخص کی حکومت کے زمانے میں اسی کے حکّام اور لشکریوں کے ہاتھوں ریحانۂ رسولؐ جگر گوشۂ بتول حضرت حسینؓ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔ اور اس نے اپنے حکّام سے اس پر باز پرس نہ کی، اس لیے ایسے آدمی سے متعلق جو بھی برائی کسی نے سنا دی وہ

[1] البدایہ والنہایہ ج ٨ ص ١٤٣

قابلِ یقین ہو گئی۔ مگر یہ ہے واقعی اسلامی انصاف کے خلاف بات کہ کسی کے ایک جرم کی سزا میں، اس جرم سے پہلے کی اس کی زندگی کو بھی خواہ مخواہ بدنام کیا جائے، ہاں جن لوگوں کے نزدیک جھوٹ سچ ہر طریقے سے صحابۂ کرامؓ کو بدنام کرنا ایک کارِ ثواب ہے ان کے لیے بالکل ٹھیک ہے کہ وہ پروپیگنڈے کا یہ تیر بھی جو بہت موقع کا ہے صحابۂ کرامؓ ہی کو نشانہ بنانے کی نیت سے چلائیں۔

یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ ان کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورۂ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں ریچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب وکباب میں غرق، لہو ولعب میں مست اور زنا وقمار کا رسیا انسان نہیں نظر آتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس قماش کے لوگ ایسی محتاط، دانشورانہ اور دین ودنیا کی نزاکتوں پر حاوی زبان نہیں بولا کرتے۔ رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی و پرہیز گار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جا سکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور بظاہر ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ جس نسل اور جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے بارے میں قرنِ اول کی نسل اور صحابۂ کرامؓ کے طبقے والے انقاد و پرہیز گاری کی توقع تو بہرحال مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:-

وقد کان یزید فیہ خصال محمودۃ	یزید میں بعض بڑی عمدہ خصلتیں تھیں مثلاً
من الکرم والحلم والفصاحۃ و	حلم وکرم، شعر وفصاحت، شجاعت اور
الشعر والشجاعۃ وحسن الرأی	امورِ سلطنت میں حُسنِ رائے۔ اسی کے ساتھ
فی الملک وکان فیہ ایضاً اقبالٌ علی	اس میں خواہشاتِ نفس کی طرف ایک گونہ
الشھوات وترک بعض الصلوٰۃ	میلان اور بعض اوقات ترک صلوٰۃ کا عیب
فی بعض الاوقات واماتتھا	بھی تھا اور نمازوں کے بارے میں

فی غالب الاوقات ۱	بے اہتمامی تو اس سے عموماً صادر ہوتی تھی۔

اس عبارت میں آخری دو باتیں (کبھی کبھی ترک نماز اور اکثر نمازوں کے سلسلے میں بے اہتمامی) کے سوا اور جو کمزوریاں بیان کی گئی ہیں وہ ہمارے نزدیک بالکل بعید نہیں۔ فلسفۂ تاریخ کے مطابق ان کمزوریوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اور ایسی روایتیں ملتی ہیں جو ذمہ دارانہ جرح وتنقید کے عمل سے گزرنے کے بعد اس طرح کی کمزوری کا یزید کے بارے میں گمان قابلِ قبول بنا دیتی ہیں، البتہ آخری دونوں باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ثبوت کی ضرورت ہے۔ جو ابن کثیر نے فراہم نہیں کیا۔ علاوہ ازیں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ دو اتنے سنگین عیب یزید میں پائے جاتے اور اس کی ولی عہدی سے شدید اختلاف کرنے والے حضرات ان کی طرف اشارہ نہ کرتے جبکہ یہ چھپے رہنے والے عیب نہیں تھے۔ اور نہ ہی حقیقت میں یہ ہو سکتا تھا کہ حضرت معاویہ ایسے فرزند کو جو ترکِ نماز اور اماتتِ صلوٰۃ کا عادی ہو اس امت پر خلیفہ بنا کر مسلط کریں جس کی سب سے بڑی پہچان "اقامتِ صلوٰۃ" ہے۔ بہر حال وہ بڑا متقی نہ سہی لیکن ان عیبوں کی نسبت اس کی طرف بڑی زیادتی ہے جو مشہور کر دیئے گئے ہیں اور خاص کر یہ تو بالکل ہی بے بنیاد بات ہے کہ اختلاف کرنے والے حضرات اس کے کچھ عیبوں کو بھی اختلاف کی وجہ بتاتے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں سوال بھیجا گیا کہ "حضرت معاویہؓ نے اپنے رو برو یزید پلید کو ولی عہد کیا ہے یا نہیں؟ — آپ نے جواب تحریر فرمایا:
"حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلیفہ کیا تھا، اس وقت یزید اچھی صلاحیت میں تھا۔"
(فتاویٰ رشیدیہ (ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی) ص ۲۸۰-۲۸۱)

ایک اور سوال اسی مضمون کا آیا جس پر جواب تحریر فرمایا گیا:
"... یزید اول صالح تھا بعد خلافت کے خراب ہوا۔"
(فتاویٰ ص ۲۸۱)

۱ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۳۰۔

ضمیمہ

متعلقہ ص ۱۲۵

ایک اہم فائدہ

ہم نے تو یہ روایت صرف یہ دکھانے کے لیے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان کشمکش کی صورت ختم کرنے کے لیے حکمین نے جب یہ طے کیا کہ خلافت کے لیے کسی اور آدمی کا انتخاب کرلیا جائے تو اس کے لیے سب سے پہلا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کا لیا گیا۔ لیکن یہ روایت اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ "تحکیم" کے سلسلے میں واقعہ کی شکل اب تک یہ بتائی جاتی رہی ہے کہ حکمین (حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ نہ علی کی خلافت نہ معاویہؓ کی۔ بلکہ مسلمان کسی تیسرے آدمی کا انتخاب کرلیں، چنانچہ ان دونوں نے اپنی تنہائی کی اس قرارداد کے مطابق یہ طے کیا کہ مجمع کے سامنے آکر علیؓ اور معاویہؓ کی معزولی کا اعلان کر دیا جائے اور یہ اعلان پہلے ابو موسیٰؓ نے کیا اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا کہ علی کی حد تک میں بھی ابو موسیٰ کے اعلان سے متفق ہوں لیکن معاویہ کو معزول نہیں کرتا ہوں جس پر دونوں میں بڑی تلخ کلامی ہوئی اور جھگڑا ابنارہ گیا۔ یہ روایت بھی طبری ہی میں ہے (ج ۶ ص ۴۰-۳۹) لیکن جو روایت اوپر نقل کی گئی اس کی رو سے واقعہ کی شکل بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور وہ اس لحاظ سے زیادہ قابل قبول بھی ہے کہ اوّل تو اس میں حضرت معاویہ کو "معزول کرنے" کی بے تک بات نہیں پائی جاتی۔ حضرت معاویہؓ کو خلافت کا دعویٰ نہیں تھا کہ ان کو "معزول" کیا جاتا۔ خلافت کا دعویٰ حضرت علیؓ کو تھا، حضرت معاویہؓ کو ان کی خلافت اس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار تھا۔ جب تک کہ وہ خون عثمانؓ کا قصاص نہ دلوادیں۔ اس لیے معزولی صرف حضرت علیؓ کی

ہو سکتی تھی نہ کہ حضرت معاویہؓ کی۔ دوسرے، واقعہ کی یہ شکل، جو طبری ج ۶ ص ۳۲ والی روایت کی رو سے سامنے آتی ہے، اس میں اسلامی تاریخ کے ایک ہیرو اور صحابیِ رسول ﷺ (حضرت عمرو بن العاصؓ) کے دامن پر دھوکہ دہی کا وہ دھبہ بھی نہیں آتا جو نہایت شرمناک اور کسی طرح بھی آسانی سے قابل قبول نہیں کہ ایک بات تنہائی کی مجلس میں طے کی اور مجمع عام میں اس کے خلاف کیا۔

یہاں جو واقعہ کی شکل بیان ہوئی ہے اس کی رو سے حضرت ابو موسیٰؓ نے خلافت کے لیے متبادل نام کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام پیش کیا۔ اس کے آگے کا حصہ روایت میں یوں ہے کہ قال عمرو انی اسمی لك معاوية بن ابی سفيان۔ عمرو بن العاصؓ نے (ابو موسیٰ کا پیش کردہ نام نہ قبول کرتے ہوئے) کہا کہ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ کا نام تجویز کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد جیسا کہ واقعہ کی دوسری روایت میں، جو کہ مشہور ہے، آتا ہے دونوں حضرات میں تلخ کلامی ہوئی اور حضرت ابو موسیٰ اپنی مغلوبیت کے احساس سے بوجھل ہو کر بجائے حضرت علی کے پاس جانے کے مکے واپس چلے گئے۔

اس روایت کی رو سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کی بنا پر انہیں بدعہدی اور دھوکہ بازی کا وہ الزام دیا جا سکے جو مشہور روایت کی بنا پر عائد ہوتا ہے، انہوں نے حضرت ابو موسیٰ سے کہا تھا کہ آپ نام پیش کریں اگر میرے لیے قابل قبول ہوا تو لازماً قبول کر لوں گا ورنہ میرا دیا ہوا نام آپ قبول کریں گے۔ اس قرارداد کے بعد حضرت عمرو پر ذمہ داری نہیں آتی تھی کہ وہ حضرت ابو موسیٰؓ کا دیا ہوا نام قبول ہی کر لیں۔ البتہ حضرت ابو موسیٰؓ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ روایت کے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے ان پر ذمہ داری آتی تھی کہ حضرت عمروؓ کا دیا نام قبول کر لیں گے کیونکہ انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ میں بھی تمہارے دیئے ہوئے نام کو قبول کرنے کا پابند نہیں بلکہ ان کی یہ بات سن کر کہ "ورنہ پھر میں جو نام دوں گا آپ اسے قبول کریں گے" فوراً ایک نام پیش کر دیا۔ البتہ الفاظ کے اس ظاہری مطلب کے برخلاف ہم حضرت ابو موسیٰ کی صفائی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تحکیم" کے خاص ماحول میں انہیں یہ گمان نہیں تھا کہ عمرو بن العاص "معاویہ بن ابی سفیان" کا نام بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاید یہ مناسب نہیں تھا.......... اس لئے انہوں نے باوجود قول دینے کے اپنے آپ کو اس نام کے قبول کرنے کا پابند نہیں جانا۔ مگر صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبارت کا بالکل لفظی مطلب نہ لیا جائے اور سمجھا جائے کہ حضرت

ابو موسیٰ بھی حضرت عمرو کی طرح آزاد تھے کہ حضرت عمرو کی تجویز مانیں یا نہ مانیں۔ رہا یہ خیال، جیسا کہ شاید حضرت ابو موسیٰ کا تھا کہ عمرو بن العاص نے ایک ایسی بات کی جس کی قول و قرار کے الفاظ کی رو سے اگرچہ پوری گنجائش تھی مگر معاملات کے جس خاص ماحول میں حکمین کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی تھی اس ماحول کے اعتبار سے یہ بات مناسب نہ تھی تو یہ ایک نقطۂ نظر ہو سکتا ہے، جبکہ دوسرا نقطۂ نظریہ ہو سکتا ہے اور بظاہر وہی حضرت عمرو بن العاص کا تھا کہ عملی اعتبار سے امت کے مفاد میں اس وقت اس سے بہتر کوئی دوسری شکل دستیاب نہ تھی کہ خلافت ــــ یا کہیے اسلامی اجتماعیت کی ذمہ داری ــــ معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ نظریت کی ترازو میں یہ بات سخت ناروا نظر آنے والی ہے کہ حضرت علی مرتضی کی موجودگی میں معاویہ بن ابی سفیان کو امت کی باگ ڈور سونپ دینے میں امت کی بھلائی سمجھی جائے۔ مگر جب ان حقائق پر نظر ڈالی جائے جو حضرت عمرو بن العاص کے سامنے پھیلے ہوئے تھے کہ مثلاً علی مرتضیٰؓ کو اپنی خلافت میں اتنا اختیار بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے حکم بھی اپنی مرضی کے مطابق مقرر کر سکیں۔ ابو موسیٰ اشعری کے تقرر کے حق میں وہ ایک منٹ کے لیے نہیں تھے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ ایسا نہ ہو ان کے بجائے حضرت عبداللہ بن عباس کو مقرر کیا جائے۔ کیونکہ ابو موسیٰ اس ڈپلومیٹک کام کے لیے، اول تو، موزوں نہیں تھے، دوسرے حضرت علی کے کیمپ میں ہوتے ہوئے وہ حضرت علی کی جنگ پالیسی کے قطعی خلاف تھے اور لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روکتے تھے۔ جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں بھی آچکا ہے۔ مگر بغاوت پر آمادہ ساتھیوں نے مجبور کیا کہ ابو موسیٰ ہی جائیں گے۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔

حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ کے تقرر پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو ابن اثیر کے محقق حاشیہ نگار نے کیا ہے کہ "علیؓ اگر اپنے معاملہ کی نمائندگی کو معاویہ کے ہاتھ میں دے دیتے تو انہیں اتنا نقصان شاید نہ پہونچتا جتنا ابو موسیٰ کے ہاتھ میں معاملہ جانے سے پہونچا۔" (ج ۳ ص ۱۶۹) بہرحال حضرت علیؓ اپنی ان تمام عظمتوں کے باوجود جن کے آگے سر نیاز جھکے بغیر نہیں رہ سکتا اپنے دائرۂ اختیار میں.......... روز بروز زیادہ بے اختیار اور عاجز و درماندہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھی ان کی کوئی بات چلنے نہیں دیتے تھے حتی کہ وہ تحکیم میں اپنی مرضی کا نمائندہ تک نہیں رکھ سکے تھے۔ اس کے برعکس معاویہ بن ابی سفیان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی ذات سے معاملات پر پورا قابو رکھتے ہیں بلکہ انہیں جو قوم اور اعوان و انصار ملے ہیں وہ سب اس معاملہ میں ان کی دل و جان سے مدد کرتے ہیں۔ ایسی

حالت میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ بات سوچنے کا پورا حق تھا کہ کم سے کم فلاح و بہبود جو
خون میں نہائی ہوئی اور عافیت کے لیے سرگرداں، اس امت کے لیے حاصل کی جاسکتی ہے وہ
اب صرف اس صورت میں حاصل کی جاسکتی ہے کہ معاملات کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ
کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ جو واحد آدمی ہے کہ حالات کو قابو میں کر سکے ....
جیسا کہ ثابت بھی ہوا۔ دوسرا نام حضرت عبداللہ بن عمر کا سامنے آیا تھا۔ ہر واقف کار جانتا ہے
کہ اپنی تمام بزرگیوں کے باوجود وہ اس میدان کے سرے سے آدمی ہی نہ تھے۔ اس وقت تو ایک
زبردست انتظامی اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے آدمی کی ضرورت تھی، نہ کہ صرف نیک
نفس کی۔ یعنی ٹھیک وہی بات جس کا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری دور میں کیا
(اور اوپر باب سوم میں اس کا ذکر آچکا ہے) کہ اجتماعی ذمہ داری اور نظم و نسق کے لیے ایک کم
معیاری مگر مضبوط (اور بقول حضرت عمرو بن العاصؓ ڈاڑھ دانت والے) مسلمان کو ترجیح دی
جانی چاہیے، اعلیٰ درجہ کے مگر کمزور ادیب کم موزوں مسلمان کو نہیں۔

طبری کی اس روایت میں جو تحکیم کے قصے میں عام طور پر مشہور ہے اور اس روایت
میں جو ہم نے اوپر (طبری جلد ۶ ص ۳۹) سے نقل کی ہے، سند کے وزن کے اعتبار سے بھی بڑا
فرق ہے۔ مشہور روایت کی سند ایک منقطع اور نامکمل سند ہے اور جو کُل دو راوی "ابو مخنف
اور ابو جناب الکلبی" امام ابن جریر طبری نے اپنے سے اوپر ذکر کیے ہیں۔ ان دونوں میں
ناقدین فن کو کلام ہے (ملاحظہ ہو لسان المیزان ج ۴ ص ۴۹۲ طبع بیروت اور تقریب
التہذیب ج ۲ ص ۳۴۶) اس کے برعکس جو روایت ہم نے اوپر طبری ج ۶ ص ۳۲ کے حوالے
سے نیز مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے درج کی ہے اس کی سند نہایت صاف اور مکمل ہے۔
حدثنی عبد الله بن احمد (ابن حنبل) قال حدثنی ابی قال حدثنی
سليمان بن يونس بن يزيد عن الزهری۔
ایسی روایت کے مقابلے میں ایک غلط قسم کی روایت مشہور ہو جانے کی وجہ بظاہر یہ
معلوم ہوتی ہے کہ وہ مشہور روایت "اجتماع حکمین" کے عنوان کے ماتحت آئی ہے اور غیر
مشہور روایت "رفع مصاحف" کے زیر عنوان درج ہوگئی ہے۔ یعنی بے جگہ ہے۔

واللہ اعلم۔

☆☆☆

باب ہفتم

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات۔ عہد یزید کا آغاز

حضرت حسینؓ کی ہجرت

سنہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے فارغ ہونے کے بعد حضرت معاویہؓ چار سال زندہ رہے۔ رجب سنہ ۶۰ھ میں آپؓ نے اس حال میں وفات پائی کہ جن حضرات نے سنہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار کیا تھا ان میں سے جو زندہ تھے وہ اپنے اُسی انکار پر قائم تھے۔

یزید کو معاویہؓ کی وصیّت

بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے موت کے وقت اس سلسلے میں کچھ وصیّت بھی یزید کو کی تھی اس وصیّت کی روایتیں مختلف ہیں اور وصیّت کی روایتوں کے اختلاف سے پہلے اس معاملے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ وصیّت بالمشافہ تھی۔ یعنی یزید اس وقت آپ کے پاس موجود تھے یا اس وقت وہ موجود نہ تھے بلکہ وصیّت قلمبند کرا کے ان کے لیے چھوڑی گئی۔ ابن اثیر نے صراحت کے ساتھ عدم موجودگی کی روایت کو ترجیح دی ہے[1] اور ابن کثیر کا بھی رجحان یہی معلوم

[1] الکامل ج ۳ ص ۲۶۰

ہوتا ہے، اگرچہ صریح الفاظ میں یہ بات انھوں نے نہیں کہی ہے۔ موقع کی تفصیلات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی فیصلہ اور رجحان صحیح ہے۔ وصیت کی روایتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس میں کچھ اختلاف ایسا بھی ہے جو جھوٹ اور سچ کی نوعیت کا حامل ہے۔ مثلاً سب سے پہلی روایت جو یزید کو موجود اور بالمشافہہ مخاطب بتاتی ہے اس کے مطابق حضرت معاویہؓ نے کہا کہ :-

"بیٹے میں نے تمھاری طرف سے پوری دوڑ بھاگ کرلی ہے۔ ہر چیز ہموار کردی ہے، دشمنوں کو زیر کردیا ہے، کُل عرب کی گردنیں تیرے لیے جھکادی ہیں۔ اور اب سوائے قریش کے چار آدمیوں کے مجھے کسی کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے کہ امرِ خلافت میں تجھ سے نزاع کرے۔ یہ چار ہیں حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر —— پس عبداللہ بن عمر کی بات تو یہ ہے کہ کثرتِ عبادت نے اب انھیں کسی کام کا نہیں رکھا ہے جب یہ دیکھیں گے کہ اور سب نے بیعت کرلی تو وہ بھی کرلیں گے۔ رہے حسین بن علی تو عراق والے انھیں تیرے مقابلے پر نکالے بغیر چھوڑیں گے نہیں اگر ایسا ہی ہو اور وہ خروج کر بیٹھیں اور تم ان پر قابو پاؤ تو درگذر کرنا اس لیے کہ بہت قریبی رشتہ ہے اور بڑا حق ہے۔ تیسرے ابن ابی بکر ہیں وہ بس اپنے ساتھیوں کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ ان کی حوصلہ مندیوں کا میدان تو بس عورتیں اور ایسی ہی دوسری لذتیں ہیں۔ ہاں وہ شخص جو تجھ پر شیر کی طرح گھات لگائے گا اور لومڑی والی وہ چالیں چلے گا کہ ذرا تو اُسے موقع دے تو وہ تجھ پر جست لگائے وہ عبداللہ بن زبیر ہے۔ اگر وہ ایسا کرے اور تجھے اس پر قابو مل جائے تو ٹکڑے ہی کرڈالنا۔[1]"

اس وصیت میں جھوٹ کی آمیزش کا کھلا نشان حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا تذکرہ

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۰-۱۷۹

ہے، ان کے بارے میں بہت تفصیل سے بحث گزر چکی ہے جس کی رو سے ان کی زیادہ سے زیادہ زندگی ۵۸ھ تک مانی جاسکتی ہے۔ حضرت معاویہ ۶۰ھ میں ان کی بابت کوئی وصیت کریں یہ صرف ایک جھوٹ اور جعل ہو سکتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ بعد کے زمانے کے کسی ایسے آدمی کی جعل سازی ہے جو اس تاریخی حقیقت سے بے خبر تھا، نیز اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ حضرت معاویہ کی وفات کے وقت یزید کی موجودگی ثابت کرنا مشکل ہے۔ اسکے مقابلے میں طبری ہی نے اگلی سطروں میں جو وصیت نامہ درج کیا ہے جو یزید کی غیر موجودگی میں دو اہم اشخاص کے سپرد کیا گیا تھا کہ یزید کو دیا جائے اور جو عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے بے محل اور بے حقیقت تذکرے سے بھی پاک ہے اس کا مزاج مذکورہ بالا وصیت سے بہت مختلف اور حضرت معاویہ کے دور اندیشانہ، فراخدلانہ، صلہ رحمانہ اور رعایا پرورانہ مزاج سے پوری طرح جوڑ کھاتا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ فی الواقع حضرت معاویہ ہی کا ہوگا۔ اس وصیت نامہ کی روایت کے مطابق :-

"جب معاویہ کا وقت ۶۰ھ میں پورا ہوا اور یزید اس وقت موجود نہ تھے تو انھوں نے ضحاکؓ بن قیس فہری کو جو اُن کے پولیس افسر تھے اور مسلم بن عقبہ المرّی کو بلایا اور ان سے کہا کہ میری وصیت یزید کو پہونچادینا کہ اہلِ حجاز کا خیال رکھو جو تمھاری اصل ہیں۔ ان میں سے جو کوئی تمھارے پاس آوے اس کا اکرام کرو اور جو نہیں آتا ہو اس کی خبر رکھو اور عراق والوں کا بھی خیال رہے کہ وہ اگر تم سے روز ایک عامل (حاکم) معزول کرنے کا مطالبہ کریں تو ان کا مطالبہ پورا کردو۔ اس لیے کہ ایک عامل کی معزولی اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمھارے خلاف حرکت میں آدیں۔ اور اہلِ شام کا بھی خیال رہے کہ انھیں کو تمھارے رازداروں کا مرتبہ ملنا چاہیے۔ کبھی دشمن کی طرف سے کوئی چیلنج آئے تو ان کی مدد حاصل کرو۔ اور جب مہم تمام ہوجائے تو انھیں ان کے ملک کو واپس کردو۔ اگر وہ غیر ملک میں زیادہ ٹھہرے تو وہاں کی

خصلتیں اختیار کرلیں گے اور (آخری بات یہ ہے کہ) مجھے قریش میں بس تین آدمیوں کی طرف سے (تمھاری مزاحمت کا) اندیشہ ہے حسین بن علی، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر ——— عبداللہ بن عمر کا جہاں تک سوال ہے تو دین (کی شدت) نے انھیں بالکل توڑ ڈالا ہے وہ (اپنی ذات سے تمھارے مقابل کسی شئی کے خواہاں نہ ہوں ہونگے۔ رہے حسین بن علی تو وہ ذرا ہلکے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے ان کے باپ کو قتل کیا اور ان کے بھائی کو بے سہارا چھوڑا انھیں کے ذریعہ اللہ تمھاری طرف سے بھی ان کو کافی ہو جائے گا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ ان کا بہت قریبی رشتہ ہے، بہت بڑا حق ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اہل عراق انھیں میدان میں لائے بغیر چھوڑ دیں گے۔ اگر ایسا ہوا اور تم ان پر قدرت پاؤ تو درگذر کرنا کیونکہ اگر میرے اور ان کے درمیان ایسی صورت پیش آتی تو میں درگزر ہی کرتا اور رہا، وہ جو ابن زبیر ہے وہ زبردست داؤں باز ہے۔ وہ سامنے آجائے تو کسر نہ چھوڑ دو، ہاں اگر صلح چاہے تو ضرور صلح کرلینا اور اپنی قوم (قریش) کا خون جہاں تک تم سے ہو سکے اس کو بہنے سے بچانا۔"[1]

بہر حال ان اختلاف کرنے والے تین حضرات کے بارے میں جو حضرت معاویہ کی وفات تک زندہ تھے تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہ نے یزید کو کچھ وصیت کی تھی اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔[2]

---

[1] طبری ج ۶ صہ ۱۸۰ [2] "خلافت معاویہ و یزید" کے مصنف جناب محمود احمد عباسی مرحوم نے ایسی کسی وصیت سے انکار کرتے ہوئے ایک دوسرا وصیت نامہ اس میں درج کیا ہے جس میں یزید کی خلافت سے کسی کے اختلاف یا اختلاف کرنے والے حضرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مرحوم کے اس غلو کا نتیجہ ہے جو ان کی تصنیف پر چھایا ہوا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ بعض قطعی طور پر ناقابل انکار باتوں سے بھی انکار کی کوشش کر جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں ماننا چاہتے کہ یزید کی ولیعہدی کے مسئلے میں جو حضرات اختلاف کر رہے تھے اس کی کچھ اہمیت تھی اس لئے اس اختلاف سے متعلق جو بیانات بدیہی طور سے ناقابل قبول تھے اور ہم نے بھی ان کو رد کیا، ان کی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

مخالفین سے بیعت کا مطالبہ

والد کے انتقال کی خبر پاکر یزید کے دمشق پہنچنے کا ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے، اس خطبے سے فراغت کے بعد جو بطور امیرالمومنین انہوں نے دمشق پہنچ کر دیا،[1] مورخین کے بیان کے مطابق ان کا پہلا کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینے کے گورنر ولید بن عقبہ[2] بن ابی سفیان (یعنی اپنے چچا زاد بھائی کو) حضرت معاویہؓ کی وفات کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، اور حسین بن علی سے بیعت لی جائے۔ لیکن دو مختلف قسم کی روایتیں اس بارے میں ہیں، ایک روایت کہتی ہے:-

امابعد فخذ حسینا وعبد اللہ	کہنا یہ ہے کہ حسینؓ عبداللہ بن عمر اور
بن عمر وعبد اللہ بن الزبیر	عبداللہ بن زبیر کو بیعت کیلئے پکڑو اس
بالبیعۃ اخذا اشد یدا لیست فیہ	سختی کے ساتھ کہ اس میں کوئی نرمی
رخصۃ حتی یبایعوا. والسلام[3]	نہیں حتیٰ کہ بیعت کریں۔

لیکن اس سخت ہدایت کے برخلاف ولید کا برتاؤ اس روایت میں اس قدر نرم دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے سے بیشتر کے اور جہاندیدہ گورنر مروان بن الحکم کو اس حکم کی تعمیل میں مشورے کے لیے بلاتا ہے کیونکہ اس پر اس حکم کی تعمیل بھاری ہو رہی ہے۔ اور یہ مشورہ پاتا ہے کہ

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ) تردید مرحوم نے اس انداز سے کی کہ اختلاف کی مکمل کہانی ہی اس تردید میں لپٹ جائے اور پھر جہاں حضرت معاویہ کی وصیت نے اختلاف کی کہانی میں از سر نو جان ڈالدی وہاں انہوں نے اسطرح اسکی تردید کر دی کہ وصیت کے اس مضمون کو بغیر کسی ثبوت بحث اور قرینے کے جعلی بتا کر ایک دوسرا وصیت نامہ البدایہ والنہایہ کے حوالہ سے درج کردیا اس وصیت نامہ میں مضمون کے اعتبار سے کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اس سے اختلاف کرنیکی ضرورت سمجھی جائے مگر جس وصیت کا (جو کہ طبری کی روایت ہے اور البدایہ والنہایہ میں بھی منقول ہے) عباسی صاحب انکار کرنا چاہتے ہیں اس کے انکار کی کوئی معقول وجہ جب تک نہ ہو اس وقت تک انکار کا کوئی وزن تو نہیں ہو سکتا۔

[1] یہ بھی گذشتہ باب میں نقل ہو چکا ہے۔ [2] یزید کا چچا زاد بھائی۔

[3] خلافت معاویہ و یزید طبع چہارم۔ کراچی۔ جون ۱۹۶۲ء۔ | [4] طبری ج ۶ صہ ۱۸۸۔

عبداللہ بن عمر کی بات تو کچھ ایسی نہیں ہے البتہ باقی دو کو اسی وقت بلاؤ اور بیعت نہ کریں تو گردن اڑا دو۔ اور جب تک بیعت نہ کرلیں یہ بھی مت بتاؤ کہ معاویہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ ورنہ ان کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔[1] یزید کے سخت حکم اور مروان کے سخت تر مشورے کے باوجود روایت یہ کہتی ہے کہ ولید نے کوئی سختی نہیں کی۔ حضرت ابن عمر کو تو بالکل ہی چھوڑ دیا البتہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ عبداللہ بن زبیر تو اس وقت آئے نہیں مگر حضرت حسین آگئے۔ اور حضرت معاویہ کی وفات پر تعزیتی کلمات کہہ کر مطالبۂ بیعت کے سلسلے میں یہ عذر پیش کیا کہ:۔

فان مثلی لا یعطی بیعتہ سرًّا ولا	میرا جیسا آدمی تو خفیہ بیعت نہیں کیا
اراك تجتزئ بها منی سرًّا	کرتا اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے
دون ان تظهرها علیٰ رؤس	سے سری بیعت کو تم کافی سمجھو گے۔ ضرورت ہے
الناس علانیۃً فاذا خرجت	کہ یہ علانیہ سب لوگوں کے سامنے ہو بس
الی الناس فدعوتهم الی	جب تم سب لوگوں کے واسطے بیعت کو
البیعۃ دعوتنا مع الناس	باہر نکل کر بیٹھو گے ہم کو بلوالینا۔ اس طرح
فكان امرًا واحدًا۔[2]	سب کام ساتھ ہو جائے گا۔

اور یہ عذر ولید نے بلا حیل و حجت قبول کرلیا۔

فقال لہ الولید وكان یحب	پس ولید جو عافیت پسند تھا اس نے کہا
العافیۃ، فانصرف علیٰ اسم اللہ	ٹھیک ہے اللہ کے نام پر آپ جائیے۔
حتیٰ تاتینا مع جماعۃ الناس۔[3]	اور پھر لوگوں کے ساتھ آجائیے گا۔

اسی واقعہ کی دوسری روایت

طبری کی اس روایت کے برعکس ابن کثیر نے محمد بن سعد کے حوالے سے یہ روایت درج

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۹ [2] ایضاً ص ۱۸۹ [3] ایضاً۔

کی ہے کہ:۔

"۱۵ رجب سنہ ۶۰ھ کی شب میں معاویہ کا انتقال ہوا اور لوگوں نے یزید سے بیعت کی۔ اس کے بعد یزید نے عبداللہ بن ادریس عامری کے ذریعہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان گورنر مدینہ کو مراسلہ بھیجا کہ اپنے وہاں کے لوگوں سے بیعت لیں اور ابتداءً عمائدین قریش سے کریں ان میں بھی خاص کر حسین ابن علی کو مقدم رکھیں کہ مرحوم امیرالمومنین نے مجھے ان کے بارے میں خصوصی طور پر نرمی اور صلح جوئی کی وصیت کی ہے۔ پس ولید نے آدھی رات ہی میں جبکہ یہ پیغام اسے ملا حسین اور عبداللہ بن زبیر کے پاس آدمی بھیجا اور یہ بتاتے ہوئے کہ معاویہ کی وفات ہوگئی ہے ان سے کہا کہ امیرالمومنین یزید کے لیے آپ سے بیعت بھی مطلوب ہے۔ ان حضرات نے کہا کہ اس کو صبح پر رکھیے تاکہ اور تمام اہل مدینہ کا رویہ بھی ہمارے سامنے آجائے اور یہ کہہ کر حسین اٹھ پڑے اور ابن زبیر بھی ان کے ساتھ نکلے[1] اور کہا "اس یزید کو ہم جانتے ہیں نہ اس میں عزم ہے نہ مروّت"

وقد كان الولید اغلظ للحسین	اور یہ بات یوں ہوئی کہ ولید نے حسین کے
فشتمہ الحسین واخذ بعمامتہ	ساتھ سخت کلامی کی تھی پس حسین نے بھی اسکو
فنزعها من رأسہ فقال الولید	سخت سست کہا اور اس کے سر سے عمامہ
ان هجنا بابی عبد اللہ الا شرًّا	کھینچ لیا......... اس پر مروان یا کوئی
فقال لہ مروان۔ او بعض جلسائہ	مصاحب بولا کہ گردن ماردینی چاہیے۔
اقتلہ فقال ان ذالك لدم	ولید نے کہا کہ نہیں، بنی عبد مناف کا یہ
مصنون بہ مصون فی بنی	خون بڑا قیمتی اور قطعی محفوظ
عبد مناف۔[2]	ہے۔

[1] اس روایت کے مطابق دونوں حضرات ولید کے پاس آگئے تھے۔ مگر طبری کی روایت کے مطابق صرف حضرت حسین آئے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳

اس روایت میں معاملہ برعکس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف سے نرمی کی خصوصی ہدایت ہورہی ہے مگر ولید ترش کلامی سے پیش آتا ہے لیکن آخر میں یہ بھی ہے کہ اس کی پگڑی کھینچ لیے جانے کا واقعہ بھی حضرت حسین کے ہاتھوں پیش آگیا اور جس پر مروان یا کسی ہم جلیس نے تلوار اٹھانے کو کہا بھی تو اس نے بالکل وہ جواب دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے نہ صرف یزید کی ہدایت کا لحاظ تھا بلکہ وہ خود بھی حضرت حسین کے لیے کافی احترام دل میں رکھتا تھا اور یہی بات بعد کے واقعات بھی اس کے لیے ثابت کرتے ہیں جو آگے آرہے ہیں[۱]۔

---

[۱] طبری کی جس روایت کا اوپر حوالہ دیا گیا اس میں یہ بات کہ مدینے کے اموی گورنر اور یزید کے عم زاد ولید بن عتبہ بن ابی سفیان حضرت حسین کے لیے نہایت گہرا احترام دل میں رکھتے تھے اور زیادہ کھل کر آئی ہے اس میں ہے کہ ولید نے جب حضرت حسین کے عذر پر کہا کہ درست ہے، آپ تشریف لے جائیں کل ہی کو سب لوگوں کے ساتھ زحمت دی جائے گی تب مروان نے فوراً ہی کہا کہ "کیا غضب کرتے ہو، یہ اگر اس وقت نکل گئے تو بہت بڑے کشت و خون کے بغیر بیعت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔" اسپر بھی جب ولید نے اپنا رویہ نہ بدلا اور حضرت حسین کو جانے ہی دیا تب مروان نے پھر ولید سے اپنی بات دہرائی کہ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے، اب یہ قابو میں آنے والے نہیں۔ تب بھی ولید کے الفاظ طبری نے جواب میں یہ نقل کیے ہیں:-

ویحِ غیرک یامروان انک قد	تیرا بھلا ہو مروان تو نے میرے لیے وہ بات پسند کی
اخترت لی التی فیہا ھلاک دینی	جس میں میرے دین کی بربادی ہے۔ بخدا پوری
واللہ ما احبُّ ان لی ماطلعت علیہ	دنیا جس پر سورج طلوع و غروب ہوتا ہے اسکا
الشمس وغربت عنہ من مال	ملک و مال بھی مجھے ملتا ہو تو قتل حسین کے بدلے
الدنیا وملکھا وانی قتلت حسیناً	میں مجھے یہ پسند نہ ہوگا۔ سبحان اللہ میں حسین کو
سبحان اللہ اقتل حسیناً ان قال	بس اس بات پر قتل کردوں کہ وہ بیعت نہیں
لا ابایع واللہ انی لاظن ان امرأ	کرتے ہیں۔ واللہ میرا خیال ہے کہ جس کسی شخص
یحاسب بدم حسین لخفیف المیزان	کو خون حسین کا حساب دینا پڑا وہ قیامت میں
عند اللہ یوم القیامۃ۔ (طبری ج ۶ ص ۱۹۰-۱۸۹)	ہلکی میزان والا ثابت ہوگا۔

نتیجۂ بحث

پس حضرت معاویہ کی وصیت کی روشنی میں، ابن سعد کی روایت کی روشنی میں — جو یزید کی طرف سے نرمی کی ہدایت دکھاتی ہے — اور ولید کے اس رویہ کی روشنی میں جس کی گواہی طبری کی پوری روایت دیتی ہے اور ابن سعد کی روایت کا آخری حصہ دے رہا ہے ہمارے لیے انصاف پسندی کی رو سے مناسب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ طبری کی روایت میں یزید کی طرف سے جو سختی کی ہدایت پائی جاتی ہے اور ابن سعد کی روایت میں ولید کی طرف جو سخت کلامی منسوب کی گئی ہے، ان دونوں باتوں کو الحاقی کاروائی سمجھا جائے۔ رجب سنہ ۶۰ھ سے لیکر محرم سنہ ۶۱ھ تک جبکہ حضرت حسین کا سانحۂ شہادت پیش آیا، ہمیں طبری کی اس ایک موقع کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت نہیں ملتی جو حضرت حسین کے بارے میں یزید کے سخت رویہ کی شہادت دیتی ہو، حالانکہ وہ اس دوران میں یزید کی بیعت سے بچ کر مدینے سے مکے چلے گئے، پھر مکے میں چار یا پانچ مہینے مقیم رہے جس میں کوفے جانے کی تیاری ہوتی رہی، حتیٰ کہ پھر کوفے کا سفر بھی شروع ہوگیا۔ مگر سمجھانے بجھانے کی کوشش کا ذکر تو یزید اور اس کے حکام کے بارے میں ملتا ہے، سختی یا دار و گیر کا قطعاً نہیں ملتا جبکہ اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ اسی دن سے جس دن سے وہ حضرت حسین کی طرح مدینے سے مکے کے لیے نکلے ہر طرح کی سختی کی ہدایتیں یزید کی طرف سے چلتی رہیں۔ اور اس کے حکام کی طرف سے دار و گیر کی کوششیں مسلسل ہوتی رہیں جیسا کہ آگے آئیگا۔

امام باقرؒ کی روایت

اور کسی کی نہیں خود حضرت امام باقر کی روایت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یزید کی بیعت کے سلسلے میں حضرت حسین پر کوئی سختی روا نہیں رکھی گئی۔ ابن جریر طبری

اپنی سند بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

قال حدثنا عمار الدُّهنی قال	ہم سے عمار دہنی نے بیان کیا کہ میں
قلت لابی جعفر حدّثنی	نے ابو جعفر (امام باقر) سے عرض کی کہ
بمقتل الحسین کانّی حضرتہٗ	مجھے قتل حسین کا قصہ اس طرح سنائیے
قال مات معاویۃ والولید بن	کہ جیسے میں وہاں موجود تھا، اسپر آپنے
عتبۃ بن ابی سفیان علی المدینۃ	فرمایا معاویہ کا انتقال ہوا اور ولید بن
فارسل الی الحسین بن علی	عتبہ بن ابی سفیان اس وقت حاکم مدینہ
لیأخذ بیعتہٗ فقال لہٗ اخّرنی	تھے پس انہوں نے یزید کی بیعت کیلئے
وارفق فاخّرہٗ فخرج الی	حسین کو بلوا بھیجا۔ آپ نے کہا کہ ذرا
مکّۃ ۔ [1]	مؤخر کردو اور نرمی برتو، اس نے مؤخر
	کردیا تب آپ مکّے کے لیے نکل گئے

مکّہ کو روانگی

بہرحال حضرت حسین کی فرمائش پر کہ بیعت کا معاملہ مؤخر کردیا جائے (کیونکہ ان کا جیسا آدمی تنہائی میں بیعت کرے یہ کوئی مناسب بات نہیں بلکہ جب تمامی اہل مدینہ بیعت کے لیے بلائے جائیں اسی وقت وہ بھی آجائیں گے اور سب کام ساتھ ہی ہوجائیگا) ولید نے آپ کو رخصت کی اجازت دیدی اور آپ نے جیسا کہ ابھی حضرت امام باقر کی روایت سے گزرا مکہ کی راہ لے لی۔ مکہ کو آپ کی یہ روانگی ۲۷ یا ۲۸ رجب سنہ ۶۰ھ یکشنبہ کی رات میں ہوئی۔ [2]

اوپر طبری کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ ولید نے حضرت عبداللہ بن عمر کو تو چھوڑ دیا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۴ [2] ایضاً ص ۱۹۰ ۔

تھا۔ مگر حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس بیک وقت آدمی بھیجا تھا، جس پر حضرت حسین نے تو اسی وقت ولید سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور تشریف لے گئے، مگر حضرت زبیر نے اس کو مصلحت نہ جانا اور پھر بار بار تقاضوں کو ٹالتے ہوئے رات ہی میں مکہ کے لیے نکل گئے اور پھر اگلی رات میں حضرت حسین نے بھی مکّے کی راہ لی۔ [1] طبری میں ہے کہ ابن زبیر کے نکل جانے کی وجہ سے حکومت کی تمامتر توجہ چونکہ ابن زبیر کی تلاشی پر مرکوز رہی اس لیے اس صبح کو وہ حضرت حسین کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے اور شام کو جب توجہ کی تو آپ نے فرمادیا کہ اب تو رات ہو رہی ہے صبح کو دیکھیں گے اور پھر اسی رات آپ بھی مکے کیلئے نکل گئے۔ [2]

پورے کنبے کے ساتھ

بتایا گیا ہے کہ حضرت حسین نے اپنے پورے گھرانے کو ساتھ لیا۔

خرج ببنیہ واخوتہ وبنی	آپ نکلے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں
اخیہ وجُلّ اھل بیتہ	کے ساتھ اور گویا تمام کنبہ ہی ساتھ تھا
الاّ محمد بن الحنفیۃ ۔ [3]	سوائے بھائی محمد بن حنفیہ کے ۔

جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے (غالبًا وقت کی تنگی اور اندیشوں کی زیادتی کی وجہ سے) صرف ایک بھائی جعفر بن زبیر کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ ان کے بارے میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۰، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۴، ابن اثیر نے طبری کی مذکورہ روایت کو جن الفاظ میں درج کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلانے کا واقعہ دن میں پیش آیا تھا اور ابن زبیر اسی رات کے آخری حصہ میں مکے کیلئے نکل گئے۔ ابن کثیر کی روایت جو اوپر درج کی گئی اس کی رو سے بلاوا آدھی رات کو ہوا تھا اور پھر اگلی رات کو ابن زبیر مدینے سے نکلے۔ اور چونکہ یہ مسلّم ہے کہ حضرت حسین ان سے ایک رات بعد نکلے ہیں اسلیے گویا حضرت نے بلاوے کے بعد دو دن اور ایک رات مدینے میں گزاری۔ طبری کے الفاظ صاف نہیں ہیں اسلیے ہماری نظر میں ترجیح ابن اثیر کے بیان کو ہے۔

[2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

"طریق اعظم" (شاہراہ) سے بچ کر ایک ذیلی راستے (طریق الفرع) سے سفر کیا تھا اور یہ کہ جیسے ہی پتہ چلا کہ وہ مدینے سے نکل گئے ہیں اور اندازہ کیا گیا کہ سوائے مکہ کے اور کہیں نہیں جا سکتے تو تقریباً اسی سواروں کے ایک دستے کے ذریعہ ان کی تلاش اور تعاقب کیا گیا مگر چونکہ وہ عام راستے سے نہیں بلکہ غیر معروف راستے سے گئے تھے اس لیے تعاقب ناکام رہا[1]

شاہراہ سے سفر

حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں متقابلانہ انداز سے کی گئی اس تصریح سے کہ انھوں نے مکہ اور مدینہ کی شاہراہ (طریق اعظم) سے بچ کر کسی ذیلی اور اجنبی راہ کو اپنایا' از خود بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسین رض نے بچ بچا کر جانے کے بجائے عام راستے سے سفر کیا، مزید برآں چند صفحوں کے بعد طبری کی ایک روایت میں اس کی تصریح بھی آتی ہے کہ آپ کے اہل بیت نے مشورہ دیا تھا کہ شاہراہ سے بچ کر سفر کیا جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کیا مگر آپ نے اسے منظور نہ فرمایا اور کھلی شاہراہ سے ہی سفر کیا[2]۔ آپ کے سفر کے سلسلے میں کسی تعاقب کا ذکر نہیں ہے۔ ۳ شعبان سنہ ۶۰ھ شب جمعہ میں آپ بخیر و عافیت پورے قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچ گئے[3]

خیر خواہوں اور عقیدتمندوں کے مشورے

۱۔ اوپر ذکر آیا کہ حضرت حسین کے قافلے میں آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ[4] ساتھ نہیں ہوئے' اس روایت میں وہیں ان کی زبان سے یہ بھی کہلوایا گیا ہے کہ:۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۰ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۶ [3] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۸۔ [4] حضرت حسین کے یہ بھائی حضرت فاطمہ رض سے نہیں بلکہ حضرت علی رض کی ایک دوسری اہلیہ سے تھے۔

" اے جان برادر ' آپ مجھے دنیا میں سب سے بڑھ کر عزیز ہیں' آپ سے زیادہ اور کوئی نہیں ہے جس کے لیے خیر خواہی بچا کر رکھوں۔ میری گذارش ہے کہ آپ جا تو رہے ہیں مگر ایک دم سے کسی شہر کا ارادہ مت کیجئے گا بلکہ شہروں سے دور رہتے ہوئے اپنے آدمی مختلف علاقوں میں بھیجئے اور اپنی بیعت کی دعوت دیجئے اگر لوگ قبول کر لیں تو اللہ کا شکر کریں۔ نہ قبول کریں اور آپ کے بجائے کسی دوسرے پر اتفاق کر لیں تو اس سے نہ آپ کے دین کو کوئی بٹہ لگے گا نہ عقل کو اور نہ آپ کی شان و منزلت میں کوئی فرق آئے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ مبادا آپ بڑے شہروں میں سے ہی کسی شہر کا رخ کریں اور پھر وہاں کے لوگوں میں دو گروہ ہو جائیں اور جنگ برپا ہو جس کا پہلا نشانہ خود آپ ہی بن جائیں......

کسی شہر میں اگر جانا ہے تو بس مکے کا رخ کریں' وہاں حالات اگر آپ کے لیے اچھے ہیں تو فبہا ورنہ پھر سفر اور صحرا نوردی کے لیے کمر باندھ لیجئے۔ شہروں سے دور رہتے ہوئے علاقہ در علاقہ گھومیے۔ حتیٰ کہ پتہ چلے کہ حالات کیا ہیں' لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو رائے قائم ہو گی وہی صحیح رائے ہو گی۔ صحیح اور دانشمندانہ رائے وہی ہوتی ہے جو حالات کی چھان بین کے بعد قائم کی جائے اس کے برعکس جو رائے حالات کی طرف پشت کرتے ہوئے قائم کی جائے اس سے زیادہ باعث پریشانی کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔[1]

اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایک طرف پختہ کاری اور دانشمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے دوسری طرف ایک چھوٹے بھائی کی طرف سے مشاورت اور اظہار رائے میں حسن ادب اور لطافت بیان کا بھی بہترین نمونہ۔ حضرت محمد بن حنفیہ حضرت حسن و حسین کے تیسرے بھائی ہیں شجاعت اور جسمانی طاقت میں اپنے والد ماجد کے خلف تھے۔ حضرات حسنین رض کے لیے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۰-۱۹۱ (قدرے اختصار کے ساتھ)

بیحد محبت اور خلوص رکھتے تھے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں جہاں تینوں بھائی حضرت علی کے دوش بدوش ہوتے تھے وہاں حضرت علی خود جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں پھولوں (رَیحَانتَی رَسُول اللہ صَلّی اللہ علیہ وَسلّم) کی حفاظت پر نظر رکھتے تھے وہاں محمد بن حنفیہ کو بھی ہدایت فرماتے کہ ان کو اپنے سے جدا اور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ حالانکہ وہ عمر میں چھوٹے تھے مگر جسمانی طاقت اور قد و قامت میں غیر معمولی جس کے بعض یادگار قصے ہیں، مذکورہ بالا عبارت میں حسنِ ادب اور لطافتِ بیان کے پردے میں صاف جھلک رہا ہے کہ وہ حضرت حسینؓ کے اندر خیالات کے طوفان کو سمجھ رہے ہیں اس طوفان کے اندر کوفے کی سمت سفر بھی انھیں نظر آرہی ہے، جبکہ وہ دونوں باتوں کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر اس انداز سے حقِ خلوص اور امانتِ مشورہ ادا کرتے ہیں کہ ادب اور لطافت بلائیں لیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد بن حنفیہؓ حضرت حسنؓ کے ہم رائے تھے اور پختگی کے ساتھ رائے قائم کر چکے تھے کہ ان کے والد کی شہادت حالات کے جس دھارے میں ہوئی ہے اسکو سامنے سے روکنے اور موڑنے کی کوشش میں نقصانات ہیں فائدہ کوئی نہیں[1] چنانچہ آپ نہ صرف یہ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ نہیں نکلے بلکہ اپنی اولاد میں سے بھی کسی کا نکلنا پسند نہیں کیا[2]۔ اور اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ جب شہادتِ حسینؓ کے تین سال بعد تقریباً پورا

[1] حضرت عائشہؓ صدیقہ کو حُجر بن عدی کے قتل کی خبر پہنچائی گئی (جو حضرت معاویہؓ پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے ایک بہت نمایاں اعتراض ہے) آپؓ کو اس خبر سے بہت صدمہ ہوا مگر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے جس برائی کو بھی روکنے اور بدلنے کی کوشش کی نتیجہ میں اس سے بھی بڑی برائی پیدا ہو گئی تو حُجر کے قتل پر بھی ہم کچھ کیے بغیر نہ رہتے۔ "لولا انّا لم نغیّر شیئاً الاصارت بنا الامور الی ما ھو اشد منہ لغیرنا قتل حجر"۔ (ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۲) بظاہر یہی نقطۂ نظر حضرت حسنؓ اور حضرت محمد بن حنفیہؓ کا تھا۔ حُجر بن عدی کے قتل پر حضرت عائشہؓ کا مذکورہ تاثر ذکر میں آجانے کے بعد یہ بات بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اس قتل کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کا یہ عذر قبول کر لیا تھا کہ "حجر کی زندگی سے جس فتنہ و فساد کا اندیشہ تھا اس کا سد باب انکی ایک جان کے مقابلے میں زیادہ قابل لحاظ تھا۔ (حوالہ سابق)۔

[2] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۱۶۵

مدینہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زیر اثر یزید کے خلاف بغاوت کا علم اٹھا کے کھڑا ہو گیا تب بھی حضرت محمد بن حنفیہ ہی اہل مدینہ میں سے وہ تیسرے بزرگ تھے جن کا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ آتا ہے کہ وہ صاف طور پر اس بغاوت کے مخالف رہے۔ تیسرا نام حضرت زین العابدین بن علی بن الحسینؓ کا بھی اسی فہرست میں ہے[1]

ایک اور روایت

البدایہ والنہایہ میں مزید برآں ایک روایت اور ہے کہ مکہ پہنچنے کے بعد حضرت حسینؓ نے کسی کو مدینے بھیجا تاکہ بنی عبدالمطلب میں سے جو افراد ان کے ساتھ آنے سے رہ گئے ہیں وہ بھی آجائیں۔ چنانچہ جن کو آنا تھا وہ آئے اور بعد ازاں حضرت محمد بن حنفیہ بھی (غالباً حج کے موقع پر) مکہ تشریف لے آئے۔

فادرك حسيناً بمكة فاعلمه ان	اور وہاں حسینؓ کو موجود پایا تو ان سے کہا
الخروج ليس له برأي يومه	کہ ان کی رائے میں اس وقت خروج کا خیال
هذا فابى الحسين ان يقبل	بالکل مناسب نہیں ہے (یعنی یزید کے خلاف
فحبس محمد بن حنفية ولده	اقدام کے خیال سے کوفے کا ارادہ) حسین
فلم يبعث احداً منهم حتى	نے یہ رائے قبول نہیں کی۔ اور محمد بن حنفیہ نے
وجد الحسين فى نفسه على محمد	اپنی اولاد میں سے کسی کو ان کے ساتھ
وقال ترغب بولدك عن	نہیں بھیجا جس پر حسین کو ان سے رنج
موضع أصاب فيه فقال وما	ہوا اور کہا کہ تم اپنی اولاد کو میری جان سے
حاجتى الى ان تصاب ويصابون	زیادہ عزیز رکھ رہے ہو؟ آپ نے جواب
معك وان كانت مصيبتك	دیا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں آپ

[1] دیکھئے ۶۳ھ کے واقعات کا بیان۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۱۶۔

اعظم عند نا منهم[1]

اور کیوں وہ آپ کے ساتھ مصیبت میں پڑیں۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ واقعہ ہے کہ آپ کی مصیبت میرے لیے انکی مصیبت سے بڑھ کر ہے۔

دونوں روایتوں کے لہجے کا فرق

طبری کی روایت میں جو لطافتِ اظہار اور حسنِ ادب ہم نے محسوس کیا تھا البدایہ والنہایہ کی اس روایت کا لہجہ اس سے بالکل مختلف ہے، ہوسکتا ہے اس میں کچھ دخل کسی راوی کی بے احتیاطی کا ہو لیکن فی نفسہٖ لہجے کے فرق کی وجہ سمجھنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ پہلی روایت کا لہجہ اس وقت کا ہے جب حضرت حسینؓ کا مدینہ چھوڑنا ان کی سلامتی کیلئے ضروری یا کم از کم مناسب سمجھا جا سکتا تھا اور مکہ سے بہتر کوئی جگہ اس کے لیے نہیں ہوسکتی تھی چنانچہ حضرت محمد بن حنفیہ نے مکے ہی کا مشورہ دیا تھا۔ کوفے کے ارادہ کی بات حضرت محمد بن حنفیہ کے لیے اس وقت بس ایک اندیشے اور امکان کے درجہ کی تھی۔ چنانچہ آپ نے کافی سمجھا کہ اشاروں کنایوں کے لطیف انداز میں اس کے خلاف رائے دیدی جائے۔ مگر اس دوسری روایت والی گفتگو کا وقت وہ ہے جب حضرت محمد بن حنفیہ دیکھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ ان کے بیحد مخلصانہ، محبانہ اور دور اندیشانہ مشورے کو نظر انداز کر کے نہ صرف خود کوفے کا عزم کر رہے ہیں بلکہ خاندان کے چھوٹے بڑے اور عورت مرد ہر فرد کو ساتھ لیے جا رہے ہیں — جو ان کے نزدیک موت کے منہ میں جانے والی بات تھی — تو ان کی شدت خلوص کا تقاضا اب یہ ہوا کہ لہجے کی ادبی لطافتیں ہٹا کر بے لوچ صراحت سے کام لیا جائے جو شاید کام کر جائے۔ محبت کرنے والا چھوٹا اگر بڑے کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھے گا تو ذرا بعید نہیں کہ وہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۵

اس انجام کو روکنے کے لیے بے ادب صاف گوئی کی جرأت بھی کر جائے۔ بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ بڑے ہونے کے باوجود حضرت حسنؓ و حسینؓ کے نسبی احترام میں چھوٹے بن جایا کرتے تھے مگر آگے آئیگا کہ جب دیکھا کہ حضرت حسینؓ ان کی سنتے ہی نہیں ہیں، خاص کر یہ کہ عورتوں بچوں کو چھوڑنے کے مشورہ پر بھی توجہ نہیں کرتے تو حضرت ابن عباسؓ کے خلوص اور غمخواری کا لہجہ بھی ایسا ہی تیز اور تیکھا ہو گیا تھا —— بہرحال یہ تو قطعی واقعہ ہے کہ حضرت ابن حنفیہ کی اولاد میں سے کوئی فرد حضرت حسینؓ کے قافلے میں شامل نہیں تھا۔ اور یہ خود ایک سخت موقف کی دلیل ہے۔

۲— طبری کے سلسلۂ روایات میں دوسرا نام حضرت عبداللہ بن مطیع کا آتا ہے۔ یہ ان کم عمر صحابہؓ میں ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سنِ تمیز کو نہیں پہنچ پائے تھے۔ یعنی حضرت حسینؓ سے کچھ چھوٹے تھے۔ واقعۂ کربلا (سنہ ۶۱ھ) کے بعد سنہ ۶۳ھ میں جو واقعۂ حرہ پیش آیا ہے۔ جو یزید کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت اور معرکہ آرائی کا نام ہے اس کے دو نمایاں قائدوں میں سے ایک یہی عبداللہ بن مطیع تھے، اس معرکہ کی ناکامی کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس مکے چلے گئے اور وہاں آپؓ ہی کے ساتھ حجاج سے مقابلہ میں شہید ہوئے[1]۔ ان عبداللہ بن مطیع کے بارے میں آتا ہے کہ جب حسینی قافلہ مدینے سے مکے جا رہا تھا تو یہ بھی کہیں سے (شاید مکے ہی سے) آتے ہوئے ملے اور سفر کا قصہ جاننے کے بعد بصد ادب والحاح گزارش کی کہ کوفہ کا قصد ہرگز نہ فرمائیے گا۔ ان لوگوں کے کردار کو بھول نہ جائیے گا[2]۔

۳۔ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ ایک ہی رات میں مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کیلئے نکلے تھے۔ اس روایت کے حوالے سے ابن کثیر نقل کرتے ہیں کہ اثنائے راہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی عمرہ سے واپس آتے ہوئے ملے اور ان دونوں صاحبان سے کہا کہ:

---

[1] الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۵ ص ۶۵-۶۶ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۶

اذکرکما اللہ الا رجعتما فدخلتما فی صالح ما یدخل فیہ الناس وتنظرا فان اجتمع الناس علیہ فلم تشذا وان افترقوا علیہ کان الذی تریدان [1]

میں اللہ کا واسطہ دیکر تم دونوں سے کہتا ہوں کہ لوٹ چلو تاکہ جو مناسب بات اور لوگ اختیار کریں تم بھی اس کو اختیار کرلو اور دیکھو۔ پھر اگر لوگ پوری طرح ایک بات پر متفق ہو گئے تو تم انحراف کرنیوالوں میں سے نہیں ہو گے اور اگر اختلاف ہوا تو تمھاری مراد پوری ہو جائیگی۔

نیز خاص طور سے حضرت حسین رض سے کہا کہ :-

"اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا تھا کہ دنیا اور آخرت میں سے جس ایک کو چاہیں پسند کرلیں آپ نے آخرت پسند فرمائی اور تم آپ ہی کا ٹکڑا اور آپ کی ذات کا حصہ ہو اسلیے تمھیں دنیا نہ مل سکے گی۔ پس یہ ارادۂ خروج چھوڑ دو۔" یہ کہکر آپ نے حضرت حسین کو گلے سے لگایا اور رو پڑے [2]۔"

اس سلسلۂ بیان میں آگے بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن عمر رض رنج و قلق کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ :-

"غلبنا حسین بن علی بالخروج "حسین بن علی رض نے کوفے کے قصد کے معاملے میں ہماری بات مان کر نہ دی حالانکہ انہوں نے اپنے باپ اور بھائی کا عبرت انگیز حال دیکھا تھا کہ کیسے فتنے اٹھائے گئے تھے اور بیچ میدان میں انکا ساتھ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا [3] انہیں تو عمر بھر کسی خروج کا نام نہ لینا تھا اور لوگوں کے عمومی فیصلے میں شامل ہو جانا تھا اسلیے کہ جماعت میں خیر ہے [4]۔"

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ ۱۶۲ [2] ایضاً صـ ۱۶۳ طبری میں یہ واقعہ اس وقت کا بتایا گیا ہے جب حضرت حسین رض مکے سے کوفے کیلئے روانہ ہو گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عمر رض حج پر آئے تھے انھیں بعد فراغت حج یہ اطلاع ملی تو آپ تیزی سے ان کے پیچھے روانہ ہوئے اور راہ میں مل کر یہ بات کی۔ طبری ج ۶ صـ ۱۶۳ [3] حضرت حسین رض نے کربلا کے میدان میں جب اپنے بلانے والوں ہی کو اپنے مقابل صف آرا پایا کر انھیں مخاطب کیا تو ان میں یہ دو نام بھی لیے تھے شبث ابن ربعی اور قیس ابن اشعث۔ ان میں سے شبث تو خود ان افراد میں تھا جن کی طرف حضرت ابن عمر رض کا اشارہ ہے۔ اور قیس کے والد اشعث مقتین میں ایسے سب لوگوں کے سربراہ تھے۔ حضرت حسین رض کا خطاب آگے اپنی جگہ پر آئیگا۔ [4] البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ ۱۶۳۔

باب ہشتم

مکہ میں ورود — اہل کوفہ کے خطوط — اور وفود مسلم بن عقیل کا مشن

بہرحال حضرت حسین رض شعبان سنہ ۶۰ھ کی ۴ تاریخ کو مکے پہنچ گئے اور دارِ عباس رض میں قیام کیا [1]۔ جیسا کہ ہونا ہی چاہیے تھا آپ کے پاس لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان میں اہل مکہ بھی تھے اور عمرہ وغیرہ کے لیے آنے والے بیرونی لوگ بھی۔ خبر کوفے بھی پہنچ گئی۔ اور رمضان میں وہاں سے شیعانِ علی رض کے خطوط لیکر ان کے قاصد بھیجنا شروع ہو گئے۔ ایک کے بعد ایک چار پانچ کھیپوں میں کم سے کم کوئی ڈیڑھ سو خطوط پہنچے جو نمایاں لوگوں کے تھے، یہ خطوط دعوتی تھے کہ آپ یہاں تشریف لے آئیے جانثاران چشم براہ ہیں۔ پہلے خط کا مضمون جو طبری نے دیا ہے اس طرح ہے :-

"سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور حبابِ شیعانِ کوفہ کی طرف سے حسین بن علی رض کے نام ۔ بعد از سلام! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کے دشمنِ جابر کا قصہ پاک کیا جس نے ناحق حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا [2]۔ اب اس وقت ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیے کہ شاید اللہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ صـ ۱۶۲ ۔ [2] یعنی حضرت معاویہ رض کے انتقال کی طرف اشارہ ہے۔

آپ کے ذریعہ ہم لوگوں کو حق پر جمع کر دے۔ یہاں جو اموی گورنر نعمان بن بشیر ہیں ہم ان کے پیچھے جمعہ اور عید تک نہیں پڑھتے اور اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ادھر کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم انشاء اللہ ان کا بستر باندھ کر انھیں شام بھیج دیں گے۔[1]

اس طرح کے خطوط کی جو بارش ہوئی اور طبری کے بیان کے مطابق ہر دو دن کے[2] فصل سے ایک کھیپ روانہ ہوئی[3] تو حضرت محمد بن حنفیہ کا ڈھکا ہوا اور عبد اللہ بن مطیع کا کھلا ہوا نہایت اخلاص اور الحاح کے ساتھ مشورہ کہ کوفے کا رُخ ہرگز نہ کیجئے گا، بے اثر ہو گیا اور ان حضرات نے جس قدر زور دیکر یہ بات کہی تھی اس سے لگتا ہے کہ ان کو خطرہ بہت تھا کہ کوفے والے بلائیں گے اور حسینؓ اپنے آپ کو روک نہ پائیں گے۔ بہرحال ان بلاوؤں کا اثر ہوا اور تاریخ کے بیان کے مطابق آپ نے طے کیا کہ اپنا ایک آدمی کوفہ بھیج کر اطمینان کریں کہ کیا واقعی یہ لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ قابلِ اعتماد ہے؟

مسلم بن عقیلؓ کوفے کو

اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؓ کا نام طے کیا اور کوفے کے جو لوگ خطوط لیکر آئے ہوئے تھے انکو اس مضمون کا جواب لکھ کر روانہ کر دیا کہ "میں اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں کہ یہ میرے قائم مقام بن کر حالات کو دیکھیں اور مجھے اطلاع دیں۔ پس اگر انہوں نے اطمینان ظاہر کیا اور لکھا کہ آپ لوگ جو کچھ مجھے لکھ رہے ہیں اس پر آپ کے تمام معززین اور اہلِ رسوخ و اہلِ رائے کا اتفاق ہے تو میں بلا تاخیر چلا آؤں گا۔ اس لیے کہ قسم میری جان کی امام تو وہی ہے جو کتاب اللہ پر عامل، انصاف کا خوگر، حق کا تابع اور اپنے آپ کو ذاتِ حق سے وابستہ رکھنے والا ہو۔

---

[1] ج ۶ ص ۱۹۰

والسلام[1]!" اور فوراً ہی پھر مسلم بن عقیل کو دو کوفیوں کے ساتھ ان کے مشن پر روانہ کر دیا۔

والیٔ کوفہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کا انتباہ

مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو ان کی آمد زیادہ دن مخفی نہیں رہ سکی، نہ ان کی سرگرمیاں مخفی رہیں جو وہ حضرت حسینؓ کے واسطے لوگوں سے بیعتِ امامت لینے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ جو انصار مدینہ میں سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے، وہ حضرت معاویہؓ کے وقت سے کوفے کے گورنر سے چلے آرہے تھے۔ ان کو اطلاع ملی تو مسجد میں لوگوں کو جمع کرایا اور تقریر کی کہ:-

"اے لوگو فتنہ آرائی اور تفرقہ انگیزی میں مت پڑو۔ اس میں ناحق جانیں جاتی ہیں خون بہتا ہے اور مال چھنتے ہیں۔ میری پالیسی اس معاملہ میں سن لو کہ جبتک مجھ پر حملہ نہیں ہوگا میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا، نہ تمھیں برا بھلا کہوں گا، نہ شبہے اور تہمت میں پکڑوں گا۔ لیکن تم نے اگر اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا، بیعت توڑی اور امام (یزید) کے خلاف کھڑے ہوئے تو قسم ہے خدائے پاک کی میں تم پر تلوار چلاؤں گا جب تک بھی میرا ہاتھ اس کے قبضہ پر رہے گا۔ چاہے تم میں سے کوئی بھی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو۔ ویسے مجھے امید یہ ہے کہ تم میں وہ لوگ زیادہ ہونگے جو حق کا حق پہچانتے ہیں، بہ نسبت ان لوگوں کے جو باطل کیلئے حق کا نام لیتے ہیں[2]۔"

امیر یزید کو شکایت

عبد اللہ بن مسلم حضرمی نامی ایک صاحب جو بنی اُمیہ کے حلیفوں میں سے تھے انھوں نے گورنر کی یہ تقریر سن کر کہا یہ تو مناسب پالیسی نہیں، نہایت کمزور پالیسی ہے جو فتنہ انگیزوں کو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۸ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۹

تیز کر دے گی۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ اس کے باوجود بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ بنی امیہ کے خیر خواہ نے یہ صورت حال امیر یزید کو لکھ کر بھیجی اور لکھا کہ اگر تمہیں کوفہ پر حکومت رکھنے کی ضرورت ہے تو فوراً کسی مضبوط آدمی کو یہاں بھیجو، نعمان کمزور آدمی ہیں یا دانستہ کمزوری دکھا رہے ہیں۔ اور بھی چند لوگوں نے اسی مضمون کے خط یزید کو لکھے[1]

عبید اللہ بن زیاد کا تقرر

یزید نے اِن اطلاعات کے بعد اپنے اہلِ مشورہ کی رائے کے مطابق حضرت نعمان بن بشیرؓ کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کا تقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ بصرہ کا حاکم تھا۔ اب بصرے کے ساتھ کوفے کی حکومت بھی اس کے سپرد کی گئی اور ہدایت دی گئی کہ فوراً پہنچ کر مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا بندوبست کرے۔ وہ ایک جوان اور اپنے باپ کی طرح سخت گیر منتظم تھا۔ بصرے والوں کو دھمکا کر کہ کوئی شخص کسی مخالفانہ حرکت کا مرتکب نہ ہو، وہ سیدھا کوفے پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ:-

کوفے میں تقریر

"امیر المومنین نے تمہارے شہر اور اس کے متعلقات کا انتظام میرے سپرد کیا ہے۔ مجھے حکم دیا ہے کہ مظلوم کے ساتھ انصاف کروں، محروم کو اس کا حق دوں، اطاعت گزاروں کے ساتھ بھلائی کروں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ سختی۔ اور سن لو کہ میں ٹھیک ٹھیک ان کے حکم کے مطابق کروں گا۔ نیکو کاروں کیلئے میں مہربان باپ کی طرح رہوں گا اور فرمانبرداروں کیلئے ہمدرد بھائی۔ میری تلوار اور میرا کوڑا صرف اسکے لیے ہے جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے گا۔ پس ہر آدمی اپنا بُرا بھلا سمجھ لے"[2]

[1] حوالہ سابق [2] الکامل فی التاریخ (از ابن اثیر) ج ۴ ص ۲۳ مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۷۹ء۔

عملی کاروائی

اس تقریر کے بعد اس نے تمام لوگوں اور بالخصوص قبائل کے ذمہ داروں (چودھریوں) کو حکم دیا کہ کسی کے یہاں کوئی پردیسی ٹھہرا ہوا ہو، امیر المومنین کا اشتہاری مجرم ہو یا کوئی خارجی اور مخالفِ حکومت خیالات پھیلانے والا، تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں کے ناموں سے تحریری طور پر مطلع کیا جائے، جو کوئی ایسا کر دے گا وہ ان لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہوگا۔ جو ایسا نہ کرے وہ اس بات کی تحریری ذمہ داری دے کہ اُس کے حلقے اور اس کی جماعت سے حکومت کے خلاف کسی طرح کی کوئی شورش نہیں ہوگی جو کوئی ایسا نہیں کرے گا اس سے ہم بری الذمہ ہوں گے، اس کا مال اور اس کی جان حلال ہوگی۔ جس عریف (چودھری) کے حلقے میں امیر المومنین کی حکومت کا کوئی ایسا قانونی مجرم پایا گیا جس کی رپورٹ نہیں کی تھی تو اُس عریف کے دروازے پر ہی اُسے پھانسی دیجائیگی، اس کے حلقے کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا، اور عریف کو شہر بدری کی سزا دیجائے گی[1]

مسلم کی تبدیلیٔ مکان

مسلم کوفہ پہنچے تھے تو مختار بن ابی عُبید کے گھر پر اترے تھے[2] جب ابن زیاد کوفے پہنچا اور اس کی یہ سخت آگاہی حضرت مسلم کے کان تک پہنچی تو آپ نے جائے قیام تبدیل کر دی اور ہانی بن عُروہ نامی شخص کے مکان میں آ گئے[3]

ایک معمہ

ہماری جو تاریخ کی کتابیں ہیں وہ صرف روایات اور بیانات کا مجموعہ ہیں۔ ان

[1] تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۰۱ [2] ایضاً ص ۱۹۹ [3] ایضاً ص ۲۰۳

روایات میں بہت سے پہلو ایسے آجاتے ہیں جن پر کچھ گفتگو یا توضیح و توجیہہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ چیز ان کتابوں میں کہیں مشکل ہی سے اور وہ بھی بس نام کو ملتی ہے۔ مختار بن ابی عبید ہماری تاریخ کے اُس دور کا جس میں واقعۂ کربلا پیش آیا بڑا معروف نام اور ایک پُراسرار کردار ہے۔ یہ شخص واقعۂ کربلا کے پانچ سال بعد ایک بجلی کے کڑکے کی طرح مسلم خانہ جنگی کے میدان میں آیا اور بس سال بھر میں ایک قیامت مچا کے گذر گیا۔ یہ خونِ حسین کے انتقام کے نام پر اٹھا تھا اور واقعی کُشتوں کے پُشتے لگا دیئے۔ ابن زیاد اور عمرو بن سعد وغیرہ تمام قاتلانِ حسین اسی کے حصّے میں آئے۔ اور اس کا تعلق بھی کوفے ہی سے تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر خیال ہوتا ہے کہ یہ مختار بن ابی عُبید جس کے گھر پر مسلم بن عقیل ٹھہرے تھے یہ وہی مختار تو نہیں ہے؟۔ لیکن پھر خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی مختار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو حضراتِ حسنینؓ کے ساتھ بڑے ہی خراب کردار کا ثبوت دیا تھا جبکہ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ جانشین ہوئے تھے، حضرت علیؓ کی شہادت ایسے وقت پیش آئی جبکہ آپ نے حضرت امیر معاویہ سے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی ہوئی تھی۔ اُس چالیس ہزار کی فوج کو لے کر جو حضرت علیؓ نے تیاری کی تھی حضرت حسنؓ روانہ ہوئے تو مدائن کے قریب پڑاؤ تھا کہ لشکر کے کچھ مفسد ایک افواہ کا بہانہ پاکر حضرت حسنؓ کے خیمہ ہی پر ٹوٹ پڑے، لوٹ مار مچائی، زخمی کر دیا۔ مدائن میں حضرت علیؓ کی طرف سے حاکم اس مختار کے چچا سعد بن مسعود ثقفی تھے۔ یہ واقعہ پیش آنے کے بعد حضرت حسنؓ مدائن میں اُن کی قیام گاہ پر آگئے تو جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے مختار نے خالص "کوفی" روایت کے مطابق، چچا سے کہا کہ "چچا اگر دولت اور عزّت کی ضرورت ہو تو انھیں باندھو اور معاویہ کے پاس پہنچا دو"۔ چچا شریف تھے، انھوں نے کہا کہ تجھ پر خدا کی لعنت۔ ابن بنتِ رسول اللہ کے ساتھ میں یہ حرکت کروں گا۔"[1]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۹۲ اس شخص کا کیرکٹر واقعتہً یہی تھا یعنی دولت و عزت کیلئے سب کچھ روا ہے۔ چنانچہ اولاً اس نے عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ اقتدار میں حصہ بٹانے کی کوشش کی جبکہ وہ اموی حکومت سے برسرِ آزما تھے (باقی آئندہ صفحہ پر)

ایک اور معمّہ

اس قصّے کے علاوہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں نے حضرت حسینؓ کو خطوط بھیجے تھے جن کے نتیجے میں مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا گیا تھا، ان کے ناموں میں کوئی نام مختار بن ابی عبید نہیں ہے۔ قاعدے سے تو مسلم کا قیام انہی لوگوں میں سے کسی کے گھر ہونا چاہیے تھا![1] اور پھر اسی طرح ہانی بن عروہ کا نام بھی ان ناموں میں نہیں ہے۔ تو مختار کے گھر سے منتقل ہوئے تب بھی اسی جیسے ایک کے گھر پہنچے! یہ آخر قصّہ کیا ہے؟ ان آٹھ دس آدمیوں میں سے کسی کے گھر میں کیوں جگہ نہیں تھی جنھوں نے دعوتی خطوط لکھے تھے؟

مزید برآں

اور پھر بات اتنی ہی نہیں، ہانی بن عروہ کے گھر بالکل تن تنہا اور ایک قطعی ناخواندہ مہمان کی طرح پہنچتے ہیں۔ ابن جریر (طبری) ہوں یا ابن اثیر یا ابن خلدون سبھی لکھتے ہیں کہ:۔

"مسلم کے کان تک جب ابن زیاد کی تقریر پہنچی تو وہ مختار کے مکان سے نکل کر ہانی ابن عروہ کے مکان تک پہنچے، ہانی نکل کر آئے اور مسلم کو دروازے پر دیکھا تو بڑا بُرا منھ بنایا۔ مسلم نے کہا بھائی میرے، تمھارے پاس پناہ کے لیے آیا ہوں، تمھارا مہمان ہونا چاہتا ہوں۔ ہانی نے جواب دیا "تم نے تو مجھے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے، اگر میرے معاملے کے اندر نہ آ گئے ہوتے تو میں کہتا کہ مجھے معاف کرو۔ لیکن اب تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آجاؤ"۔[2]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وہاں دال نہیں گلی تو حضرت حسینؓ کے نام پر خود ایک محاذ کھول دیا اور وہ وہ سوانگ بھرے اور جھوٹ بولے کہ اللہ کی پناہ۔ تفصیل کے لیے تاریخ دیکھیے۔

[1] ایک دوسری روایت یہ بھی ملی ہے کہ ان کا قیام مسلم بن عوسجہ کے یہاں ہوا تھا۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۴ مگر روایت مختار ہی ہے کہ قیام مختار کے یہاں فرمایا۔ "شہید انسانیت" کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے بھی اسی روایت کو اختیار فرمایا ہے۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۰۳ ابن اثیر ج ۴ ص ۲۶۹ دار الفکر بیروت۔

کیا ہونا چاہیئے تھا؟

مسلم بن عقیلؓ جیسا معزز مہمان جو حضرت حسینؓ کا قاصد ہی نہیں اُن کا بھائی بھی ہے جس کے آتے ہی شیعان علیؓ و حسینؓ کی سرگرم آمد و رفت اس کے پاس شروع ہو گئی تھی۔ اٹھارہ ہزار آدمی اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے وہ ابن زیاد کی دھمکی سن کر احتیاطاً اپنی جائے قیام بدلنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس فیصلے میں کوئی مقامی آدمی شریک تک نظر نہیں آتا، ایک غریب الدیار بے یار و مددگار کی طرح خود ہی منہ اٹھا کر کہیں کو چل دیتا ہے اور ایسے ناروا سلوک سے دوچار ہوتا ہے!

یہ چند در چند سوالات ہیں جن کا کوئی جواب ہمیں اپنی ان تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن ان روایتوں کا تعلق کسی ایسی بات سے نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی راوی کے متعلق جھوٹ کا گمان کیا جائے۔ البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ مختار کے گھر سے ان کا بے یار و مددگار حال میں ہانی کے گھر بھیجا اور ہانی کے یہاں ایک "آفت و مصیبت" کہہ کر ان کا استقبال کیا جانا، ان میں سے کوئی ایک بات بھی اس کے لیے کافی تھی کہ کوفیوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جاتا کہ یہ ہرگز ہرگز قابل اعتبار نہیں ہیں۔ اور اسی وقت کوفے سے نکل جانے کی کوئی تدبیر سوچی جاتی۔ یا کم از کم حضرت حسینؓ کو یہ صورتِ حال بتا دینے کی سعی کی جاتی جن کو اس سے پہلے بالکل مختلف صورتِ حال کی اطلاع کی جا چکی تھی۔

لیکن قضا و قدر کے فیصلے کون بدل سکتا ہے؟ جناب مسلم نے ان حالات میں بھی ہانی بن عروہ کے گھر میں پناہ گیری ہی قبول نہیں کر لی بلکہ بظاہر اپنے مشن کے بارے میں بھی اُن کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ حضرت حسین کو خط بھیج چکے تھے کہ فوراً آجایئے۔ یہاں حالات بالکل سازگار ہیں، بس آپ کے آنے کی دیر ہے۔ اپنی اس رائے میں تبدیلی انہوں نے اس وقت کی جب کہ وہ دشمن کے پنجے میں گرفتار ہو گئے[1] اور یہ ٹھیک وہ دن تھا جس دن حضرت

[1] طبری ج ٦ ص ٢١١

حسینؓ ان کے خط پر مکے سے روانہ ہو رہے تھے۔ یعنی ٨ ذی الحجہ سنہ ٦٠ھ جو تاریخی روایتوں میں مکہ سے حضرت حسینؓ کی کوفہ کو روانگی کا دن بتایا گیا ہے۔[1]

جناب مسلم کا انجام

کوفے کے ایسے نا وفادار اور طوطا چشم ماحول میں عبید اللہ بن زیاد جیسا چُست، چالاک اور سخت گیر منتظم پہنچ جائے تو مسلم بن عقیل جیسے ایک سادہ مزاج، پردیسی اور اجنبی کی کہاں خیر۔ اس نے ان کا پتہ نکال لیا کہ ہانی بن عروہ کے گھر پر مقیم ہیں۔ ہانی کے والد عُروہ پر عبید اللہ کے والد زیاد کا بڑا احسان تھا۔ زیاد نے سنہ ٥٠ھ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے بعد کوفہ کی گورنری سنبھالی تھی تو حضرت علیؓ کے حامی سرداروں کو سختی سے دبایا تھا لیکن عروہ کو جانے کیوں اس نے اپنے احسان و کرم کا نشانہ بنایا۔[2] عروہ کے بیٹے ہانی کے ساتھ بھی اس نے یہی معاملہ رکھا اور اسی کے مطابق اپنے باپ کے بعد ابن زیاد نے معاملات رکھے۔ اس لیے اُس کو اس انکشاف سے بڑی چوٹ لگی کہ مسلم جو اس کے آقا یزید بن معاویہؓ کا تختہ اُلٹنے کی مہم پر آئے ہیں، ہانی کے گھر میں مقیم ہیں۔ اور وہی گھر ان کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس نے ہانی کو بلوایا جو بڑی مشکل سے آنے کو تیار ہوئے۔ ان کو دراصل ابن زیاد کے کوفہ پہنچنے پر اور بحیثیت گورنر پہنچنے پر از خود ہی اس کے پاس آنا چاہیئے تھا لیکن جناب مسلم کے قیام کی شرم ہی بظاہر دامن گیر تھی جو وہ ملنے نہیں آئے۔ اس چیز سے ابن زیاد کو اس اطلاع پر اور زیادہ بھروسہ ہوا ہو گا کہ مسلم بن عقیل ہانی کے گھر پر مقیم ہیں اور وہیں سے حضرت حسین کی حمایت کے لیے بیعت کا سلسلہ چلایا جا رہا ہے اور اسی سے اس روایت کو تقویت ملتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جناب مسلم جب مختار کے گھر سے نکل کر ہانی کے گھر پناہ لینے پہنچے تو ہانی ان کو دیکھ کر اتنے پریشان ہوئے کہ اپنی پریشانی بے حجابانہ ظاہر کر ڈالی اور

[1] طبری ج ٦ ص ٢١١ [2] اسی سلوک کے لیے ایک دوسرا نام حُجر بن عدی کا بھی عروہ کے ساتھ لیا گیا ہے جن کا قصہ بعد میں کچھ اور ہوا۔

عربوں کی روایتِ مہماں نوازی بھی بھلا بیٹھے۔

بہرحال ہانی کسی طرح آئے تو ابن زیاد نے بہت ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اپنے اور اپنے باپ کے احسانات یاد دلاکر کہا کہ تمہارے گھر میں امیر المومنین کی حکومت اور عامۃ المسلمین کے امن وامان کے خلاف فتنہ و فساد کی یہ کھچڑی پک رہی ہے؟ ہانی نے انکار کرنا چاہا مگر یہ نہ چلا تو ایک بار پھر انہوں نے وہی کمزوری دکھائی جو جناب مسلم کو اپنے دروازے پر پاکر دکھائی تھی۔ کہا کہ واللہ میرا یقین کرو، میں انکو اپنے گھر نہیں لایا تھا ہاں وہ میرے دروازے پر آکر کھڑے ہوئے تو میں انھیں دھتکار نہ سکا۔ تم مجھے موقع دو، میں ابھی جاکر انھیں رخصت کرتا ہوں کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ابن زیاد نے کہا، یہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں تم اس کام کے لیے جاسکتے ہو کہ انھیں میرے پاس لے کر آؤ۔

شکر ہے کہ ہانی کو اس مرحلے پر اپنے مہمان اور پناہ گیر کا حق یاد آگیا اور وہ ابن زیاد کی یہ فرمائش پوری کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ نتیجۃً ان کے ساتھ سختی کا معاملہ ہوا اور اس کی خبر کچھ مبالغے کے ساتھ جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، ہانی کے گھر پہنچی تو عورتوں کی آہ و فغاں نے مسلم بن عقیل کو مجبور کیا کہ وہ اپنے محسن کو ابن زیاد کے پنجے سے نکالنے کی تدبیر کریں۔ انکی سمجھ میں جو تدبیر آئی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے انہوں نے حضرت حسینؓ کے لیے جاںنثاری کی بیعت لی تھی، جن کی تعداد عام طور سے اٹھارہ ۱۸ ہزار بتائی گئی ہے، ان کی طلبی کیلئے مقررہ نعرہ بلند کرائیں اور انھیں لے کر دار الامارۃ ــــ گورنر ہاؤس ــــ پر حملہ کردیں۔ اس نعرہ پر عام روایتوں کے مطابق چار ۴ ہزار آدمی اسی وقت جمع ہوگئے۔ اور جناب مسلم کی سرکردگی میں دار الامارہ پر جا پہنچے۔

حملے کی پسپائی اور مسلم بن عقیلؓ کی بے کسی

مگر یہ چار ۴۰۰۰ ہزار بہرحال کوفی ہی تھے، ابن زیاد نے صرف حسنِ تدبیر سے یہ ساری

جمعیت آناً فاناً منتشر کردی۔ سرداران قبائل جو خواستہ یا ناخواستہ گورنر کے دباؤ میں رہتے تھے، کچھ اس "فوج" کے سامنے آگئے کہ خود سمجھائیں، کچھ اپنے قبیلوں میں چلے گئے کہ ان لوگوں کی ماؤں بہنوں کو باہر بھیج دیں جو انھیں سمجھا کر لے جائیں۔ بہرحال تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی اور جو کچھ رہ گئے تھے وہ بھی رات کے اندھیرے میں اضافے کے ساتھ کم ہوتے ہوتے جناب مسلم کو بالکل اکیلا چھوڑ گئے کہ وہ خود ہی اپنے لیے جو کچھ کرسکتے ہوں کریں۔

رات کو تو، روایت کے مطابق کہیں پناہ مل گئی مگر دن کا اجالا ہونے پر ان کا پتہ نشان ابن زیاد تک پہنچ گیا اور اس نے انھیں ایک فتنہ جو اور مفسد قرار دیکر سر قلم کرادیا اور پھر یہی انجام ہانی بن عروہ کا بھی کرایا۔ یہ واقعہ ۹ ذی الحجہ کا بتایا گیا ہے[1]

[1] جناب مسلم اور ہانی کا یہ پورا قصہ کچھ اور زیادہ تفصیلات کے ساتھ طبری ج ۶ میں ۲۰۵ سے ۲۱۱ تک بیان ہوا ہے

بابِ نہم ۹

قافلۂ حسین رضؓ اپنی آخری منزل کی طرف

مسلم بن عقیلؓ جب ۸؍ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ کی صبح گرفتار کیے گئے تو جو صاحب اُن کی گرفتاری کے لیے فورس (FORCE) لے کر آئے تھے[1]، یہ محمد بن اشعث کہلاتے تھے اور یہ جناب مسلم کے گھرانے کے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان کے والد اشعث بن قیس حضرت علیؓ کے بہت نمایاں ساتھیوں میں تھے۔ لیکن جنگِ صفین کی خونریزی دیکھ کر حضرت علیؓ کے بہت سے ساتھیوں میں جو ایک برگشتگی آئی یہ اس میں بہت نمایاں ہوئے اور تحکیم کے لیے حضرت علیؓ کی طرف سے بادلِ ناخواستہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی نامزدگی زیادہ تر انہی کے دباؤ کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ حضرت ابوموسیٰ کا جو رویہ اس خانہ جنگی کے بارے میں شروع ہی سے رہا تھا اُس کی بنا پر ان کے بارے میں یہ یقینی تھا کہ وہ ہر قیمت پر آئندہ جنگ کا سدِباب ہی کریں گے۔ یہ محمد بن اشعث اُس مجلسِ خواص کے شرکاء میں بتائے گئے ہیں جو مسلم بن عقیلؓ کی کوفے میں آمد پر دارِ مختار میں پہلے دن ہوئی۔ لیکن ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جبکہ اور شرکا تن من دھن سے جناب مسلم کے مشن میں تعاون کی پُرجوش یقین دہانی کر رہے تھے یہ بالکل خاموش رہے تھے۔ اور پوچھے جانے پر کہا تھا کہ میں دل سے آپ لوگوں کی تمناؤں میں شریک ہوں، مگر قتل

---

[1] مشہور روایات کے مطابق اس گرفتاری کے لیے بڑی فورس بھیجی گئی تھی اور بڑا معرکہ رہا، مگر طبری کی ص ۲۲۱ کی ایک روایت کے مطابق ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

قتال کا معاملہ ہو تو اس میں شرکت کا روادار نہیں [1]۔

بہر حال جب ابن زیاد کے صریح اور محکم عزم کے آگے وہ لوگ بھی اپنا قبلہ بدلنے پر تیار ہو گئے جنھوں نے حضرت حسینؓ کو کوفے کی دعوت بھیجی تھی [2] تو محمد بن اشعث تو پہلے ہی کنارے پر کھڑے تھے انھیں حکم ہوا تو مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا فریضہ طوعاً یا کرہاً انھیں ادا کرنا کیوں کچھ زیادہ مشکل ہوتا؟

روایت میں ہے کہ گرفتاری کے بعد لے جائے جا رہے تھے تو رونے لگے، محمد بن اشعث کو تعجب ہوا کہ اتنے بڑے مشن کا آدمی روئے دے رہا ہے، جواب دیا کہ رونا اپنے لیے نہیں ہے، حسینؓ اور ان کے قافلے کے لیے ہے جو آج ہی میرے خط کی بنا پر مکّے سے چل رہے ہوں گے۔ تم اگر احسان کر سکو تو اتنا کر دینا کہ انھیں میرے واقعہ کی اطلاع کرا دو تاکہ وہ اب ادھر کا ارادہ ختم کر دیں۔ روایت کے مطابق محمد بن اشعث نے اس کا وعدہ کر لیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس پیغام کو پہنچنے میں تو ابھی کافی وقت لگنا تھا [3]۔

حج سے ایک دن پہلے روانگی

سیدنا حسینؓ جو آثار و قرائن کی روشنی میں بظاہر کوفے ہی کا خیال لے کر مدینے سے نکلے تھے، وسط رمضان میں مسلم بن عقیلؓ (چچیرے بھائی) کو کوفہ بھیجنے کے بعد منتظر تھے کہ وہاں سے مناسب حالات کی خبر آئے تو اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں، غالباً ذوالقعدہ میں یہ خبر آ گئی [4]۔ آپ نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۹۔ [2] شبث بن ربعی اور حجار بن ابجر عجلی وغیرہ ملاحظہ ہو طبری ج ۶ ص ۱۹۷ اور ص ۲۰۸۔

[3] یہ خط حضرت حسینؓ کو راستہ میں آخر ذی الحجہ یا شروع محرم میں ملا جبکہ کوفہ قریب آ رہا تھا۔ یہ اس بنا پر کہا جا رہا ہے کہ سفر کی جس منزل پر اس خط کے ملنے کا ذکر روداد سفر میں آگے آ رہا ہے اس منزل پر آپ کے پہنچنے کا وقت حساب سے یہی بنتا ہے۔ [4] اس خط کے پہنچنے کی تاریخ بتانے والا کوئی بیان ہماری نظر سے سوائے البدایہ والنہایہ کے کہیں نہیں گزرا۔ ج ۸ ص ۱۷۱ پر ہے کہ دکان کتاب مسلم قد وصل إلیہ قبل ان یقتل بسبع وعشرین لیلۃ۔ لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ خط کے قتل سے (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

ضروری تیاری کی اور ٹھیک حج سے ایک دن پہلے یعنی ۸ ذی الحجہ کو جو کہ "یوم الترویہ" کہلاتا ہے اور حجاج کے قافلے اس دن مکّے سے منیٰ کو روانہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے قافلے کے ساتھ کوفے کی سمت روانہ ہو گئے اور جیسا کہ ابھی گزرا یہ وہی دن تھا جب کوفے میں مسلم بن عقیلؓ اہل کوفہ کی روایتی غداری کا شکار ہو کر زیاد کے ہاتھوں گرفتار ہو رہے تھے۔

خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں

حضرت محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن مطیع اور عبداللہ بن عمر کی کوشش کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ ہر ایک نے کوفے کے ارادے سے باز رہنے کی ہر ممکن فہمائش اور درخواست کی مگر جیسے کہ تقدیر الٰہی میں ایک بات طے ہو چکی ہو، کسی کی بات مؤثر نہ ہوئی۔ آپ نے اہل کوفہ کی دعوت کو مشروط طور سے قبول کر کے مسلم بن عقیلؓ کو حالات کی تصدیق کے لیے وہاں بھیجا۔ اور ان کی تصدیق آتے ہی روانگی کا عزم کر لیا۔ اس عزم کی اطلاع دوسرے لوگوں کو کس طرح ہوئی، اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شاید سفر کی تیاریاں اور کچھ دوسری علامات قرینہ بن گئیں۔ بہر حال اس آخری موقع پر کچھ اور لوگ بھی روکنے کے لیے سامنے آئے۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

حضرت عبداللہ بن عباس بزرگ خاندان تھے۔ انھیں کے آبائی مکان میں آپ ٹھیرے ہوئے بھی تھے۔ انھیں ارادۂ سفر کی اطلاع نہ ہونے کا سوال ہی کیا۔ علاوہ ازیں ایک روایت یہ بھی ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کے مکہ آ جانے پر حضرت ابن عباسؓ کو بزرگ خاندان کی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۲۷ دن پہلے پہنچنے کی بات کہی جا رہی ہے اور بظاہر عبارت قتل سے قتل حسین مفہوم ہوتا ہے۔ اور ایسا مانا جائے تو گویا ۱۳ ذی الحجہ کو خط ملا۔ حالانکہ روانگی کی روایت ۸ ذی الحجہ کی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ خط ملنے کے بعد ہی روانگی ہوئی تھی۔ البتہ قتل سے قتل مسلم مراد لے لیں تو کسی درجہ میں بات بن جائے گی۔

حیثیت سے لکھا بھی تھا کہ آپ انھیں سمجھائیں کہ وہ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ میں ص ۱۶۴ پر اس خط کا اور اس کے جواب کا تذکرہ خلاصۂ مضمون کے ساتھ ہے[1]۔ جواب کا خلاصہ یہ دیا گیا ہے کہ :-

انی لأرجوا ان لا یکون خروج	مجھے امید ہے کہ حسین کا (مدینے سے)
الحسین لامرٍ تکرھه ولست	نکلنا کسی ایسی بات کے قصد سے نہیں ہوا
أدع النصیحة له فی کل ماتجتمع	ہوگا جو تمھارے لیے باعثِ تکلیف ہو اور
به الالفة وتطفی بہ الثائرة۔	اور میں (پھر بھی) کوئی دقیقہ انھیں اس بات
	کے سمجھانے میں نہیں چھوڑوں گا جس سے
	ہم لوگوں کی الفت باہمی برقرار رہے اور
	فتنہ دب جائے[2]

اس خلاصۂ جواب کے بعد بتایا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت حسینؓ کے پاس آئے اور بڑی دیر تک گفتگو کی جس میں آپ نے کہا کہ "خدا کے لیے عراق کا ارادہ نہ کرو اور اپنی جان کھونے کو وہاں نہ جاؤ اور نہیں تو کم از کم اتنی بات مانو کہ موسمِ حج گزر جانے دو، حج میں آنے والے لوگوں سے مل کر وہاں کے حالات کا اندازہ کرو اور پھر طے کرو جو کچھ طے کرنا ہو[3]۔ اس کے آگے کا جملہ ہے کہ "یہ واقعہ عشرۂ ذی الحجہ کا ہے"۔ یعنی بالکل اس وقت کا جبکہ روانگی ہونے والی تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ گفتگو کو اگر ہم یزید کی اور آپ کی خط و کتابت کا نتیجہ سمجھیں، جیسا کہ البدایہ کی طرزِ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یزید نے حضرت ابن عباسؓ کو بالکل آخری مرحلہ میں لکھا جبکہ ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور حضرت حسینؓ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ گفتگو اگرچہ البدایہ والنہایہ میں اس

---

[1] دونوں کا تفصیلی متن "حیاة الامام حسین بن علی" از باقر شریف القرشی جلد ثانی میں ہمارے سامنے ہے۔
[2] اس جواب ہی سے یزید کے خط اور اسکی اسپرٹ کا اندازہ ہو جاتا ہے یعنی اسی اسپرٹ کا خط اسکا بھی تھا۔ [3] البدایہ ج ۸ ص ۱۶۴

طرح درج کی گئی ہے جیسے کہ اوپر کی خط و کتابت کا نتیجہ ہو لیکن واقعہ میں یہ گفتگو اس سے الگ بالکل آخری مرحلے کی ہو۔ جبکہ یزید کا خط بظاہر اُس مرحلے میں آیا ہوگا جب حضرت حسینؓ کے مکے آنے کے بعد وہاں کوفیوں کی آمد شروع ہوئی اور مسلم بن عقیل کوفے پہنچ گئے۔ ہمارے نزدیک قرینِ قیاس یہی بات ہے۔ یعنی یہ مذکورۂ بالا گفتگو دوسری بار کی ہے ورنہ اصل گفتگو آپ نے خط آنے کے فوراً بعد ہی کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت جو گفتگو حضرت ابن عباسؓ اور حضرت حسین کے درمیان ہوئی وہ ریکارڈ میں نہ آئی ہو۔ البتہ جب حضرت حسین کوفے کے قصد پر مُصر رہ کر پابہ رکابی کے مرحلے میں داخل ہو گئے ہوں تب حضرت ابن عباسؓ نے ایک بار پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہو اور وہ روایت ہو کر ابن کثیر تک پہنچی ہو۔ بہرحال آگے روایت کا بیان یہ ہے کہ حضرت حسین نے حضرت ابن عباس کا مشورہ قبول نہیں فرمایا فابی الحسین الّا ان یمضی الی العراق (حسین عراق جانے کے ارادے پر مُصر ہی رہے) فقال له ابن عباس (اس پر حضرت ابن عباس نے ان سے فرمایا:-

واللہ انّی لاظنك ستُقتل	واللہ مجھے لگتا ہے کہ تم کل اپنی بیویوں
غدًا بین نسائك وبناتك	اور بیٹیوں کے درمیان اسی طرح قتل
کما قُتِل عثمان بین نسائه	کیے جاؤ جیسے عثمان اپنی بیویوں اور
وبناته واللہ انّی لاخافُ	بیٹیوں کے درمیان قتل ہوئے تھے
ان تکون انت الذی یقادِ به	واللہ مجھے تو یہ بھی خوف ہے کہ تم قصاصِ
عثمان فانّا للہ وانّا الیه	عثمان میں قتل کیے جانے والے بنو۔ پس
راجعون	(تم نہیں مانتے تو) انا للہ وانا الیہ راجعون[1]۔

لیکن حضرت حسین کے لیے یہ مکرر تفہیم بھی کچھ مؤثر نہ ہو سکی بلکہ جیسا کہ آگے روایت میں ہے

---

[1] طبری کی روایت میں یہ آخری جملہ نہیں ہے اور حضرت ابن عباس کی زبان کے ساتھ اس جملے کا جوڑ قابلِ یقین بھی نہیں ہے۔ یزید کے بارے میں انکے اس طرح کے خیالات ہونے کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۴

آپ نے اس اندازِ تفہیم پر ایک گونہ ناگواری کا اظہار فرمایا۔

٢۔ ابوبکرؒ بن عبدالرحمٰن: یہ مدینے کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے تھے، ان کے والد عبدالرحمٰن بن الحرث بن الہشام بن المغیرہ المخزومی القرشی خود بڑے صاحبِ فضائل تھے۔[1] غالباً حج کو آئے ہوئے تھے کہ حضرت حسین کے قصدِ کوفہ کا چرچا سنا تو ازراہِ خلوص و محبت حاضرِ خدمت ہوئے۔ اور حسب روایت طبری[2] عرض کیا کہ:-

"آپ ایک ایسے ملک کا ارادہ فرما رہے ہیں جو خالی نہیں پڑا ہوا ہے بلکہ وہاں اس کے امراء و حکام موجود ہیں جن کے ہاتھ میں خزانے ہیں اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ روپے پیسے کے بندے ہیں۔ پس وہی لوگ جنھوں نے آپ کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہ آپ کے خلاف لڑنے کو آجائیں گے۔" الخ

مسعودی کی روایت میں ان کا پیرایۂ بیان کچھ اور زیادہ مؤثر ہے۔ فرمایا کہ:-

"دیکھیے آپ کے والد ماجد آپ سے زیادہ حوصلہ اور طاقت رکھتے تھے۔ لوگ ان کی بات سنتے بھی زیادہ تھے۔ اہل شام کو چھوڑ کر باقی سب ان کی شخصیت پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کو لیکر معاویہ کے مقابلے پر چلے۔ معاویہ کی ان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی لوگ دنیا اور دنیوی زندگی کی محبت میں اُن کا حق بھول گئے۔ انھیں خون رُلایا حتیٰ کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر جو کچھ ان لوگوں نے آپ کے بھائی کے ساتھ کیا وہ سب بھی آپ جانتے ہیں۔ اور پھر انہی غدّاروں کا بھروسہ کر کے آپ اُن لوگوں سے لڑنے جا رہے ہیں جو آپکے مقابلے میں زیادہ قوی اور تیار ہیں لوگ ان سے امیدیں بھی زیادہ کر سکتے ہیں اور ڈرتے بھی زیادہ ہیں۔"[3]

[1] ان کا نام مؤرخ مسعودی کے ماسوا اور لوگوں نے عمر بن عبدالرحمٰن لکھا ہے مگر صحیح نام ابوبکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اصابہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو الاصابہ لابن حجر ج ۵ ص ۶۶۔ [2] جز ۶ ص ۲۱۶۔
[3] مروج الذہب (دار اندلس بیروت) ج ۲ ص ۵۶

٣۔ کئی اور مخلصین:- اسی طرح اور کئی نام آتے ہیں جن کا تعلق مخلصین کے زمرے سے تھا کہ انہوں نے یا اس عنوان سے کوفے کے قصد کی مخالفت کی کہ کوفی بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں، اور حالات ناسازگار، یا اس عنوان سے کی کہ اس اقدامِ خروج کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ابن کثیر نے ایک ہی جگہ یہ نام اور ان کے اقوال جمع کر دیئے ہیں[1]۔ حضرت ابوسعید الخدری، جابر بن عبداللہ، واثلہ بن واقد اللیثی اور مسوَر بن مخرمہ جو سب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور یہ سب مخلصینِ حضرت علی ہی سے تھے۔ حضرت ابوسعید خدری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:-

"اپنی جان کے بارے میں اللہ سے ڈریئے، اپنے گھر ہی میں رہیے اور اپنے امام پر خروج مت کیجئے۔"

حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا:-

"اللہ سے ڈریئے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مت ٹکرائیے۔"

واثلہ بن واقد اللیثیؓ نے فرمایا کہ:-

"آپ کا خروج بجا نہیں ہے آپ صرف اپنی جان دینے جا رہے ہیں اس سے باز رہیئے۔"

مِسوَر بن مَخرَمہ نے لکھا کہ

"اہلِ عراق کے خطوط سے دھوکہ میں نہ آیئے اور نہ ابن زبیر کے اس قول سے کہ وہ لوگ آپ کی مدد کریں گے۔"

لیکن سب ہی کی خواہشیں، منّتیں اور دلیلیں ناکام ہو گئیں اور حضرت حسین ۸ ذی الحجہ کو دوپہر کے وقت جبکہ حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہوئے عمرہ کے ارکان ادا کر کے کوفے کی سمت روانہ ہو گئے[2] گویا آپ نے احرام باندھا ہوا تھا مگر وہ احرام حج کا نہیں عمرے کا تھا۔

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳
[2] طبری ج ۶ ص ۲۱۷۔ اپنے عزم وارادے پر حضرت حسین کی اس درجہ پختگی بھی ایک حل طلب سوال ہے دم تحریر سامنے نہیں لیکن یاد آتا ہے کہیں یہ روایت نظر سے گزری ہے کہ آپ نے کوئی (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

عبداللہ بن جعفر کی سعی

حضرت کے عم زاد عبداللہ بن جعفرؓ حجاز کی بڑی اہم شخصیت تھے۔ عم زاد ہونے کے علاوہ حضرت کی ہمشیرہ حضرت زینب کبریٰ کے شوہر بھی تھے۔ قیام مدینے میں رہتا تھا غالباً حج کے لیے آئے ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت حسین کی روانگی سے پہلے اُن کی کسی مداخلت کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے حضرت حسین کے اس رُخ سے جو وہ یزید کے سلسلے میں اختیار کر رہے تھے، ناخوش ہوں، کیونکہ وہ حضرت معاویہ کے زمانے سے اس خاندان کے ساتھ بہتر تعلقات رکھتے آئے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی معاملہ تھا۔ اور عمر میں حضرت حسین سے بڑے بھی تھے، بہرحال جو بھی وجہ ہو۔ روایت ہے کہ ان کو اطلاع ملی کہ حسین روانہ ہو گئے تو وہ اپنے دو بیٹوں کو حضرت حسین کے تعاقب میں روانہ کر کے کہ ذرا آگے بڑھ کر ان سے کہو کہ اول تو لوٹ آئیں ورنہ کم از کم ذرا سا ٹھہریں میں آرہا ہوں، اور یہ کہہ کر وہ خود سیدھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) خواب دیکھا تھا جس میں اس ارادے کے لیے تائیدی اشارہ پایا جاتا تھا۔ پس گویا یہ اسی خواب کا اثر تھا کہ آپ اس ارادے پر نظر ثانی کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر جب ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ آپ اس ارادے کو فسخ کر کے درمیان راہ سے واپسی پر بھی تیار ہو گئے تھے مگر تقدیر الٰہی معاون نہ ہوئی اور واپسی ممکن نہ ہو سکی۔ تو یہ روایت کچھ معتبر نہیں رہتی اور اس کے بعد جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخی بیانات کی روشنی میں، جن میں سے کچھ اس کتاب کے پچھلے ابواب میں مذکور بھی ہوئے ہیں، آپ کے خیالات کے مطابق حضرت معاویہ کا دور بھی محض حالات کی مجبوری سے قبول کیا جانے والا دور تھا، نہ کہ خوشی سے۔ اور پھر جب آخر میں یزید کی ولیعہدی کا مسئلہ سامنے آگیا تب تو روایات کی رو سے یہ سوال بھی آپ کے سامنے آنے لگا تھا کہ "میں معاویہ کے خلاف جہاد نہ کر کے اللہ کو کیا جواب دے سکوں گا"، پس گمان یہ ہوتا ہے (بلکہ اس کا بھی روایتوں سے تقریباً ثبوت ہی ملتا ہے) کہ یزید کی ولیعہدی عمل میں آجانے کے بعد گویا آپ نے طے کر لیا تھا کہ اس کی اگر خلافت کی نوبت بھی آتی ہے تو بشرط حالات آپ اس خلافت کو الٹ دینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے۔ بظاہر یہی تہیہ تھا جسے آپ ایک دینی تقاضا سمجھتے تھے اور اس لیے اس وقت تک اس میں کسی تبدیلی کے روادار نہ ہوئے جب تک ایسے حالات سامنے نہ آ گئے کہ ان میں آپ نے اپنے لیے ... ۱۸۵ واللہ اعلم بالصواب۔

والی حرمین عمرو بن سعید کے پاس گئے کہ دیکھو حسین چلے گئے ہیں، تم مجھے ایک خط اُن کیلئے لکھ کر دو کہ وہ لوٹ آئیں اور یہ کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی سے پیش آؤ گے، کسی طرح کی کارروائی اُن کے خلاف نہیں ہوگی۔ روایت کہتی ہے کہ عمروؓ نے عبداللہ بن جعفر سے کہا کہ تم خود خط لکھ لو اور مجھ سے دستخط کرالو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ پھر ابن جعفر نے کہا کہ مزید اطمینان کے لیے اپنے بھائی یحییٰ کو میرے ساتھ کرو اور یہ خط تمھاری طرف سے وہی حسین کو دیں۔ چنانچہ یہ بھی ہوا۔ یہ دونوں صاحبان حضرت حسین کے پاس پہنچے۔ مگر دوسرے تمام لوگوں کی طرح ناکام ہی رہے [1]۔

والیٔ حرمین کی طرف سے بجبر روکے جانے کی روایت

حضرت عبداللہ بن جعفر اور والیٔ حرمین عمرو بن سعید کے بارے میں جو روایت ابھی مذکور ہوئی اس کی روشنی میں طبری ہی کی یہ دوسری روایت کسی طرح قابل اعتبار نظر نہیں آتی کہ "جیسے ہی قافلہ مکے سے نکلا حاکم مکہ عمرو بن سعید کے فرستادے ان کے بھائی یحییٰ بن سعید کی قیادت میں ان کا راستہ روکنے اور بجبر مکہ واپس لانے کے لیے پہنچے۔ مگر یہ لوگ کامیاب نہیں ہو سکے تھوڑی سی زور آزمائی اور مار پیٹ کے بعد یہ فرستادے نامراد لوٹنے پر مجبور ہوئے [2]۔ دونوں روایتوں میں اتنا تضاد ہے کہ کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ دونوں بیک وقت نہیں ہو سکتیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دوسری والی روایت، پہلی والی روایت میں مذکور واقعہ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور کچھ نہیں۔ ویسے بھی کیا تُک تھا کہ جس حاکم نے سوا چار مہینے حضرت حسین سے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ جبکہ اُسے معلوم تھا کہ آپ نے مدینہ کیوں چھوڑا ہے۔ رمضان تک تو وہ خالی حاکم مکہ ہی تھا رمضان میں مدینے کی حکومت بھی اس کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اور اس سپردگی کے ساتھ ہی اس نے عبداللہ بن زبیر کے

[1] طبری ج ۶ ص ۲-۲۱۹

[2] ایضاً ص ۱۸-۲۱۷

خلاف ــــ جو حضرت حسین ہی کے ساتھ مکے میں آئے تھے ــــ گرفتاری کے لیے کاروائی بھی شروع کر دی تھی۔[1] اس کے برخلاف کوئی ایک بھی روایت نہیں ملتی کہ اُس نے حضرت حسین کو چھیڑا ہو، ان کے معاملات میں کسی طرح کا دخل دیا ہو۔ حالانکہ اہلِ کوفہ کے وفود اُن کے پاس آ رہے تھے، اُن کے فرستادے کوفے جا رہے تھے، وہ سفر کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تقریباً اسّی نوّے آدمیوں کا قافلہ جانے کو تھا اس کی تیاریاں دو چار دن پہلے سے تو بالکل صاف نظر آنے ہی لگی ہوں گی۔ اب اس تمام مدت میں تو حاکم مکہ ان سے تعرض نہیں کرتا۔ مگر جب وہ مکہ سے نکل جاتے ہیں تو اُن کی پکڑ کو آدمی دوڑاتا ہے۔ کوئی تک کی بات تو ہے نہیں۔

نیز خود اس روایت کا ایک دوسرا جزو بجائے خود اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ حاکمِ مکہ کی طرف سے تعاقب کی کہانی درست نہیں ہے۔ وہ دوسرا جزو یہ ہے کہ قافلہ حاکمِ مکہ کے فرستادوں کو پسپا کر کے آگے بڑھا تو ایک قافلہ ملا جو یمن سے (سالانہ معمول کے مطابق) دارالخلافہ دمشق کے لیے بہت سے قیمتی سامان لیے جا رہا تھا، حضرت حسین نے اس پر قبضہ کر لیا اور شتربانوں سے کہا کہ تم میں سے جو چاہے یہاں سے لوٹ جائے اور جو چاہے ہمارے ساتھ کوفے تک چلے ہم دونوں کو معاوضہ دیں گے ــــ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کے دونوں جزو ں میں سے کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتا ہے، ورنہ کیسے یہ بات قابلِ تصور ہے کہ ابھی حاکمِ مکہ کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا (جس کے بعد پورا اندیشہ ہونا چاہیے تھا کہ شاید وہ مزید کمک لے کے آتے ہوں) اور ابھی ایک ایسا کام کیا جانے لگا (یعنی سرکاری قافلے کے اموال پر قبضہ کرنا) کہ پسپا شدہ لوگ کسی کمک کے ساتھ دوبارہ نہ بھی آتے ہوں تو اس نئے واقعہ کے بعد حاکم پر بالکل فرض ہو جائے کہ وہ سرکاری مال کی بازیابی اور شتربانوں کی امداد کے لیے کوئی موثر کاروائی کرے۔ اور جب روایت میں یہ بھی ہے کہ جن شتربانوں نے آگے جانا قبول نہیں کیا ان کا وہیں حساب کر دیا گیا۔[2] تب تو حاکمِ مکہ کو واقعہ کی فوری اطلاع ہونے کا بھی سامان ہو گیا تھا اور

[1] طبری ج ۶ ص ۹۳-۱۹۲   [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۸

کسی کاروائی کا اندیشہ نہ ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ بہر حال روایت کے دونوں اجزا میں سے ایک ضرور غلط ہے اور اس صورتِ حال کے نتیجہ میں یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی غلط ہوں۔[1]

نوٹ کرنے کی بات

بہر حال نہ صرف یہ کہ جبر و اکراہ والی یہ روایت کسی طرح قابلِ قبول نظر نہیں آتی۔ بلکہ یہ بات بھی نوٹ کی جانی چاہیے کہ جس طرح حاکمِ مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے حضرت حسین کے ساتھ قاعدہ و قانون کے بجائے لحاظ و احترام کا معاملہ کیا۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے برخلاف آپ کو بالکل آپ کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسی طرح حاکمِ مکہ ــــ اور بعد میں حاکمِ حرمین ــــ عمرو بن سعید بن العاص ــــ المعروف اَشدق ــــ نے آپ کے ساتھ یہی معاملہ رکھا، کوئی تعرض آپ سے نہیں کیا اور کیا تو وہ بھلائی کا معاملہ کیا جو عبداللہ بن جعفرؓ نے ان سے چاہا تھا۔ ہمارے خیال میں یزید کے بارے میں حضرت حسین کے سخت مخالفانہ رویّے کی روشنی میں یہ بات نہیں سوچی جا سکتی کہ مقامی حکّام احترام، نرمی اور چشم پوشی کا یہ معاملہ مرکزی حکومت اور دارالخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔ لازماً یہ رویّہ وہیں کے ایما پر ہونا چاہیے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے نام کے خط سے بھی، جس کا اوپر تذکرہ ہوا، یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یزید کی طرف سے حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے معاملہ میں وہی فرق تھا جس فرق کی حضرت معاویہ نے اُسے وصیت کی تھی۔[2]

[1] "شہیدِ انسانیت" کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے اسی اشکال یا کسی دوسرے اشکال سے بچنے کی راہ یہ اختیار فرمائی ہے کہ قافلہ کو محض ایک قافلہ بتایا ہے یمن کا سرکاری قافلہ نہیں بتایا۔

[2] شیعہ مصنفین نے مدینے سے حضرت حسین کے خفیہ کوچ کا بدیہی جواز ثابت کرنے کے لیے اور اسی طرح مکہ سے قبلِ حج کوچ کے لیے عجیب عجیب الزامات حکّامِ مکہ و مدینہ اور حکومتِ دمشق پر لگائے ہیں مگر سب بے بنیاد اور محض افترا ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

ذی الحجہ کی ۸ ریا ۱۰ ر

محمود احمد عباسی مرحوم نے اپنی کتاب (خلافت معاویہ و یزید) میں ایک خاص بحث یہ کی ہے کہ حضرت حسینؓ کے قافلے کا سفر ۸ ر ذی الحجہ کو حج سے پہلے شروع ہوا تھا یا ۱۰ ر کو؟ وہ کہتے ہیں کہ ۸ ر کی جو روایت عام طور پر مؤرخین کے یہاں پائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے صحیح ۱۰ ر ذی الحجہ ہے۔ یعنی آپ حج کر کے روانہ ہوئے تھے۔ اس کے انہوں نے بہت سے دلائل جمع کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ دمشق کو جانے والے یمنی قافلے کو پکڑنے کی جو روایت آئی ہے اس میں اس واقعہ کا مقام تنعیم کو بتایا گیا ہے۔ جو مکہ مکرمہ سے شمال مغرب کی جانب ۴ میل کے فاصلے پر مشہور جگہ ہے۔ اس کو چھوٹا عمرہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ عمرہ کا احرام باندھنے کے لیے حدود حرم سے باہر جو جانا پڑتا ہے تو اس کام کے لیے یہ قریب ترین جگہ ہے)۔ عباسی صاحب کہتے ہیں کہ تنعیم کا محلِ وقوع اس سمت جنوب مشرق سے، جس سمت میں آدمی مکے سے کوفے کو جاتا ہے، بالکل مخالف سمت 'شمال مغرب' میں راہِ دمشق پر ہے۔ تو مکے سے کوفے کو جاتے ہوئے تنعیم کا یہ واقعہ کیسے پیش آگیا؟ اور کیسے یہ قافلہ جو حج کے ایام میں مکے سے گزر رہا تھا بغیر حج کیے ہوئے مکہ سے آگے بڑھ کر تنعیم پہنچ گیا ہوگا؟ عباسی صاحب کا یہ سوال تو بالکل صحیح ہے مگر اس کے ذریعہ جو وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہاں حج کے بعد ۱۰ ر ۱۱ ر ذی الحجہ میں حضرت حسینؓ کا سفر مانا جائے تو یہ

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) مثلاً شہید انسانیت "ص ۲۲۵ پر ہے کہ ولید حاکم مدینہ نے یزید کو حضرت حسین کے بیعت سے انکار کی خبر دی تو اس نے حکم بھیجا کہ بیعت کرنے اور نہ کرنے والوں کی فہرست بھیجو جس کے ساتھ حسین کا سر بھی ہونا چاہیے۔"

یہ اگر واقعہ ہوتا تو آخر مکہ بھی تو یزید کی قلمرو میں شامل تھا پھر کیوں اس نے مکے کے حاکم کو فرمان بھیجا کہ حسین مدینے سے نکل کر مکہ پہنچ گئے ہیں تم ان کو گرفتار کرو۔ حالانکہ وہاں آپ کا تین مہینے سے اوپر قیام رہا تھا۔۔؟

واقعہ ممکن ہوسکتا ہے، یہ بالکل بھی قابلِ قبول بات نظر نہیں آتی۔ کیونکہ حج کرنے کی صورت میں حضرت حسین اور ان کا قافلہ تنعیم سے، اسی مخالف سمت میں جس سمت میں راہِ کوفہ ہے، اس وقت کے مقابلے میں اور زیادہ دور ہو جاتا تھا جس وقت آپ ۸ ر ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں تھے۔ حج کے ارکان منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں ادا ہوتے ہیں، اور یہ مقامات مکہ سے بجانب مشرق (یا جنوب مشرق) ۲½ میل سے لیکر ۱۳ میل تک کے فاصلے پر ہیں۔ جبکہ تنعیم مکہ سے خود عباسی صاحب کے قول کے مطابق بھی ــــ بجانب شمال مغرب ۳-۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ پس مکہ سے ۳-۴ میل مخالف سمت میں اگر اس واقعہ کا تصور مشکل ہے تو اسی مخالف سمت میں ۱۵-۱۶ میل کا فاصلہ ہو جانے پر اور بھی زیادہ مشکل ہو جانا چاہیے۔

دوسری دلیل عباسی صاحب نے البدایہ والنہایہ کے الفاظ "ذالك فی عشر ذی الحجة" کو بنایا ہے جس کا مطلب ان کے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ ۱۰ ر ذالحجہ کو روانہ ہوئے۔ مگر اسی البدایہ والنہایہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ:

فاتفق خروجه من مكة ايام التروية قبل مقتل مسلم بيوم واحد۔ فان مسلماً قتل يوم عرفة۔ [۱]	پس آپ کا مکہ سے خروج ایام ترویہ میں قتل مسلم سے ایک دن پہلے ہوا مسلم کا قتل یوم عرفہ میں ہوا تھا۔

پس اس کی روشنی میں "عشر ذی الحجة" کا مطلب ۱۰ ر ذی الحجہ نہیں بلکہ "عشرۂ ذی الحجہ" لیا جائے گا۔

علاوہ ازیں معاملہ کا یہ پہلو بھی عباسی صاحب سے نظر انداز ہوگیا کہ اگر حضرت حسینؓ نے سفر کا آغاز حج کے بعد کیا ہوتا تب وہ ۱۲ ر تاریخ سے پہلے سفر نہیں کر سکتے تھے، حاجی کو کم از کم ۱۲ ر تک منیٰ میں رک کر رمی جمرات کرنا ہوتی ہے۔ اور اس صورت میں عباسی

---

[۱] ج ۶ ص ۱۵۹۔

صاحب کے دیئے ہوئے پیمانۂ رفتارِ سفر کے مطابق وہ ۱۰ محرم کو کربلا میں نہیں پہنچ سکتے تھے جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں بذاتِ خود ۸ یا ۱۰ ذی الحجہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن عباسی صاحب کے قارئین میں سے کسی کی نظر سے ہمارے یہ صفحات گزرے تو اُسے خیال ہو سکتا ہے کہ ایک سوال جو حضرت حسین کی تاریخِ روانگی کے سلسلے میں اتنی اہمیت سے ایک مصنف نے اٹھایا تھا بعد والے دوسرے مصنف نے اس سے بالکل اعتنا ہی نہیں کیا۔ اس لیے اپنا نقطۂ نظر اس بارے میں عرض کرنا مناسب سمجھا گیا۔

کربلا تک کی رودادِ سفر اور یوم شہادت کی روائتیں

آغاز سفر کے ساتھ جس طرح کی روایتیں ابھی آپ کے سامنے آئیں کہ ایک کا مضمون دوسرے کی نفی کر رہا ہے۔ بلکہ خود ایک ہی کے اندر کے دو حصے ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں۔ ان کے بعد جو اور روائتیں کربلا تک کے سفر اور یوم شہادت کی روداد بیان کرتی ہیں، وہ بعینہٖ اس کیفیت کی حامل اگرچہ نہ ہوں مگر دوسرے متعدد اسباب سے ان کا بیشتر حصہ مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہے اور کوئی خاص اہمیت بھی اس پوری روداد کے بیان کی ہے نہیں، مثلاً آپ راستے میں کہاں کہاں ٹھہرے؟ کیونکہ اکثر یہ جگہیں وہ ہیں جو قاری کے لیے ایک جائے مجہول کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا علم اُسے ہو یا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا کتنی دیر تک دو منزلوں کے بیچ میں چلے اور کتنی دیر اور کون سے وقت آپ کس منزل پر ٹھہرے، اور کتنا پانی کہاں سے بھر کے لیا تھا لیا۔ اور کس منزل کی کیفیت کیا تھی؟ یہ سب باتیں وہ ہیں جو اس واقعہ کے بارے میں اُس خاص نقطۂ نظر کے ساتھ جو شیعہ حضرات کا ہے اور جو اعتقادات حضرت حسین اور ان کے اہلِ بیت کے بارے میں شیعہ حضرات رکھتے ہیں اُن اعتقادات کے ساتھ تو ان تفصیلات میں جانے کے

کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان اعتقادات اور اس نقطۂ نظر کے بغیر ان تفصیلات میں جانا کوئی بامعنی کام نہیں ہوگا اس لیے ہم تفصیل برائے تفصیل کے بجائے اس روداد کی صرف وہی باتیں یہاں بیان کریں گے جن میں ہر اعتقاد اور ہر نقطۂ نظر کے لیے کوئی افادیت کا پہلو ہے۔

فرزدق سے ملاقات

فرزدق عربی شاعری کا مشہور نام ہے۔ حضرت علی اور آپ کے اہل بیت کے حامیوں میں سے تھا۔ عراق ہی وطن تھا۔ طبری نے دورانِ سفر حضرت حسین سے اسکی ملاقات بتانے والی دو روایتیں دی ہیں۔ ایک بتاتی ہے[1] کہ مقامِ صفاح پر اس کی ملاقات ہوئی (جو کہ حدودِ حرم سے باہر تقریباً دس میل کی مسافت پر ہے) اور اس ملاقات کے راوی ایسے دو کوفی ہیں جو یوم ترویہ میں مکہ مکرمہ پہنچے جو کہ حضرت حسین کی روانگی کا دن تھا۔ اور آپ کو رخصت کر کے حج کے قافلوں میں شامل ہو گئے۔ اس سفر کی بہت سی روائتیں انہی دو کے حوالے سے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم حج سے فارغ ہو کر شتابی سے حضرت حسین کے تعاقب میں نکلے ــــ شریک سفر ہونے کے لیے نہیں بلکہ تماشہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم "صفاح" پہنچے تو دیکھا کہ فرزدق ہے جو حضرت حسین سے مل رہا ہے۔ اور ان دونوں کی بات چیت ختم ہوئی تو حضرت حسین نے اپنی سواری کو حرکت دی اور السلام علیکم کہہ کر دونوں الگ ہو گئے۔ ان الفاظ سے صاف طور پر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ فرزدق عراق کی طرف سے آ رہا تھا جدھر کو حضرت حسین تشریف لے جا رہے تھے۔

عراق کی سمت سے آنے کا یہ کون سا وقت تھا۔ جبکہ حج ہو چکا ہے؟ اور حضرت کو صفاح پہنچتے پہنچتے جو کہ بمشکل دس میل پر ہے ایسے کتنے دن لگ گئے کہ وہ دو کوفی

[1] سله . ی ج ۶ ص ۲۱۸ .

(عبداللہ بن سُلیمؒ اور المذری بن مشعل جو واقعہ کے راوی ہیں) حج کرنے کے بعد حضرت حسین کے پیچھے نکلے تو اُس وقت تک حضرت حسین کا قافلہ صفاح تک ہی پہنچا تھا؟ جبکہ یہ دونوں حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد ۱۲ ذی سے پہلے نہیں روانہ ہو سکے ہوں گے۔ یعنی حضرت حسین کی روانگی کے چار دن بعد ان کی روانگی ہوئی ہو گی!

دوسری روایت[1] جس کا راوی خود فرزدق کو بتایا گیا ہے، وہ بتاتی ہے کہ فرزدق ۶۰ھ کے ایام حج میں (اپنی والدہ کو حج کرانے کے واسطے لیے ہوئے) حرم (یعنی حدود حرم) میں داخل ہوا تو اسے ایک قافلہ مکے سے نکلتا ہوا ملا جو تلواروں اور ڈھالوں کے ساتھ تھا۔ معلوم کرنے پر کہ یہ کس کا قافلہ ہے پتہ چلا کہ حضرت حسین بن علیؓ کا۔ فرزدق نے لپک کر دعا سلام اور کچھ بات چیت کی جس میں یہ سوال بھی تھا کہ اے ابن رسول اللہ آپ حج چھوڑ کے کہاں جا رہے ہیں؟

بس پہلی روایت کے رو سے حج (یوم عرفہ) ہوئے بھی قریب چار پانچ دن ضرور ہو چکے تھے جب فرزدق عراق سے آتے ہوئے (صفاح کے مقام پر) حضرت حسین سے ملا۔ اور دوسری روایت کی رو سے فرزدق ۸ ذی الحجہ کو حرم شریف پہنچ گیا تھا اور حضرت حسین سے ملاقات مکے سے آپ کے نکلتے وقت ہوئی۔

اور ایک تیسری روایت بھی ہے جو بعض شیعہ مصنفین نے اپنے ماخذ سے لی ہے[2]۔ وہ اس ملاقات کے واقعہ کی ایک تیسری شکل بتاتی ہے کہ فرزدق حج کر کے لوٹ رہا تھا۔ تب ایک پڑاؤ پر ملاقات ہوئی۔ غرض "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کا مضمون ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یا کہہ لیجئے "اندھوں کی فیل شناسی" کہ جس اندھے نے ہاتھی کے جس حصے کو چھوا اسی کی شکل و صورت اور سائز کو پورے ہاتھی کی شکل اور سائز بتا دیا۔

روداد سفر کی روایتوں کا یہی وہ حال ہے جس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ بالکل قابل اعتبار

[1] ایضاً۔ [2] عبدالرزاق الموسوی المقرّم نے "مقتل الحسین" میں ص ۱۷۵ پر۔

نہیں ہیں۔ فرزدق کی ملاقات کے سلسلے میں طبری کی دونوں روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت حسین نے فرزدق سے پوچھا کہ "اپنے پیچھے (یعنی عراق میں) کیا حال چھوڑ کر آئے ہو؟" فرزدق نے جواب دیا کہ:

"دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ اور قضا و قدر اللہ کے ہاتھ میں۔ جس پر آپ نے فرمایا "سچ کہتے ہو" اور رخصت ہو گئے[1]"

یہاں قدرتی طور پر حیرت ہوتی ہے کہ حضرت حسین نے تو یہ سفر پوری طرح اس اطمینان پر شروع کیا تھا کہ کوفے کے لوگ آپ کی حمایت پر مستعد اور آپ کی آمد کے لیے چشم براہ ہیں پھر فرزدق کی اس سے بالکل مخالف بات پر اظہار تعجب کرنے کے بجائے آپ نے تصدیق و تصویب فرمائی! بعد میں آنے والی کچھ اور روایات بھی ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق والی گفتگو کی شاید کوئی اصلیت نہیں ہے۔ یہ روایات آگے آ رہی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق سے ملاقات سے کافی دنوں بعد تک حضرت حسین کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب کوفہ ان کے ساتھ نہیں ہے

انجام حضرت مُسلم کی خبر

حضرت حسین کا قافلہ کوفے کی طرف سرگرم سفر تھا۔ مُسلم بن عقیل کا خط ملنے کے بعد سے وہاں کے حالات میں جو تبدیلی ہوئی تھی مثلاً خود جناب مُسلم اور ہانی بن عروہ کو دی جانے والی سزائے موت، اس کا کوئی علم کسی ذریعہ سے نہ ہوا تھا۔ راہ میں ایک منزل زُبالہ آتی ہے جہاں سے کوفہ زیادہ دور نہیں رہتا۔ اس منزل پر آپ کو وہ قاصد ملا[2] جسے کوفے سے محمد بن اشعث نے مسلم بن عقیل کی وصیت کے مطابق ان کا یہ پیغام دے کر بھیجا تھا:

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۸ [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۶۔

"میں یہاں گرفتار کیا جا چکا ہوں۔ آپ شاید چل بھی نہ پائیں کہ میرا قتل ہو جائے۔ پس آپ جہاں بھی یہ پیغام پائیں لوٹ جائیں۔ کوفہ والوں کا بھروسہ نہ کریں، ان لوگوں نے آپ سے بھی جھوٹ بولا تھا اور مجھ سے بھی جھوٹ ہی بولا۔ اور یہ تو آپ کے والد کے وہ ساتھی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ موت یا قتل کی تمنا کرنے لگے تھے۔[1]"

ایک روایت کے مطابق آپ نے درمیان سفر میں مقام حاجر سے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن یقطر کے ہاتھ (یا حسب اختلاف روایت ایک دوسرے شخص کے ہاتھ) اہل کوفہ کے نام اپنی روانگی کی اطلاع بھی روانہ کی تھی۔ اسی منزل زبالہ پر ان کے بارے میں بھی خبر ملی کہ وہ کوفے سے پہلے قادسیہ کے مقام پر گرفتار کر لیے گئے اور پھر مقتول ہوئے۔[2]

ساتھیوں کو آگاہی

کہا گیا ہے اور بالکل قرین قیاس ہے کہ زبالہ کی منزل پر یہ پوری صورت حال کو بدل دینے والی جو اطلاعات حضرت حسینؓ کو موصول ہوئیں تو آپ نے ضروری سمجھا کہ ساتھیوں کو آگاہ کریں اور اجازت دیں کہ اس نئی صورت حال میں جو شخص قافلے سے علاحدہ ہونا چاہے وہ علاحدہ ہو جائے۔ یہ بات روایات کے مطابق آپ نے خاص طور پر ان ساتھیوں کے پیش نظر کہی تھی جو راستے کی منزلوں پر آپ کے بارے میں یہ سمجھ کر ساتھ ہو گئے تھے کہ کوفہ آپ کے تابع ہے اور آپ وہاں حکومت کرنے جا رہے ہیں۔ اور یہ زیادہ تر بدوی لوگ تھے جو منفعت کی امید میں ساتھ لگ گئے تھے۔ چنانچہ ایسے سب ہی لوگ یہ خبر سن کر منتشر ہو گئے اور آپ کے ساتھ شریک سفر صرف وہی لوگ رہے جو مکہ سے ساتھ تھے۔[3]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ [2] ایضاً ص ۲۲۶ [3] ایضاً

واپسی کا مشورہ

طبری نے اسی صفحہ (۲۲۶) پر اگلی روایت دی ہے کہ زبالہ کے بعد والی منزل بطن عقبہ پر قیام ہوا تو وہاں ایک شخص نے آپ کے حالات جاننے کے بعد باصرار مشورہ دیا کہ برائے خدا آگے نہ جائیے ان حالات میں آگے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اس رائے سے اتفاق کیا مگر فرمایا کہ "اللہ کے ارادوں پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا" اور سفر جاری رکھا۔

ایک صفحہ قبل یعنی (ص ۲۲۵ پر) طبری نے ایک اور روایت بھی ایسے ہی مشورے کی نقل کی ہے، یہ مشورہ ان دونوں کوفیوں نے دیا تھا جن کا ذکر ہم نے فرزدق کی ملاقات والی روایتوں کے ضمن میں کیا ہے کہ یہ حج کے بعد سے حضرت حسین کے قافلے کے پیچھے بطور مشاہد لگ گئے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ زرود کے مقام پر کوفے سے آنے والے ایک شخص سے ہم کو مسلم اور ہانی کے مارے جانے کی خبر ملی جو ہم نے ثعلبیہ[1] کی منزل پر حضرت حسین کی خدمت میں رازداری کے ساتھ پہنچائی اور پھر ذرا سا وقفہ دیکر عرض کیا کہ "للہ آپ آگے نہ جائیے۔ اب کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ کہتے ہیں کہ سنتے ہی بنو عقیل چلائے کہ ہرگز نہیں، واللہ ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یا تو اپنے بھائی مسلم کا انتقام لیں اور یا ہم بھی انکے والے انجام سے دوچار ہو جائیں"۔ کوفی راوی کہتے ہیں کہ اس پر آپ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ ان (بچوں) کے بعد بھلا زندگی میں کیا مزہ؟ یعنی آپ نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ فرما لیا۔ ص ۲۲۶ والی روایت میں جو الفاظ بطن عقبہ کی منزل کے آئے ہیں کہ "تم ٹھیک کہتے ہو مگر اللہ کے ارادوں پر کون غالب آسکتا ہے"؟ ان الفاظ کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ غالباً کوفیوں والی وہ روایت صحیح ہے جو ابھی گزری جس کے مطابق بظاہر آپ (دو منزلیں پہلے ثعلبیہ کے مقام پر) یہ فیصلہ کر لینا چاہتے تھے کہ آگے نہ بڑھا جائے مگر بنو عقیل

---

[1] ثعلبیہ اس راہ کی مشہور منزلوں میں ہے۔ مکہ کی طرف سے جانے میں زبالہ سے ایک منزل پہلے پڑتی ہے۔

کا رُخ دیکھ کر اس کو مناسب نہ سمجھا اور ان کے اصرار کو آپ نے سمجھا کر یہ تقدیرِ الٰہی ہے۔

حضرت محمد الباقر کی روایت

طبری نے روداد سفر اور واقعۂ شہادت کے سلسلے میں دوسری بہت سی روایتوں کے ساتھ ایک مسلسل روایت ٹکڑوں میں بانٹ کر حضرت حسین کے پوتے حضرت محمد الباقر کی بھی درج کی ہے، اس روایت کے پہلے ٹکڑے کا ایک اقتباس ہم پیچھے دے چکے ہیں (باب ۷) اس کے دوسرے ٹکڑے میں آتا ہے۔

فاقبل حسین بن علی بکتاب	حسین بن علی، مسلم بن عقیل کا خط پانے
مسلم بن عقیل کان الیہ حتیٰ	کے بعد کوفے کی طرف متوجہ ہو گئے حتیٰ کہ
اذا کان بینہٗ وبین القادسیۃ	جب آپ وہاں پہنچے کہ قادسیہ[1] کے اور
ثلثۃ امیال لقیہٗ الحرُّ بنُ یزید	آپ کے درمیان بس تین میل کا فاصلہ
التمیمی فقال لہٗ این ترید	تھا تو وہاں حُر بن یزید التمیمی سے ملاقات
قال ارید ھٰذا المصر قال	ہوئی۔ حُر نے دریافت کیا کہاں
لہٗ ارجع فانی لم ادع لک	کا ارادہ ہے؟ فرمایا اسی شہر کا۔ حُر
خلفی شیئًا ارجوہ فھمّ ان	نے عرض کی، آپ لوٹ جائیں اسلیے
یرجع وکان معہٗ اخوۃ مسلم	کہ میں (جو وہیں سے آرہا ہوں) آپ
بن عقیل فقالوا واللہ لانرجع	کے لیے کوئی اچھی صورت حال چھوڑ کر
حتی نصیب بثأرنا	نہیں آرہا ہوں۔ اس پر آپ نے واپسی
او نُقتل، فقال لاخیر فی	کا ارادہ فرمایا۔ لیکن مسلم بن عقیل کے

[1] قادسیہ اسلامی تاریخ فتوحات کا نہایت مشہور نام ہے۔ کوفے سے تقریبًا ۴۵۔۵۰ میل بجانب جنوب مغرب اس کا محل وقوع ہے، اس میں گزر کر ہی کوفے کا سیدھا راستہ مکے سے تھا۔

حیاتنا بعدکم فساد...[1]	بھائی آپ کے قافلے میں تھے، وہ بولے کہ خدا کی قسم ہم تو بغیر بدلہ لیے یا اپنی جان دیئے نہیں واپس ہوں گے، تب آپ نے فرمایا کہ تمھارے بعد میرے لیے زندگی میں کیا مزہ ہے؟ اور یہ کہکر آپ آگے کو چل دیئے۔

حضرت محمد الباقر کی اس روایت کے بعد۔ جو اگر سنداً صحیح روایت ہے، اور یقینًا انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) سے سنی ہوگی جو اس سفر میں اپنے والد ماجد حضرت حسین کے ساتھ تھے[2]۔ یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ حضرت حسین نے حالات کے مکمل انقلاب کا علم و یقین حاصل ہو جانے کے بعد واپسی کا ارادہ فرمایا تھا۔ اگرچہ وہ برادرانِ مسلم کی وجہ سے عمل میں نہ آسکا۔

سمتِ سفر کی تبدیلی اور نزولِ کربلا

جیسا کہ اوپر کی روایت میں آیا آپ نے برادرانِ مسلم کی بات سن کر واپسی کا ارادہ ترک کیا اور آگے کو چل دیئے۔ مگر پھر یہی روایت بتاتی ہے کہ آگے کو بڑھتے ہی ابن زیاد کا گھڑسوار دستہ سامنے آگیا۔ جو قادسیہ میں متعین تھا۔ اسے دیکھ کر آپ نے اپنا رُخ قادسیہ اور کوفے سے ہٹا کر کربلاء کی طرف کر دیا[3]۔

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [2] خود محمد الباقر بھی اُس وقت دو ڈھائی سال کی عمر کے تھے، یعنی قافلۂ کربلا میں شامل تھے۔ [3] کربلا قادسیہ سے بجانب شمال اور کوفے سے بجانب شمال مغرب ۱۲-۱۰ کلومیٹر آگے ہے۔ اور حضرت حسین جنوب مغرب سے کوفہ کی طرف کو بڑھ رہے تھے۔

فسار فلقیه اوائل خیل عبید الله فلما رأی ذالك عدل الی کربلاء فاسند ظهره الی قصباء وخلا کی لا یقاتل الّا من وجهٍ واحد فنزل وضرب ابنیته وکان اصحابه خمسة واربعین فارسًا ومائة راجلٍ [1]

(پس آپ آگے کو چل دیئے) مگر چلتے ہی آپ کو عبید اللہ بن زیاد کا مقدمۃ الجیش نظر آیا۔ اسے دیکھ کر آپ نے کربلا کی طرف رُخ موڑ لیا۔ وہاں آپ نے بانس اور نرکل کے جنگل کو اپنی پشت پر لیا اور مضبوطی سے جم گئے تاکہ دشمن سوائے ایک طرف کے کہیں اور سے حملہ نہ کر سکے۔ یہاں نزول فرما کر آپ نے اپنے خیمے لگوا دیئے اور آپ کے ساتھی پینتالیس[۴۵] سوار اور سو[۱۰۰] پیادے تھے۔

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۰

باب دہم [۱۰]

کربلا کی سرگذشت

عمرو بن سعد کی آمد

حضرت محمد الباقر کی جس روایت کے الفاظ پر گذشتہ باب بند ہوا ہے، اسی روایت میں آگے بیان ہوا ہے کہ عمر بن سعدؓ بن ابی وقاص جن کو ابن زیاد رَے [1] کا حاکم بنا کر بھیج رہا تھا، حضرت حسین کا معاملہ سامنے آجانے پر ابن سعد کو یہ حکم ہوا کہ پہلے تم اس معاملے سے نپٹتے جاؤ (عربی کے الفاظ ہیں اکفنی ھٰذا الرجل) انھوں نے اس خدمت سے معافی چاہی، مگر مجبور ہونا پڑا اور حضرت حسین کے نزول کربلا کی اطلاع پا کر کربلا کا رُخ کیا۔

صلح کی بات اور ناکامی

فلمّا اتاه قال له الحسین اختر واحدة امّا ان تدعونی فانصرف من حیث جئت امّا ان تدعونی فاذهب الی یزید واما ان تدعونی

پس جب ابن سعد وہاں پہنچ گئے تو حضرت حسین نے اُن سے کہا کہ تین[۳] باتوں میں سے ایک قبول کر لو یا تو میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس ہو جانے دو یا یزید کے پاس چلا جانے دو اور یا

[1] فارس کا ایک اہم شہر جو اب تہران سے تین میل کے فاصلے پر ایک مضافاتی بستی ہے۔

فالحق بالثغور[1]

کہو تو سرحدوں کی طرف (جہاں میدان جہاد گرم ہے) نکل جاؤں۔

عمرو نے آپ کی اس پیش کش کو قبول کر کے ابن زیاد کو اطلاع بھیجی۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ یوں نہیں، بلکہ انھیں پہلے "میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھنا ہوگا" "لا ولا کرامة حتیٰ یضع یدہٗ فی یدی"۔

فقال لہٗ الحسین لا واللّٰہ لا یکون ھٰذا ابداً[2]

اس پر حسین نے کہا کہ نہیں، یہ تو بخدا کبھی نہیں ہوگا۔

ایک دوسری روایت سے تائید

حضرت محمد الباقر کی روایت کے بعد طبری نے انہی کی روایت کی طرح کی ایک جامع روایت (جس میں اول سے آخر تک کا قصہ اختصار سے بیان کیا گیا ہے) اور درج کی ہے اس کے راوی حُصَین بن عبدالرحمٰن ہیں[3] اس سے بھی واقعہ کی صورت تقریباً یہی معلوم ہوتی ہے جو مندرجہ بالا روایت سے سامنے آئی۔ اس میں ہے کہ "حضرت حسینؓ اپنی منزل کی طرف وہاں کے حالات سے بالکل بےخبر گامزن تھے۔

حتیٰ لقی الاعراب فسألھم فقالوا واللّٰہ ماندری غیر انا لانستطیع ان نلج ولا نخرج

یہاں تک کہ کچھ اعرابی ملے اور آپ نے ان سے حالات کی بابت سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور ہمیں

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [2] ایضاً۔ [3] حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب لکھنوی رح (م ۱۳۸۱ھ) جو پیش نظر موضوع پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اُن کی تحقیق کے مطابق واقعہ کربلا کی تمام روایتوں میں صرف حضرت محمد الباقر کی اور حُصین بن عبدالرحمٰن ہی کی یہ دو روایتیں سند کے اعتبار سے صحیح اور بےعیب ہیں۔

اندر کی تو خبر نہیں البتہ اتنا جانتے ہیں کہ نہ ہم اِدھر سے اُدھر جا سکتے ہیں اور نہ اُدھر سے اِدھر آسکتے ہیں[1]۔

فانطلق لیسیر نحو طریق الشام نحو یزید فلیقتہٗ الخیول بکربلاء فنزل یناشدھم اللّٰہ والاسلام قال وکان بعث الیہ عمر بن سعد وشمر بن ذی الجوشن وحصین بن نُمیر فناشدھم الحسین اللّٰہ والاسلام ان یسیّروہ الیٰ امیر المؤمنین فیضع یدہٗ فی یدہٖ فقالوا الا علیٰ حکم بن زیاد[2]

اس پر آپ نے شام کے راستے کی طرف یعنی یزید کی طرف کو چلنا شروع کیا اور اسی اثنا میں مقام کربلا میں آپ کو گھڑسوار دستوں کا سامنا ہوا پس آپ اترے اور انھیں اللہ اور اسلام کا واسطہ دیکر سمجھانے لگے۔ راوی کا مزید بیان ہے کہ ابن زیاد نے عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن اور حُصین بن نُمیر کو کربلا بھیجا تھا۔ سو آپ نے انکو اللہ اور اسلام کا واسطہ دیکر کہا کہ انکو امیر المومنین (یزید) کے پاس جانے دیں، وہاں آپ اپنا ہاتھ انکے ہاتھ میں دیدیں گے۔ مگر ان لوگوں نے کہا کہ نہیں پہلے آپ کو ابن زیاد کا حکم ماننا ہوگا (یعنی ان کے پاس چلنا ہوگا)

---

[1] یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ بات چیت قادسیہ کے قریب ہی کہیں ہو رہی ہے جو کوفے کا ناکہ تھا اور جہاں روک تھام کے انتظامات تھے۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۲۲ اس روایت میں تین صورتوں کے بجائے صرف یزید کے پاس جانے والی صورت کا ذکر ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ تینوں صورتوں میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر چیز تھی۔ واللہ اعلم۔

اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں ہے، جو اوپر والی روایت میں تھا کہ عمر بن سعد نے تو حضرت حسین کی پیش کش (یا مصالحتی فارمولہ) قبول کر لیا تھا مگر ابن زیاد نے اُسے رد کر کے واحد صورت یہ تجویز کی کہ وہ کوفے آکر پہلے اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں۔ بعد میں ان کے مستقبل کا فیصلہ ہو گا۔ مگر یہاں اس بات کا ذکر نہ ہونا کہ عمر بن سعد نے تو قبول کیا تھا مگر ابن زیاد نے رد کر دیا، صرف بربنائے اختصار ہی سمجھا جانا چاہیے، ورنہ ایسی کوئی ایک روایت بھی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کرنے کی گنجائش ہو کر عمر بن سعد کو لڑائی ٹالنے سے نہیں بلکہ برپا کرنے سے دلچسپی تھی۔ ابن سعد سے متعلق تمام روایتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے پر خواہش مند تھا کہ اسکے نامۂ اعمال میں قتلِ حسینؓ نہ لکھا جائے۔ اگرچہ اس معاملے میں حکومت کو ناراض کرنے کی حد تک جانے کو تیار نہ تھا۔

جنگ اور شہادت

حضرت محمد الباقر کی روایت میں اوپر گزر چکا ہے کہ ابن زیاد کی طرف سے یہ شرط کہ "پہلے حسین اُس کے قیدی بن کر کوفے آئیں بعد میں ان کی سہ رخی پیش کش پر غور کیا جائے گا" حضرت حسین کو منظور نہیں ہوئی اور فرمایا "لا واللہ لا یکون ھٰذا ابدًا" اس کے بعد بیان ہوا ہے

نقاتلہ، فقتل اصحاب الحسین	جس پر عمر نے آپ سے جنگ کی (یا آپ
کلّھم وفیھم بضعۃ عشر شابًا	نے عمر سے جنگ کی) اور اس میں تمام
من اھل بیتہٖ وجاء سھمٌ	رفقائے حسین شہید ہوئے اور ان میں
فاصاب ابنًا لہٗ معہٗ فی حجرہٖ	۱۵۔۲۰ کے درمیان جوان آپ کے
فجعل یمسح الدم عنہ،	اہلبیت میں سے تھے۔ اور ایک تیر آکے

ویقول اللّٰھم احکم بیننا وبین	آپ کے ان صاجزادے کو لگا جو آپ کی گود
قومٍ دعونا لینصرونا نقتلونا	میں تھے۔ آپ صاجزادے کا خون پونچھتے
ثم امر بحبرۃٍ فشقّھا	جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے
ثم لبسھا وخرج بسیفہٖ	اللہ تو ہی انصاف کیجئے ہمارے اور ان
فقاتل حتّٰی قُتِل۔ صلوات	لوگوں کے درمیان جنھوں نے ہماری
اللہ علیہ۔[1]	مدد کے وعدے پر ہمیں بلایا اور پھر
	قتل کیا، پھر آپ نے ایک چادر طلب کر کے
	اُسے پھاڑا اور اپنے اوپر لپیٹا پھر تلوار
	لیکر نکلے اور قتال کیا حتی کہ شہید ہوئے
	صلوات اللہ علیہ۔

حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اس موقع پر ذرا سی اور تفصیل ہے، اُس میں کہا گیا ہے کہ ابن زیاد نے جو لشکر حسینی قافلہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا تھا اس میں ایک صاحب حُر بن یزید حنظلی بھی تھے جو ایک سوار دستے کے سالار تھے۔ انھوں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی کہ حضرت حسینؓ کی بات رد کی جا رہی ہے تو معاملہ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیا غضب ہے!

واللہ لو سألکم ھٰذا الترک	یہ بات تو اگر تم سے تُرک اور دُیلَم (کے
والدیلم ما حلّ لکم ان	کافر) بھی مانگتے تو اُن کا سوال بھی رد
تردّوہ۔[2]	کرنا تمہیں روا نہ تھا۔

مگر ہائی کمان کے ان تینوں افراد (عمر، شمر، حُصَین) نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا[3] جس پر

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [2] ایضًا ص ۲۲۲ ۔ [3] بعض دوسری روایات میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے کہ حُر نے یوم عاشورہ کی صف آرائی کے وقت ابن سعد (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

حُرّ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حضرت حسین کی صفوں میں پہنچ گیا اور وہاں سے پلٹ کر ابن زیاد کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔

فصرف الحُرّ وجهہ فرسہ وانطلق الی الحسین واصحابہ فظنّوا انّہٗ انّما جاء لیقاتلھم فلمّا دنا منھم قلّب ترسہ وسلّم علیھم ثمّ کرّ علی اصحاب ابن زیاد فقاتلھم فقتل منھم رجلین ثم قُتل رحمۃ اللہ علیہ[1]	اس پر حُرّ نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیرا اور حسین اور انکے ساتھیوں کی طرف چلا اُن لوگوں نے گمان کیا کہ یہ شخص اُن سے لڑنے آرہا ہے مگر قریب پہنچ کر حُرّ نے اپنی ڈھال کو الٹ دیا (جو دوست نہ کہ دشمن ہونے کی علامت تھی) اور سلام کیا اس کے بعد وہ اصحاب ابن زیاد پر پلٹا اور حملہ کرکے دو آدمی مارے اور پھر خود بھی جان دیدی۔

حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت کے اس زائد حصّے سے یہ سمجھنا ممکن ہوتا ہے کہ کربلا کی جنگ کا آغاز شاید حُرّ بن یزید کی تلوار سے ہوا مگر کسی دوسری روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف شکل سامنے آتی ہے جبکہ اس روایت کا بیان اتنا تشنہ ہے کہ محض اس کی بنیاد پر اس میں درج واقعہ کو جنگ کا آغاز قرار دینا مشکل ہے۔

حُرّ بن یزید دوسری روایات میں

حُرّ بن یزید کا تذکرہ واقعۂ کربلا کی دوسری روایات میں بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے، اور ماتم حسین کی مجلسوں میں انصار حسینؑ کے جب نام آتے ہیں، تو وہاں یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) امیر لشکر کو مخاطب کرکے یہ بات کہی تھی، اور ابن سعد ہی نے صرف جواب دیا تھا جو یہ تھا کہ میں تو خود ہی چاہتا تھا مگر میرا اختیار نہیں ہے۔

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۲

ایک بہت نمایاں نام ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں پہلی تفصیلی روایت یہ ہے کہ عمر بن سعد کے فوجی دستوں سے پہلے ایک گھڑسوار دستے نے آکر حضرت حسینؑ کا راستہ روکا تھا، یہ دستہ حُرّ بن یزید ہی کی قیادت میں تھا۔ اس روایت کے مطابق اس دستے کا اور قافلۂ حسینی کا سامنا کربلا سے کچھ دور پہلے ذو حُسُم پہاڑ کے دامن میں ہوا۔ یہ دستہ اس اطلاع پر کہ حضرت حسین نے اپنا رُخ کوفے سے موڑ کر اس راہ پر کر دیا ہے جو شام اور دمشق کو جاتی ہے، اس مقصد سے قادسیہ سے دوڑایا گیا تھا کہ ان لوگوں کو حراست میں کو فہ لائے۔ حضرت حسین نے اس بات سے انکار کرکے مکہ کو واپسی کا ارادہ کیا تو حُرّ اس میں حائل ہوا لیکن دل میں نرمی تھی، کسی بڑی سختی پر آمادہ نہ ہو پایا اور بیچ کی راہ یہ نکالی کہ نہ آپ کوفے جائیں نہ ہی مکّے کو، بلکہ ایک بین بین راستے پر ہم دونوں ملکے ملکے چلتے ہیں حتیٰ کہ میں ابن زیاد کو خط بھیج کر موجودہ صورت حال میں اس کا نیا حکم حاصل کروں۔ روایت کہتی ہے کہ یہ حکم آیا کہ جہاں ہو وہیں قافلے کو روک لو اور انتظار کرو۔ چنانچہ حُرّ نے جو ابن زیاد کا حکم آپ کو پہنچایا اور مزید کسی رعایت سے معذوری ظاہر کی، تو اگرچہ آپ کے کچھ ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ اس حکم کے مطابق اسی جگہ پر رُک جانا قبول کیا جائے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کسی مناسب اور اپنی پسند کی جگہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اگرچہ اس میں حُرّ کے دستے سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ مگر حضرت حسینؓ نے کسی طرح کی جنگ آزمائی کو مناسب نہ جانا اور حُرّ نے جہاں کہا وہاں آپ ٹھہر گئے ___ اور یہ کربلا کا میدان تھا۔[1]

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۲۔ کربلا کے متعلق روایتوں میں یہ بھی ہے اور اسکی بہت شہرت ہے کہ یہ بے آب و گیاہ ریتیلا میدان تھا۔ مگر واقعہ میں یہ بات بے اصل ہے۔ خود حضرت محمد الباقر والی روایت کے الفاظ کہ وہاں بانس اور نرکل (قصباء) کا جنگل تھا اسکی تردید کرتے ہیں۔ بعض روایتوں میں آپکے مقام نزول کو نینوی بھی بتایا گیا ہے۔ معجم البلدان کے مطابق یہ نینوی ایک وسیع علاقہ ہے جس میں کربلا کا قریہ واقع تھا۔ یہ وہ نینوی نہیں ہے جو شہر موصل کے پاس مشہور شہر اور ایک پرانی تہذیب کا مرکز ہے ___ ج ۲ ص ۲۱۵

آپ کے اس نزول — نزول کربلا — کی تاریخ ۲ر محرم یوم پنجشنبہ سنہ ۶۱ھ درج ہوئی ہے۔ اور طبری نے چونکہ حُر سے متعلق یہ روایت "سنہ ۶۱ھ کے واقعات" کا عنوان قائم کر کے دی ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ حُرؔ کے دستے سے آپ کے قافلے کا سامنا یکم محرم سنہ ۶۱ھ کو ہوا۔ یعنی اس سے پہلے نہیں۔ اس کے بعد روایت کا سلسلۂ بیان کہتا ہے کہ اگلے دن یعنی ۳ر محرم یوم جمعہ کو — عمر بن سعد کی سرکردگی میں چار ہزار نفوس پر مشتمل مزید فوجی دستے پہنچ گئے۔

دونوں روایتوں میں تطبیق

حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت اور دوسری روایتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے اُسے ہم اجمال اور تفصیل کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ بایں معنی کہ حُرؔ بن یزید کا پورا قصّہ اسی تفصیل کے مطابق ہو جو ابھی اوپر بیان ہوئی لیکن حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اس کا اختصار کر کے بس حُرؔ کی موجودگی میدان کربلا میں دکھائی گئی ہے۔

حُرؔ کے کردار کی کچھ اور تفصیلات

لیکن اس موجودگی کے بعد حُرؔ کے جس خاص کردار کا بیان حُصین کی روایت میں ہوا ہے کہ وہ اپنے دستے کی قیادت چھوڑ کر حضرت حسینؓ کی صفوں میں جا ملے اور پھر اُدھر سے پلٹ کے عمر بن سعد کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، اس کردار کی جو تفصیلی شکل طبری کی دوسری روایتوں میں بیان ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ جسے تفصیل اور اجمال کا فرق کہہ کر قبول کر لیا جائے بلکہ یہ دراصل میدان کربلا کے واقعات کی اُس "تفصیل" کا حصّہ ہے جس کا وجود بظاہر عالم واقعہ میں نہیں ہوا بلکہ وہ مصنفین مقاتل یا ان کے "راویوں" کی قوت تخیّل کا کرشمہ ہیں۔

اس نوعیت کی تفصیلی "روایتوں" کے مطابق جن کا سلسلہ طبری میں صفحہ ۲۳۴ سے

تقریباً ۲۶۸ تک یعنی تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ صفحات میں پھیلا ہوا ہے) حُرؔ نے یوم عاشورہ میں عین اس وقت جبکہ دونوں طرف صف بندی ہو چکی تھی اپنے سرداران لشکر کی آنکھوں کے سامنے بڑی باریک حکمت عملی سے کام لیکر اپنی صف کو پار کیا اور صفِ حسینی میں جا پہنچے۔[۱] اوّلاً معافی تلافی کی کہ یہ میرا ہی قصور ہے جو آپ کو آج یہ صورت حال درپیش ہے۔ ورنہ میں اگر آپ کا راستہ نہ روکتا تو آپ سلامتی کے ساتھ واپس ہو چکے ہوتے۔ اس کے بعد اپنی معافی اور توبہ کی قبولیت کا اطمینان حضرت حسینؓ کی زبان سے حاصل کیا۔ پھر پلٹ کر لشکر ابن زیاد کی طرف گئے اور ایک تقریر ان کو مخاطب کر کے کی۔

"اے لوگو، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ حسین کی پیش کردہ باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی تم قبول نہیں کرتے — "لوگوں" نے کہا کہ "ہمارے امیر عمر بن سعد سے بات کرو۔ پس انھوں نے عمر کو مخاطب بنا کر یہی بات کہی۔ عمر نے جواب دیا کہ "مجھے تو خود بیحد خواہش تھی، اگر میرے بس میں بات ہوتی" اس پر حُرؔ پھر عام لوگوں سے مخاطب ہو گئے کہ "اے کوفیو خدا تمھیں غارت کرے۔ تم نے ان کو بلایا اور بلا کر دشمن کے حوالے کر دیا۔ تم نے دعویٰ کیا تھا کہ تم اپنی جانیں ان پر قربان کرو گے۔ اور اب تم اُلٹا ان کو قتل کرنے کے درپے ہو۔ تم نے انھیں گھیر لیا ہے اور گھوٹ کے مارنا چاہتے ہو۔ اللہ کی لمبی چوڑی زمین میں سے کسی طرف کو چلے جانے کا اذن نہیں دے رہے کہ وہ اور ان کے اہلبیت امن پائیں۔ تم نے ان کو ایسا بے بس قیدی بنا لیا ہے کہ اپنے نفع نقصان کا کچھ بھی اختیار ان کو نہیں رہ گیا۔ تم نے اُن کو، اُنکی عورتوں اور ساتھیوں کو فرات کے اس بہتے پانی سے محروم کر رکھا ہے، جسے یہودی مجوسی اور نصرانی بھی پیتے ہیں اور علاقے کے خنزیر اور کُتّے اس میں لوٹتے ہیں ادھر یہ ہیں کہ پیاس سے مرے جاتے ہیں۔ کیا ہی بُرا سلوک ہے جو تم نے ذرّیت

---

[۱] اس حکمت عملی کی تفصیل خاصی طویل ہے۔ طبری ج ۶ ص ۲۴۴۔

محمدؐ کے لیے روا رکھا ہے، خدا انھیں بھی (قیامت کی) پیاس کے دن پانی کے قطروں کو ترسائے۔ اگر تم اس وقت کا رویہ چھوڑ کر اس سے توبہ نہیں کرتے ہو[1]۔"

اور سب باتیں چھوڑیئے اس بات کا یقین تو درکنار، کیا امکان بھی مانا جاسکتا ہے کہ لشکر کا ایک افسر عین میدان جنگ میں کھلی غداری کر کے "دشمن" کی صفوں[2] کا حصہ بنجائے اور لشکر کا افسر بالا نہ صرف یہ کہ دشمن کی صفوں سے اس کی تقریر سننے اور اپنے فوجیوں کو سننے دینے کے لیے تیار ہوجائے، بلکہ اس کے جواب میں ایسے الفاظ بھی کہے کہ:-

"تم جانتے ہو کہ میرے بس میں کچھ نہیں۔ ورنہ میں تو شروع ہی سے اس بات کا حامی اور حریص ہوں کہ حسینؓ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک بات مان لیجائے"؟

ظاہر ہے کہ یہ تو عام حالات میں بھی ایک ناقابلِ تصوّر بات ہے۔ مگر یہاں تو حالات بھی عام قسم کے نہ تھے۔ اسی تاریخ طبری کی روایات کے مطابق یہ صورتِ حال تھی کہ عمر بن سعد کی ہر ممکن کوشش کے باوجود کہ اُسے اس مہم پر نہ بھیجا جائے ابن زیاد نے مجبور کر کے بھیجا تھا۔ پھر جب انھیں روایتوں کے مطابق[3] اس ● نے حضرت حسین کی طرف سے مصالحت کی پیش کش اور اُس کا فارمولا اپنی سفارش کے ساتھ ابن زیاد کو بھیجا تو وہاں سے جواب آیا تھا کہ:-

"میں نے تم کو اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تم وہاں جاکر اپنی بچت کی راہیں نکالو، حسین کو ڈھیل دو اور بقاء و سلامتی کے خواب دکھاؤ، نہ اسلیے کہ وہاں جاکر اُن کے سفارشی بن بیٹھو۔ دیکھو اگر حسین اور ان کے ساتھی میرا حکم مانتے اور اپنے آپکو سپرد کر دیتے ہیں تو انھیں یہاں بھیجدو۔ ورنہ ان پر یلغار کر دو اور نہ صرف قتل کرو بلکہ ان کا مُثلہ کرو (ناک کان کاٹو) اسلیے کہ یہ اسی کے قابل ہیں، اور خاص کر

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۵ [2] غلط فہمی نہو یہاں "دشمن" کا لفظ ابن زیاد کی فوج کے نقطۂ نظر سے اور اس کے احساس کی ترجمانی کے طور پر لکھا گیا ہے۔ [3] جی ہاں "انہی روایتوں کے مطابق" ورنہ آگے جو بات نقل کی جا رہی ہے اس مصنف کے نزدیک اسکا بیشتر حصہ تو بالکل من گھڑت ہے اور ہو سکتا ہے کہ کُل ایسا ہی ہو۔

حسین قتل ہوں تو ان کا سینہ اور پُشت گھوڑوں سے رَوندو۔ اسلیے کہ وہ حکومت کے نافرمان، باغی، حریف اور نہایت خطا کار ہیں[1]۔"

نیز یہ بھی اس سلسلے کی روایات میں موجود ہے کہ ابن زیاد نے یہ جوابی خط شمر ذی الجوشن کو اس ہدایت کے ساتھ دیکر کربلا روانہ کیا تھا کہ اگر عمر بن سعد پھر بھی لیت و لعل کرے تو لشکر کی کمان تم ہاتھ میں لو اور عمر کا سر کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دو[2]۔

چنانچہ جیسا کہ حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اوپر گزرا اور اس کے سوا بھی طبری کی متعدد روایتیں یہی بات بتاتی ہیں کہ، عمر بن سعد حضرت حسین کی پیش کش قبول کرنے سے عذر کر کے ان کے سامنے بس یہی ایک فیصلہ کن بات رکھنے پر مجبور ہوئے کہ آپ اپنے آپکو ابن زیاد کے حکم کے مطابق (جو سرکار یزید کی طرف سے حضرت حسین کے معاملے میں کلّی (FULL) مختار بنادیئے گئے ہیں) ہمارے حوالے کردیں۔

کیا کوئی امکان ان حالات میں اس بات کے سوچے جانے کا ہے کہ اسی عمر بن سعد نے اپنے لشکر کے ایک باغی کی نہ صرف تقریر خود سنی اور اپنے لشکر کو پورے سکون و اطمینان سے سننے دی بلکہ نہایت ندامت کے ساتھ علی الاعلان یہ جواب بھی دیا کہ "میں کیا کروں مجبور ہوں؟" ہاں یہ بات ہوسکتی تھی جبکہ مان لیا جائے کہ عمر بن سعد کو گرفتاری یا جنگ کیلئے نہیں بلکہ صلح کی گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ایسی صورت میں ۴-۵ ہزار فوج کی کوئی تُک نہ بیٹھے گی۔

ایک اور روایت اس قصے کو اور بھی زیادہ ناقابلِ تصور بنانے والی سن لیجئے۔ طبری کی اسی جلد ص ۲۲۲ پر ہے کہ عمر بن سعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرمی دور کرنے کے لیے نہر میں گھسے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر کان میں کہا: امیر ابن زیاد نے جُویریہ بن بدر

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۶ [2] ایضاً۔

تیمی کو اس ہدایت کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ (عمر) اگر حسین اور اُن کے ساتھیوں سے جنگ نہیں کرتے ہیں تو وہ آپ کی گردن مار دے۔ عمر نے یہ سنا تو کود کر اپنے گھوڑے کی طرف آئے، سوار ہوئے اور گھوڑے ہی پر بیٹھے بیٹھے ہتھیار منگا کر سجائے اور لشکر لے کر حسینی قافلے پر پہنچے اور جنگ کی"۔ ذرا غور کر لیجیے کہ ایک طرف یہ روایتیں اور ایک طرف وہ روایتیں! کیا کوئی بھی صورت دونوں کے بیک وقت درست ہونے کی ہے؟[1]

اور یوم عاشورہ کی باقی کہانی

حیرت مصنفینِ مقتلِ حسینؓ یا ان کے راویوں پر نہیں، جنھوں نے واقعۂ کربلا کو ایک بھرپور رزمیہ داستان کا روپ دینے کے جوش میں اس کے مبیّنہ واقعات کے سلسلے میں امکان اور عدمِ امکان سے بحث نہیں رکھی۔ حیرت اپنے مؤرخین پر ہے کہ یہ باہم متضاد اور ناممکن الوقوع قسم کی حکایتیں قطار در قطار انھوں نے اپنی کتابوں میں جمع کر لی ہیں۔ جیسے حُرّ کی تقریر کی یہ روایت ہے ایسے ہی انھیں حالات میں جن کی طرف اوپر دو تین اشارے کیے گئے، کتنی ہی روایتیں اور حکایتیں ہمیں حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کی کتنی ہی چھوٹی بڑی تقریریں سناتی ہیں۔ دو دو آدمی عمر بن سعد کی گردن مارنے کا حکم لیے ہوئے موجود ہیں۔ اور ایک تو ان میں شمر جیسا بدنام بھی ہے۔ مگر ابن سعد ہیں کہ نہ صرف حسینؓ کے خلاف تلوار آزمائی میں "بدستور" دیر لگا رہے ہیں بلکہ اس طرح دیر لگا رہے ہیں کہ اپنے فوجیوں کو وہ تقریریں سُنواتے ہیں جو انھیں بغاوت پر آمادہ

[1] اور یہ تمام گفتگوِ حُر کے بارے میں اس بنیاد پر ہو رہی ہے کہ وہ ابن زیاد کا ایک فوجی افسر تھا جیسا کہ مشہور روایات میں ہے۔ مگر یاد کیجیے حضرت محمد الباقر والی روایات۔ اس کی رو سے یہ شخص مخالف فریق سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتا تھا ایک عام آدمی تھا، جو کوفے کی طرف سے آتا ہوا حضرت حسینؓ کو ملا تھا۔

کرنے کے لیے "دشمنوں" کی صفوں سے کی جا رہی ہیں۔ اہلِ تشیع اپنے ائمہ کے لیے معجزات کا ویسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسے ہم انبیاء علیہم السلام کے لیے[1]۔ وہ اگر ان ناممکنات کے قائل ہیں اور ایک ہی وقت میں متضاد باتوں کے وقوع کا بیان منبر پر کرتے ہیں تو ٹھیک ہیں وہ بطور معجزۂ امام اِن باتوں کا قائل اپنے آپکو کر سکتے ہونگے مگر ہم لوگ جو اِن "ائمہ" کے لیے تمام تر احترام کے باوجود کوئی معجزہ نہیں مانتے وہ کیسے انتہائی درجہ کی ان متضاد روایتوں کو اپنے دل و دماغ یا اپنی کتابوں میں جگہ دیتے ہیں؟ ان متضاد اور اعجوبہ روایتوں کے جنگل میں تقریباً دس ماہ پہلے داخل ہو کر یہ راقم الحروف جس حیرت میں مبتلا ہوا تھا آج تک اُس حیرت کا وہی عالم بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہے۔ اب تک یہ معمہ حل نہیں ہو پایا کہ ہمارے مؤرخین نے کیسے اس جنگل کو اپنی کتابوں میں سجایا ہے؟

حضرت حسینؓ اور رفقاء کی تقریریں

طبری نے روایت بیان کی ہے کہ شمر بن ذی الجوشن، عبیداللہ بن زیاد کا وہ حکمنامہ عمر بن سعد کے پاس لے کر آیا (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) جس میں کہا گیا تھا کہ حسینؓ سے نپٹنے کے معاملے میں فضول وقت مت گنواؤ تمھیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ انھیں حراست میں لے کر یہاں آؤ، حراست قبول نہیں کرتے تو قتال کر کے قصہ ختم کر دو، ورنہ ہم نے شمر کو ہدایت کی ہے کہ وہ لشکر کا چارج تم سے لے لے۔ ابن سعد نے خط دیکھ کر کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ معاملہ تم ہی نے خراب کیا ہے۔ ورنہ ابن زیاد حسین کی پیش کردہ تین صورتوں میں سے کسی ایک کو مان ہی لیتا اور پھر یہ کہہ کر کہ نہیں، میں ہی مفوّضہ مہم کو انجام دونگا۔

[1] کتاب کے پہلے ایڈیشن کے تبصرے پر ایک تبصرہ نگار نے اس جملے پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں دونوں عقیدوں کو یکساں بتایا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ مگر اس میں غلطی دراصل تبصرہ نگار سے ہو رہی تھی کہ اس نے "ویسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں" کو "ہی عقیدہ رکھتے ہیں" کے معنیٰ میں لے لیا۔

اُس نے اُسی وقت فوج کو حملے کے لیے کوچ کا حکم دیدیا۔ یہ محرم سنہ ٦١ھ کی ٩ تاریخ پنجشنبہ کا دن اور عصر کا وقت تھا[١]۔ اس کے بعد بیان ہوا ہے کہ ان لوگوں سے یہ کہہ کر مہلت (حضرت حسین کی طرف سے) مانگی گئی کہ بھئی یہ تم ایکدم سے چڑھ آئے، ہمیں بتایا تو ہوتا۔ کہ کوفے سے ہماری پیش کش نامنظور ہوگئی ہے۔ بات معقول تھی۔ شمر کو بھی اتفاق کرنا پڑا اور اس قرار داد پر فوج واپس ہوگئی کہ صبح تک آپ لوگ فیصلہ کرلیں، صبح کو یا تو سپردگی ہوجائے ورنہ ہم طاقت استعمال کریں گے[٢]۔

حالات کی جو صورت اوپر بیان کی گئی تھی اس میں ٩ محرم کی شام کو داخل ہونے والے اس نئے عنصر کا بھی اضافہ کرلیجئے، جس کا ابھی ذکر ہوا کہ دشمن ٩ محرم کی شام ہی کو حملہ آور ہونے کے لیے آیا اور بمشکل صبح تک کا وقت دیکر واپس گیا کہ رات میں فیصلہ کرلیں کہ پُر امن سپردگی منظور ہے یا مزاحمت۔ اور پھر اس پس منظر میں ذرا غور کیجئے کہ کیا یہ بات قابل یقین نظر آتی ہے کہ ١٠ تاریخ کی صبح عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن کے ساتھ (اور اُس عمرو بن الحجاج کے ساتھ جسے ہم روایتوں کے مطابق کچھ ہی دیر بعد رفقائے حسین پر نہر فرات کا راستہ روکتے ہوئے پاتے ہیں) اپنی فوج لیے ہوئے آتا ہے تو نہ یہ پوچھتا ہے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ اور نہ ہی کسی علامت سے یہ نتیجہ اخذ کرکے کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے[٣] حملہ آور ہوتا ہے، بلکہ اپنی چار پانچ[٤] ہزار فوج ــــ اور شیعہ مصنفین کے مطابق کم از کم بتیس تیس ہزار فوج[٥] کے ساتھ آکر بہتر پیادوں اور تیس سواروں[٣] کے سامنے اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کچھ برابر سرابر کی بات ہو اور باقاعدہ جنگ ہونی ہو[٥]۔ اور پھر اس صورت حال میں حضرت حسینؓ انہیں

---

[١] طبری ج ٦ ص ٢٢٦-٢٣٣ [٢] ایضاً ص ٢٢٨ [٣] روایت میں ہے کہ صبح کو جب لشکر حسینی خیموں پر پہنچا تو دیکھا کہ خیموں کے اردگرد آگ روشن ہے جس سے سمجھا جاسکتا تھا کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے اور یہ حفاظتی انتظام ہے۔
[٣] شہید انسانیت، از قبلہ علی نقی صاحب لکھنوی۔ ص ٣٧٠ [٤] کوئی بھی حکومت اپنے باغیوں کے ساتھ حتی الامکان، برابر کے حریفوں والا معاملہ نہیں کرتی چہ جائیکہ اتنا کمزور حریف۔

مخاطب کرکے کچھ فرمانے کے لیے" اونٹنی پر سوار ہو کر تشریف لاتے ہیں[١]۔ اور آپ کو پورا موقع دیا جاتا ہے کہ جو کچھ فرمانا ہو فرمائیں۔ چنانچہ حسب روایت وہ فرماتے ہیں :۔

"اے لوگو، میری بات سنو، جلدی سے کام نہ لو، یہاں تک کہ مجھ پر جو تمہارا حق ہے اس کے ماتحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کروں اور تمہارے سامنے یہ حقیقت حال بیان کردوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کرلیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہوگی۔ اور تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے لیے میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے مجتمع کرلو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کرلو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی مہلت دیئے ہوئے میرا خاتمہ کردو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک عمل بندوں کا مددگار ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ حضرت حسین کے یہ ارشادات جب (خیموں میں) ان کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنے تو وہ چیخیں چلائیں اور روئیں اور ان کی آواز بلند ہو کر باہر پہنچی تو آپ نے اپنے بھائی عباس اور اپنے بیٹے علی کو بھیجا کہ "جاؤ انھیں چپ کراؤ، کس قدر یہ لوگ رو رہی ہیں۔" پھر جب وہ چپ ہوگئیں تب آپ نے از سر نو حمد و ثنا سے تقریر شروع کی اور فرمایا :۔

"ذرا تم میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منھ ڈالو اور غور کرو کہ کیا تمہارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کا نواسہ نہیں ہوں، اور اُنکے

---

[١] طبری ج ٦ ص ٢٤٢

وصی اور اور ان کے چچازاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور اُنکی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں ؟ کیا حمزہ سید الشہدا میرے باپ کے چچا اور جعفر طیار خود میرے چچا نہیں تھے، کیا حدیث جو زبان زد خلائق ہے تمھارے کانوں تک نہیں پہنچی کہ حضرت رسول خدا نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ دونوں جوانانِ اہل جنّت کے سردار ہیں ؟" اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتہً وہ سچ ہی ہے (اس لیے کہ میں نے جب سے یہ جانا کہ اللہ جھوٹ بولنے والے سے ناراض ہوتا ہے اور خود اس کا جھوٹ بھی اسے نقصان دیتا ہے، تب سے میں نے کبھی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا) پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے اشخاص ہیں جن سے اگر تم پوچھو تو بتلادیں گے۔ پوچھ لو جابر بن عبداللہ سے، ابوسعید خُدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، اَنس بن مالک سے وہ تمھیں بتلائیں گے کہ انھوں نے رسالت مآب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے، پھر کیا یہ تمھیں میری خونریزی سے روکنے کیلئے کافی نہیں ہے ؟[1]"

راوی کہتا ہے کہ "اس موقع پر شمر آپ کا قطع کلام کرتے ہوئے بولا کہ "میں خدا کی تابعداری کنارے پر کھڑے ہوکر کرنے والوں میں سے (یعنی منافقوں میں سے) ہوں، اگر ذرا بھی سمجھا ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" حبیب بن مظاہر، یکے از رفقاء حسینؑ نے جواب میں کہا کہ واللہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تو اللہ کی تابعداری ایک کنارے پر نہیں، ستّر کناروں پر کھڑے ہوکر کرتا ہے (یعنی پرلے درجے کا منافق ہے) اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہہ رہا ہے کہ تیری سمجھ میں حضرت کی بات ذرا بھی نہیں آرہی۔ کیونکہ اللہ نے تیرے دل پر مہر لگادی ہے۔"

اس کے بعد حضرت حسینؑ نے سلسلۂ تقریر دوبارہ جاری کرتے ہوئے فرمایا:-

"اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے،

[1] ہمارے جو بزعمِ علم درایت پر ایسے درایت غور کرنے کے عادی ہیں، انھیں شاید ہی یہ ماننے سے اختلاف ہو کہ یہ سب گھڑی ہوئی روایت ہے۔

کہ میں تمھارے رسول کا نواسہ ہوں، اور خدا کی قسم مشرق سے مغرب تک کوئی بھی رسول خدا کا نواسہ میرے سوا موجود نہیں ہے، نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا کسی دوسری قوم میں۔ بس میں ہی ایک تمھارے نبی کا نواسہ ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تم کیوں میرے درپے ہو؟ کیا کسی مقتول کا بدلہ لینے کو، جس کو میں نے قتل کیا ہے ؟ یا کسی مال کے سلسلے میں جس کو میں نے تلف کردیا ہے ! یا کسی کو زخم لگایا ہے جس کا قصاص مطلوب ہے ؟

راوی کہتا ہے کہ "کوئی جواب کسی طرف سے نہیں ملا" تو آپ نے نام لے لے کر ان میں سے بعض کو مخاطب کیا :-

"اے شبث بن ربعی، اے حجار بن اَبجر، اے قیس بن اَشعث، اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ "باغات میں بہار ہے، کھیتیاں سرسبز ہیں، چشمے ابل رہے ہیں، اور مسلح لشکر آپ کی پذیرائی کو چشم براہ ہیں۔ پس قدم رنجہ فرمائیے ؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں، ہم نے تمھیں کوئی خط نہیں لکھا یہ سن کر ارشاد ہوا۔ اللہ اکبر، اتنا بڑا جھوٹ ! قسم ہے خدا کی تم نے لکھا تھا۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا :-

"اے لوگو، اگر تمہیں میرا آنا ناپسند ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ روئے زمین پر جہاں کہیں اپنے لیے امن وامان کی جا سمجھوں چلا جاؤں۔ اس پر قیس بن اشعث نے کہا کہ آپ اپنے بنی عم[1] کا حکم کیوں نہیں مان لیتے ؟ آپ کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ جو آپ چاہیں گے وہی آپ کے ساتھ ہوگا۔ حضرت نے فرمایا : تم اپنے بھائی ــــ محمد بن اشعث ــــ کے بھائی ہی تو ہو۔ کیا تمھاری خواہش ہے کہ بنو ہاشم تم پر مسلم بن عقیل کے علاوہ کسی دوسرے خون کا بھی دعویٰ[1]

[1] مسلم بن عقیل کے واقعہ میں گذر چکا ہے کہ ان کی گرفتاری محمد بن اشعث کے ذریعہ ہوئی تھی۔

کریں۔ نہیں خدا کی قسم میں ذلّت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں نہیں دونگا۔ اور نہ غلاموں جیسے اقرار تمھارے آگے کروں گا۔ اے لوگو، میں تمھارے رب کی اور اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو، اور میں پناہ مانگتا ہوں ہر متکبّر سے جسے یوم حساب پر ایمان نہیں۔"

راوی کہتا ہے کہ "اس کے بعد آپ نے اونٹنی کو بٹھایا، اُترے اور عقبہ بن سمعان (خادم) کو حکم دیا کہ اسے باندھ آئے اور اب دشمن آپ کی طرف بڑھنے لگا۔"[1]

حضرت حسینؑ کی یہ مبیّنہ تقریر اس سوال پر غور کرنے کے لیے من وعن نقل کی گئی ہے کہ جب امیر لشکر عمر بن سعد کو اتنے سخت احکام ہوں جیسے کہ اوپر طبری کی روایتوں سے نقل کیے گئے۔ دو دو آدمی اُن روایتوں کے مطابق، ان تاکیدی احکامات کے ساتھ بھیجے گئے ہوں کہ اگر عمر بن سعد حسین کو ڈھیل دینے اور معاملے کو طول دینے کی روش سے باز نہ آئے تو اُس کی گردن کاٹ کر ہمارے پاس بھیجدی جائے اور معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے، کیا اس سب کے باوجود (اور مزید اس کے باوجود کہ ایک شب کی جو آخری مہلت حضرت حسین کو ۹ کی شام کو دی گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور ان کی طرف سے سرِ تسلیم خم کرنے کی بات سامنے نہیں آئی) یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ۱۰ کی صبح کو عمر بن سعد اپنا لشکر لے کر خیامِ حسینی پر آئے تو بجائے اس کے کہ فوراً کوفے کے احکام کی تعمیل شروع کرے وہ حضرت حسینؑ کو موقع دیتا ہے کہ اس کے ساتھیوں میں اپنے ایک طویل خطاب کے ذریعہ کوفے اور دمشق کی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کریں؟ حقیقتاً یہ قابلِ تصوّر بات بھی نہیں ہے، چہ جائیکہ بطور واقعہ پیش آئی ہو، ہاں کوئی حضرت حسینؑ کے لیے معجزہ کی قدرت کا قائل ہو تو اسکے لیے شاید یہ بات قابلِ تصوّر ہو سکتی ہو۔ . .

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳-۲۴۲ حضرت کی تقریر کے آغاز سے یہاں تک اقتباسات کے ترجمے میں اپنی سہولت کی خاطر ہم نے قبلہ علی نقی صاحب کے ترجمے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن کلیتہً انحصار نہیں کیا گیا۔

معاملہ کا ایک اور پہلو

اس سوال سے قطع نظر جس کی بنیاد تقریر کے ماحول اور موقع پر رکھی گئی ہے اور اسی موقع و محل کے پیش نظر ہم مجبور ہوئے ہیں کہ اس تقریر کی واقعیت میں کلام کریں، (اس سے قطع نظر) تقریر میں داخلی شہادتیں بھی اس بات کی صاف نظر آ رہی ہیں کہ یہ واقعہ نہیں کچھ لوگوں کی تخئیلی قوت کا کرشمہ ہے۔ عہد نامۂ جدید کی انجیل مرقس جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو تختۂ دار پر چڑھا ہوا دکھاتی ہے وہ آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمۂ شکایت وجزع وفزع کہلواتی ہے کہ:۔

اِلوھی اِلوھی لما سبقتنی[1]

اے میرے اللہ، اے میرے اللہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے؟

اسلامی ذہن کی رو سے یہ کیسا بُرا داغ ہے جو اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے دامن صبر و رضا پر لگایا گیا ہے۔ مگر حضرت حسین کی طرف مذکورۂ بالا تقریر منسوب کرنے والوں نے اس سے کہیں زیادہ بڑا داغ نواسۂ رسولؐ کے دامانِ عزّ و شرف کو لگایا ہے۔ اہل انجیل نے پیغمبر کو بہرحال صرف خدا ہی کے سامنے رُلایا اور اس سے شکوہ کرایا ہے۔ مگر ان لوگوں نے پتہ نہیں یہ کس سطح کے لوگ تھے؟ ــــ حضرت حسین کو ان غدّار کوفیوں اور ابن زیاد کے کاسہ لیسوں کے سامنے ہر ہر رُخ سے اور ہر ہر رنگ میں جان کی امان مانگتے دکھایا ہے جنکی طرف رخ کرنے کی اجازت بھی غیرت کے قانون میں نظر نہیں آتی۔ اور یہ تو عام قانون غیرت کی بات ہے یہاں تو معاملہ ریحانۂ رسولؐ کی غیرت کا اور ہاشمی خون کی غیرت کا ہے۔

وہ مرتبہ ناشناس اور زمانہ ساز جنھوں نے کل آپ کے بڑے بھائی حضرت حسن مجتبیٰ کو رنج دینے اور رسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور جو آج چند ٹکوں یا چھوٹے بڑے مرتبوں کی خاطر آپ کا خون بہانے کو . . . لشکرِ اعداء میں شامل ہو گئے تھے جس میں شمر جیسے زباں دراز بھی تھے جس نے ابھی ابھی آپ کے خیموں کے گرد آگ کے الاؤ دیکھ کر

پکارا تھا:-

یاحسین استعجلت النار — اوحسین، یہ آگ کی ایسی جلدی کہ قیامت سے

فی الدنیا قبل یوم القیامۃ۔ — پہلے دنیا ہی میں اس کا بندوبست کرلیا؟

ان بے ادبوں اور مسخ فطرتوں کے سامنے آپ واسطے دینے اٹھے اپنی نسبی عظمتوں کا! نواسۂ رسولؐ ہونے کا! ابن فاطمہ بنت الرسولؐ ہونے کا! ابن علی مرتضیٰ وصی رسولؐ ہونے کا! حضرت حمزہ سید الشہداء سے اپنی قرابت کا اور جعفر طیارؓ سے رشتے کا! کیا واقعی یہ باتیں کسی ایسے آدمی کے لیے قابلِ تصور ہیں جو سچ مچ حضرت حسینؓ کا کچھ مرتبہ سمجھنے کے قابل ہو؟ اور یوں بھی یہ واسطے دینا تو کسی بھی حالت میں حضرت حسین جیسے مرتبے کے انسان کے لیے موزوں بات نہیں ہو سکتی۔ بہت کم شعور اور کم سطح کے لوگ ایسے واسطوں کا استعمال کرتے ہیں۔

آگے آیئے۔ تقریر کے اس حصے پر وہی شمر ایک بار پھر زبان درازی کا وہ مظاہرہ کرتا ہے جو اوپر گذر چکا اور خالص لوبھی لہجے میں کہتا ہے ع

سمجھ میں کچھ نہیں آیا یہ تم نے کیا سنایا تھا

مگر افسوس کہ یہ خطابِ حسینی کے مصنف اس کے بعد حضرت والا کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ چلو تمھیں میرے اور میرے بھائی کے بارے میں جوانانِ جنت کی سرداری والی حدیث کی صحت کا یقین نہیں تو کیا یہ بھی تمھارے لیے ممکن ہے کہ میرے نواسۂ رسولؐ ہونے میں شک ظاہر کرو؟ کیا مشرق و مغرب میں ایک میرے سوا کوئی اور ہے جسے نواسۂ رسولؐ ہونے کا دعویٰ ہو؟ کل روئے زمین پر میں تنہا ہوں جو اس شرف کے ساتھ مشرف ہو۔ بتاؤ اس کے باوجود تم کیسے میرے خون کے پیاسے ہو؟

اور ابھی بس کہاں؟ وہ شبث بن ربعی، وہ حجار بن ابجر وہ قیس بن اشعث اور یزید بن حارث جن کے دستخطی خط حضرت والا کی تحویل میں موجود تھے جن میں بڑے اشتیاق سے کوفے میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی گئی تھی ——— یہ

چاروں[۱] اپنی بے غیرتیوں کے ساتھ صفِ اعداء میں اپنے اپنے قبیلوں کی کمانیں سنبھالے کھڑے تھے۔ حضرت حسین کو ان بے غیرتوں سے بھی تو نام بنام مخاطب ہو کر ان کے خطوط یاد دلاتے دکھایا گیا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ — پتہ نہیں یہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس طرح دانستہ یا نادانستہ سبطِ رسولؐ کی رسوائی کا سامان کیا ہے؟

اور ہاں وہ خواتینِ خانوادۂ نبوت جن کے ذکر کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط اور عزیمت و خودداری کی صفات تصور میں آتی ہیں۔ وہ نقشِ فاطمی ذہن میں ابھرتا ہے، جو میدانِ اُحد میں قائم ہوا تھا کہ سیدۂ فاطمہ کسی آہ و بکا کے بجائے اپنے والد ماجد (اور ہمارے آقائے نامدار) کی مرہم پٹی کا حوصلہ دکھا رہی اور دوسروں کا حوصلہ بڑھا رہی ہیں۔ اور پھر عائشہ صدیقہؓ کا وہ نقش کہ زخموں کو دھونے اور زخمیوں کو پانی پلانے کے لیے مشک اٹھائے دوڑ رہی ہیں۔ ان صفات کی جگہ پر ہمیں یہ کربلا میں "خطابِ حسینی" کا قصہ سنانے والے سناتے ہیں کہ ابھی تلوار چلی نہیں، کوئی معرکہ ہوا نہیں، کوئی خون نہیں، کوئی زخم نہیں، فقط ایک جملہ حضرت حسین کی زبان سے ابتدائے تقریر میں نکلا کہ "اگر تم نہیں مانتے تو پھر ایک دم کی بھی مہلت دیئے بغیر پوری طاقت سے اٹھو اور میرا خاتمہ کر دو" بس اتنا سننا تھا کہ خانوادۂ نبوت کے خیمے ماتم کدے بن گئے اور آہ و بکا کا وہ شور برپا ہوا کہ حضرت کو تقریر روک دینا پڑی۔

حقیقت (کم از کم راقم کے نزدیک) یہ ہے کہ پوری تقریر اور اس کے درمیانی قصے گویا لکھے ہی اسی نقطۂ نظر سے گئے ہیں کہ واقعۂ کربلا کے نام پر ایک ماتمی فضا پیدا کرنے میں مدد مل سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ واقعیت سے ان کا دور دور بھی کوئی تعلق ہی نہیں، نہ ہو سکتا ہے۔ واقعیت اگر ہے تو اُس دعا میں ضرور نظر آتی ہے، جو تقریر والی روایت سے متصلاً پہلے کی روایت میں[۲] طبری نے دی ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب (۱۰ کی) صبح کو دشمن کا لشکر آ پہنچا تو

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۱۹۷ پر ان لوگوں کے خط اور ناموں کا ذکر ہے، وہ نام چار سے زیادہ ہیں، البتہ قیس بن اشعث کا نام ان میں نہیں ہے۔ [۲] طبری ج ۶ ص ۲۴۰-۲۴۱

حسینؓ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور (یوں بارگاہِ احدی میں) عرض کناں ہوئے :-

"خداوندا تو ہی میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں، میرا قبلۂ امید ہے ہر کلفت میں، اور تجھ ہی پر ہر مہم میں جو مجھے درپیش ہو، میرا بھروسہ ہے۔ کتنے ہی حالات ایسے ہیں جن کے مقابلے میں دل کمزور پڑجاتا ہے اور تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں، دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دشمن طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں، میں ان حالات کو تیرے حضور پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں فریاد کیا کرتا ہوں، اسلیے کہ تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا میں جانتا نہیں۔ پس تو حالات کی تکلیف اور ان کی ناسازگاری کو دور کرتا اور راہ نکالتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک، ہر بھلائی کا سرچشمہ اور ہر امید کا مرکز ہے۔"

یہ دعا اگر معیارِ روایت کے اعتبار سے کوئی کمزوری نہیں رکھتی تو اس کی واقعیت تسلیم کرنے میں ذرا بھی اشکال نہیں، کیونکہ یہ مبینہ تقریر کے برعکس موقع و محل کا عین تقاضہ ہے، اور حضرت حسین سے پورے طور پر متوقع اور ان کے شایانِ شان ہے۔

زُہیر بن قین کی تقریر

دو تقریریں جو اوپر درج ہوگئیں، ایک حُر بن یزید کی اور ایک خود حضرت حسینؓ کی، ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی اس ماحول اور صورتِ حال میں جو کربلا کے سلسلے کی روایتیں بتاتی آرہی تھیں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہاں تو ایسی تقریروں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ لگتا ہے کہ معرکۂ کارزار نہیں۔ مبلغ عکاظ تھا۔ طوالت ہوئی جاتی ہے، مگر ایک تقریر اور سن لیجئے۔ یہ زُہیر بن قین نام کے ایک ساتھی ہیں۔ اور ان کی بھی کچھ ایسی اہمیت ہے جیسی حُر بن یزید کی۔ ایک ایسا شخص اس تقریر کا راوی بنایا گیا ہے جو ابن زیاد کی فوج میں شامل تھا نہ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں۔ یہ کہتا ہے کہ

(حضرت حسین تقریر کے بعد پیچھے ہٹے اور) ہم آگے بڑھے تو زُہیر بن قین نکل کر آئے۔ گھوڑے پر سوار اور اسلحہ سے لیس تھے، انھوں نے ہمیں مخاطب کر کے کہا کہ :-

"کوفے والو، خبردار، خدا کے عذاب سے خبردار، ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان بھائی کا حق ہے کہ اس کی خیر خواہی کرے۔ ہم لوگ اس وقت بھائی بھائی ہیں، ایک دین اور ایک ملّت پر ہیں، جب تک ہمارے درمیان تلوار نہیں چلنے لگتی، ہاں اگر تلوار چل گئی تو پھر یہ رشتہ خود بخود کٹ جائے گا اور تم الگ اور ہم الگ ملت ہوجائیں گے۔ دیکھو ہمیں تمھیں اللہ نے ذرّیتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم تم کیا کرتے ہیں۔ سو ہم تمھیں دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور سرکش عبیداللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ اس لیے کہ تمھیں ان کی حکومت سے سوائے دکھ اور رنج کے اور کچھ نہ ملے گا جو تمھاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے، تمھارے ہاتھ پاؤں قطع کراتے تم کو سولیاں دلواتے اور تمھارے نیک اعمال قرّاء اور عمائد مثلاً حُجر بن عدی اور ان کے اصحاب اور ہانی بن عروہ وغیرہ کو قتل کراتے رہے۔"

راوی کہتا ہے کہ اس پر ہماری طرف والوں نے زُہیر کو بُرا بھلا کہا اور عبیداللہ بن زیاد کی تعریفیں کیں اور کہا کہ ہم تمھیں اور تمھارے صاحب (حضرت حسین) اور ان کے سب ساتھ والوں کو اس کے بغیر نہیں چھوڑیں گے کہ یا قتل کریں اور یا گرفتار کر کے عبیداللہ بن زیاد کے پاس روانہ کریں۔ اس پر زُہیر بن قین پھر عرض پرداز ہوئے کہ :-

"اے اللہ کے بندو فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد سمیہ کی اولاد کے مقابلے میں تمھاری محبت اور مدد کی زیادہ حقدار ہے۔ اور اگر تم مدد نہیں کرسکتے تو میں تمھارے لیے اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم ان کو قتل کرو، تم اس شخص (حسینؓ) کے اور اس کے چچازاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے

ہٹ جاؤ۔ قسم میری جان کی۔ یزید کے لیے تمھاری اطاعت کو قتل حسین کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی تمھاری اطاعت پر راضی رہے گا۔"[1]

ایک خاص نکتہ

ماحول صورتِ حال اور موقع و محل کے اس نکتے کے علاوہ جس کی بنا پر ہمارے لیے یہ ماننا مشکل ہو رہا ہے کہ فی الواقع یہ تقریریں میدان کربلا میں ہوئی تھیں، زُہیر بن قین کی تقریر کے بارے میں خاص طور سے یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ اس میں جو کچھ لعنت و ملامت کوفیوں کو ہے اور جو کچھ اپیل اور فہمائش کے جملے ہیں، اُن سب کی بنیاد بس یہ ہے کہ حضرت حسین اور ان کے اہل خانہ اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ذریتِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حالانکہ ان صاحب کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں عثمانی گروہ کے تھے، اور اس لیے اتفاق سے جو حج سے واپسی میں حضرت حسین کے قافلے کا ساتھ ہو گیا تو منازل پر فاصلے سے اپنا خیمہ لگاتے اور حضرت حسین کے سائے سے بھی بچنا چاہتے تھے[2]۔ مگر حضرت حسین کے اس سفر کے حالات میں آتا ہے کہ وہ راستے کے تقریباً ہر اہم آدمی ہی کو بالخصوص جس کا کوفے سے تعلق تھا، اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک دفعہ ان کو بلاوا بھیجا تو ان کی بیوی نے شرم دلا کر کہ "بہر حال ابن بنت رسول اللہ ہیں، آپ کو اُنکی دعوت پر جانا چاہیے، ان کو خیمۂ حسینی میں جانے پر مجبور ہی کر دیا اور پھر وہ آپ کی طرف سے آپ کی مہم میں، رفاقت کی دعوت بھی رد نہ کر سکے اور جان و دل سے ساتھ ہو گئے۔ بہر حال ایک عثمانی الاصل آدمی بھی صرف اسی "ذریتِ محمد" اور "ابن بنت رسول اللہ" کے حوالے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳۔ [2] پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو منزل بہ منزل ساتھ چلنے کی ضرورت کیا تھی جو یہ ساتھ ہو کر بھی دور رہنے کا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ یہ اس فاصلے کو کم از کم ایک دو منزل کا فاصلہ بھی تو بنا سکتے تھے!

سے یزیدی کوفیوں کو لعنت و ملامت یا ان سے اپیل کرے یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں بے شک یہ بھی ایک نہایت مناسب عنوان اور حوالہ تھا۔ مگر اسی پر انحصار اور صرف اسی حوالے سے حضرت حسین اور ان کے اہل خانہ کی عظمت اور ان کا حق پہچاننا، ابن زیاد کے مقابلے میں ان کے لیے صرف اسی حوالہ کو وجہ ترجیح بنانا یہ تو شیعیت کا مزاج ہے اور اس لیے جس طرح حضرت حسین کی تقریریں علاوہ حالات اور ماحول والے نکتے کے بعض اور پہلو بھی اس تقریر کو غیر واقعی اور جعلی قرار دینے والے اور اسی کے ساتھ اس جعلسازی کی بنا بھی سامنے لانے والے ہیں۔ اسی طرح زُہیر بن قین کی تقریر کا یہ پہلو بھی اس کی غیر واقعیت کو ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس جعلی کاروائی کے پیچھے کام کرنے والے اس نقطۂ نظر کو بھی صاف سامنے لے آتا ہے کہ اس طرح کی تقریریں اگر حضرت حسین کی موجودگی میں عثمانی الاصل لوگوں کی زبان سے ادا کرادی جائیں تو شیعی تصورات اور طرزِ فکر کو ایک اچھی اساس اور بنیاد ملتی ہے[1]۔

سبھی کچھ تصنیف

جس طرح یہ تقریریں بول رہی ہیں کہ میدان کربلا میں ہوئی نہیں بلکہ بعد میں تصنیف کی گئی ہیں اسی طرح — جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا تھا — یوم عاشور کی تقریباً پوری کہانی کا یہی حال نظر آتا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) مُبارزانہ جنگ[2] کے قصّے

تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو مبارز طلبی[3] شروع ہو جاتی ہے، اور عمر بن سعد جو

---

[1] مجھے اس امکان سے انکار نہیں ہے کہ محرک نقطۂ نظر اسکے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ [2] ایک صف سے ایک سورما نکل کر پکارتا ہے کہ کوئی اسکے مقابلے کو آئے اس طرح دونوں صفوں سے ایک ایک آدمی نکل کر لڑتا ہے۔ [3] مقابل کو پکارنا۔

ابن زیاد کی ساری تنبیہات کے خلاف اِن حضرات کو تقریریں کر کے اس کے اپنے کیمپ میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور بے یقینی اور بے دلی پھیلانے کا پہلے ہی کافی موقع دے چکا تھا۔ تقریروں کے بعد حُرؔ بن یزید کے حملہ آور ہونے اور دو آدمی بھی اپنی صف کے اس کے ہاتھوں مارے جانے کے باوجود ابن زیاد کے انتہائی سخت احکام کی تعمیل میں بھرپور یلغار کر کے قصّہ ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ صفِ حسینی سے جو مبارزانہ جنگ کا سلسلہ اب شروع ہوتا ہے، جو غیر معمولی قلتِ تعداد کی بنا پر اس صف کے لیے مناسب ترین اور پسندیدہ ترین صورت جنگ ہو سکتی تھی، تو وہ اس میں بھی ان کی معاونت شروع کر دیتا ہے۔ اور شمر جو اپنی آمد کے بعد سے برابر اپنی موجودگی کا اظہار طرح طرح سے کر رہا ہے۔ ابن سعد کی اس بے عملی کے معاملے میں وہ ذرا بھی باعمل نظر نہیں آتا۔ حالانکہ وہ بھیجا صرف اسی لیے گیا ہے کہ ابن سعد کی سست روی اور بے عملی کا سلسلہ روک دے۔ پس ہے یہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات کہ وہاں جنگ مبارزانہ ہوئی ہوگی؟

(ب) صبح سے سہ پہر تک کے معرکے

ابن زیاد کے سخت احکام کی اور شمر جیسے "حسین دشمن"[1] کو تعمیل احکام کے لیے مسلّط کیے جانے کی روایتیں جس طرح اس بات کو باور کرنے کی اجازت نہیں دیتیں کہ کربلا میں مبارزانہ جنگ کا سلسلہ چلا ہوگا۔ یہی روایتیں اور لشکر ابن سعد کی تعداد والی روایتیں (کم سے کم ۴-۵ ہزار، ورنہ شیعہ ماٰخذ کے مطابق کم سے کم تیس[۳۰] چالیس[۴۰] ہزار) اس بات کا تصور مشکل بناتی کہ اس لشکر نے قافلہ حسینی کو کوئی باقاعدہ جنگ کرنے کا موقع دیا ہوگا۔ یہ کیس اور معاملہ کسی جنگ کا تھا ہی نہیں، یہ فقط مزاحمت کا اور مزاحمت کو توڑنے کا کیس تھا۔ ابن سعد کی اس

---

[1] شمر کا نام صفّین کی معرکہ آرائی میں بھی ملتا ہے اور بہت واضح طور پر تو نہیں، لیکن بظاہر وہ حضرت علیؓ کی صف کا آدمی نظر آتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہی ہے تو اس کی یہ دشمنی بھی عجیب ہے۔

نفسیاتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے جس کی گواہی قصّے کی تمام روایتیں دے رہی ہیں کہ ایک طرف ابن زیاد کی فرمانبرداری بھی منظور تھی دوسری طرف حضرت حسین کی سلامتی بھی عزیز (اس کیفیت میں اور کم از کم بیس[۲۰] پچیس[۲۵] گنا زیادہ نفری کے ساتھ) واقعۂ کربلا کی اس کے سوا کوئی اور صورت از روئے عقل و عادت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ ابن سعد کی طرف سے ان لوگوں کو گھیر کر اور بے قابو کر کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں سلامتی کے ساتھ گرفتار کر لینے کی کوشش ہوتی اور اُدھر سے مزاحمت۔ یہ مزاحمت طاقتور ہوتی، اور بظاہر طاقتور ہونی ہی چاہیے تھی، تو ابن سعد کی کوشش ناکام ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ تعداد اپنی مزاحمت پر قربان ہو جاتی۔ لیکن اس میں صبح سے سہ پہر تک کا وقت لگ جانا اور باقاعدہ "دو لشکروں" کے درمیان جنگ کی صورت بنتی، جیسا کہ روایتیں کہتی ہیں اور مجالس عزا میں دہرایا جاتا ہے۔ یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہرگز نہیں۔ بظاہر یہ بیان واقعہ کے بجائے واقعہ کی اسی طرح کی ایک مبالغہ آمیز اور انتہا پسندانہ تعبیر ہے جس طرح کی دوسری انتہا پسندانہ تعبیر اس کے مقابل ایک روایت میں یوں پائی جاتی ہے کہ ابن زیاد نے جس شخص (زُحر بن قیس) کو حضرت حسین کا سر لے کر یزید کے پاس بھیجا۔ اس نے یزید کے پاس پہنچ کر کہا کہ:-

"ابشر یا امیر المومنین بفتح	امیر المومنین مژدہ ہو، اللہ کی طرف سے
اللہ ونصرہ ورد علینا الحسین	فتح و نصرت کا! حسین بن علی اپنے
بن علی فی ثمانیۃ عشر من	اٹھارہ گھر والوں اور ساٹھ شیعوں
اھل بیتہ وستین من	کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ (اس خبر پر)
شیعتہ فسرنا الیھم فسألناھم	ہم لوگ ان کی طرف چلے اور ہم نے
أن یستسلموا وینزلوا علی حکم	مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد
الامیر عبید اللہ بن زیاد	کر کے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے
او القتال، فاختاروا القتال	پر چھوڑ دیں ورنہ قتال کے لیے تیار

على الاستسلام نعدونا عليهم مع شروق الشمس فاحطنا بهم من كل ناحيةٍ حتىٰ اذا اخذت السيوف مأخذها من هام القوم يهربون الىٰ غير وزرٍ و يلوذون منا بالآكام والحفر لواذاً كما لاذ الحمائم من صقر فوالله يا امير المومنين ما كان الّا جزر جزورٍ او نومة قائلٍ حتىٰ اتينا علىٰ اٰخرهم .... [1]

ہوں۔ ان لوگوں نے قتال پسند کیا۔ نتیجہ میں ہم لوگوں نے سورج نکلتے ہی ان پر چڑھائی کی اور ہر طرف سے گھیر لیا حتیٰ کہ جب تلواروں نے ان کی کھوپڑیوں پر کام شروع کیا تو جدھر منہ اٹھا بھاگ پڑے کہیں ٹیلوں کی کہیں گڑھوں کی پناہ ڈھونڈنے لگے جیسے کہ کبوتر شکرے کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ پس اے امیر المومنین قسم ہے خدا کی ہمیں انکا خاتمہ کرنے میں اس سے زیادہ وقت نہیں لگا جتنا ایک قصاب کو ایک اونٹ ذبح کرنے میں یا دوپہر کو کسی شخص کے قیلولہ کرنے میں لگتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس طرح یہ روایت بیجا مبالغے پر مبنی ہے یہی حال صبح سے سہ پہر تک کی روایتوں کا سمجھنا صحیح ہے۔

لمبے وقت کے دامن میں لپٹے قصّے

لمبا وقت لگنے کی روایتیں جب ناقابلِ اعتبار اور ناقابلِ قبول ٹھہر جاتی ہیں تو پھر اس لمبے وقت کے دامن پر جو اور بہت سی کہانیاں ٹانک دی گئی تھیں وہ بھی کسی اعتبار کے لائق کہاں رہ جاتی ہیں؟ انھیں کہانیوں میں فرزندانِ اہلبیت کی لاشوں کا ایک کے بعد

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۴

ایک کرکے تڑپنا، حضرت حسین کا ان کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا، رنج والم کے کلمات سے انھیں آخرت کے لیے رخصت کرنا، یا ایک طرف کو لا کے لٹانا۔ حضرت زینب کبریٰ کا روتے تڑپتے بار بار میدانِ جنگ میں نکل آنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ساری کہانیاں جن میں سے کتنی ہی ایسی ہیں جو دراصل حضرت حسین کی شان کو، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، داغ لگاتی ہیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سبائی[1] ذہن کے ماتحت گڑھی گئی ہیں جو برابر فرزندانِ اسلام کی "متاعِ دین و دانش" لوٹ لینے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا اور اسے نواسۂ رسولؐ کی مظلومیت کے نام پر ایک ہوش رُبا قسم کی جذباتی فضا پیدا کر دینے میں اپنے اس منصوبہ کی تکمیل کا بہترین سامان نظر آیا اور اپنے اس حربے اور مقصد میں وہ خوب خوب کامیاب رہا۔ اسلام کے ناواقف اور ضعیف العقیدہ فرزندوں کی ایک بڑی تعداد اس حربے کا شکار ہو کر اسلام کی شاہراہ (MAIN STREAM) سے ہٹ گئی اور بالکل ایک اجنبی راہ پر "اسلام" ہی کے بلکہ "اصل اسلام" کے نام سے لگ گئی۔ آج جو لوگ اس مذہبِ ماتم حسین کے پیرو ہیں یقین ہے کہ وہ اپنے دلوں سے اسلام دوست ہیں۔ اس مذہب کے اصل بانیوں کی طرح چھپے دشمن نہیں مگر "صیاد[2] کے اقبال" کا بھی کیا "سحر" ہے کہ اُن کے "صید[3]" کی یہ موجودہ نسل بھی (جو ہماری ہم عصر ہے) اپنی "قید" کی جان و دل سے حفاظت کرنا چاہتی ہے[4]۔ اور اسی مذہب والوں کا کیا، ہر شخص جس مذہب کے ماحول میں پیدا ہو گیا ہے، بے سوچے سمجھے بلکہ سوچ سمجھ کی دعوت سے (الا ماشاء اللہ) دشمنی کرتے ہوئے اسی مذہب پر جینا اور مرنا چاہتا ہے۔

[1] عبداللہ بن سبا وغیرہ۔ [2] شکاری [3] شکار۔
[4] طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

دامانِ اہلبیت کے لیے ننگ

بہرحال آئیے یوم عاشورہ کی وہ کہانیاں دیکھیں جن سے دراصل حضرت حسین کی شان اور عظمت کو دھبہّ لگتا ہے۔ دھبہّ لگانے کو تو وہ قبل از "جنگ" کی تقریر ہی بہت کافی ہے جو اوپر نقل ہو چکی۔ علی مرتضیٰ شیرِ خدا کا بیٹا اور ان بے حیا، غدار اور پست کردار لوگوں سے جن کا ازخود کیا ہوا احسان بھی اہلِ شرف و عزّت کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اپنے والد ماجد کے نام پر، اپنی والدہ خاتونِ جنت کے نام پر، اپنے نانا سید الانبیاءؐ کے نام پر، اپنے چچا جعفر طیار کے نام پر اور اپنے نانا کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے نام پر اپنی جان کی امان مانگے؟ (جیسا کہ وہ تقریر دکھاتی ہے) اور ایک بار نہیں، عنوان بدل بدل کر بار بار مانگے؟ العیاذ باللہ!

اس تقریر میں ننگ و عار کا یہ پہلو ہرگز کوئی ایسا نکتہ نہیں ہے کہ کوئی آ کے اُسے کھولے تو لوگوں پر کھلے۔ بالکل کھلی ہوئی اور عام آدمی کو محسوس ہونے والی بات ہے مگر اس حد تک عام آدمی کہاں جا سکتا ہے کہ روایت میں کلام کرے۔ اس پہلو کا معاملہ تو وہ حضرت حسینؓ پر چھوڑ دے گا کہ ہوگی کوئی مصلحت، البتہ یہ بات اس کے دل میں نقش ہو جائے گی کہ حضرت حسینؓ اپنی اصل عظمت یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے، فاطمہ بنت رسول اللہ اور علی "وصی رسول اللہ" کے بیٹے ہیں اور یہی وہ دوسرے مسلمانوں سے چاہتے تھے کہ انھیں اس نسبی عظمت سے دیکھا جائے اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اصل اہمیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن کے نسبی رشتے کی ہو، دینی رشتے پر نظر ہو یا نہ ہو (حالانکہ اسلام میں اصل اہمیت تقویٰ اور تدیّن کی ہے نہ کہ نسل و نسب کی) یہ بات اگر مسلمانوں کے ذہن نشین ہو گئی اور عزت و احترام کے ساتھ قبول کر لی گئی تو سبائی منصوبے کی کامیابی کیلئے پوری بنیاد فراہم ہو گئی[1] رسول اللہ

[1] شیعیت کے سلسلے میں عبد اللہ بن سبا کا بنیادی کردار ایک مانا ہوا کردار تھا لیکن (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت اور وراثت کو ایک نسبی سلسلہ بنا دینے اور نسب ہی میں ساری عظمتیں جمع کر دینے کا کام اس کے بعد کچھ مشکل نہیں رہ گیا۔ بس یہ فلسفہ ہے جو اس سراپا ننگ و عار تقریر کے پیچھے کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہی بیماری جو اس تقریر کے ذریعے مسلمانوں کے ذہن میں پیوست کرنے کی کوشش کی گئی تھی اسی کو آگے کی ان کہانیوں سے خوب خوب گہرائی میں اتارنے کی سعی کی گئی ہے کہ آپ اپنے فرزندوں، بھتیجوں، بھانجوں اور بھائیوں کی لاشوں کی طرف دوڑتے ہوئے جاتے اور اس طرح کے کلمات سے اپنے رنج والم اور بے بسی کا اظہار کرتے۔

بُعْدًا القوم قتلوك ومَن خصمهم یوم القیٰمة منك جدك[1]
ہلاک ہوں وہ لوگ جنھوں نے تجھے قتل کیا اور جن کے مقابلے میں قیامت کے دن تیرے نانا فریق ہوں۔

اسی طرح کسی رفیقِ کربلا کی جانبازی اور مردانہ کارکردگی پر اُسے شاباش دیتے ہیں تو ان روایتوں کے مطابق بایں الفاظ دیتے ہیں:۔

جزاك الله خيرًا عن اهل بيت نبيك[2]
اللہ تمہیں اپنے نبی کے اہل بیت کی طرف سے بہترین بدلہ دے۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات کی مثالیں آ گئیں۔ اصل منشا یہاں حضرت حسینؓ کی تقریر کے علاوہ اُن مزید کہانیوں کی کچھ نشاندہی ہے جن سے واقعہ میں حضرت موصوف کی شان پر یا آپ کے دیگر اہل بیت کی شان پر دھبہّ آتا ہے، مگر دھوم سے مشہور کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصری) نے جب سے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ یہ کوئی حقیقی نہیں بلکہ راویوں کی بنائی ہوئی شخصیت ہے، تب سے شیعہ اہل قلم ابن سبا کی شخصیت کا انکار کرنے لگے ہیں مگر طٰہٰ حسین کی تحقیقات کا حال تو یہ ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے وجود کا بھی انکار کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ایک دوسرے مصری محقق انور الجندی کا مجموعۂ مضامین "قضایا معاصرۃ" اس سے طٰہٰ حسین کے یہودی رابطوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ [1] طبری ج ۶ ص ۲۵۷ یہ کلمات جس موقع سے نقل کیے جا رہے ہیں وہ آپ کے بھتیجے قاسم بن حسنؓ کی شہادت کا موقع ہے۔ [2] ایضاً ص ۲۵۵۔

گئی ہیں اور ہر سال تازہ کی جاتی ہیں۔

سب سے بڑی مثال

اس کی سب سے بڑی مثال وہ روایتیں ہیں جو دکھاتی ہیں کہ حضرت حسین دوسرے رفقاء وانصار ہی کو نہیں اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو بھی، حتیٰ کہ نابالغ بچوں کو بھی[1] اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت دیتے رہے اور جب سوائے ایک بیمار صاحب فراش صاحبزادے، علی بن الحسینؓ (زین العابدین) کے اور کوئی نہ بچا تب آپ نے تلوار اٹھائی۔ اول تو اپنے بچوں ہی کو آدمی، اگر مجبور معذور نہیں ہے تو ہلاکت کے لیے آگے نہیں بڑھاتا یا کم از کم اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اور یہاں روایتیں ہمیں باور کرا رہی ہیں کہ نہ صرف صاحبزادے علی اکبر (بعمر ۱۹-۲۰ سال) کو اکیلا آگے بڑھنے دیا اور پھر دیکھتی آنکھوں اکیلا ہی آخر دم تک لڑنے بھی دیا، بلکہ بھتیجوں اور بھانجوں اور بھائیوں کے ساتھ بھی اُن کی کم عمری کے باوجود یہی معاملہ رکھا! کوئی بتائے کہ کیسے یقین کیا جائے؟ اور یقین کیا جائے تو پھر کیسے حضرت والا کے لیے عقیدت کو ایک شدید احساس کی چبھن سے بچایا جائے؟

ایک تأویل لاطائل

بات خدا لگتی ہے، چنانچہ جو لوگ ان روایتوں کے قائل ہیں وہ بھی اس سوال سے آنکھیں نہ چُرا سکے۔ مگر تاویل کی راہ کہیں بھی بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جناب علی نقی صاحب کی کتاب "شہید انسانیت" جس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس میں بھی یہ سوال

[1] یہ ابھی قاسم بن الحسنؓ کا جو نام گزرا ہے۔ ان کے بارے میں "شہید انسانیت" میں تصریح ہے کہ بالغ نہیں ہوئے تھے (ص۵۰) اور شہادت کا جو واقعہ طبری میں ہے اس میں بھی کچی عمر کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً زخم کھا کر "ہائے چچا" پکارنا وغیرہ۔

سامنے لایا گیا ہے اور خطابت و ذہانت کی پوری صلاحتیں صرف کر کے اس کا حل یوں پیش کیا گیا ہے کہ:-

"حسین کے لیے نسبتہً یہ بہت آسان ہوتا کہ سب سے پہلے آپ اپنی جان کا ھدیہ راہ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑا درجہ نہ دیا جا سکتا جس نے کبھی بھی حمایت حق میں اپنی قربانی پیش کی ہو۔

اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وقیع نہیں سمجھی جا سکتی تھی جتنی کہ بقول نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی قربانی، کہ آپ دین حق کی تبلیغ کی وجہ سے سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ یا سقراط کی قربانی کہ ان کو اصول کی حمایت میں زہر کا جام پینا پڑا۔ اور حسین کے لیے اس منزل سے گزر جانا مشکل ہی کیا ہوتا جب کہ آپ اسی باپ کے بیٹے تھے جس کا قول یہ تھا کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر آ پڑتی ہے یا موت پر میں جا پڑتا ہوں اور نیز یہ کہ موت سے اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ پستانِ مادر سے مانوس ہوتا ہے .... مگر حسین کی شہادت کو جو خاص امتیاز حاصل ہے وہ اسی لیے کہ آپ نے ایسے ہر ہر فرد کو جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے تھے، اپنی موجودگی میں راہِ حق میں نثار کر دیا...... حسین کا کمال عمل محض یہی نہیں تھا کہ وقت اور موقع آنے پر آپ نے اپنی جان راہِ خدا میں پیش کر دی بلکہ آپ کے نفس کا کمال یہ تھا کہ آپ نے جان سے عزیز ہستیاں رضائے حق کے راستے میں یکے بعد دیگرے قربان کر دیں[1]۔ اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ ان تمام

[1] اگرچہ ان میں ایسے کم عمر بھی تھے، جیسے کم عمروں کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شریک ہو کر راہِ خدا میں بھی اپنی جان قربان کرنے کی اجازت نہیں دی؟

دشوار گزار مراحل کو طے نہ کر لیا اس وقت تک خود اپنی جان کا ہدیہ پیش نہیں کیا۔[1]"

ایک بے معنی اور ناقابلِ فہم بات کو "خطیبانہ فلسفہ" بنانے کی یہ کوشش ایک بڑے فاضل اور نامی گرامی شیعہ عالم کی ذہانت و ریاضت کا ثمرہ ہے جس میں کسی سنجیدہ سوال کا جواب نہیں ملتا۔ البتہ ایک سوال اور پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا امام کی شان حضرت عیسیٰؑ سے بھی بالاتر تھی؟ بس اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ معاملہ کس قدر ناقابلِ توجیہہ اور ناقابلِ حل ہے۔ حل واقعہ میں صرف ایک ہی ہے کہ ان روایتوں کو جن کی سندیں کوئی وزن نہیں رکھتیں اور جن میں دس علامتیں موضوع ہونے کی پائی جاتی ہیں انھیں موضوع قرار دے کر رد کیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنا دین و ایمان مظلومیتِ حسین کے ماتم کو نہیں قرار دے رکھا ہے ورنہ تو ان روایتوں کی حفاظت لازم ہو جاتی۔ اس لیے کہ ان کے بغیر وہ فضا ہی نہیں بن سکتی جس میں ماتم ہی اوّل اور ماتم ہی آخر ہو جائے۔ مثلاً حضرت محمد الباقر والی روایت لے لیجئے جس المیۂ کربلا کو بغیر نمک مرچ لگائے اور بغیر ایک رزمیہ داستان بنائے سیدھے سادے لفظوں میں یوں پیش کر دیا گیا ہے کہ:

> پس جب آپ نے ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کی شرط پوری کرنے سے انکار کیا تو عمر بن سعد نے آپ سے قتال کیا۔ اس میں آپ کے تمام اصحاب شہید ہو گئے جن میں آپ کے اپنے گھر کے قریباً ۱۵۔۲۰ جوان بھی تھے[2] بعد ازاں آپ نے خود قتال کیا اور آپ بھی شہید ہوئے۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ماتم کے کاروبار کو رونق نہیں مل سکتی۔ اس میں ایک کے بعد ایک لاشہ گرنے کا منظر نہیں آتا۔ اس لاشے پر حضرت حسین کا دوڑ کے جانا اور حزن و

---

[1] "شہیدِ انسانیت" ص ۱۴۰۔۵۱۲ [2] البدایہ والنہایہ میں ان حضرات کی بابت کئی اقوال نقل کیے گئے ہیں ایک قول ۱۶ کا ہے جو حسن بصریؒ کی طرف منسوب ہے۔ ایک ۱۷ کا جو محمد بن حنفیہ کی طرف منسوب ہے اور ایک ۲۳ کا قول ہے۔ (ج ۸ ص ۱۸۹)

الم کے کلمات ادا فرمانا نہیں آتا۔ حضرت زینب سر کھولے سینہ پیٹتی اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی نہیں آتیں ... نعش سے لپٹ کے بین کرتی نہیں پائی جاتیں۔ حضرت حسین پیاس کی شدت سے فرات کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور عین اس حالت میں کہ پانی حلق سے اتارنے جا رہے ہیں، گلے میں دشمن کا تیر کھاتے ہوئے اور پھر ان کے لیے یوں بددعا کرتے نہیں دکھائی دیتے کہ:۔

"اے اللہ ان کو گن لے اور پھر انھیں چن چن کے مار اور ایک کو بھی باقی نہ رکھ۔[1]"

اور پھر بعد میں زخموں سے چور دشمن کے نرغے میں گھرے ہوئے اُن سے یوں مخاطب ہوتے ہوئے بھی نہیں ملتے جس سے ایک عاجزی اور بیچارگی کی تصویر بنتی ہے کہ:۔

> "کیا تم میرے قتل پر ایک دوسرے کو اکساتے ہو؟ یاد رکھو کہ میرے بعد کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس کے قتل سے اللہ اتنا ناراض ہو جتنا میرے قتل سے ہوگا ...... اور اگر تم نے مجھے قتل کر ہی دیا (اور نہ مانے) تو اللہ تم پر آپس کی لڑائی اور خونریزی کا عذاب مسلط فرمائے گا اور پھر اس عذابِ دنیا پر بس نہ کرتے ہوئے (آخرت کے) عذابِ الیم کا اس پر اضافہ فرمائے گا۔[2]"

اور پھر حضرت زینب یہ کہتی ہوئی نہیں نکل آتیں کہ:۔

یا عمر بن سعد ایقتل ابو — اے عمر بن سعد کیا ابو عبداللہ (حسینؓ)

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۸ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ اس عبارت میں علاوہ اس بات کے کہ اور سب کو کٹوا کر حضرت حسین اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عبارت کے زیر خط الفاظ بھی توجہ طلب ہیں قرآن کے اسلام میں ایک نبی اور رسول کے علاوہ کوئی شخص مجاز نہیں کہ ایسا گمان اپنے بارے میں رکھے فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ ۔ اپنی پاکیزگی (بزرگی) کے دعوے نہ کرو اللہ بہتر جانتا ہے کون متقی ہے (النجم آیت ۳۲) کیسے مانا جا سکتا ہے کہ حضرت حسین قرآن پاک کی اس تعلیم سے ناآشنا تھے اور معاذ اللہ وہ باتیں زبان پر لا رہے تھے جو اہلِ تقویٰ کی شان نہیں۔

عینی اللہ وانت تنظر الیہ[1] — قتل ہوں گے اور تم دیکھ رہے ہو گے؟

چنانچہ اس سادہ روایت کا ذکر، باوجود حضرت محمد الباقر کی روایت ہونے کے مشکل ہی سے کہیں ملیگا۔

قصہ مختصر

اختصار کی کوشش کے باوجود قصہ طویل ہو گیا۔ مختصر یہ ہے کہ معرکۂ کربلا کی لمبی چوڑی کہانیاں، علاوہ اس کے کہ موقع و محل کے حالات ان کے وقوع کے لیے گنجائش نہیں دکھاتے اور علاوہ اس کے کہ ان قصوں کی سندیں نہایت بے وقعت ہیں، یہ قصے متعدد پہلوؤں سے خانوادۂ نبوت پر داغ بنتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال کے ذکر سے ہم نے اوپر بات شروع کی تھی، اور اس کے ضمن میں باقی وہ تمام باتیں بھی آگئی تھیں جن کو الگ الگ ذکر کرنے کا ارادہ تھا۔ یعنی حضرت حسین کا اپنے آپ کو اپنی زبان سے مقدس اور مقبول بارگاہِ حق بتانا۔ جس کی کوئی گنجائش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں نہیں ہے۔ اپنے دشمنوں کو بد دعائیں دینا، جو اُن کے نانا کی سنت نہیں اور مردوں کا میدان جنگ میں شیوہ نہیں۔ سیدہ زینبؓ بنت خاتونِ جنت کا بین و بکا کرتے ہوئے بار بار میدان جنگ میں آنا اور لاشوں سے لپٹ کے رونا چلّانا۔ پھر حسینؓ کے لیے عمر بن سعد سے رحم کی اپیل کرنا۔ بھلا یہ باتیں کہیں خانوادۂ نبوت کی خواتین کو زیب دیتی ہیں اور خاتون بھی علی مرتضیٰ جیسے شیر مرد کی بیٹی۔ یہ روایتیں اگر قابلِ اعتبار ہو سکتی ہیں تو صرف ان لوگوں کے لیے جنھیں خانوادۂ نبوت کی محبت کے نام پر ان کی مظلومیت کے ماتم کی دوکان کھولنی ہے خواہ مظلومیت کی اس داستان کو رنگین کرنے کے لیے ان تمام چیزوں کا اپنے ہی ہاتھوں سے خون کرنا پڑے جو اس خانوادے کا اور کسی بھی خانوادے کا شرف اور اس کی عزت ہوں۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶

۴۔ بندشِ آب

داستان کربلا کا ایک اور اہم جزو ابن زیاد کی طرف سے قافلۂ حسینی پر پانی کی بندش ہے۔ دوسرے اجزاء پر گفتگو نے اتنا وقت لے لیا کہ اب جی چاہتا ہے یہ گفتگو ختم ہو۔ مگر اس بندشِ آب والے جزو کی اہمیت اجازت نہیں دیتی کہ اس سے اغماض کر لیا جائے۔ یہ بندش ۷ محرم سے بتائی گئی ہے اور اہلِ قافلہ کا پیاس سے خاص کر خود حضرت حسین کا بُرا حال سنایا جاتا ہے کہ سخت حالت جنگ میں بھی دشمن کو نقصان پہنچانے یا اس سے اپنا دفاع کرنے سے بھی بڑھ کر پانی کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا! حالانکہ اسی یوم عاشورہ کی روایتوں میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت حسین اور اُن کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے غسل کیا اور ایک بڑے برتن میں مشک گھول کر تیار کیا گیا تھا جو ان حضرات نے جسم پر لگایا۔ اس کے علاوہ کربلا کا میدان جس کے بارے میں روایتوں نے یہ تأثر دیا ہے کہ وہ ایک بے آب و گیاہ ریگستان تھا اس کی تردید کے لیے حضرت محمد الباقر والی وہ روایت کافی ہے جس کا کچھ حصہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ جس کے مطابق کربلا ایک ایسی زمین تھی جس میں نرکل اور بانس کا جنگل یا جھاڑیاں موجود تھیں اور یہ خشک ریگستان میں نہیں ہوا کرتیں۔ یہ مسلّم ہے کہ یہ دریائے فرات یا اس سے نکلنے والی کسی نہر کا کنارہ تھا۔ یہاں پانی زمین کی سطح سے اتنا قریب تھا کہ تھوڑی سی زمین کھودو اور پانی لے لو۔ معجم البُلدان میں کربلا کے ذیل میں صراحت ہے کہ یہاں کی زمین میں نرمی (رَخُوۃ) ہے۔ اور یاد آتا ہے کہ طبری ہی میں یہ روایت موجود ہے کہ اصحابِ حسینؓ کو بھی زیر زمین کا یہ تجربہ ہوا تھا کہ ذرا سا کھودنے پر پانی نکل آیا۔[1] بہرحال "یہ تاریخی حقیقت" کے نام پر خالص ایک پروپیگنڈہ ہے کہ کربلا میں پانی نایاب یا کمیاب تھا اور اس سے ۷ محرم سے بندشِ آب

---

[1] دمِ تحریر صفحہ کا حوالہ مجھے دستیاب نہیں ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ میری یادداشت صحیح ہے تلاش سے طبری میں (یا ابن اثیر میں) وہ موقع نکل آئے گا۔

والے افسانے کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

معاملے کے کچھ اور پہلو!

کربلا جیسی لبِ دریا سرزمین پر اس بات کو ممکن سمجھ لینا کہ وہاں ڈیڑھ دو سو ایسے مسلّح انسانوں پر جن میں تیس بتیس سوار بھی تھے مسلسل تین دن تک پانی کی مکمل بندش کی جا سکتی تھی، یہ بات عقل و خرد سے مکمل رخصت لیے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں اگر یہ بات کہی جائے کہ پانی کا گھاٹ ـــــ یعنی اس جگہ کا جو قریبی گھاٹ تھا وہ ـــــ روکا گیا تھا۔ تاکہ حسینی قافلہ بسہولت پانی نہ لے سکے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ پانی کے گھاٹ سے ہٹ کر پورے دریا پر روک ممکن نہیں ہو سکتی اور واقعہ یہ ہے کہ روایت میں گھاٹ روکنے ہی کا ذکر ہے جس کے الفاظ آگے آ رہے ہیں۔

لیکن اس میں بھی، ۷ تاریخ سے شروعات کی جو بات کہی جاتی ہے، اور وہ بندشِ آب والی روایت میں آئی ہے، وہ بھی ایسی ہی ناقابلِ فہم ہے جیسی مکمل بندش والی بات۔ اسکے برخلاف جو بات واقعاتی لحاظ سے قابلِ فہم ہے وہ یہ ہے کہ ۸ تاریخ کو جب دشمن نے قطعی اقدام کا فیصلہ کر لیا تو اپنی جلد از جلد کامیابی کے لیے جہاں دوسرے ذرائع اور ہتھیار استعمال کیے وہاں ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی جو جنگ میں عام طور پر کی جاتی ہے کہ فریقِ مخالف کے لیے پانی کا حصول مشکل بنا دیا جائے۔ اس سے قدرتی طور پر مخالف فریق کی قوّتِ مدافعت گھٹتی ہے۔ پس اگر یہ دعویٰ کیا جائے یا یوں کہیے کہ روایت میں اس طرح کی بات کہی گئی ہو، تو یہ ایک قابلِ فہم بات ہے اور اس پر کسی کو کلام کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ نیز واقعے کے تمام پہلوؤں کی روایات کے چوکھٹے میں اس کا فِٹ ہونا بھی دقت طلب نہ ہوگا۔ جبکہ اس کے برعکس، ۷ تاریخ والی روایت بعض دوسری روایتوں کے ساتھ جوڑ نہیں کھا سکتی بلکہ ایک تضاد کا درجہ لیئے ہوئے نظر آئیگی۔ آئیے اس پہلو سے روایت کا جائزہ لیجیے۔

ہم نے اگرچہ تفصیل اور ترتیب کے ساتھ وہ روایات اس کتاب میں جمع نہیں کی ہیں جن میں ابن سعد اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور ملاقاتوں کا بیان ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا بیان آتا ہے، تاہم کچھ نہ کچھ ذکر ان سب چیزوں کا اسی باب کے اوپر کے صفحات میں آچکا ہے، اور یوں بھی یہ باتیں واقعۂ کربلا کے سلسلے میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ اس لیے قارئین اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جس وقت سے ابن سعد نے کربلا میں قدم رکھا اسی وقت سے اس کے اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر اس کا نتیجہ ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان خط و کتابت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ ابن سعد حضرت حسین کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے؟ اس سلسلہ میں کئی ایک روایات ہیں جن کا مجموعی تاثر یہ بنتا ہے کہ طرفین کی یہ سلسلہ جنبانی بالکل آخر وقت تک قائم رہی۔ اور دو روایتیں تصراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ ۹ تاریخ کی شام کو یہ سلسلہ بند ہوا۔ ان دونوں روایتوں کا ذکر اوپر اسی باب میں آچکا ہے۔ طبری جزو ۶ میں ان میں سے ایک روایت ص۲۳۲ پر سعد بن عُبیدہ کے حوالے سے ہے۔ دوسری ص۲۳۵-۲۳۶ پر عبداللہ بن شریک عامری کے حوالے سے۔

معاملات کے اس پس منظر میں ذرا غور کر کے دیکھنا چاہیے کہ ۷ تاریخ سے بندشِ آب کا نہ صرف حکم بلکہ اس کا نفاذ بھی بتانے والی روایت کو ماننے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ اور وہ بات الگ رہی جو اس گفتگو کے شروع میں عرض کی گئی ہے کہ قتل و قتال کی حالت میں تو (جو ۸ تاریخ کو ہوا) بندشِ آب کی کاروائی کچھ بامقصد اور بامعنی ہو سکتی تھی۔ بغیر قتل و قتال کی حالت کے یہ ایک فضول سی محض بدنامی مول لینے والی بات تھی۔ مزید برآں کیا یہ ممکن ہے کہ ۷ تاریخ سے ایسا ہوا ہو اور ۸ تاریخ سے پہلے کہیں کسی طرح بھی اس کی شکایت کی کوئی روایت نہ پائی جائے؟ تمام شکایتی بیانات ۸ تاریخ ہی کے ذیل میں

آتے ہیں۔ اس سے پہلے کا کوئی بیان نہیں ملتا حالانکہ دونوں فریقوں میں برابر رابطہ چل رہا تھا!

روایت کی اندرونی شہادت

روایت میں اس بات کی صراحت تو ہے ہی، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کہ بندشِ آب کی صورت صرف یہ تھی کہ گھاٹ روکا گیا تھا:-

"..... پس عمر بن سعد نے عمرو بن الحجاج کو پانچسو سواروں کا دستہ دے کر بھیجا۔ اور وہ گھاٹ پر جا اُترے[1] اور حسین اور ان کے ساتھیوں اور پانی کے بیچ میں حائل ہو گئے......"

اس کے علاوہ اس بات کی بھی علامت روایت کے اندر پائی جاتی ہے کہ یہ کاروائی ۱۰ تاریخ ہی کو عمل میں آئی جو جنگ کا دن تھا، کیونکہ روایت میں اگرچہ مذکورہ بالا الفاظ کے بعد "وذالك قبل قتل الحسين بثلاث" (اور یہ شہادت حسین سے تین دن پہلے کی بات ہے) کے الفاظ آتے ہیں مگر پھر فوراً ۱۰ تاریخ ہی کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کی کوئی بات نہیں۔

قال ونازلهٗ عبد الله بن	حُمید کہتا ہے کہ عبداللہ بن ابی الحصین
ابی الحصین الازدی وعدادهٗ	ازدی جس کا شمار بجیلہ میں ہوتا تھا[2]
فی بجيلة فقال یاحسین الا	حضرت حسین کے مقابلہ پر آیا اور کہا کہ
تنظر الی الماء کانهٗ کبد السماء	حسین تم پانی کو دیکھ رہے ہو کیسا آسمان
والله لاتذوق منه قطرةً	کی طرح شفاف ہے۔ قسم خدا کی تم اس
حتیٰ تموت عطشاً...[3]	سے ایک قطرہ بھی نہ چکھ سکو گے حتیٰ کہ

[1] روایت کے اصل الفاظ ہیں "فنزلوا علی الشریعة" (طبری ج ۶ ص ۲۳۴) "شریعة" کے معنی گھاٹ یا گھاٹ کا راستہ
[2] یعنی سرکاری رجسٹر میں اس کا نام قبیلۂ بجیلہ کے تحت درج تھا۔ [3] حوالۂ سابق۔

پیاس سے (معاذ اللہ) دم نکل جائے۔

سچ بات یہ ہے کہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں یہ بے تکے طور پر "شہادت سے تین دن پہلے" کے الفاظ روایت میں درج کیے گئے ہیں۔ حضرت حسینؓ سے کسی کا مقابلہ ۱۰ تاریخ سے پہلے کہیں مروی نہیں اور پانی کی کوئی شکایت بھی ۱۰ تاریخ سے پہلے کہیں بیان نہیں کی گئی۔

اور خود راوی کے اوصاف:

اس روایت پر غور و فکر کے سلسلے میں اس کے راوی حُمید بن مسلم کے کردار پر بھی نظر ضروری ہے۔ واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں اس کی روایات بے شمار ہیں جن میں اس بات کے نہایت واضح قرائن ہیں کہ اس کی روایتیں ہی جعلی اور جعلسازانہ نہیں بلکہ یہ خود بھی شاید ایک جعلی شخصیت ہے۔ ورنہ ایک نہایت موقع پرست اور کوفیوں کے امتیازی (TYPICAL) اوصاف کا مجسّمہ ہے۔ ویسے تو یہ اپنے آپ کو ابن سعد کی فوج میں شامل بتاتا ہے۔ اور جب تک واقعۂ شہادت ہو نہیں جاتا یہ اپنا کوئی ذرا سا بھی ہمدردانہ کردار اہل بیت کے ساتھ نہیں دکھاتا مگر جیسے ہی یہ واقعہ ہو لیتا ہے نہ صرف اس سے بڑھ کر اہل بیت کا کوئی ہمدرد کربلا کے میدان میں نظر نہیں آتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفِ اعداء کا نہیں صفِ حسینی کا آدمی تھا۔ جنگ کے وقت میں حضرت حسین نے دشمنوں کی جارحیت اور سفاکی پر جو رجوع الی اللہ سے دعا یا بددعا کی صورت میں یا اظہار رنج و الم کی صورت میں ظاہر فرمایا اس کا ایک ایک لفظ آپ اس شخص کی زبان سے سن لیجئے جیسے کوئی ہمزاد ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ واقعۂ کربلا کے تین چار سال بعد یزید کی موت کے ساتھ ہی جب وقت بدلا اور ایک طرف حضرت عبداللہ بن زبیر اور دوسری طرف مختار ثقفی نے ہمدردان بنی اُمیّہ اور قاتلان حسین کے لیے زمین تنگ کر دی تو بہت سے لوگوں نے عافیت طلبی کے لیے

چولا بدلا، حمید بن مسلم واقعی اگر اُس زمانے کا کوئی شخص تھا تو یقیناً انہی چولا بدلنے والوں میں سے ایک تھا۔ اہل بیت کی ہمدردی میں طرح طرح کے غم انگیز افسانے تراشتا ہے یہاں تک کہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو شمر جیسے سخت آدمی سے بھی لڑتا جھگڑتا اور اُسے مغلوب کرلیتا ہوا دکھاتا ہے۔ جو کہ روایات کی روشنی میں حادثۂ کربلا کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ اور جس کی آمد کے بعد ابن سعد کو بھی [illegible] قتال پر مجبور [illegible] تھا جس کو وہ برابر ٹالنے کی کوشش میں لگا تھا[1]۔ ان افسانوں [illegible] جن میں سے ایک یہ بندش آب والا افسانہ بھی ہے، وہ ایک طرف اپنے آپ کو محبانِ اہلِ بیت میں شمار کرا رہا تھا، دوسری طرف نظر آتا ہے کہ [illegible] سے ذاتی اور خاندانی رنجشیں یا رقابتیں بھی چکا رہا تھا۔ ورنہ جب یہ خود یزیدی لشکر میں تھا تو اس کے لیے کوئی جواز نہ تھا کہ مظالم کی روایتوں میں افراد کو بھی نامزد کرتا جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں عبداللہ بن ابی الحصین کا نام اس نے دیا ہے۔ اس کی روایتوں میں یہی تنہا ایک نامزد رپورٹ نہیں ہے۔ بار بار وہ یہی کام کرتا نظر آتا ہے۔ حضرت حسینؓ کے جسد مبارک کو گھوڑوں کی سُم سے روندے جانے والی روایت میں (جس پر آگے کلام آئے گا) یہ دس آدمی اس ناپاک کام میں شریک بتاتا ہے مگر صرف دوؔ کا ذکر نام کے ساتھ کرتا ہے۔ اس طرح کا معاملہ اس کی اور روایتوں میں بھی ہے۔ بلکہ اس شخص کے اسی کردار کی بنا پر یہ بھی خیال ہونے لگتا ہے کہ کہیں شمر کی بدنامی میں بھی اُس کی اپنی واقعی بداعمالیوں کے ساتھ حمید بن مسلم کی "مہربانیوں" کا بھی تو کافی دخل نہیں ہے؟ اس لیے کہ اس کی روایتوں میں شمر کا ذکر بار بار آجاتا ہے اور اس ذکر میں اُس کی برائیاں الم نشرح کرنے سے حُمید کی بہت ہی خصوصی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگلے باب میں حمید پر اس کی کچھ اور روایتوں کے ماتحت بھی گفتگو آئے گی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ پر اس کی روایت میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت علی زین العابدینؒ جو قتل و قتال کی نوبت سے بچ رہے تھے انھیں بعد میں شمر کی زد سے بچانے کا کارنامہ اسی فدوی کا ہے۔

خلاصۂ کلام

یوم عاشورہ کے واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں جن مختلف پہلوؤں کو اوپر کے صفحات میں اُجاگر کیا گیا اُن کے پیش نظر اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یہ روایتیں بالعموم ناقابل اعتبار بلکہ بیشتر بالبداہت (EVIDENTLY) قابل رد ہیں اس لیے عقل اور نقل، قانونِ شریعت اور تقاضائے دیانت ہر ایک کے ماتحت ان روایتوں کی فراہم کی ہوئی تفصیلات کو کم از کم ناقابل اعتبار ضرور قرار دیا جانا چاہیے اور اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہیں سمجھی جانی چاہیے جو ایسی روایتوں میں آتا ہے جیسی روایت حضرت محمد الباقرؒ کے حوالے سے اوپر نقل کی گئی کہ[1]:

"جب حضرت کربلا میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے (اور کوفیوں کی غداری لشکر عمر بن سعد کی شکل میں عملاً سامنے آگئی) تو آپ نے (اس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے) تین شکلیں ابن سعد کے سامنے رکھیں۔ میں حجاز واپس چلا جاؤں۔ یزیدؔ کے پاس چلا جاؤں۔ یا کسی سرحد پر نکل جاؤں (یعنی ملک چھوڑ دوں) ابن سعد نے تجویز پسند کی اور ابن زیاد کے پاس بھیجدی۔ وہاں سے نامنظور ہوئی اور اس کی جگہ یہ حکم آیا کہ وہ (کسی اور بات سے پہلے) ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ (پھر ان کی کسی بات پر غور کیا جائے گا) اس شرط کو حضرت حسینؓ نے قطعی طور سے رد کر دیا۔ نتیجہ میں ابن سعد نے (جیسا کہ اس کو حکم تھا) طاقت استعمال کی اور اس میں حضرت حسین کے تمام ساتھی شہید ہوئے۔ ان میں آپ کے گھرانے کے بھی قریباً ۱۵۔ ۲۰ جوان تھے۔ آپ کا ایک چھوٹا بچہ بھی اک

---

[1] یہ احتیاط علمی ذمہ داری ہی کی بنا پر لازم نہیں ہے بلکہ شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بھی یہی چاہتی ہے اس لیے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق دو فریقوں سے ہے اور شرعاً و اخلاقاً کسی فریق کی حمایت یا مخالفت میں کوئی بات مضبوط شہادت کے بغیر جائز نہیں۔

تیر آکر لگنے سے شہید ہوا۔ اس کے بعد آپ نے بھی تلوار اٹھائی اور قتال کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔[1]

روایتِ حضرت باقر کی خطا؟

واقعۂ کربلا کے بیان میں شیعہ نقطۂ نظر کو براہِ راست جاننے کی غرض سے جو چند کتابیں مجھے دیکھنے کا موقع ملا اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت محمد الباقر کی یہ روایت ان حضرات کے یہاں ذکر میں نہیں لائی جاتی۔ حالانکہ سند کے اعتبار سے ان حضرات کے یہاں اُس کی بے حد وقعت ہونی چاہیے تھی۔[2] ہاں اس کا آخری حصہ جو دربار یزید میں حضرت حسینؓ کا سر لیجانے سے متعلق ہے، جس کا ذکر ہم آگے کریں گے، اس کا تذکرہ یہ حضرات کر دیتے ہیں۔ وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس روایت میں یزید کے پاس جانے کی پیش کش بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ پیش کش باوجود "حُسین کی پیش کش" ہونے کے ایسی ناخوشگوار شئی گردانی گئی ہے کہ یوم عاشورہ کی جن روایتوں کا بڑے ذوق وشوق سے بیان کیا جاتا ہے، ان میں بھی جہاں کہیں اس پیش کش کی بات صراحۃً یا اشارۃً آگئی ہے وہاں یا تو روایت کا بیان اسی جگہ ختم کر دیا گیا ہے، یا یہ جزو حذف ہے۔ کئی ایک مثالوں میں سے بس ایک مثال حضرت حسین کے رفیق زُہیر بن قَین کی اُس تقریر کی لے لیجئے جو اسی باب میں اوپر گزر چکی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ:-

"اے اللہ کے بندو، فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد بہ نسبت ابنِ سُمیہ (ابن زیاد) کے تمہاری محبت اور نصرت کی زیادہ مستحق ہے۔ لیکن اگر تم ان کی مدد نہیں بھی کرتے تو ان کے قتل کے درپے ہونے سے تو باز آؤ اور اِس آدمی

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [2] اور جیسا کہ باب نمبر ۱ میں گذر چکا ہے محققین اہل سنت کے یہاں تو قصے کی تمام روایتوں میں دو ہی روایتیں سند کے اعتبار سے قوی ہیں اور ان میں سے ایک یہی حضرت محمد الباقر کی روایت ہے۔

(حضرت حسینؓ) کے اور اس کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میری جان کی قسم یزید کو تم سے راضی کرنے کیلئے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تم حسینؓ کو قتل کر دو۔[1]"

لیکن "شہید انسانیت" کے مصنف اس تقریر کو اس پیشکش سے پہلے والے جملے پر ہی ختم کر گئے ہیں۔[2] یہ بعد کے جملے بھی اُن کے قارئین تک پہنچ جائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ یزید کے پاس جانا چاہتے تھے[3] اس کو انھوں نے پسند نہیں فرمایا۔

اور شیعہ حضرات کو کیا کہیں، خود اہل سنت حضرت حسینؓ سے متعلق شیعی تصورات سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ ان کے یہاں بھی واقعے کے اس جزو کو، جو حتمی طور پر ثابت ہے، تاریکی ہی میں رکھنا عام طور پر پسند کیا گیا۔ ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء "واقعہ کربلا" نامی راقم کا مضمون جس پر "نظر ثانی" اس کتاب کی شکل اختیار کر گئی جو آپ پڑھ رہے ہیں، اُس مضمون میں راقم نے اس حقیقت سے بے خبری کے عالم میں کہ حضرت حسینؓ نے جو سہ رخی پیش کش کربلا میں کی تھی جس کا ایک جزو یزید کے پاس جانا اور اکثر روایتوں کے مطابق بیعت کے لیے جانا تھا،[4] اس کا یہ جزو مکمل تاریکی میں ہے، اس جزو کو بھی روشنی دکھاتے

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۲ [2] ملاحظہ ہو ص ۸۱--۲۸ [3] حُر بن یزید تمیمی کی تقریر اور اس سے متعلق قصے میں بھی بار بار حضرت حسین کے پیش کردہ شرائط کے الفاظ بار بار ہیں۔ وہ روایت جس میں شمر، ابن زیاد کو یہ شرائط قبول کرنے سے روکتا ہے اس کا تقریباً ہر مصنف کے یہاں تذکرہ ہوتا ہے اسی روایت میں وہ شرائط پوری تفصیل سے موجود ہیں مگر ان کی طرف سے تجاہل برتا جاتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر اختلافی بیانات اور راویوں کی روایتیں طبری نے ص ۲۳۵ پر درج کر دی ہیں ان کا یکجائی مطالعہ بھی صاف طور سے اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہاں شرائط والی روایتیں ہی منضبط ہیں اور خود طبری نے گویا یہی تاثر دیا ہے۔ [4] ان روایتوں کے الفاظ ہیں حتّٰی اضع یدی فی یدہٖ جس کا لفظی ترجمہ ہے (تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدوں) کوئی اس عبارت کا ترجمہ "بیعت" سے نہ بھی کرنا چاہے تو "سپردگی" سے پھر بھی کرنا ہی ہوگا، اور پھر فرق کیا رہا؟ ویسے "سر داد نداد دست در دستِ یزید" والے مشہور مصرعے کے مطابق تو ان الفاظ کا مطلب بیعت ہی ہوتا ہے۔

کی غلطی کر دی اور بس یہ "غلطی" قیامت خیز ہو گئی۔ بہت بہت پڑھے لکھے سنی حضرات جن میں میرے بعض بڑے محترم اور مشفق بھی شامل تھے، ان کے لیے حضرت حسینؓ کی طرف اس بات کی نسبت ناقابل برداشت ہوئی اور معاملہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب الفرقان کی اگلی اشاعت میں تاریخ طبری اور ابن کثیر وغیرہ کے پانچ چھ حوالوں سے اصل عربی عبارتوں میں وہ پیش کش نقل کر دی گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس پیش کش کی بات کوئی افتراء اور بہتان یا کسی کمزور ذریعے (SOURCE) کی بات نہیں تھی۔

ناقابلِ انکار حقیقت

بہرحال یہ بات پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ سامنے آجانی چاہیے کہ حضرت حسینؓ نے کربلا میں یہ دیکھ کر کہ حالات کا رُخ اُس خیال اور گمان کے بالکل برعکس ہے جس گمان اور اطمینان کے ساتھ کوفے کی طرف سفر شروع کیا گیا تھا، ابن زیاد کے نائب عمر بن سعد کو وہ پیش کش کی جو حضرت محمد الباقر کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ اور جس کی تائید واقعۂ کربلا سے متعلق چند در چند روایات میں صراحتہً یا اشارۃً پائی جاتی ہے۔ یہ حضرت حسینؓ کے ورودِ کربلا کے ساتھ جڑی ہوئی ایسی حقیقت ہے کہ جب تک آپ کے ورودِ کربلا اور عمر بن سعد کے وہاں آنے سے انکار نہ کر دیا جائے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے، جسٹس امیر علی جیسے شیعہ مصنفین جن کے یہاں شیعیت تو قدرتی طور سے پائی جاتی ہے۔ مگر علمی خیانت کے بظاہر قائل نہیں ہیں، انھوں نے بھی واقعہ کربلا کے سلسلے میں نہ صرف اس سہ گانہ پیش کش کی بات پوری صراحت سے درج کی ہے بلکہ ایک روایت (صرف ایک روایت) جو اس کی تردید میں پائی جاتی ہے اس کو رد بھی کر دیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب "اسپرٹ آف اسلام" (SPIRIT OF ISLAM) میں واقعہ کربلا کے ذکر میں حضرت حسین کی سہ گانہ پیش کش بیان کر کے موصوف نے اس پر حاشیہ دیا ہے جو کتاب کے اردو ترجمے میں بایں الفاظ درج ہوا ہے:۔

"صاحبِ روضۃ الصفا یہ شرائط بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ خدام حسین میں سے ایک شخص نے جو مقتلِ کربلا سے اتفاقاً بچ نکلا، اس دعوے کو غلط بتایا کہ امام حسین نے اموی سردار کے سامنے کسی قسم کی شرائطِ صلح پیش کیں، ممکن ہے[1] کہ اس خادم نے یہ انکار یہ ظاہر کرنے کی خاطر کیا ہو کہ امام حسین نے صلح کی تجویز کر کے اپنے آپ کو دشمن کے سامنے ذلیل نہیں کیا۔ لیکن میرے نزدیک صلح کی تجویز سے حضرت حسین کی سیرِ عالیہ کی کسی طرح کسرِ شان نہیں ہوتی۔[2]..."

---

[1] یہاں سے جسٹس امیر علی کا تبصرہ شروع ہوا ہے۔

[2] روحِ اسلام ترجمہ "اسپرٹ آف اسلام" از محمد ہادی حسین۔ اسلامک بک سینٹر دہلی ص ۴۵۶

باب یازدہم ۱۱

شہادت کے بعد کی کہانی

شہادت تک کے مرحلے میں جس طرح کی بے سروپا کہانیاں اللہ ہی جانتا ہے کہ بنانے والوں نے کن کن مقاصد کے لیے بنائیں اور ہمارے اہل تاریخ نے شائع کیں، ان کہانیوں کا سلسلہ شہادت کے المناک مناظر پیش کرنے پر ختم نہیں ہو گیا (جنھیں پیش کرنے کی ہمت ہم اپنے اندر نہیں پا سکے کیونکہ ایک جھوٹ سے خواہ مخواہ دل زخمی کیا جائے) بلکہ ان سے بھی بدتر قسم کے مناظر دکھانے والی کہانیاں ہم اپنی انہی تاریخی کتابوں میں مابعد شہادت کے سلسلے میں پاتے ہیں۔[۱]

خواتین کی بے حرمتی

شہادت اور اس کے ذیل کے دلدوز مناظر جس روایت کے اندر آتے ہیں اس کا خاتمہ خواتین اہل بیت کی بے حرمتی پر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر تن سے جدا کرنے اور آپ کے جسم کی پوشش، کپڑے، جوتے، ٹوپی کھسوٹ لینے کے بعد یہ لوگ خواتین اور خیمے کے مال و اسباب پر لوٹے، حد یہ تھی کہ سروں سے اوڑھنیاں اور چادریں تک کھینچ لی گئیں۔[۲] اس کے بعد کی روایت کہتی ہے کہ اس مرحلے پر عمر بن سعد

۱؎ طبری اور ابن اثیر کا تو ایک ہی حال ہے البتہ کہیں کہیں ابن کثیر نے تھوڑی سی احتیاط برتی ہے ۲؎ طبری ج ۶ ص ۲۶۰

پہنچے اور اعلان کیا کہ کوئی شخص ان عورتوں کے خیمے میں نہ جائے اور ان کے سامان سے کسی نے کچھ لیا ہو تو واپس کرے۔ مگر کسی نے کچھ واپس نہیں کیا۔[1]

لاش کی بے حرمتی

پھر بھی روایت بتاتی ہے عمر بن سعد نے یہ شریفانہ حکم جاری کرنے کے بعد دوسرا اس کے مقابل میں حکم یہ جاری کیا کہ

"ہاں کون ہے جو اپنے گھوڑے کے ذریعے حسینؓ کی لاش کو روندے؟ چنانچہ دس ہمت والے نکل کے آئے اور انھوں نے "یہ کارِ خیر" بھرپور طریقے سے انجام دیا۔"[2]

سر کی بے حرمتی اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی

اسی روایت کے مطابق آپ کا سر فوراً کوفے کو روانہ کیا گیا اور دوسرے دن قافلے کی خواتین اور باقی ماندہ بچوں کو ساتھ لے کر عمر بن سعد اور اس کی فوج نے کربلا سے کوچ کیا، آگے کی ایک روایت کے مطابق (جس کا راوی حُمید بن مسلم ہے) حضرت حسینؓ کا سر اور آپ کے اہلِ بیت جب ابن زیاد کے یہاں پہنچائے گئے تو اس نے سر کی بھی بے حرمتی اپنی چھڑی اور زبان سے کی اور اہلِ بیت کے زخمی دلوں پر بھی خوب خوب نمک چھڑکا۔[3] اور پھر اس کے آگے آنے والی روایت کے مطابق حضرت علی بن الحسینؓ (حضرت زین العابدین) جو کربلا میں بیمار صاحبِ فراش ہونے کی وجہ سے "میدانِ جنگ" میں نہ نکل سکے تھے (اور بعد ازاں خود حُمید بن مسلم کی "عنایت" سے بچ گئے تھے) کو باقیاتِ قافلہ میں دیکھنا ابن زیاد کو اس قدر ناگوار ہوا کہ اس نے اُن کا ستر کھلوا کر بالغ اور نابالغ ہونے کی جانچ کرائی اور نتیجے میں بالغ پا کر قتل کا حکم دیا۔ مگر پھر (مختلف روایتوں کے مطابق مختلف وجوہ سے) اُن کی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ [2] ایضاً ص ۲۶۱ [3] ایضاً ص ۲۶۳-۲۶۲

جان بخشی کردی[1]

تنقید کی ایک نظر

پچھلے باب میں ہم نے کہا ہے کہ اس واقعہ کی روایتوں میں روایت اور درایت کے اصولوں کے اعتبار سے اس قدر ناقابلِ قبول اور ناقابلِ قیاس باتیں بھری ہوئی ہیں کہ کسی بھی روایت کو، خاص کر جس سے کسی پر کوئی الزام آتا ہو، قبول کرنا اور مان لینا ایک بڑا مشکل اور بھاری ذمہ داری کا کام ہے، کیونکہ شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جانا ہر مہذب قانون کا ضابطہ ہے۔ شریعتِ اسلامی کا ضابطہ بھی یہی ہے۔ یہ سب روایتیں جن کا اختصار اوپر کے صفحات میں بیان ہوا اسی الزامی نوعیت کی ہیں۔ تاہم جہاں تک ابن زیاد کا سوال ہے اُس کے متعلق یہ ماننا از روئے قیاس کچھ بہت مشکل نظر نہیں آتا کہ حضرت حسینؓ کا سر اس کے سامنے رکھا گیا ہو تو اس نے آپ کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے چھڑی سے آپ کے دانتوں اور سر کو ٹھوکا دیا ہو۔ لیکن آفت رسیدہ خواتین کے ساتھ جس قسم کی نمک پاشی کی باتیں اُس سے منسوب کی گئی ہیں، اُن کے لیے جب تک کوئی نہایت مضبوط شہادت نہ ہو کوئی جواز یقین کر لینے کا نظر نہیں آتا۔

حضرت حسینؓ کے دانتوں کو چھڑی لگانا یوں بعید از قیاس نہیں ہے کہ ابن زیاد کو بظاہر حضرت حسینؓ کا کوئی ایسا احترام نہیں تھا جیسے احترام کے تخیل سے ہمیں یہ بات بے حد قبیح معلوم ہوتی ہے۔ اُسے اگر کوئی احترام ہوتا تو کربلا کا سانحہ ہی کیوں پیش آتا، لیکن خواتین کی بات بہت مختلف ہے۔ حضرت حسینؓ کے لیے بے احترامی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ (ابن زیاد) جس حکومت کا عہدہ دار بلکہ نشستی نمک خوار تھا حضرت حسینؓ اس کو چیلنج کرنے کیلئے نکلے تھے، خواتین بے چاری محض تابع تھیں اور انھوں نے کوئی عمل یزید کی حکومت کو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۳

چیلنج کرنے کا نہیں کیا تھا۔[1] اس لیے قرینِ قیاس نہیں ہے کہ وہ خواتین کے ساتھ، خاص طور سے اُن کی غمزدگی میں، ایسے طور سے پیش آیا ہو جسے کوئی بھی ماحول پسند نہیں کرسکتا ـــــــ ایسی خلافِ قیاس بات کا الزام کسی کو دینے کے لیے بہت ٹھوس شہادت چاہیے۔ اور یہاں شہادت کس کی ہے؟ حُمید بن مسلم کی۔ ایسا جھوٹا اور لپاٹیا راوی، جس کے جھوٹ اور افسانہ تراشی کی شہادت خود طبری کے اندر کی اس کی روایتوں میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ انہی روایتوں میں (بشمول زیرِ بحث روایت) موجود ہے[2] جو اوپر کے صفحات میں پیش کی گئیں۔ آیئے ایک نظر ڈالیے۔

حُمید بن مسلم کے تضادات

اس روایت کو، (جو کہ زیرِ بحث ہے)، شروع کرتے ہوئے حُمید بن مسلم کہتا ہے کہ کربلا سے اُسے عمر بن سعد نے اپنے گھر روانہ کیا تاکہ اس کی خیر و عافیت کی خبر اور "فتح" کی خوشخبری پہنچائے۔ اور یہ کام کرکے وہ ابن زیاد کی طرف گیا تو وہاں دیکھا کہ سرِ حسینؓ رکھا ہوا ہے اور قافلۂ حسینی کے باقیماندہ افراد بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ بس اس کے آگے وہ خواتین اور اہلِ بیت کے زخموں پر ابن زیاد کی نمک پاشی کا قصہ سناتا ہے۔ جبکہ یہی شخص ایک صفحہ پہلے (ص۲۶۱) کی روایت میں یہ بیان دے رہا ہے کہ عمر بن سعد نے اس کو اور فلاں دوسرے شخص کو حضرت حسین کا سر ابن زیاد کے پاس پہنچانے کے لیے بھیجا۔ یعنی اس کی ایک روایت کے مطابق سر پہنچانے والا یہ خود تھا اور دوسری روایت کے مطابق کسی دوسرے شخص نے یہ کام کیا۔

---

[1] شیعہ حضرات کی کتابوں میں ان خواتین کی طرف جو باغیانہ تقریریں کوفے میں ان کے داخلے کے موقع پر منسوب کی گئی ہیں۔ ذرا سے غور سے بھی آدمی اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ سب تصنیف ہے۔ ورنہ جب وہ انہی لوگوں کے بقول قیدیوں کی طرح لے جائے جا رہی تھیں تو کون انھیں راستے میں کھڑے ہو ہو کر باغیانہ تقریریں کرنے دیتا۔ [2] پچھلے باب میں اس کے کردار پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

بہرحال یہ شخص ایک "حاضر و ناظر" قسم کا راوی ہے، ہر جگہ موجود ملتا ہے۔ اور متضاد قسم کی باتوں پر یقین کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی شہادت پر کیسے کسی کو ملزم ٹھیرا جاسکتا ہے؟ افسوس ہوتا ہے کہ آخر طبری نے اس کے ایسے بیانات کیونکر بلا کسی تنقید اور تبصرے کے جمع کر دیئے ہیں جو خواہ مخواہ تشویشِ ذہن اور ضیاعِ وقت کا باعث ہوں!

رہی وہ روایت کہ حضرت زین العابدین کا ستر کھول کر ان کے بلوغ اور عدم بلوغ کا امتحان کیا گیا۔ تو اس مذاق کے لیے کیا کہا جائے! اس راوی کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ حضرت زین العابدین ۲۲ سال کی عمر کے شادی شدہ اور ایک بچے حضرت محمد الباقر کے باپ تھے۔ اور بچہ بھی قافلے میں موجود تھا۔[1]

---

[1] شیعہ مآخذ میں تو ابن زیاد کے بارے میں اس موقع کی وہ روایتیں ہیں کہ اللہ کی پناہ اور وہ کسی حد تک سنیوں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی بابت تفصیل میں ہمیں نہیں جانا۔ البتہ ایک روایت کا ذکر یہاں کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ابن زیاد کے ساتھ بھی ہم کوئی بے انصافی کا معاملہ نہ کریں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ روایت طبری ہی میں ہے اور بتاتی ہے کہ۔

فجئ برأس الحسین الی ابن	ترجمہ: حسینؓ کا سر ابن زیاد کے پاس لایا گیا اور
زیاد فوضع بین یدیہ فجعل	سامنے رکھا گیا۔ پھر وہ اپنی چھڑی سے اشارہ
یقول بقضیبہ ویقول ان	کرنے اور کہنے لگا کہ اچھا ابو عبداللہ کے
اباعبد اللہ قد کان شمط قال	بال تو کھچڑی ہو گئے تھے اور ان کی بیویاں
وجئ بنسائہ وبناتہ واھلہ	بیٹیاں اور دیگر اہل خانہ بھی لائے گئے
وکان احسن شئ صنعہ أن	ان کے معاملے میں ابن زیاد نے سب سے اچھی
امر لھم بمنزل فی مکان معتزل	بات یہ کی تھی کہ ان کے قیام کے لیے ایک
واجریٰ علیھم رزقا وامرھم	ذرا الگ تھلگ جگہ پر انتظام کیا تھا وہیں
بنفقۃ وکسوۃ قال فانطلق	ان کا کھانا جاتا تھا، اور (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اس کے بعد پیچھے کی طرف چلیے۔ حضرت حسینؓ کے جسد خاکی کو گھوڑوں سے روندوانے کی روایت اُن روایتوں میں سرفہرست رکھے جانے کی مستحق ہے جن کی وجہ سے روا بتوں کا یہ سارا کارخانہ جعل وفریب پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس کا راوی بھی وہی مُسلم بن حُمید ہے اسی روایت میں حُمید کا وہ بیان بھی آتا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ مجھے عمر بن سعد نے حضرت حسینؓ کا سر لے کر ابن زیاد کے پاس روانہ کیا تھا، اور آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ اسی شخص کی دوسری روایت اس بیان کی تردید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جھوٹ کی یہ منہ بولتی علامت بھی موجود ہے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

غلامان منهم لعبد الله بن جعفر وا بن جعفر فأتيا رجلًا من طئ فلجآ إليه فضرب اعناقهما وجاء برؤسهما حتى وضعهما بين يدى ابن زياد، قال فهمّ بضرب عنقه وامر بداره فهدمت۔

دوسری ضروریات اور اخراجات فراہم کرنے کے بھی احکام دیئے تھے، اسی دوران میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ان میں سے عبداللہ بن جعفر کے دو بیٹے یا پوتے نکل کر بنو طے کے ایک آدمی کے یہاں پہنچ گئے اور اس سے پناہ چاہی تو اس (ظالم) نے ان کی گردنیں مار دیں اور سر لے کر ابن زیاد کے پاس آیا۔ راوی کہتا ہے کہ ابن زیاد نے (غصے میں) اس کے قتل کا ارادہ کیا اور (پھر فیصلہ بدل کر) اس کا گھر ڈھا دینے کا حکم دیا اور وہ ڈھا دیا گیا۔

اس روایت میں اور سب باتیں خود سمجھ لینے کی ہیں مگر ایک نقطہ عام قارئین کے اعتبار سے وضاحت طلب ہے کہ اہل عرب کے یہاں کنیت سے کسی کا ذکر یا اس کو خطاب ازراہ تعظیم ہوتا ہے اس روایت کے مطابق ابن زیاد نے حضرت حسین کا ذکر آپ کی کنیت ابوعبداللہ سے کیا ہے اور چھڑی سے کہیں ٹھوکا نہیں دیا ہے، بلکہ اشارہ کیا ہے جو ابن زیاد کے رویئے کو کافی مختلف شکل دینے والی بات ہے اور کم سے کم خواتین کے ساتھ سلوک کے سلسلہ میں تو ہم اس روایت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

شہداء کی تعداد بہتّر بتاتا ہے، جو محض ایک شہرت ہے واقعہ نہیں۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی بھی لکھتے ہیں کہ :-

"ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ تیئیس سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے اور اسی لیے شہدائے کربلا کے لیے بہتّر کا لفظ زبان زدِ خلائق ہے مگر کربلا کے حالاتِ جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد سو سے زیادہ اور دو سو سے کم تھی۔"[1]

اگر یہ شخص (حُمید بن مسلم) واقعی کربلا میں موجود ہوتا یا جو روایتیں اس کے نام سے آتی ہیں وہ واقعی کسی بھی ایسے شخص کی ہوتیں جو کربلا میں موجود تھا تو یہ بہتّر کی خلاف واقعہ تعداد اس نے نہ بتائی ہوتی ـــ اور یہی وہ روایت ہے جو خواتین کے سروں سے چادریں تک کھینچ لینے کا قصہ سناتی ہیں، پس خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ کس قسم کی روایت ہے اور اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں اُن کی کیا حیثیت ہے ؟

قصر یزید میں

بیان میں کہا گیا ہے کہ کوفے سے حضرت حسینؓ کا سر امیر یزید کے پاس دمشق بھیجا گیا۔ علیٰ ہذا قافلۂ حسینی کے باقیماندہ افراد خواتین اور بچے بھی وہیں پہنچائے گئے۔ اس بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں وہ تو یہ ہیں کہ یزید نے بھی سر کے ساتھ ٹھوکا دینے کی گستاخی کی اور بقیۃ السیف اہل خانہ کے ساتھ بھی رنج پہنچانے والی باتیں کیں۔ بلکہ شیعہ روایات کے مطابق تو اہلِ خانہ کا قافلہ کوفے سے دمشق تک لایا ہی گیا غیر مسلم قیدیوں کی طرح نہایت ذلت اور تشہیر کے ساتھ تھا۔ اور پھر گھنٹوں محل کے دروازے پر کھڑا رکھا گیا وغیرہ وغیرہ خرافات جن میں امویوں کے ہاتھوں خاندانِ نبوت کی وہ تذلیل دکھا کر جو مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھی

[1] شہید انسانیت ص۳۷۰

بلکہ ان اہلبیت کی خود اپنے ہاتھوں بھی اپنی تذلیل اور تشہیر (انکی "تقریروں" وغیرہ کی شکل میں)
دکھا کر دراصل شیعہ مذہب کے تمام عقائد اور اعمال و رسوم کی سند اور اصل اہلبیت ہی سے فراہم
کرنے کا وہ فنکارانہ انتظام کیا گیا ہے کہ ایک فن کے اعتبار سے بے اختیار داد دینے کا جی چاہتا ہے۔
لیکن جسکو اصلیت اور واقعیت سے دلچسپی ہے، اُسکے لیے اسی طبری میں، جس میں خود کافی لغویات موجود
ہیں، ان تمام خانہ ساز لغویات کی تردید کا سامان بھی موجود ہے۔

وہ ایک روایت جو دسویں باب میں گذری ہے کہ ابن زیاد نے جو آدمی حضرت حسینؓ کا سر لیکر
دمشق بھیجا تھا اور اُس نے کربلا کی یہ کہانی سنائی تھی کہ حسینؓ اور اُنکے ساتھی ہمارے سامنے ایسے بھاگے
جیسے شکروں کے سامنے کبوتر حتیٰ کہ ذرا سی دیر میں اُنکا کام کر دیا گیا۔ اس میں آگے مزید یہ الفاظ بھی
تھے "پس اب وہاں اُن کے جسم ہیں بے لباس کپڑے ہیں خون آلود چہرے خاک آلود.....الخ"

وہی روایت اس کے بعد بتاتی ہے:

فدمعت عین یزید وقال قد کنت	یہ سنکر یزید کی آنکھیں بھر آئیں اور کہا ارے یہ
ارضیٰ بطاعتکم بدون قتل	کیا کیا) میں تو قتل حسینؓ کے بغیر بھی تم سے راضی
الحسین لعن الله ابن سُمیّہ اما	رہتا، اللہ ابن سُمیہ[1] کو غارت کرے بخدائے پاک
والله لو انی صاحبہ فعفوت عنہ	میں اگر اُسکی جگہ ہوتا تو حسینؓ سے درگزر ہی
فرحم الله الحسین ولم یصلہ	کرتا۔ اللہ حسینؓ پر رحمت کرے" اور پھر
بشیٔ۔	اُس آدمی کو کوئی انعام وصلہ دیا (جس کا وہ متوقع تھا)

اس کے بعد راوی مزید بیان اس بارے میں دیتا ہے کہ ابن زیاد نے حضرت حسینؓ کے
اہل خانہ کو بھی دو آدمیوں کی تحویل میں امیر یزید کے پاس ارسال کیا تھا ان دو میں سے ایک
کا نام مُحَفّز بن ثعلبہ تھا۔ اس مُحَفّز نے محل کے دروازے پر آکر آواز لگائی:

ھٰذا مُحَفّز بن ثعلبہ اتیٰ	یہ مُحَفّز بن ثعلبہ ہے جو "ایسوں

---

[1] ابن سمیہ تو ابن زیاد کے باپ زیاد کو کہا جاتا ہے، واللہ اعلم، یہاں ابن زیاد کے لیے کیونکر استعمال ہوا

باللئام الفجرۃ۔	ایسوں[1]" کو (معاذ اللہ) لے کر آیا ہے۔

یزید نے اس کے جواب میں کہا کہ:-

ماولدت اُم مُحَفّز شرّ و الأمَ (منہ[2])	مُحَفّز کی ماں نے اس سے زیادہ بُرا اور اس سے زیادہ لئیم نہیں جنا۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایت ضرور صحیح ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ اس روایت
کی موجودگی اُن روایتوں کو مشکوک ضرور بنا دیتی ہے جن میں یزید کے اس رویے کے
برعکس رویہ دکھایا گیا ہے۔ اور مزید یہ بھی کہا جائیگا کہ جو مزاج، جو طبیعت اور جو خاندانی ماحول
یزید کیلئے فی الوقت ثابت ہے (نہ کہ خانہ ساز کیس) اور حضرت حسین کے لیے اسکے جن رویے
اور جن احساسات کی مضبوط شہادت کربلا کے واقعۂ شہادت سے کچھ پہلے تک کیلئے پائی جاتی ہے
جن کا کچھ بیان اس کتاب کے بعض گزشتہ ابواب میں بھی ہوا ہے، یہ ثبوت اور یہ شہادتیں
بہرحال اپنا وزن اس روایت کے اور اس جیسی روایتوں کے پلڑے میں ڈالتی ہیں۔

حضرت محمد الباقر کی روایت اور یہ قصے؟

ہم نے حضرت محمد الباقر کی روایت کا بار بار حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا ہے اور بقدر ضرورت
شہادت تک کا حصہ نقل بھی کیا ہے۔ اس حصے کے بعد اس روایت میں بھی بعد شہادت والا قصہ
ابن زیاد اور یزید سے متعلق آتا ہے ضروری ہے کہ اس گفتگو میں اسکو بھی سامنے لایا جائے۔

اس روایت کو ہم نے شہادت حضرت حسینؓ تک نقل کیا تھا اس کے آگے اس روایت
میں ہے کہ آپکو قبیلۂ مذحج کے ایک آدمی نے قتل کیا تھا پھر اس نے سر کو تن سے جدا کیا اور

---

[1] بہت بُرے الفاظ تھے اس لیے ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ عربی الفاظ میں لئام لئیم کی جمع ہے اور فجرہ فاجر کی

[2] طبری ج ۶ ص ۲۶۴ "طبری میں "شرو والأم" ہے جو بداہۃً غلط ہے "شرًّا والأم منہ" ہونا چاہیے
ابن اثیر میں یوں آیا ہے "الأم واحمق منہ" ج ۳ ص ۲۹۸ ۔

لے کر عبید اللہ بن زیاد کے پاس آیا اور انعام کا طالب ہوا۔ ابن زیاد نے یزید کے پاس روانہ کر دیا۔ یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا تو وہ آپکے مُنہ پر چھڑی سے ٹھوکے دیتے ہوئے ایک "شعر" پڑھنے لگا (جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ حسین نے از راہ حق ناشناسی و حق تلفی ہمارے خلاف صف آرائی کی) حضرت ابو برزہ اسلمیؓ صحابی موجود تھے انہوں نے ٹوکا کہ چھڑی ہٹا لو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہا دیکھا ہے کہ انکے مُنہ پر مُنہ رکھے ہوئے چوم رہے ہیں۔ بعد میں حضرت حسینؓ کے اہل خانہ بھی کوفے سے دمشق ہی پہنچا دیئے گئے۔ اس موقع پر یزید نے اپنے خواص اہل شام کو جمع کیا جن میں سے ایک نے خانوادۂ حسینی کی ایک صاحبزادی پر نظر ڈال کر یزید سے کہا کہ امیر المومنین یہ لڑکی مجھے بخش دیجئے۔ حضرت زینبؓ نے آڑے آکر کہا کہ ایسی بات کوئی شخص دینِ حق سے باہر ہو کر ہی کہہ سکتا ہے اس نے اپنی بات پھر دہرائی تو یزید نے کہا کہ باز آجاؤ (کُفَّ عن هٰذا) اور پھر ان لوگوں کو اپنے گھر میں بھیج دیا۔ بعد ازاں اُنکے لیے سامانِ رخصت مہیا کر کے انکو مدینے روانہ کیا۔[1]

گویا اس روایت کا بیان بھی ایک معاملے میں انہی روایتوں کی طرح ہے جن کے مقابلے میں ہم نے ابھی اس سے اوپر کی ذکر کردہ روایت (بحوالہ طبری ص۲۶۴) کو قابلِ ترجیح قرار دیا۔ یعنی اسمیں بھی منہ پر چھڑی لگانے والی بات آئی ہے۔ سو اس سلسلے میں پہلی بات تو ہمارے نزدیک قابلِ توجہ یہ ہے کہ یزید سے ہم حضرت حسینؓ کیلئے اُس احترام کی توقع نہیں کر سکتے جو ہمارے نزدیک ضروری ہے اسلیے بالکل ممکن ہے کہ چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ شکایت کا واقعہ پیش آیا ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ روایت کے اس حصے میں کھُلے طور پر الحاق کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:-

۱- یہ روایت کہتی ہے کہ قاتل نے سر کو تن سے جُدا کیا اور سیدھا لیکر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ حالانکہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر سالارِ لشکر ابن سعد کے بھیجے ہوئے کوئی شخص یہ کام بالا ہی بالا خود کر ڈالتا۔

۲- یہ دو شعر بھی روایت میں اسی شخص کی زبان سے ابن زیاد کے سامنے کہلوائے گئے ہیں

[1] طبری ج ۶ ص۲۱-۲۲۰

جن کا ترجمہ ہے:

"حضور والا میری سواری کو سونے اور چاندی سے لاد دیجئے۔ اس لیے کہ میں نے
ایک شاہِ ذی شان کو قتل کیا ہے۔
میں نے اس کو قتل کیا ہے جو اپنے نسب اور ماں باپ کے اعتبار سے سب سے اچھا ہے"

لیکن یہی دو شعر پڑھتا ہوا قاتل ہمیں ایک دوسری روایت میں کربلا کے میدان میں عمر بن سعد کے خیمے پر بھی دکھایا گیا ہے۔ اور پھر اس میں یہ بھی ہے کہ عمر بن سعد نے سنا تو کہا کہ:

"واللہ تو ازلی مجنون ہے۔ لاؤ اس کو اندر لاؤ۔ چنانچہ اندر لایا گیا تو چھڑی سے اس کی پٹائی کی۔ اور کہا، ارے او پاگل تو ایسی باتیں مُنہ سے نکال رہا ہے؟ ابن زیاد نے اگر سن لیا تو تیری گردن مار دے گا۔[1]"

عمر بن سعد کے خیمے پر بھی فی الواقع یہ شعر پڑھے گئے تھے یا نہیں؟ یہ الگ بات ہے لیکن بہ نسبت اسکے کہ قاتل سر الگ کر کے بالا ہی بالا ابن زیاد کے پاس لے گیا ہو اور وہاں ان اشعار کی صدا لگائی ہو، یہ بات زیادہ سمجھ میں آنیوالی ہے کہ وہ یہ "کارنامہ" کر کے عمر بن سعد سالارِ لشکر کے خیمے پر آیا ہو اور داد و انعام کا طالب ہوا ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہو۔ ایک روایت کے مطابق یہ شعر قاتل نے میدان کربلا میں ابن سعد کے خیمے پر پڑھے تھے۔ اب اگر بعد میں یہی قصہ کوئی ابن زیاد سے متعلق کر کے سناتا ہے تو صاف طور سے یہ کسی گڑبڑ کا شاخسانہ ہے اور وہ بھی بہت اوٹ پٹانگ قسم کی گڑبڑ۔ اور پھر اس کھلی گڑبڑ کے نتیجے میں بالکل قرینِ قیاس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف "چھڑی سے ٹھوکا دینے" کی نسبت بھی اسی نوعیت کی چیز ہو، یعنی یہ کہ واقعہ تو ابن زیاد کا تھا۔ جیسا کہ اور روایتوں میں آچکا ہے۔ مگر حافظہ کی گڑبڑ یا ارادے کی گڑبڑ سے کسی راوی نے یزید کے سر لگا دیا۔ اور یاد رہے کہ ابن زیاد کے بارے میں بھی ہم اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ایسے واقعہ کا

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۱

ہونا بعید از قیاس اگرچہ ہرگز نہیں ہے، البتہ جب ایک روایت "ٹھوکا دینے" کے بجائے "اشارہ کرنے" کی موجود ہے تو کم از کم شک کا فائدہ ابن زیاد کو پہنچنے سے ہم نہیں روک سکتے۔ خواہ وہ قتل حسینؓ کی اصل ذمہ داری کے لحاظ سے ہمیں کتنا ہی مبغوض ہو۔

خواتین خانوادۂ نبوت کے ساتھ اور صاحبزادہ علی بن الحسینؒ کے ساتھ رنج رسانی اور سخت کلامی وغیرہ کی روایتیں جو طبری میں بھی آتی ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی ہیں، ان سب کے بارے میں ہم اپنے آپکو یہی کہنے کے لیے مجبور پاتے ہیں کہ جب ان روایتوں سے بالکل مختلف صورت بتانے والی روایتیں بھی موجود ہیں، جو ابھی ہمارے سامنے گذریں تو کوئی جواز نہیں کہ برائی اور بدسلوکی کا معاملہ دکھانے والی روایتیں قبول کرلی جائیں، اور یہ تو ماننا ہی ہوتا ہے کہ یزید نے اس قافلے کو بہت دے دلاکر نہایت احترام کے ساتھ ایسے لوگوں کی معیت میں مدینے روانہ کیا تھا، جن کے احترام اور حفظ مرتبت کے رویہ سے اہل قافلہ نہایت خوشنود اور شکر گزار ہوئے[1]۔ اور پھر مدت العمر اس خاندان کے ساتھ غیر معمولی مراعات اور حسن سلوک کا رویہ رہا جس کی تفصیلات میں جانے کی شاید ضرورت نہیں، اور پھر ایسا ہی رویہ اس خانوادۂ نبوت کا بھی بنوامیہؓ کے ساتھ رہا۔ مگر اسکو کیا کیا جائے کہ ان سارے حقائق کے باوجود من گھڑت روایتوں کے پروپیگنڈے سے بنائی ہوئی جذباتی فضا میں لوگ ہمیں یہاں تک یقین ماننے پر لے آئے ہیں کہ کوفے سے جب شہدائے کربلا کے سر اور بقیۃ السیف افراد کا قافلہ دمشق کے حدود میں داخل ہوا اور یزید کی "منتظر نظریں" اپنے محل کی بلندی سے اس پر پڑیں تو اس نے "وجد میں آکر یہ دو[2] کافرانہ شعر پڑھے۔

لمّا بدت تلك الحمول واشرفت　　　تلك الرؤس علیٰ ربی جیرون

نعق الغراب فقلت نح اولا تنح　　　فلقد قضیت من النبی دیونی

ترجمہ: جب جیرون کے ٹیلوں پر کجاوے ابھرے اور وہ سر نظر آئے تو کوے نے کائیں کائیں شروع کی،

[1] تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۶۶

میں نے کہا کہ تو بول یا مت بول میں نے تو نبی سے اپنا قرض چکا لیا ہے" (یعنی جنگ بدر کا قرض معاذ اللہ) کاش ہم سمجھ سکتے کہ یہ باتیں غم حسینؓ اور حمایت حسینؓ کے پردے میں کس کافرانہ منصوبے کی تکمیل ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کا ارشاد

اس موقع پر امام ابن تیمیہؒ کی بات قابل ذکر نظر آتی ہے۔ اپنی مشہور کتاب "منہاج السنۃ" میں لکھتے ہیں جس کا ہم یہاں خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

"یزید کے سلسلے میں لوگوں کے تین گروہ ہیں، ایک کا اعتقاد ہے کہ یزید صحابی بلکہ خلفائے راشدین میں سے یا بلکہ انبیائے کرامؑ کے قبیل سے تھا۔ اسکے برعکس ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ کافر اور بدباطن منافق تھا۔ اسکے دل میں بنو ہاشم اور اہل مدینہ سے اپنے ان کافر اعزا و اقارب کا بدلہ لینے کا جذبہ تھا جو جنگ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ کچھ اشعار اس کی دلیل میں اسکی طرف منسوب کرتے ہیں[1] لیکن یہ دونوں قول ایسے غلط اور بے بنیاد ہیں کہ ہر سمجھدار اس کا بخوبی اندازہ کرسکتا ہے۔ یزید حقیقت میں ایک مسلمان فرمانروا اور بادشاہانہ خلافت والے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا۔ نہ وہ صحابی یا نبی تھا اور نہ ہی کافر و منافق۔"

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک مجہول السند روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر یزید کے سامنے لاکر رکھا گیا اور اس نے آپ کے دندان کو اپنی چھڑی سے ٹھوکا دیا۔ یہ روایت نہ صرف یہ کہ از روئے سند ثابت نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون ہی میں اس کے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے، اس میں جن صحابہؓ کی موجودگی اس وقت یزید کے پاس بتائی گئی ہے (کہ انھوں نے اس کی حرکت پر ٹوکا تھا) وہ شام میں نہیں عراق

[1] یہی اشعار ہیں جو ابھی ہم نے نقل کئے۔

ہیں رہتے تھے۔ اور اس روایت کے برعکس متعدد لوگوں کی روایت ہے کہ یزید نے قتلِ حسینؓ کا حکم دیا نہ اُس کا یہ مقصود تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق آپ کا اعزاز واکرام ہی پسند کرتا تھا۔ البتہ اس کی خواہش یہ تھی کہ آپ اس کی حکومت کے خلاف اقدام کے ارادے سے باز آئیں۔ اور چونکہ آخر میں یہی ہوا کہ کوفے کے قریب پہنچ کر آپ نے اپنا ارادہ ختم کر دیا اور یزید کے پاس جانے یا کسی سرحد پر نکل جانے کی پیش کش کی۔ اس لیے جب یزید اور اس کے گھر والوں کو آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو ان کے لیے یہ نہایت تکلیف دہ ہوئی۔ یزید نے اس وقت یہاں تک کہا کہ خدا کی لعنت ہو ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر۔ اس کی اگر حضرت حسینؓ سے رشتہ داری ہوتی تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔ پھر اس نے آپ کے اہلِ خاندان کیلئے نہایت اچھا واپسی کا سامان کیا اور ان کو مدینے پہنچوایا اور اس سے پہلے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ وہ چاہیں تو دمشق ہی میں اُس کے پاس رہیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس نے حسینؓ کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لیا۔

اور یہ جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں کہ حضرت حسینؓ کے گھرانے کی خواتین کو قیدی اور باندی بنا کر شہر شہر گھمایا تو اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی ہاشمی خاتون کو باندی نہیں بنایا۔ عام اُمتِ مسلمہ تو کیا خود بنی اُمیہ میں ہاشمی خواتین کی تعظیم کا یہ حال تھا کہ حجاج بن یوسف نے (جو قریشی نہیں ثقفی تھا) عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی تو خاندانِ بنو اُمیہ اس قدر برہم ہوا کہ دونوں کی علاحدگی کرائے بغیر نہ رہا۔"[1]

---

[1] انتخاب وتلخیص از منہاج السنۃ ص ۳۲۱ تا ۳۲۵

باب دوازدہم

وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا

ایک نوشتۂ تقدیر تھا جو پورا ہوا

کربلا کا یہ حادثہ، فاجعہ، اسے بجز تقدیرِ الٰہی کے اور کیا کہا جائے؟ ـــــ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اہلِ تعلق اور اہلِ محبت، جن میں وقت کے بزرگ ترین اکابر اہلِ علم و دین بھی ہیں، ایک زبان ہو کر سمجھائیں کہ عراق کا قصد نہ کیجئے! یہ غداروں اور دھوکہ بازوں کی سرزمین ہے، صبح و شام بدل جانے والوں کی سرزمین ہے، اور اُن آزمائے ہوئے نابکاروں کی سرزمین ہے جنھوں نے آپ کے والد ماجد کو رُلایا اور آپ کے بھائی کو کبھی نہ بھلایا جانے والا تجربہ کرایا۔ مگر یہ ساری فہمائشیں دھری رہ جائیں۔ نہ محمد بن حنفیہ جیسے جاں نثار بھائی کی مؤدبانہ اور حکیمانہ گذارش کام آئے۔ نہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بزرگانہ اور محبانہ فہمائش۔ نہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث کا ہر ہر پہلو سے سمجھانا اور نہ حضرت عبداللہ بن مطیع کا فدویانہ واسطے دینا، نہ حضرت ابوسعید خدری، حضرت واثلہ بن واقد اللیثی، حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت جابر بن عبداللہ کا اپنے اپنے انداز سے فیصلہ بدلوانے کی کوشش کرنا۔ حتیٰ کہ وہ آخر میں حضرت عبداللہ بن جعفر کا بیچ میں آکر آخری زور لگا لینا بھی اسی طرح بے کار جائے، جیسے کمان سے نکلے تیر کو واپس لانے کی کوشش بے سود ہوا کرتی ہو!

اور پھر جب وقت آتا ہے کہ آپ (حضرت حسینؓ) سفر کے آخری مرحلے میں اُس مہم سے دستکشی کا فیصلہ فرما لیتے ہیں جس مہم کے لیے سفر اختیار فرمایا گیا تھا تو قضائے الٰہی یہاں بھی آڑے آجاتی ہے اور عبیداللہ بن زیاد جس کو بظاہر بڑی خوشی کے ساتھ آپ کی تین باتوں میں سے یزید کے پاس جانے والی بات تو مان ہی لینی چاہیئے تھی کہ اچھا ہے، وہ جائیں اور یہ جائیں، میں آزمائش سے بچا۔ مگر بالکل خلاف قیاس و گمان ابن زیاد نے آپ کی تینوں باتوں کو یکساں طور پر رد کر دیا۔ اور پہلے کوفے آنے کی وہ شرط لگا دی کہ حادثہ اور المیہ ٹلنے کی شکل بنتے بنتے بگڑ گئی ــــ آخر اسے تقدیر الٰہی کے سوا اور کیا کہا جائے؟

زُبالہ کی منزل پر جب آپکو اپنے عمزاد اور سفیر مسلم بن عقیل کی کوفے میں گرفتاری اور انجام کی خبر ملی اور وہ ساری بساط اُلٹی ہوئی نظر آئی جس کی بنیاد پر آپ نے سفر شروع کیا تھا۔ تو وہ پہلا وقت تھا کہ آپ کو (غالباً عورتوں اور بچوں کے خیال سے) سفر ترک کر کے واپس ہوجانے کا خیال ہوا۔ اور یہ ایک مناسب وقت تھا۔ کیونکہ کوفہ یہاں سے ابھی کچھ دور تھا۔ اور اُن مخلصین کی فہمائشوں، گزارشوں اور منتوں کے پس منظر میں جو اس سفر سے مانع ہو رہے تھے۔ اور ان تجربات کے پس منظر میں جو حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کو اہل کوفہ سے پیش آئے تھے، اور سب سے بڑھ کر خود مسلم بن عقیل کے خط کے پس منظر میں جو انھوں نے اپنی گرفتاری پر اہل کوفہ کی بزدلی اور غداری کے حوالے سے حضرت حسینؓ کو اس مقصد سے لکھا تھا کہ وہ سفر ترک کر کے پیچھے کو لوٹ جائیں (ان سب باتوں کے پس منظر میں) کسی کو بھی واپسی کے خیال سے اختلاف نہ ہونا چاہیے تھا مگر جیسے کہ کوئی بات ہو کر رہنی ہو اور کوئی نہیں خود برادران مسلم بن عقیل اَڑ گئے کہ نہیں اب پیچھے نہیں لوٹا جا سکتا۔ ہم اپنے بھائی کا بدلہ لیں گے یا اپنی جان بھی دیدیں گے، ظاہر بات ہے کہ اس صورت حال میں حضرت حسینؓ کے لیے ممکن نہ تھا کہ واپسی پر اصرار فرمائیں، آپکو واپسی کا خیال ترک کر کے معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا پڑا۔ اور گویا پھر تقدیر کا ہاتھ بیچ میں آگیا۔

اور پھر جب قادسیہ کے قریب پہنچ کر مرحلہ وہ آگیا کہ حالات کی خبروں کی بجائے حالات کی

اپنی ٹھوس شکل و صورت ہی سامنے آجائے اور اس مرحلے پر برادران مسلم بھی غالباً اپنے جذبات کے عالم سے نکل آئے۔ تب واپسی کے خیال پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا، مگر آپ نے کوفے کی بہت سے بہر حال ہٹ جانے کے لیے ایک غیر معمولی فیصلہ فرما لیا۔ یہ فیصلہ تھا یزید کے پاس دمشق چلے جانے کا! بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا۔ یہ ایک انقلاب لا سکتا تھا۔ روایات میں صراحت ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے (وضع الید فی الید) کیلئے کیا تھا (اور صراحت نہ بھی ہو تب بھی جن حالات میں آپ یزید کے پاس جا رہے تھے، اُن حالات میں آپ کے وہاں جانے کے اور کوئی دوسرے معنیٰ نہیں ہوتے)[1] پس ابن زیاد کو بصد مسرت یہ بات قبول کرنی تھی کہ آپ یزید کے پاس تشریف لے جائیں۔ حضرت حسینؓ از خود یزید کے پاس جانے کا ارادہ فرما رہے ہیں! اس سے زیادہ کسی کو کیا چاہیے؟ زیادہ سے زیادہ اس کا اطمینان کر لیا جاتا کہ آپ واقعی وہیں جائیں گے اور کہیں نہیں چلے جائیں گے۔ اس کیلئے ابن زیاد اپنا ایک دستہ ساتھ میں کر سکتا تھا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق تو آپ نے عمر بن سعد سے فرمایا ہی یہ تھا کہ:

(فان ابیت هذا) فسيرني الى يزيد[2] — (اگر دوسری بات منظور نہیں ہے) تو تم مجھے یزید کے پاس بھیجدو (جانے دو نہیں بلکہ بھیجدو)

یزید کے پاس آپ کا اس درجہ لچک کے ساتھ جانا کہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں اس کا نتیجہ (وقت کے تمام دستیاب قرائن و شواہد کی بنا پر) سوائے اس کے کچھ نہیں ہونا تھا کہ یزید آپکا اکرام کرے اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرے کہ آپ کی اس کے ساتھ کشیدگی جاتی رہے۔ وہ کیا شکل ہوتی؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقش قدم پر "صلح حسنؓ" جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔ مگر قیاس و گمان کے تمام تقاضوں کے

---

[1] بلکہ ان خاص حالات سے قطع نظر بھی اس لیے جو لوگ اس جانے کے کوئی اور معنی کرتے ہیں انھیں بس "شاہ کا شاہ سے بھی زیادہ وفادار" ہی کہا جا سکتا ہے۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۷۰

بر عکس ابن زیاد کو آپ کی پیش کش قبول نہ ہوئی۔ اور البتہ کربلا جو کاتب تقدیر کے ہاتھ سے رقم ہو چکا تھا وہ وجود میں آ کر رہا۔

نوشتۂ تقدیر کا راز؟

اس تقدیر کا راز اور اس کی حکمت کیا ہو سکتی ہے جو ایک الم انگیز واقعہ کے لیے راہ بنا تی آ رہی تھی؟ سوال کافی سخت ہے۔ مگر امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کا ایک جواب ملتا ہے جو ہے تو قیاس و گمان ہی کی بات مگر امام موصوف نے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"حسینؓ کا قتل بلاشبہ مظلومانہ قتل ہے، جو اُن کے حق میں شہادت، علوِّ منزلت اور رفعِ درجت ہے اور (راز اس کا یہ ہے کہ) اُن کے اور اُن کے بھائی کیلئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کیلئے کسی نہ کسی طرح کی بلا اور مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دوسرے اہلبیت کی طرح سے اس کے مواقع اس لیے حاصل نہ ہو سکے تھے کہ ان کی زندگی اسلام اور عزت و عافیت کی گود ہی میں بسر ہوئی تھی۔ پس ایک بھائی کی وفات زہر خورانی سے ہوئی اور دوسرے کی قتل سے، تاکہ اس مصیبت کے صلے میں وہ شہداء کا عیش اور سُعدا کی منزلت پاسکیں [1]۔"

گویا حضرت حسینؓ کا کچھ نہ سمجھ میں آنے والا سفر ہو یا ابن زیاد کا اس سے بھی زیادہ ناقابل فہم رویہ، دونوں تقدیر الٰہی کے ایک منصوبے کا کرشمہ تھے جو پہلے سے طے ہو چکا تھا۔

حضرت حسینؓ کا اقدام اور ابن تیمیہؒ

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن تیمیہؒ حضرت حسینؓ کے لیے اس علوّ منزلت کے

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۳۲۱

قائل ہونے کے باوجود جو اُن کے مذکورہ بالا بیان میں نظر آتی ہے آپ کے اُس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں، جس کے نتیجے میں شہادت کا مرتبہ آپ نے پایا۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ بات جان لینی چاہیے کہ صحابۂ کرام کا طبقہ ہو یا تابعین عظام کا یا بعد کے زمانوں کے اہلِ بیت یا غیر اہلِ بیت کا، ان میں سے بڑے بڑے اہلِ علم و دین سے بعض وقت ایسی نوعیت کا اجتہاد سرزد ہوتا ہے جس میں کچھ ظن و وہم اور کبھی کوئی باریک قسم کی ہوائے نفس شامل ہو جاتی ہے، ایسا اجتہاد اس شخصیت کی عظمت کے باوجود قابلِ اتباع نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی ایسی بات پیش آ جاتی ہے تو دو قسم کے انسانوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے: جو لوگ اُس انسان کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کے اس خاص فعل کو بھی صحیح اور قابلِ اتباع قرار دیا جائے۔ جو اُسے ناپسند کرنے والے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ایک اجتہادی غلطی کی بدولت اُسے ولایت و تقویٰ کے مرتبے ہی سے نہیں، اہلِ جنت اور اہلِ ایمان کے زمرے سے بھی خارج کر دیں [1]۔"

کیوں اس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں؟ منہاج السنۃ کی اسی بحث میں جس بحث سے اوپر کے دو اقتباس لیے گئے ہیں، ہمیں اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے:۔

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی معاش و معاد (دنیوی اور اخروی زندگی) کی صلاح و فلاح کے لیے ہوئی تھی، آپؐ نے ہر اس بات کا حکم دیا جس میں صلاح (بھلائی) ہے اور ہر اس بات سے منع فرمایا جس میں فساد (بگاڑ) اور برائی ہے پس ایسا کوئی کام اگر سامنے آتا ہے جس میں صلاح اور فساد دونوں پہلو پائے جاتے ہیں تو اہلِ سنت یہ دیکھتے ہیں کہ فساد کا پہلو غالب ہے، یا صلاح کا؟ اور پھر جو پہلو غالب نظر آتا ہے اسی کے مطابق اس کام پر حکم لگاتے ہیں، صلاح اور فلاح کا پہلو

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۳۱۹

غالب ہے تو اس کام کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، فساد اور خرابی کا پہلو غالب نظر آتا ہے تو اس کام کے ترک کو ترجیح دی جاتی ہے۔

پس اب ایک یزید یا عبدالملک اور منصور جیسا کوئی شخص خلافت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سے قتال کر کے کسی بہتر شخص کو اُس کی جگہ لانے کی کوشش کی جائے؟ اہلِ سنت اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، کیونکہ ایسے فعل سے بہ نسبت بھلائی اور مصلحت کے بگاڑ اور فساد کے زیادہ امکانات ہیں۔ پوری تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ کسی صاحبِ سلطنت و قوت شخص کے خلاف جب بھی خروج کیا گیا بالعموم اُس کا خیر بہت معمولی اور شر بہت زبردست ہوا، مثلاً مدینے والوں نے یزید کے خلاف جو خروج کیا، یا ابن الاشعث نے عبدالملک کے خلاف عراق میں کیا، یا ابن المہلب نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی، یا ابومسلم نے خراسان میں بنو امیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، یا خلیفہ منصور کے خلاف مدینے اور بصرے سے بغاوت اٹھی۔ اُن میں ہر جگہ ہزیمت اور بربادی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور ابومسلم خراسانی جیتا بھی تو کیا جیت اُس کی ہوئی؟ منصور کے ہاتھوں وہ خود مارا گیا اور جیت میں کس قدر آدمی اُس نے مروا دیئے! اللہ کی پناہ! الغرض ایسے لوگ

فلا اقاموا دینًا ولا ابقوا دنیًا — نہ دین ہی قائم کر سکے نہ دنیا ہی بچا سکے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں فرماتا کہ جس میں نہ دین کی فلاح ہو نہ دنیا کی صلاح (اور ایسے کام اللہ کو پسند نہیں ہیں) چاہے ان کے کرنے والے کیسے ہی متقی بندے اور اصحابِ جنت کیوں نہ ہوں؟ ذرا بتائے کیا یہ لوگ (جنکے نام مثلاً اوپر لیے گئے) علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور عائشہؓ سے بڑھ کر ہیں، جن کا تقویٰ مسلّم ہوتے اور جنت کی بشارت جنھیں حاصل ہونے کے باوجود اُن کے قتالِ باہمی والے فعل کو قابلِ تعریف نہیں قرار دیا گیا؟

مسلمانوں کے اکابر اہلِ علم نے ہمیشہ ہی اِن خروجوں کی مخالفت کی ہے، مثلاً یزید کے خلاف اہلِ مدینہ خروج پر آمادہ ہوئے تو عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن مسیب اور علی بن الحسین (زین العابدین) نے انکو ایسا کرنے سے منع کیا۔ یا ابن الاشعث کی بغاوت کا فتنہ اُٹھا تو حسن بصری، مجاہد وغیرہ نے سمجھایا، لہٰذا اہلِ سنت کے یہاں یہ مسئلہ بالکل طے شدہ ہے کہ فتنے کے وقت میں تلوار اٹھانا مناسب نہیں۔ علمائے اہلِ سنت نے اس مسئلہ کی اس درجہ اہمیت سمجھی ہے کہ اسے عقائد کی فہرست میں داخل کر کے لازم کیا ہے کہ ائمہ اور خلفاء کے جور و ستم کا مقابلہ تلوار کے بجائے صبر اور برداشت سے کیا جائے۔ حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ کیسے کیسے اور کتنے اہلِ علم اور اہلِ دین بھی فتنوں کی لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں۔ انکا یہ فیصلہ اسلیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں سے اس معاملے میں یہی حکم ثابت ہوتا ہے اور جو کوئی بھی اس سلسلے کی احادیثِ نبویہ پر غور کرے گا وہ خود بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ احادیث کا حکم بہترین حکم ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب حسینؓ نے عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو اکابر اہلِ علم و دین مثلاً ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے اس ارادے کے خلاف مشورہ دیا۔ انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا انجام آپ کی جان کو گزند پہنچنے کے سوا مشکل ہی سے کچھ اور ہوگا، چنانچہ جب آپ اپنا ارادہ بدلنے کو تیار نہ ہوئے تو بعض نے کہہ بھی دیا کہ "اچھا جائیے آپ کو اللہ کے سپرد کیا"[1]، اور بعض نے کہا کہ "بات بدنما ہو جائے گی ورنہ جی چاہتا تھا کہ آپ کو زبردستی سے روک لیں"۔

ان حضرات کا یہ کہنا سوائے اس کے اور کسی وجہ سے نہیں تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ کی اپنی اور عامۂ مسلمین کی مصلحت اسی میں تھی، اور اللہ و رسول کے یہاں مصالح کی رعایت اور مفاسد سے بچنے ہی کا حکم ہے۔ چنانچہ بالکل وہی ہوا جس کا ان حضرات

---

[1] استودعك الله من قتيل۔

کو اندیشہ تھا کہ دین یا دنیا کی کوئی بھلائی تو اس اقدام سے کسی کو حاصل نہ ہوئی۔ البتہ کوفے کے بدنہاد ظالموں کو سبطِ رسول اللہ پر قابو مل گیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔ کاش وہ اپنے شہر ہی میں رہتے تو وہ فساد نہ لازم آتا جو ان کے خروج اور قتل سے رونما ہوا۔

فان ما قصدہ من تحصیل الخیر	انھوں نے اپنے خروج سے جس تحصیلِ خیر اور
ودفع الشر لم یحصل منہ شئ بل	دفعِ شر کا ارادہ کیا تھا تو وہ کچھ حاصل نہ
زاد الشر بخروجہ وقتلہ ونقص	ہوا۔ اس کے بجائے اس خروج اور پھر
الخیر بذالک وصار سببًا لشرٍ	قتل سے شر بڑھا اور خیر کم ہوا۔ اور یہ
عظیمٍ وکان قتل الحسین مما	قصہ ایک شرِ عظیم کا سبب گیا یعنی قتلِ
اوجب الفتن کما کان قتل عثمان	حسینؓ اسی طرح فتنوں کا موجب بن گیا
مما اوجب الفتن۔	جیسے قتلِ عثمانؓ سے فتنے اٹھے تھے۔

"یہی وہ وجہ تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حسنؓ کے لیے بطور تعریف فرمایا تھا کہ "میرا یہ بیٹا سردار ہے، زمانہ آئے گا کہ اس کے ذریعہ اللہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا" لیکن کسی کی بھی تعریف آپؐ نے اس کے لیے نہیں فرمائی کہ وہ حالت فتنہ میں تلوار اٹھائے گا۔ یا کسی امام جائر پر خروج اور اس کی سربراہی ماننے سے انکار کر دے گا ہاں خوارج کے سلسلے میں ضرور آپؐ نے صاف ارشاد فرمایا تھا کہ ایسی جماعت مسلمانوں میں رونما ہو تو اُس سے ضرور قتال کیا جائے۔ چنانچہ ان سے جب علی رضی اللہ نے قتال فرمایا تو وہی صحابہؓ جو جمل اور صفّین کے قتال میں آپؓ کے ہمنوا نہیں تھے اس قتال میں سب کے سب متفق ہوئے اور اسی طرح بعد کے اہلِ علم نے بھی ان دونوں قتالوں میں فرق کیا۔"[۱]

۱؎ منہاج السنۃ ص ۲۱۲ تا ص ۳۱۴ ج ۲ سے تلخیص و انتخاب ۔

ظلم کی ذمّہ داری کس پر ؟

امام ابن تیمیہؒ کی یہ بحث کہ حضرت حسینؓ کا یہ اقدام جس کے نتیجے میں آپ کی مظلومانہ شہادت پیش آئی، شرعی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت رکھتا تھا؟ اور کیوں رکھتا تھا؟ یہاں ایک ضمناً ذکر میں آجانے والی بحث تھی، ورنہ ہمارے موضوع کو اس شرعی بحث سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ مظلومانہ شہادت کی بات آنے اور اُسے مان لیے جانے کے بعد جو مسئلہ طبعی طور پر ہمارے سامنے آنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اس ظلم کی ذمّہ داری کس پر آتی ہے؟ یزید پر یا ابن زیاد پر؟

تاریخی شہادتوں کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے ہے وہ کسی بھی طرح اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس خونِ ناحق کی ذمّہ داری یزید پر ڈالی جائے؛ یزید نے بیشک ابن زیاد کے سپرد یہ بھی کیا تھا کہ وہ حضرت حسینؓ سے نپٹے اور کوفے میں ان کو آزادانہ داخل نہ ہونے دے۔ اس کے بعد اگر یہ بات پیش نہ آگئی ہوتی کہ حضرت حسینؓ نے اس مہم سے قطعی دستبرداری ظاہر کر کے جس کے لئے وہ مکے سے نکلے تھے، یزید کے پاس جانے اور اپنا فیصلہ اس کے ہاتھ میں رکھ دینے کی پیش کش کر دی، تب بیشک ابن زیاد کے حکم سے کی جانے والی جنگی کارروائی کی اصل ذمّہ داری یزید ہی پر آتی، مگر اس کامل طور پر تبدیل شدہ صورت میں ابن زیاد نے یزید سے رجوع کیے بغیر اور کارروائی کے افسرِ اعلیٰ عمر بن سعد کے مشورے کے بھی برخلاف جو قتل و قتال کی کارروائی کرائی اس کی ذمّہ داری یزید پر ڈالنا ایک زیادتی ہی کی بات ہوگی۔ ہاں اگر وہ اس کارروائی سے اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار کرتا تو پھر ضرور حق تھا کہ اسی کو اصل ذمّہ دار قرار دیا جائے، مگر اس بارے میں ہم گذشتہ باب میں مختلف روایتوں کا جائزہ لے کر دیکھ چکے ہیں کہ ذمہ داری کے ساتھ ایسی بات یزید کی طرف منسوب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ متعدد قرائن و شواہد کی روشنی میں پلڑا اُن روایتوں کا بھاری نظر آتا ہے جو اس واقعہ پر یزید کی نارضامندی اور ناخوشی ظاہر کرتی ہیں، اور اسی بنا پر اس باب (۱۲) کے پچھلے صفحات میں ابھی ہم لکھ کر آئے ہیں کہ :-

"یزید کے پاس آپ کا اس درجہ لچک کے ساتھ جانا کہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں، اس کا نتیجہ وقت کے تمام دستیاب شواہد و قرائن کی روشنی میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرتا......... اور حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق اُنہی کے نقشِ قدم پر "صلحِ حسنؓ" جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔"

پس ہمارے خیال کے مطابق اس کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اگر حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بارے میں یزید سے رجوع کیا جاتا تو وہ ابن زیاد کو اس رویے اور اس کاروائی کی اجازت دیتا جس کے نتیجے میں سانحۂ کربلا پیش آیا۔

ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی ؟

یہ سوال جب کسی عام آدمی کی طرف سے سامنے آئے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی۔ مگر جب پڑھے لکھے لوگ بھی یہ سوال اٹھاتے ہیں تو پھر حیرت ہوئے بغیر نہیں رہتی، اس لیے کہ ناراضمندی اور سزا دہی کا کوئی ایسا لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک حاکم نے اپنے ماتحت کی کسی بات کو ناپسند کیا ہو تو وہ اُسے سزا بھی ضرور دے دے، بہت سی دفعہ ناخوشی کا اظہار بھی اُس آدمی پر کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کی کیسی قابلِ لحاظ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ حضرت علیؓ کی فوج میں، بلکہ اُن کے نہایت خاص معتمدین میں بھی وہ لوگ شامل تھے جو قاتلانِ عثمانؓ کے سرگروہ شمار کیے جاتے تھے، اور خود حضرت علیؓ کو اس الزام سے انکار نہ تھا۔ مگر اس مطالبے کے جواب میں کہ اُن کو سزا دیجائے یا ورثاء عثمانؓ کے سپرد کیا جائے حضرت علیؓ کو ہمیشہ یہی کہنا پڑا کہ حالات اجازت نہیں دیتے۔ یعنی سزا کا مطالبہ کرنے والے بھی موجود تھے، اصولاً حضرت علیؓ کو مطالبے سے اتفاق بھی تھا پھر

بھی مصالحِ وقت کا مسئلہ ایسا تھا کہ آپ اس پر عمل درآمد نہیں کر سکتے تھے۔ تو اب اگر ہم یزید کے لیے کوئی جداگانہ اصول نہیں بناتے ہیں تب آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ :-

جس ابن زیاد نے یزید کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے عراق کو نہ صرف روک لیا تھا بلکہ جو طوفان وہاں یزید کے خلاف تیار ہو رہا تھا، اس کا رُخ اس نے تمام تر حضرت حسینؓ کے خلاف موڑ کے دکھا دیا، یزید کیلئے کیسے ممکن تھا کہ اس کا سر قلم کرنے کی بات سوچے ؟

اور وہ بھی ایسی حالت میں ! کہ کوئی مطالبہ کسی طرف سے ایسا نہیں ہے ؟

اور

مزید برآں ! ایسی حالت میں کہ اس کے ذہن پر اس قسم کا کوئی تقاضہ بھی بظاہر نہیں ہو سکتا تھا ؟

اُسے واقعہ سے رنج ہوا ہو، افسوس ہوا ہو، ایک الگ بات ہے، لیکن یزید اور حضرت حسینؓ کے تعلقات کی جو تاریخ تھی (جو یزید کے والد کے زمانے سے چلی آرہی تھی اور جس کو ہم پچھلے ابواب میں دیکھ آئے ہیں) اس کے ہوتے ہوئے ایک خاندانی آدمی ہونے کے ناتے یہ توقع تو یزید سے کی جا سکتی تھی اور کی جانی چاہیے تھی کہ اُسے واقعہ پر رنج و ملال ہو مگر اس سے آگے بڑھ کر یہ توقع تعلقات کے اُس پس منظر میں کرنا کہ وہ ابن زیاد کی اس کاروائی کو ایک قابلِ سزا جرم سمجھے یہ تو ایک بہت ہی غیر فطری قسم کی توقع ہے۔ حضرت حسینؓ کی اُس تمام عظمت کے باوجود جس کی بنا پر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ یزید اگر کربلا کے اس واقعے سے خوش نہیں ہوا تھا تو ابن زیاد کو اس کی طرف سے کوئی سزا یا ملامت ہونی چاہیے تھی، ہم اس فطری حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار

نہیں کر سکتے کہ جب سیاسی کشمکش کا بیچ آجاتا ہے تو پھر فریقین کے ذہن سے ایک دوسرے کی قابلِ لحاظ عظمتوں کا نقش مٹتا چلا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کشمکش شروع ہوئی تو حضرت معاویہ کو پورا احساس تھا کہ اُن کی اور حضرت علیؓ کی کوئی برابری ہی نہیں ہے، حضرت علیؓ نے اپنے خطوط میں انھیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے بے تأمل اعتراف کیا کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

امّا شرفك فی الاسلام و	اسلام میں آپ کی بزرگی اور جناب
قرابتك من رسول الله	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے
صلے اللہ علیہ وسلّم فلست	آپ کی قرابت کا جہاں تک تعلق ہے
ادفعهٗ	اُس سے مجھے ذرا انکار نہیں ...

مگر جب اس کش مکش پر لمبا عرصہ گزر گیا اور تلخی بڑھتی چلی گئی تو پھر حضرت معاویہؓ کے رویّے میں اس اعتراف اور احساس کی جھلک ہمیں نظر آنی بند ہونے لگی، اور یہ بالکل فطری بات ہے، ہم اپنی خواہش کے ماتحت کسی جگہ پر ایک اصولِ فطرت کو ماننے سے انکار کریں تو یہ ہماری مرضی ہے۔ اصول اپنی جگہ اصول رہے گا۔ بہرحال ابن زیاد کو کوئی سزا نہ دینا یا ملامت نہ کرنا، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ یزید کو کوئی افسوس اور رنج بھی حضرت حسینؓ کی شہادت پر نہیں ہوا یا وہ خوش ہوا ہو اور اس کی اپنی مرضی بھی فی الواقع وہی رہی ہو جو ابن زیاد کے ہاتھوں ہو گیا۔

ابن زیاد کیوں بضد ہوا؟

باب کے ابتدائی صفحات میں جو ہم نے لکھا کہ، بظاہر تو ابن زیاد کو نہایت خوشی سے اس بات پر راضی ہونا چاہیے تھا کہ حضرت حسینؓ اگر یزید کے پاس جانا چاہتے ہیں تو

ضرور چلے جائیں۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے بجز تقدیر الٰہی کے اور کیا کہا جائے، جس میں گویا حضرت حسینؓ کا مرتبۂ شہادت پانا مقدر ہو چکا تھا۔ ہمارے اس لکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ابن زیاد کے ذہن میں بھی اپنے اس رویّے کی کوئی وجہ نہ رہی ہوگی اور بس یونہی تقدیری جبر سے وہ یہ کام کر بیٹھا ہوگا۔ بے شک اس کے ذہن میں کوئی بات اور اپنے اس رویّے کا جواز ہونا چاہیے۔ اور ہمیں اس کی تلاش ہے۔ اس تلاش میں کامیابی کی منزل تو اب تک ہاتھ نہیں آسکی ہے۔ لیکن اس تلاش اور غور و فکر کے دوران میں بعض باتوں کی طرف نظر جاتی ہے، جن کا یقیناً بہت کچھ دخل ابن زیاد کے اس رویّے میں ہونا چاہیے۔

ا۔ اس نے اپنے باپ سے وراثت میں ایک سخت گیر منتظم (ADMINISTRATOR) کا مزاج پایا تھا۔ نظم و نسق اور امن و امان کا قیام اور اُس کا تحفظ باپ کی طرح ابن زیاد کی نظر میں بھی ایک حاکم کا سب سے بڑا فریضہ اور سب سے بڑی نیکی تھی۔ اس کے باپ زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کا حاکم مقرر کیا تو بصرے کے امن و امان کا حال اُس وقت بے حد خراب تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر ایک زبردست تقریر میں اپنی پالیسی کا بیان کیا۔ اس بیان کے ماتحت رات کو عشاء کے بعد سے صبح فجر تک باہر نکلنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کی خلاف ورزی کی سزا قتل۔ ایک اعرابی (یعنی بصرہ شہر سے باہر کا آدمی) جو اس قصّے سے بے خبر تھا کسی کام سے بصرے آیا تھا۔ رات میں چلتا پھرتا پایا گیا۔ گرفتار ہوا اور زیاد کے پاس لایا گیا، اس نے اپنی صفائی دی۔ زیاد نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ تیرا بیان سچا ہے تو بے خبر تھا۔ مگر نظم و نسق کا تقاضہ یہ ہے کہ میں تجھے بھی نہ چھوڑوں۔ چنانچہ قتل کر دیا گیا۔[1] اس مزاج اور طبیعت کا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۲۶ اس واقعہ کو بیان کر کے طبری لکھتے ہیں۔
"زیاد پہلا حاکم تھا جس نے حکومت کی آواز کو وزن دیا۔ معاویہؓ کے (باقی اگلے صفحہ پر)

ابن زیاد وارث تھا۔

۲۔ کوفے اور بصرے کے لوگ ہمیشہ اس قدر ناہنجار رہے تھے کہ ہر حکومت اور ہر حکمراں اُن سے عاجز رہا۔ انتظام اور امن وامان کو اہمیت بلکہ ہر چیز پر فوقیت دینے والا آدمی ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں اور بھی زیادہ سخت گیر بلکہ سخت گیری کا ایک "عادی مجرم" بن جائے گا۔ کوئی سخت گیری اس کے لیے سخت گیری نہ رہ پائے گی۔ مسلم بن عقیل اور ان کے میزبان ہانی بن عُروہ کے ساتھ جو سلوک اس نے کیا وہ یقیناً اسی قبیل کی چیز تھی۔ امن وامان اور قومی یکجہتی سے بڑھ کر کوئی چیز اس کے یہاں مقدس نہیں تھی۔ اس کو خطرے میں ڈالنے والے افعال اور اشخاص سے بڑھ کر کوئی فعل اور کوئی شخص اس کی نظر میں مبغوض نہ تھا۔

۳۔ حضرت حسینؓ اور یزید کے تعلقات کی ناخوشگوار تاریخ کے باوجود یزید کی طرف سے جس پاس ولحاظ کی توقع ہم مختلف وجوہ سے کرتے آرہے ہیں۔ (مثلاً یہ کہ وہ ایک صحابی کا اور ایک بڑے خاندانی صحابی کا بیٹا تھا۔ نیز حضرت حسینؓ سے اُس کی خاندانی قرابت بھی تھی۔ اور پھر اس کے والد کی بڑی تاکیدی وصیت بھی حضرت حسینؓ کے ساتھ آخری حد تک حسنِ سلوک اور حق شناسی کی تھی۔)

(حاشیہ بقیہ صفحۂ گذشتہ) اقتدار کو مضبوطی بخشی، لوگوں کو اطاعت سکھائی۔ بے دھڑک سزائیں دیں اور تلوار نیام سے باہر نکالی۔ گمان پر پکڑا اور شبہے میں سزا دی۔ چنانچہ اس کی حکومت میں لوگ اس درجہ اس سے خائف ہوئے کہ ایک دوسرے کی شرارتوں سے محفوظ ہوگئے۔ کسی کی کوئی چیز گرجاتی تو مجال نہیں تھی کہ کوئی دوسرا اس کو ہاتھ لگالے۔ حتیٰ کہ اصل مالک آتا اور اپنی چیز اُٹھا لیتا۔ عورتیں اپنے گھروں میں بے کھٹکے دروازہ کھول کر سو سکتی تھیں۔ الغرض وہ سیاست اس نے کی کہ اس کی مثال نہیں دیکھی گئی۔ ..... " یہ طبری کا تبصرہ ہے اس کو نقل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سیاست کو پسند کیا جائے۔

ان میں سے کوئی چیز ابن زیاد کے ساتھ نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ ایک ساقط النسب آدمی کا بیٹا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اس (نسبی) سلسلے میں اُس پر اور اُس کے باپ پر جو احسان کیا تھا اُس کا یہ اثر عین قرینِ قیاس ہے کہ آدمی کو "بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کا وفادار" بنا دے۔ اور اس لیے قرینِ قیاس ہے کہ حضرت معاویہؓ اور یزید کے ماتحت ان باپ بیٹوں کی انتظامی سختی میں ان کے اپنے سخت گیر انتظامی مزاج کے علاوہ کچھ اس احسان مندی کا بھی دخل ہو، اور خاص طور سے وہ اشخاص ان کے لیے کسی بھی پاس ولحاظ کے مستحق نہ رہ جاتے ہوں جو اس خاندان کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہوں۔

ان باتوں سے یہ عُقدہ تو حل نہیں ہوتا کہ جب حضرت حسینؓ کی سہ گانہ پیش کش گویا پکار کر کہہ رہی تھی کہ اب اُن سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو پھر کون سی انتظامی مصلحت کا یا "بادشاہ کی بادشاہ سے بھی زیادہ" کون سی وفاداری کا تقاضہ تھا کہ اس پیش کش کو قبول کرنے کی نرمی دکھانے کے بجائے وہی سختی دکھائی جائے جو عام عادت بن گئی تھی۔ مگر ان باتوں کی طرف توجہ سے عُقدے کی سختی کچھ کم بہرحال ہوجاتی ہے۔

آہ یہ بے توفیقی!

بہرحال یہ بڑا ہی المناک حادثہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت حسینؓ رضی اللہ عنہ کے لیے وہ جراُت آسان فرمادی جو بہت ہی شاذونادر اہلِ جراُت کو بھی نصیب ہوتی ہے، کہ حالات کو یکسر بدلا ہوا دیکھ کر اُن کی مطابقت میں وہ فیصلہ فرمائیں جس میں ملّت کی صلاح وفلاح ہے نہ یہ کہ اُن بدلے ہوئے حالات میں اپنی آن کا مسئلہ مقدم رکھیں، تب ابن زیاد کو یہ توفیق نہ ہوسکی کہ وہ

ملت کی صلاح وفلاح کے لیے حضرت حسینؓ کی اس عظیم جذباتی قربانی کی قدر جان لیتا اور اپنی بے جا ضد سے اس واقعہ کا ذمہ دار نہ بنتا جس نے عالم اسلام پر ایک بار پھر خونی فتنوں ہی کے دروازے نہیں کھولدیئے بلکہ اعتقادی فتنوں کی رگوں میں بھی ایک نیا خون دوڑا دیا۔

اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا ومن

سیئات اعمالنا

وصلّ اللّٰھم وسلم علیٰ عبدك ونبيّك

سیّدنا محمّدٍ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ

وازواجہٖ اجمعین

اختتامیہ

(کتاب کا خلاصہ اور کچھ توضیحات)

کتاب الحمدللہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس کے اہم نکات ومباحث کو اگر ہم تھوڑے سے لفظوں میں سمیٹ کر بیان کرنا چاہیں تو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ:

۱۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت کے آغاز ہی سے مسلمانوں میں خانہ جنگی کی جو المناک صورت برپا ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق، اس کا خاتمہ حضرت علیؓ کے جانشیں سیدنا حسن بن علیؓ کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ نے خلافت کا ادارہ تمام تر حضرت معاویہؓ کے لیے چھوڑ کر خود کو اس نزاع سے دستبردار کر لیا۔ یہ ۴۱ھ کی بات ہے جسے اسلامی تاریخ میں "عام الجماعۃ" (اجتماعیت واپس آنے کا سال کہا گیا ہے)۔

۲۔ حضرت حسنؓ کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ اپنے بڑے بھائی کے اس فیصلہ سے متفق نہ تھے مگر جب حضرت حسنؓ کی طرف سے فیصلے پر عملدرآمد ہو گیا تب سے وہ بھی اس کے احترام کو لازم جانتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تعلقات میں خوشگواری کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔

۳۔ مصالحت اور خوشگواری کی یہ فضا پندرہ سال تک چلتی رہی۔ جبکہ اس دوران میں حضرت حسنؓ نویں سال میں انتقال فرما گئے تھے۔ مگر سولہویں سال (۵۶ھ) میں حضرت امیر معاویہؓ نے جب اپنے بڑھاپے کے احساس سے اپنے بعد کے لئے کسی کو جانشین اور ولی عہد نامزد کرنے کے لئے سوچا اور پھر اپنے بیٹے یزید کو اس کے لئے موزوں قرار دیا تو نئے سرے سے ایک اختلاف کی صورت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اختلاف کرنے والوں میں صرف حضرت حسینؓ ہی نہیں تھے بلکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عمر فاروقؓ کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زبیر بن عوام کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ بھی اس میں شامل تھے۔

۴-اس اختلاف کی سب سے اہم اصولی بنیاد یہ تھی کہ باپ اپنے بعد کے لئے بیٹے کو بطور ولی عہد خلافت نامزد کرے یہ اسلامی خلافت کا نہیں قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا دستور ہے۔ دوسری ایک بنیاد بظاہر یہ بھی تھی کہ اصحابِ نبی ﷺ کی موجودگی میں انہی میں سے کوئی منصب خلافت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے نہ کہ بعد میں پیدا ہونے والا ایک نو عمر۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری یہ بات جو اس سلسلے میں بیحد مشہور ہے کہ اس اختلاف کی ایک اہم بنیاد یہ بھی تھی کہ یزید بڑا فاسق و فاجر ہے۔ یہ بات کہیں اس اختلاف کی روداد میں آخر آخر تک نہیں پائی جاتی۔ محض "زیبِ داستاں" کے طور پر بڑھائی گئی بات ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کا نقطۂ نظر ان حضرات کے بالمقابل بظاہر یہ تھا کہ خلافت کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز مضبوط انتظامی اہلیت اور گرفت ہے۔ اور اس معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ یزید ہی کی خلافت کی شکل میں امید کرتے تھے کہ ادارۂ خلافت مضبوط رہے گا اور وہ افراتفری نہیں پھیلے گی جو حضرت عثمانؓ کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ مؤرخین نے اگرچہ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبتِ پدری کا بھی دخل تھا۔ مگر خود انہوں نے اس طرح کے کسی محرک سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

۵-یہی اختلاف تھا جس سے واقعۂ کربلا کی داغ بیل پڑی اور یہ خاص کر اہلِ کوفہ تھے جنہوں نے اس اختلاف کا سلسلہ کربلا کے میدان سے ملا دینے میں پورا کردار ادا کیا۔ کوفہ چونکہ حضرت علیؓ کا دار الخلافہ رہا تھا اس لئے قدرتی طور پر حضرت حسینؓ سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ وہاں پائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے لوگوں کی ایک مستقل خصوصیت شوریدہ سری اور تلون مزاجی اور حکمرانوں سے چپقلش بھی تھی۔ اس کی بنا پر ان مذکورہ بالا پندرہ سالوں میں بھی لازماً وہاں ایک بڑا حلقہ ایسے لوگوں کا ہو جانا چاہئے تھا جو حضرت امیر معاویہ کے خلاف کوئی بڑا محاذ قائم ہو جانے کا خواہشمند ہو۔ مزید بر آں عبد اللہ بن سبا (یہودی منافق) کی ریشہ دوانیوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور ہی سے وہاں ایک ایسا کالم پیدا کر دیا تھا جسے مرکزِ خلافت سے محاذ آرائی ہی میں "اسلام کی خدمت" نظر آتی تھی۔ ان متعدد عوامل کے تحت کچھ لوگوں نے اولاً تو حضرت حسنؓ کی وفات کے فوراً بعد ہی چاہا تھا کہ حضرت حسینؓ کو از سر نو امیر معاویہ کے خلاف متحرک کر دیں جس میں وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد ولی عہدی کے مسئلہ میں اختلاف پر ان لوگوں کی توقعات پھر زندہ ہوئیں اور

حضرت حسینؓ سے رابطہ پیدا کر کے چاہا کہ اس مسئلہ پر آپ کو حضرت معاویہؓ کے خلاف میدان میں اتار دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلامی جمعیت کی حفاظت فرمائی اور ان کا یہ حربہ بھی کارگر نہیں ہو سکا۔ البتہ اس ضمن میں یہ بات ضرور سامنے آگئی کہ اس ولی عہدی کے مسئلہ نے حضرت حسینؓ کی سوچ کو بھی بہر حال اس راہ پر لگا دیا ہے اور حضرت معاویہ کے بعد ٹکراؤ کی صورت پیش آ جانے کے کافی امکانات ہیں۔

۶-ولی عہدی کے مسئلہ پر جو ایک روایت صحابیٔ رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو ملزم ٹھہراتی ہوئی ملتی ہے، کہ یزید کی ولیعہدی کی تجویز دراصل ان کے دماغ سے نکلی تھی اور صرف اپنا عہدہ (کوفہ کی گورنری) بچانے کے لئے انہوں نے، یہ جانتے بوجھتے کہ اس کا انجام اسلامی جمعیت کے لئے تباہ کن ہو سکتا ہے، یہ تجویز دی تھی۔ اس روایت کی جانچ کی جاتی ہے تو یہ ایک انتہائی مہمل افسانے سے زیادہ کچھ نہیں نکلتی۔ جبکہ حضرت مغیرہ خود قرآن پاک کی رو سے ایسے درجے کے فضائل والے صحابی ہیں کہ کوئی مضبوط روایت بھی ہو تو ان آیتوں کے مقابلے میں اس روایت کو دیوار سے مار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا۔

۷-حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولیعہدی کے بارے میں مملکت کے ایک بڑے حلقے کا رسمی Formal اعتماد حاصل کر کے اپنے فیصلے کو قطعیت کا درجہ دے دیا مگر اس اعتماد کے ووٹ میں مکے اور مدینے کی کمی رہی۔ تب آپ نے وہاں کا ایک سفر کیا تا کہ اس کمی کو (خاص کر مدینہ منورہ کے اعتماد کی کمی کو) دور کیا جا سکے۔ جس کی نمائندگی عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ، عبد اللہ بن عمرؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ کی طرف سے مخالفت کی شکل میں ہو رہی تھی۔

اس سفر کا اور وہاں ان چاروں حضرات سے ملاقات وغیرہ کا جو قصہ تاریخی روایتوں میں مذکور ہے، اس کا بڑا حصہ نہایت مضحکہ خیز اور چاروں بزرگوں کے نام کو قطعی بٹہ لگانے والا ہے۔ البتہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ ایک طرف تو یہ چاروں حضرات ـــــ بشرطیکہ حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی اس وقت زندہ رہے ہوں ورنہ باقی تینوں حضرات ـــــ اپنے موقف پر قائم رہے۔ اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ بھی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ اختلاف ختم نہیں ہو سکے گا اور یزید کو اقتدار میں آنے پر اس مخالفت کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی موت کا وقت آنے پر ان حضرات کے سلسلے میں یزید کو مناسب وصیتیں بھی فرمائیں جن میں حضرت حسین کے لئے ہر ممکن طور سے

حسنِ معاملہ کی تائید تھی۔

۸-ولی عہد کی نامزدگی کے چار سال بعد (۶۰ھ میں) حضرت معاویہؓ نے انتقال فرمایا اور یزید نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لے کر حاکمِ مدینہ کو حکم بھیجا کہ عمائدینِ مدینہ خاص کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ جنہوں نے ولی عہدی کی بیعت نہیں کی تھی، ان سے اب خلافت کی بیعت لی جائے (چوتھے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا) حاکمِ مدینہ نے اہل الرائے کے مشورے سے طے کیا کہ عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں تو کسی جلدی کی ضرورت نہیں ہے بے ضرر ہستی ہیں۔ البتہ باقی دونوں حضرات کے بارے میں عجلت اور چوکسی کی ضرورت ہے۔ مگر یہ دونوں حضرات کچھ حاکم کی نرمی اور کچھ اپنی حکمتِ عملی کی وجہ سے اس بیعت سے بچنے اور مدینے سے نکل کر مکے پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا تو پیچھا بھی کرنے کی کوشش حکومت کی طرف سے کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر حضرت حسینؓ کے بارے میں کسی تعاقب کی روایت نہیں پائی جاتی۔

۹-شعبان ۶۰ھ کے پہلے ہفتہ میں مکہ معظمہ پہنچ جانے کے بعد ۸ رذی الحجہ تک حضرت حسینؓ کا قیام وہیں رہا۔ اور اس درمیان میں رمضان المبارک سے اہل کوفہ کے وفود اور خطوط آپ کے پاس آنا شروع ہوگئے، جن میں کوفہ آکر ان لوگوں کی سربراہی سنبھالنے کی درخواست تھی اور یقین دلایا گیا تھا کہ سارا کوفہ آپ کے ساتھ ہے، جیسے ہی آپ آئیں گے یہاں کے یزیدی حاکم کو نکال کر باہر کر دیا جائے گا۔ آپ نے پوری طرح اطمینان حاصل کرنے کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا اور ان کی طرف سے اطمینان کا خط آنے پر حج سے ایک دن پہلے، ۸ رذی الحجہ کو، آپ کوفہ کے لئے روانہ ہوگئے لیکن ٹھیک اسی ۸ رذی الحجہ کو، جبکہ حضرت حسینؓ کوفہ والوں کے اعتماد پر سفر کا قدم اٹھا رہے تھے، مسلم بن عقیل کوفہ والوں کی بے وفائی کا شکار ہو کر حاکم کوفہ عبیداللہ بن زیاد کی گرفت میں آچکے تھے۔ اور دوسرے ہی دن ان کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا گیا تھا۔ حضرت حسینؓ کو اس کا پتہ راستے کی کافی منزلیں طے کرنے کے بعد چلا اس پر آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ مگر برادرانِ مسلم کے جذباتِ انتقام آڑے آگئے۔ (جو یہ چاہتے تھے کہ یا بدلہ لیں گے یا مر جائیں گے۔) چنانچہ آپ سفر جاری رکھنے پر مجبور ہوئے اور پھر دوسری بار جب آپ نے یہی ارادہ کوفے سے کچھ قریب پہنچ کر اس وقت کیا جب آپ کو اس بات کی مزید شہادت ملی کہ کوفہ تو پوری طرح عبیداللہ

بن زیاد (حاکمِ کوفہ) کی گرفت میں ہے اور آپ صرف گرفتار ہو کر ہی اندر جا سکتے ہیں، تب واپسی کیلئے کوئی گنجائش اور کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ آپ کی گرفتاری کے لئے فوجی دستے حرکت میں آچکے تھے، آپ نے اس وقت فوری طور پر ایک غیر معمولی فیصلہ کیا یعنی اپنا رخ یزید کے دارالخلافہ دمشق کی طرف موڑ دیا۔ مگر ان فوجی دستوں نے پیچھا کر کے آپ کو جلد ہی رک جانے پر مجبور کر دیا جو ابن زیاد کے حکم کے ماتحت چاہتے تھے کہ آپ کوفہ چلیں۔ یہی جگہ جہاں آپ کو قدم روک لینے پڑے اور جسے آپ کی شہادت گاہ بننا مقدر تھا کربلا کے نام سے جانی جاتی ہے۔

۱۰-فوجی دستوں کے سردار عمر بن سعدؓ بن ابی وقاص جن کے بارے میں روایتیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان کے دل میں حضرت حسینؓ کے لئے نہایت نرم گوشہ تھا انہوں نے اندھادھند کوئی کارروائی کرنے کے بجائے معاملے کو پر امن طریقے سے سلجھانے کی کوشش میں حضرت حسینؓ سے رابطہ قائم کیا اور آپ کی طرف سے یہ خواہش سامنے آنے پر کہ آپ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک قبول کرلی جائے۔ یعنی:

۱-واپس ہونے دیا جائے۔

۲-یزید کے پاس چلا جانے دیا جائے یا لے چلا جائے۔

۳-کسی مملکت کی سرحد پر بھیجدیا جائے جہاں آپ مقیم ہو جائیں اور جہادی مہمات میں حصہ لے کر عمر گزاریں۔

عمر بن سعد نے ابن زیاد (حاکم کوفہ) کو اس کی اطلاع اس طور سے بھیجی کہ جیسے یہ ایک نہایت عمدہ اور قابل قبول بات ہو۔ روایتوں کے مطابق ابن زیاد کو بھی اس صورتِ حال سے خوشی ہوئی، مگر شمر جیسے مشیران نے اس کی رائے پلٹ دی بلکہ عمرو بن سعد سے بھی اسکو کچھ بدگمان کر دیا جس کے نتیجے میں شمر ہی کو بھیجا گیا کہ وہ عمر سے اصل حکم کی تعمیل کرائے۔ یعنی مفاہمت سے یا طاقت سے، جس طرح بھی ممکن ہو حسین اور ان کے ہمراہیوں کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے کوفہ لایا جائے۔ اور یہ چیز اس قتل و قتال کا موجب بن گئی جس نے کربلا کا نام امر کر دیا۔

۱۱-کربلا کے میدان کا واقعہ بہت سادہ اور بہت مختصر ہے اور جتنے قصے کہانیاں اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں جب ان کی جانچ اس وقت اور ماحول کے امکانات و مواقع، روایتوں کے تقابل، انسانی فطرت اور حضرت سیدنا حسینؓ اور ان کے اہل بیت کے دینی شعور کی روشنی میں کی جاتی ہے تو

یہ تمام کے تمام قصے ایک ایسی من گھڑت داستان بن کے رہ جاتے ہیں جسے بس ابن سبا یہودی کے شیطانی منصوبے کے مطابق ہی گھڑا جا سکتا تھا۔

۱۲- کوفے کے دروازہ بند پا کر اولاً حضرت حسینؓ کی طرف سے خود اپنی کوشش کہ یزید کے پاس دمشق چلے جائیں اور اس میں رکاوٹ پڑنے کے بعد رکاوٹ ڈالنے والی کوفی فوج کے سردار عمر بن سعدؓ کو ان تین باتوں کی پیش کش جن میں سے ایک یہ تھی کہ آپ کو یزید کے پاس بھیجدیا جائے، اس کے بعد حاکم کوفہ کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا کہ ان باتوں پر غور کرنے سے پہلے اپنی اطاعت قبول کرنے کی شرط عائد کرے اور کوئی بے جواز وجہ بھی حقیقت میں ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ سوال حل کیا جا سکے کہ جب بات یزید کے ہاتھ میں جا رہی تھی اور ایک بھاری مسئلہ بغیر قتل و قتال کے طے ہونے کے پورے امکانات پیدا ہو گئے تھے تو ابن زیاد نے ایک قتل و قتال کو دعوت دینے والی یہ شرط کیوں عائد کر دی؟ــــ لیکن اس کہانی میں یہی تنہا ایک مقام نہیں ہے جس کا عقدہ حل کرنے سے عقل عاجز رہ جاتی ہو۔ ہم نے حضرت حسینؓ کے اعزہ، واحباب اور خیر خواہ بزرگوں میں کتنوں ہی کو پایا ہے کہ وہ کوفے کی طرف آپ کے ارادہ سفر سے حیران و پریشان ہیں اور ان کی بالکل سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ ارادہ کیسے ایک مناسب ارادہ ہو سکتا ہے؟ اور انہیں اس اظہار حیرانی پر کوئی ایسا جواب بھی نہیں ملتا کہ کچھ مطمئن ہو سکیں۔ (اور آج بھی آدمی خالی الذہن ہو کر پورے قصے کو پڑھے تو وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس کے اظہار کو بے ادبی سمجھے)۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قصے پر غور کرنے والے اہلِ علم و فکر میں سے امام ابن تیمیہؒ نے بھی اس مشکل کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور پھر وہ یہ خیال پیش کر کے اسے حل کرتے ہیں کہ:

"حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کے لئے کسی نہ کسی طرح کی مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دیگر اہل بیت کے برخلاف اس کے مواقع حاصل نہ ہو سکے تھے ان کی زندگی اسلام کی اور عزت و عافیت کی گود میں بسر ہوئی تھی۔ بس اس لئے ہی ایسا ہوا کہ ایک بھائی کی موت زہر خورانی سے اور دوسرے کی مظلومانہ قتل سے ہوئی تاکہ اس کے صلہ میں وہ شہداء کا عیش اور اہل سعادت کی منزلت

پا سکیں۔"

یعنی اس نہ سمجھ میں آنے والے پورے قصے کا راز ان کے خیال کے مطابق یہ تھا کہ حضرت حسین مرتبۂ شہادت پر فائز ہوں ورنہ یہ قصہ پیدا ہونے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ یا تو حضرت حسینؓ اپنے ہمدردوں کی رائے کے مطابق کوفے کے سفر سے رک گئے ہوتے اور یا پھر ابن زیاد بے وجہ کی ضد پر آمادہ نہ ہوا ہوتا۔

۱۳- اس قتل ناحق میں یزید کا کیا کردار ہے؟ــــ اگر بے لاگ انصاف کی نظر ڈالی جائے اور کم از کم شبہے کا فائدہ جو ہر ملزم کو دیا جاتا ہے یزید کو بھی دیا جائے تو اس کا کوئی کردار اس معاملے میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس کی سب سے کھلی اور سامنے کی دلیل خود حضرت حسین کی آخری وقت کی یہ کوشش اور خواہش ہے کہ آپ کو یزید کے پاس پہنچ جانے کا موقع مل جائے! اگر آپ کے لئے ذرا بھی اس خیال و گمان کی گنجائش ہوتی کہ کوفے کی سرکار (انتظامیہ) کی طرف سے جو کچھ آپ کے ساتھ معاندانہ اور سنگدلانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے اس میں یزید کی مرضی شامل ہے، تو آپ کی طرف سے اس سرکار کوفہ کے نمائندوں کو یہ پیش کش بالکل ناقابل قیاس تھی کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دینے کو تیار ہوں۔ ابن زیاد کے ہاتھ اور یزید کے ہاتھ میں یہ تفریق تو آپ اسی اعتماد کی بنیاد پر کر سکتے تھے کہ آپ کی طرف سے مصالحانہ رویہ سامنے آنے کے بعد یزید کی طرف سے کسی غیر شریفانہ رویہ کا سوال نہیں ہے۔

۱۴- اور یہی حقیقت ان روایتوں کو محض خرافات ثابت کرنے کے لئے بھی کافی ہے جو بتاتی ہیں کہ سانحۂ شہادت کے بعد حضرت حسینؓ کا سر مبارک اور آپ کے باقیاتِ اہل بیت کو یزید کے پاس پہنچایا گیا تو اس نے توہین اور طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کیا۔ ویسے یہ روایتیں فنی معیار پر بھی خرافات ہی ثابت ہوتی ہیں جیسا کہ متعلقہ باب میں ان پر کی گئی بحث سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

حرف آخر

کتاب کی تلخیص ختم ہوئی۔ لیکن چند باتیں اور اسی ضمن میں درج کر دینے کی ضرورت ہے۔

۱- کربلا کے حادثے کے سلسلے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ یہ حادثہ یزید کی مرضی سے پیش آیا اور اس کا کلیجہ اسکی خبر سے ٹھنڈا ہوا۔ آپ کے ہاتھ کی یہ کتاب، اسکے برعکس، جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا، یہ ظاہر کرتی ہے کہ واقعے کی ساری روایتوں کو، جو کہ بہت متضاد ہیں، اگر خالی الذہن ہو کر

(یعنی پہلے سے کوئی بات طے نہ کر کے) پڑھا جائے تو ایسا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض قرائن سے اس کے رنجیدہ ہونے کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

متضاد روایتوں والے اس واقعے کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، ہمارا کہنا صرف اپنے مطالعے کے نتیجے کے طور پر ہے، جسکا اظہار اس واقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ یزید سے ہمارا کوئی رشتہ ناتہ نہیں کہ اس کو بے قصور بنانے کی فکر کریں اور ان بہت سے لوگوں کی ناراضگی مول لیں جو ایک روایتی تصور کے خلاف بات نہیں سن سکتے۔ بلکہ اسے حسینؓ دشمنی (معاذاللہ) گردانتے ہیں۔

۲-دوسرا یہ ایک تصور بھی اس قصے میں اتنا ہی عام ہے کہ یزید سخت فاجر و فاسق قسم کا انسان تھا۔ اور یہی ایک بڑی بنیادی بات تھی کہ حضرت حسینؓ اور ان کے دوسرے ہم خیال اس کی خلافت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہمیں اپنے مطالعے میں اس کی کوئی ادنیٰ شہادت نہیں مل سکی کہ ایسی کوئی بات تھی جو اختلاف کی بنیاد بنی۔ اس لئے اس نتیجے کا اظہار بھی نہ صرف ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی بلکہ اس ذمہ داری کا ایک دینی پہلو بھی تھا۔ جسکی بنا پر نہ صرف اسکا اظہار کرنا بلکہ زور دے کر اظہار کرنا ہمیں لازم تھا۔ اور وہ پہلو یہ تھا کہ اہل سنت وجماعت نے اصحاب نبی ﷺ کو ان کے مرتبوں کے ساتھ ساتھ عادل اور راست باز بلا تفریق مانا ہے اور یزید کو منصب خلافت کے لئے ولی عہد نامزد کرنے والے حضرت امیر معاویہؓ بلا اختلاف اصحابِ نبی ﷺ میں شامل ہیں۔ اس لئے اگر ہمارا مطالعۂ تاریخ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ کم از کم حضرت معاویہؓ کی زندگی تک بلکہ حضرت حسینؓ کی زندگی تک بھی جو حضرت معاویہؓ کے بعد بس چھ مہینے اور تھی، یزید کے اندر فسق وفجور کہلانے والی بات کی شہادت نہیں ملتی(۱)۔ تب ہماری یہ ایک دینی ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے مطالعے کے اس نتیجے کو پورے زور سے بیان کریں، تاکہ ایک صحابیٔ رسولؐ کی عدالت اور راست بازی پر جو یہ حرف آرہا تھا کہ انہوں نے ایسے نالائق شخص کو منصب خلافت کے لائق ٹھہرایا، اس سے ان کا دامن صاف ہو جائے اور اصحابِ نبیؐ کا جو مقام اہل سنت کے دل میں ہے اس میں بال نہ آنے پائے۔ کیونکہ ان کا یہ مقام ہی ہمارے دین کا پشتہ ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت معاویہؓ کا انتخاب عمومی مصلحت کے لحاظ سے کیسا تھا؟ اس میں گفتگو ہو سکتی ہے اور ہم نے بھی اس میں گفتگو کی

(۱) اور ہماری ساری گفتگو اسی وقت کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد کا دور ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

ضرورت سمجھی ہے۔

۳-کتاب کی اولین اشاعت (۱۹۹۲ء) ہی پر مصنف کے وہم وگمان سے بھی بالاتر جو اہمیت اس کو بفضل خدا ملی اس کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے تبصرے بھی، جو غیر متوقع ہرگز نہیں تھے، سامنے آئے کہ: اس میں یزید اور حضرت معاویہؓ کی طرفداری زیادہ ہو گئی ہے۔ ایسے تبصروں والے حضرات سے اگرچہ ہم باوجود خواہش کے یہ نہیں معلوم کر سکے کہ ان کا اشارہ کن باتوں کی طرف ہے، لیکن بظاہر انکا اشارہ کتاب کے انہی دو پہلوؤں کی طرف تھا۔ اور ان کے بارے میں ہماری پوزیشن یہی ہے جس کا اوپر اظہار کیا گیا، اسکو ہماری وضاحت سمجھا جائے یا ہماری معذرت!

۴-ایک بالکل غیر متوقع بات بھی سامنے آئی۔ اور وہ یہ کہ متعدد اصحاب نے یزید کے ذکر میں بے احترامی کا شکوہ کیا۔ یعنی یہ کہ واحد غائب کے صیغوں اور ضمیروں (تھا۔ نہیں تھا۔ اس اور جس) کا استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو اس سے بھی بڑھ کر گرفت کی آپ نے یزید کے اولین خطبے کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ:

> ”رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی، پرہیزگار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جا سکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا۔“(۱) تو اس ”غالب گمان“ کی کوئی دلیل دیئے بغیر آپ نے اس بدگمانی کا اظہار کیسے جائز سمجھا؟“۔(۲)

میرے پاس واقعی دلیل نہیں تھی۔ اسلئے اس (تازہ) ایڈیشن میں یہ غالب گمان والے الفاظ نکالنا اپنا فرض سمجھا اور اس ترمیم کا اظہار یہاں اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ یزید کی طرفداری کا احساس کرنے والے حضرات اس ترمیم کے پسِ منظر سے واقف ہو جائیں۔

۵-طرفداری کا احساس کرنے والے ایک صاحب نے نشاندہی کی کہ یزید کے ایک نائب حاکم مکہ عمر بن سعید العاص الاشدق کی طرف سے حضرت حسینؓ کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا سلوک دکھا کر (ص۱۷۰) تو آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ بغیر یزید کی رضا کے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب عبیداللہ بن زیاد حاکم کوفہ وہ سنگدلی اور سفاکی کرتا ہے جس سے آپ کو بھی انکار نہیں تو آپ کہتے ہیں کہ اس میں یزید کی رضا شامل نہیں تھی! یہ کیسے؟(۳) سوال بظاہر معقول تھا مگر مجھے یہ بھی

(۱) طبع اول ص۱۳۱ (۲) یہ خط بھی اور اس سے قبل والے اعتراض کے خطوط بھی الفرقان کی جلد ۱۹۹۲ء کے بعض شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ (۳) یہ اودھ کے ایک خاندان سادات سے تعلق رکھنے والے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ انگریزی کے ایک استاذ تھے۔

اطمینان تھا کہ میں نے کہیں دوہرا معیار نہیں برتا ہے۔ کہیں دانستہ ناانصافی نہیں کی ہے۔ اس لئے عرض کیا کہ سوال تو آپ کا معقول ہے مگر جواب میں کتاب دیکھ کر دے سکتا ہوں، میرے ذہن میں موقع کی پوری عبارت نہیں ہے۔ کتاب دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ نہ ان صاحب نے غلط کہا نہ مجھ سے بے انصافی ہوئی۔ میرا قلم کوتاہی کر گیا۔ یعنی حاکم مکہ کے رویے سے متعلق عبارت میں چند الفاظ کی کمی رہ گئی جس کے نتیجے میں یہ سوال کسی بھی ناقدانہ ذہن والے قاری کے دل میں پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اب یہ عبارت بریکٹ والے الفاظ بڑھا کر اس طرح کر دی گئی ہے:

"ہمارے خیال میں (یزید کے بارے میں حضرت حسینؓ کے سخت مخالفانہ رویے کے پس منظر میں) یہ بات نہیں سوچی جاسکتی تھی کہ مقامی حکام احترام، نرمی اور چشم پوشی کا رویہ مرکزی حکومت اور دارالخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔"

اس ترمیم کے بعد امید ہے کہ کسی کو بھی ان دونوں جگہوں کا فرق سمجھنا مشکل نہ رہے گا اور وہ فرق یہ ہے کہ یزید کی بابت حضرت حسینؓ کے سخت مخالفانہ رویے کو، جو اس کی نامزدگی کے وقت سے چلا تھا، سامنے رکھا جائے تو یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ یزید کی حکومت کا کوئی حاکم بغیر اس کی مرضی جانے کوئی ایسا کام کھلے طور پر اور پھر مدت دراز تک کرے گا جس سے حضرت والا کے بارے میں اس کی نرمی اور چشم پوشی کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن سختی کا کوئی قدم ایسے حالات میں کوئی حاکم اٹھاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا بالکل بھی ضروری نہیں ہوگا کہ اس خاص قدم کی بھی اوپر سے ہدایت ملی ہے۔ جبکہ وہ حاکم خاص طور سے حضرت حسینؓ کے خطرے سے نپٹنے ہی کے لئے مقرر بھی کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ابن زیاد کا تقرر برائے کوفہ خاص اسی مقصد سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت حسینؓ کا ابن زیاد کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے انکار کرنا اور یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے لئے بخوشی تیار ہونا یہ خود اس بات کی کھلی علامت ہے کہ آپ ابن زیاد کے سخت رویہ میں یزید کی مرضی کا عکس نہیں دیکھتے تھے۔

۶-مذکورہ بالا اعتراض ایک درجہ میں معقول اعتراض تھا اور اس کا ذکر اسلئے مناسب سمجھا گیا کہ کسی اور کو بھی متعلقہ مقام پر یہ خیال گزرے تو اس کا دفعیہ ہو جائے۔ لیکن ایک اعتراض اور بھی تھا جو کتاب نکلتے ہی ایک ایسے صاحب کے قلم سے سامنے آیا جو نہ صرف خوب عالم و فاضل بلکہ ہماری ایک نامور علمی و دینی درسگاہ کے نظام تعلیم کے نگراں ہیں۔ اسکا ذکر عبرت کے لئے کرنا

مقصود ہے۔ کہ شیعیت نے ہمارے اچھے اچھوں کے دل و دماغ پر کیسا جادو کر رکھا ہے، کہ جب کربلا کے موضوع میں کوئی بات اس کے پھیلائے ہوئے تصورات کے برعکس آجائے تو ایسے لوگ بھی اپنی حیثیت اور اپنے منصب کے تقاضے بھول کر کیا کیا باتیں کرنے پر آجاتے ہیں! یہی کتاب جس کے بارے میں ابھی آپ نے پڑھا کہ اس پر ایک صاحب کو اعتراض ہوا کہ اس میں یہ کیسے لکھدیا گیا کہ "غالب گمان یہ ہے کہ وہ (یزید) کوئی بڑا متقی، پرہیزگار نہیں تھا۔" اور یہی کتاب جس میں مصنف حضرت حسینؓ کے عزیزوں، ہمدردوں اور خیر خواہوں کی وہ منتیں، سماجتیں، وہ فہمائشیں اور گزارشیں دیکھتے ہوئے جو آپ کے قصد کوفہ پر نظر ثانی کی طالب ہو رہی تھیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ اس وقت اگرچہ نہیں رکتے مگر ایک منزل پر راستے سے پلٹنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو عجیب عجیب قسم کی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ قضیہ ختم کرنے کے لئے از خود ایک مصالحانہ انداز میں یزید کے پاس چلے جانا چاہتے ہیں تو ابن زیاد کی بیجا ضد سد راہ ہو جاتی ہے (یہ سب دیکھتے ہوئے) اپنے آپ کو حیران و پریشان پاتا ہے کہ آخر ان تمام باتوں کی جو بظاہر نہیں ہونی چاہئے تھیں کیا توجیہ کرے، اور پھر اس وقت جا کر اسے اطمینان کا سانس نصیب ہوتا ہے جب امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کی توجیہ اسے نظر پڑتی ہے، جو قارئین نے سب سے آخری باب (۱۲) میں پڑھی ہوگی (کہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انہیں شہادت کا مرتبۂ بلند دینے کی غیبی تدبیر تھی) اسی کتاب کے بارے میں مذکورہ تبصرہ نگار نے لکھا کہ:

"کتاب کا مفروضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ یزید ایک مسلمان، خدا ترس، پاک سیرت، خلیفۂ برحق تھا........ اور اس کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب، بلاوجہ اپنے جان گنوانے والے شخص تھے۔"

کتاب کے کسی ایک جملے کا بھی سہارا لئے بغیر، کسی ایک حسبِ مطلب لفظ کی بھی نشاندہی کئے بغیر، یہ خالص افترا پردازانہ "نتیجۂ بحث" اس کے ذمے ڈالنے پر بھی تبصرہ نگار کی رگِ شیعیت سکون نہیں پا سکی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ یہ حضرتِ حسینؓ کی مخالفت کے پردے میں دراصل رسول اللہ ﷺ سے عناد و عداوت کا اظہار ہے:

"وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ سے دل صاف نہیں رکھتے اور نہ ہی آپؐ سے بیزاری و کراہیت ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ وہ اس راستے سے اپنے دل کا بخار

نکالتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفیٰ ﷺ سے فرمایا:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ.

ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں تم کو رنج پہنچاتی ہیں۔ مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ لوگ سیدنا حسینؓ سے نہیں رسول اللہ ﷺ سے عناد کا اظہار کرتے ہیں۔“

یہ عبارت جو کبھی ایک دوسرے تنقید نگار نے ایک ایسے مصنف کے حق میں، اپنے برہم جذبات کے ماتحت لکھی تھی جس نے حضرت حسینؓ کی شہادت کو شہادت ماننے کے بجائے بغاوت کی شرعی سزا بتاتے ہوئے ”قُتِلَ بِسَيْفِ جَدِّهٖ“ (وہ تو اپنے نانا ہی کی تلوار سے قتل ہوئے) کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اسی عبارت کو یہ ہمارا تبصرہ نگار اس کتاب اور اس کے مصنف کے حق میں دوہرا رہا ہے جس میں کسی ایک لفظ تک کی نشاندہی بھی آج تک کسی ناقد کی طرف سے نہیں ہو سکی جو حضرت حسینؓ کی ادنیٰ شان کے بھی خلاف پڑتا ہو چہ جائیکہ (معاذ اللہ) ان سے عناد کا اظہار!(۱)

ہمیں یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کتاب کے بارے میں جو افترا پردازانہ بات تبصرے کے پہلے اقتباس میں ملتی ہے وہ افترا پردازی کی نیت ہی سے لکھی گئی ہے اور نہ ہی اس کے بعد والے مذکورہ بالا اقتباس کے حق میں یہ خیال ہے کہ یہ دانستہ طور سے محض مصنف کو بدنام کرنے کی ایک کوشش ہو۔ بلکہ یہ محض اس شیعیت کے جراثیم کی کارپردازی فی الواقع ہے جس کی رو سے حضرت حسینؓ وہ امام مامور من اللہ ہیں کہ ان کا قول وارشاد اللہ ورسول کا ارشاد ہے اور اس سے اختلاف اللہ ورسول سے جنگ وعناد۔ اور اس کتاب میں ظاہر ہے کہ حضرت حسینؓ کے حضرت معاویہؓ سے اختلاف اور پھر یزید سے اختلاف کا بیان اس شیعی عقیدے کی رعایت سے الحمد للہ بالکل خالی تھا۔ دوسرے فریق کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی اور حضرت حسینؓ کے اپنوں اور ہمدردوں نے آپ کی رائے سے جو اختلاف آپ کی خیر خواہی میں ظاہر کیا اسے بھی بیان میں لایا گیا تھا۔ اس لئے شیعیت کے جراثیم جس دل ودماغ میں پیوست ہوں اس کا ردعمل ایمانداری سے یہی ہونا چاہئے جو اوپر کے اقتباسات میں نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر جرأت سے محرومی نہ ہوتی تو اس تبصرہ نگار نے کتاب کے مصنف سے بھی پہلے حضرت امام ابن تیمیہؒ کو ان تیروں کا نشانہ بنایا ہوتا۔ اس لئے کہ مصنف نے

(۱) صاد و واقعہ یہ ہے کہ اصلاً جس مصنف کے حق میں یہ عبارت کسی نے لکھی تھی اس کی برہمی تو اس مصنف کے خلاف بجا تھی۔ مگر ان الفاظ میں اس برہمی کا اظہار قطعاً نارو ااور حدودِ شرعی سے قطعی تجاوز تھا۔ اللہ دونوں کو معاف فرمائے۔

تو کہیں نہیں لکھا کہ اس قضیے میں کون صحیح تھا کون غلط تھا۔ بلکہ فیصلہ قارئین پر چھوڑا۔ مگر امام ابن تیمیہؒ کا ایک اقتباس جو کتاب میں ضمناً آیا ہے اس میں انہوں نے حضرت حسینؓ کے موقف سے شرعاً اختلاف کا اظہار بھی ان کو شہید برحق ماننے کے ساتھ ساتھ لیا ہے۔ الغرض یہ حبِ حسینؓ کے قابل احترام پردے میں شیعیت ہے جو اس طرح کے ردِ عمل کو عین دین وایمان سمجھتی ہے۔

۷-اور اسی ضمن میں ایک خیال آتا ہے جس کے حوالے سے یہ مذکورۂ بالا حقیقت اور بھی روشن ہوتی ہے۔ وہ خیال یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کو عام طور پر ہم سنیوں کے یہاں بھی ہر سال اس تصور کے ماتحت بطور ایک معرکۂ حق وباطل یاد کیا جاتا ہے کہ ایک فاسق وفاجر نے اسلامی تخت خلافت پر قبضہ کر لیا تھا جس سے اسے آزاد کرانے کی خاطر حضرت حسینؓ نے تلوار اٹھانے کی ٹھانی۔ مگر اسی میدان کا ایک اور مرد بھی، جس کا نام عبداللہ بن زبیرؓ ہے۔ جس نے یزید سے لیکر عبدالملک بن مردان تک کے اموی حکمرانوں کے خلاف بارہ برس تک تلوار چلائی۔ اور جب تک سر ہی تن سے جدا نہ ہو گیا تلوار اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ پر اس کی شہادت (جمادی الاولیٰ ۷۳ھ) کا دن آنے پر اسے اور اس کی معرکہ آرائیوں کو یاد کرنے کا دستور ہم نے کہیں نہیں دیکھا! اور پھر اسی کی معرکہ آرائیوں کے دور میں واقعۂ کربلا کے تین سال بعد وہ واقعۂ حرہ پیش آتا ہے جس میں بلا کسی اختلاف روایت کے یزید ہی کے حکم سے مدینہ منورہ (زادھا اللّٰہ تشریفا و تکریما) تاراج ہوا اور ساکنان مدینہ پر تین دن مسلسل قیامت ٹوٹی۔ مگر ہم نے نہیں دیکھا کہ جب وہ دن سال میں، عشرۂ محرم کی طرح، لوٹ کر آتے ہوں تو ان کی یاد میں بھی کوئی روتا ہو۔ اور ان دنوں کے حوالے سے بھی یزید کو فاسق وفاجر اور ملعون ومردود بتانے کے لیے جلسوں اور مجلسوں کا اہتمام ہوتا ہو! حالانکہ یہی وہ موقع تھا کہ اس کے حوالے سے یزید کو فاسق وفاجر وغیرہ کچھ بھی کہا جاتا تو اس کا جواز فراہم تھا۔ مگر وہ دن تو کسی کو بھی بھول کر یاد نہیں آتے۔ رہے شیعہ تو وہ کہاں اس کے یاد کرنے والے۔ اس سے تو ان کا کام بگڑتا۔ ہاں اگر حضرت علی بن الحسینؓ (زین العابدینؒ) کو خدانخواستہ اس قصے میں کچھ ہو جاتا تو بیشک یہ دن بھی محرم والا مقام پا لیتے مگر ان کے بارے میں یزید کی اپنے کمانڈر کو سخت ہدایت تھی کہ کسی طرح کا گزند نہ پہنچے۔ سو الحمد للہ آپ عافیت سے رہے۔

پتہ نہیں ہم میں سے کتنے ہوں جو اس بہتر سالہ جواں مرد (عبداللہ بن زبیرؓ) کو کچھ ٹھیک سے جانتے بھی ہوں۔ وہ بذات خود کچھ کم صاحب فضائل آدمی نہ تھے۔ جہادی معرکوں سے تو کتاب

زندگی بھری ہوئی تھی ہی، ذوق عبادت کا بھی عالم یہ تھا کہ شہادت کی خبر پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی، جو ان کی یزید وغیرہ کے خلاف معرکہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے "صدام و قوام" (شب زندہ دار اور دن کے روزہ دار) کے حوالے سے اظہار افسوس کیا ہے۔ رہا حسب و نسب تو باپ کی طرف سے آپ بیٹے تھے آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد حضرت زبیر بن العوامؓ کے، جو حواریٔ رسول کا لقب رکھتے تھے اور ان دس صحابہ میں سے ایک تھے جنھیں جنت کی بشارت ملی۔ اور ان کی طرف سے حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیقؓ کی اولاد، جو بنت صدیق ہونے کے علاوہ "ذاتُ النطاقین" کا وہ لقب بھی رکھتی تھیں جس سے آنحضرت ﷺ کے سفر ہجرت کی ایک خاص یاد وابستہ ہے۔ مردِ میدان ہونے کا عالم یہ تھا کہ بہتر سال کی عمر میں بھی بالکل اکیلے رہ جانے کے باوجود دشمن کی فوج قابو پانے سے عاجز تھی۔ اور اس لئے جب یہ شیر مرد پتھروں کی چوٹ کھا کر گرا۔ اور پھر دشمن قابو پا سکا تو یہ اتنی بڑی کامیابی دشمن کو لگی کہ نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ یاد آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے جب یہ تکبیر سنی اور وجہ معلوم ہوئی تو فرمایا کہ یہی وہ تھا جس کی پیدائش پر بھی مدینے میں تکبیر بلند ہوئی تھی۔ کیونکہ مہاجرین کے گھر میں یہ پہلی پیدائش تھی۔ اور غیر معمولی خوشی کا سبب یہ تھا کہ یہود مدینہ نے یہ شہرت دے رکھی تھی کہ اُن کے عاملوں نے مہاجر ماؤں کے رحم بند کر دئے ہیں۔

الغرض یہ تھے عبداللہ بن زُبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو ہمیں یزید دشمنی کے حوالے سے بھی کبھی یاد نہیں آتے۔ پھر بھی خبر دار جو ہمیں شیعیت کا عیب لگایا، خبر دار جو قصے کہانیوں سے پردہ اٹھایا۔

ع طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

☆☆☆

اشاریہ

(INDEX)

موضوعات	صفحات
۱۔ اشخاص	از: ۲۹۶ تا ۳۰۲
۲۔ مقامات و ممالک	" ۳۰۲ " ۳۰۳
۳۔ اقوام، طبقات، قبائل، مسالک، فرق	" ۳۰۴ " ۳۰۹
۴۔ متفرقات	" ۳۰۶ " ۳۰۷

نوٹ

یہ اشاریہ ہمارے محب و مہربان جناب قطب الدین ملّا صاحب (بیلگامی) کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے تو مذکورہ بالا عنوانات سے کہیں زیادہ عنوانات کے ماتحت مواد مرتب کیا تھا مگر ہمیں بس نہایت ضروری پر اکتفا کرنا پڑا۔

اشخاص

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: ۵، ۱۵، ۳۱، ۳۵، ۳۸، ۴۹، ۵۲، ۷۱، ۷۲، ۷۷، ۹۰، ۹۶، ۱۱۲، ۱۶۴، ۱۶۸، ۱۷۱، ۲۱۲، ۲۱۸، ۲۲۶، ۲۳۵ (حاشیہ) ۲۳۸، ۲۶۰، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۶، ۲۸۱، ۲۹۳

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام: ۲۲۳ (حاشیہ)

۳۔ حضرت ابراہیم بن محمد صلی علیہ وسلم: ۳۸

۴۔ ابن اثیر: ۳۳ (حاشیہ) ۴۳، ۵۷، ۵۸، ۶۹، ۷۸، ۸۰، ۸۱، ۸۴، ۱۶۱، (حاشیہ) ۱۷۵

۵۔ ابن الاشعث (عبدالرحمٰن) ۲۷۰، ۲۷۱

۶۔ ابن المہلب (یزید) ۲۷۰

۷۔ (شیخ الاسلام) ابن تیمیہ: ۱۸، ۲۶۴، ۲۶۸، ۲۷۳، ۲۸۷، ۲۹۲، ۲۹۴

۸۔ ابن جریر طبری: ۱۵۹، ۱۶۱ (حاشیہ) ۱۶۹، ۱۷۵

۹۔ (حافظ) ابن حجر (عسقلانی) ۷۳ (حاشیہ) ۹۶، ۱۴۰، ۱۴۱

۱۰۔ ابن خلدون: ۳۴، ۳۶، ۳۷، ۱۲۸، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۷۷

۱۱۔ ابن زبیر: (دیکھئے عبداللہ بن زبیرؓ)

۱۲۔ ابن زیاد ۳، ۲۱، ۲۸، ۲۹، ۱۰۴ (حاشیہ) ۱۱۵، ۱۲۶، ۱۷۲، تا ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۵، ۲۰۱، ۲۰۳ تا ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۵، ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۵۲ تا ۲۵۶، ۲۵۸ تا ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۷۳ تا ۲۷۹، ۲۸۵ تا ۲۸۸، ۲۹۱، ۲۹۲

۱۳۔ ابن سبا: دیکھئے عبداللہ بن سبا

۱۴۔ ابن سعد: دیکھئے محمد بن سعد

۱۵۔ ابن سعد (سپہ سالار) دیکھئے عمر بن سعد

۱۶۔ ابن سمعان: دیکھئے عقبہ بن سمعان

۱۷۔ ابن سمیہ: دیکھئے ابن زیاد

۱۸۔ حضرت ابن عباسؓ: دیکھئے عبداللہ بن عباسؓ

۱۹۔ ابن عمرؓ: دیکھئے عبداللہ بن عمرؓ

۲۰۔ ابن عون (راوی) ۹۴، ۱۰۰

۲۱۔ ابن قتیبہ (عبداللہ بن مسلم) ۹۵

۲۲۔ ابن کثیر ۵۰، ۵۳، ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۵، ۶۹، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۸، ۸۹، ۹۴، ۹۷، ۹۸، ۱۰۵ (حاشیہ) ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۳۲، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۵۶، ۱۶۱ (حاشیہ) ۱۸۵، ۲۴۸، ۲۵۱

۲۳۔ ابن مرجانہ: دیکھئے ابن زیاد

۲۴۔ ابن معین: ۸۶

۲۵۔ ابن مغیرہ (بن شعبہ) ۹۴

۲۶۔ (سید) ابوالاعلیٰ مودودی ۳۱

۲۷۔ ابوالاعور (عمرو بن سفیان سلمی) ۳۳

۲۸۔ (مولانا) ابوالکلام آزاد ۱۵

۲۹۔ (حضرت) ابوایوب انصاریؓ ۹۸

۳۰۔ حضرت ابوبکر: دیکھئے احنف بن قیسؓ

۳۱۔ حضرت ابوبرزہ اسلمیؓ: ۲۶۰

۳۲۔ ابوبکر بن العربی: ۱۳۴ (حاشیہ)

۳۳۔ حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام: ۱۸۶، ۲۶۵، ۲۷۱،

۳۴۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ۱۴، ۳۲، ۷۲، ۷۳ (حاشیہ) ۷۷، ۱۱۲، ۱۲۸، ۱۲۹، ۲۸۲، ۲۹۶

۳۵۔ ابوبکر عبدالرزاق صنعانی: (حاشیہ) ۱۳۴

۳۶۔ ابوجعفر: دیکھئے حضرت محمد الباقرؒ

۳۷۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ: ۱۲۲

۳۸۔ ابوجناب الکلبی: ۱۵۱

۳۹۔ (حضرت) ابوسعید الخدریؓ ۱۸۷، ۲۱۸، ۲۶۵

۴۰۔ ابوسفیان: ۴، ۷۲

۴۱۔ ابوعبداللہ: دیکھئے حضرت امام حسینؓ

۴۲۔ ابوعبید: ۹۵

۴۳۔ ابومخنف: ۲۶، ۲۷، ۲۹، ۱۵۱

۴۴۔ ابومسلم خراسانی: ۲۷۰

۴۵۔ (حضرت) ابوموسیٰ اشعریؓ: ۳۸، ۴۹، ۷۴، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۸۱

۴۶۔ (حضرت) احنف بن قیسؓ ۱۰۲، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸

۴۷۔ امام احمد بن حنبلؒ: ۸۴، ۱۲۲

۴۸۔ (حکیم) احمد حسین الہ آبادی (حاشیہ) ۱۵

۴۹۔ (شیخ) احمد زینی دحلان: ۱۶

۵۰۔ (حضرت) اسامہ بن زیدؓ ۴۸

۵۱۔ (حضرت) اسمٰعیل علیہ السلام (حاشیہ) ۲۳۵

۵۲۔ (حضرت) اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ ۲۹۶

۵۳۔ اشتر (مالک بن اشتر) ۳۳

۵۴۔ اشعث بن قیس: ۱۸۱

۵۵۔ علامہ اقبال: (حاشیہ) ۱۱

۵۶۔ المذری بن مشمعل ۱۹۶

۵۷۔ (جسٹس) امیر علی: ۲۸، ۲۴۸

۵۸۔ (حضرت) انس بن مالکؓ: ۲۱۸

۵۹۔ انوار حسین: (فقرو) ۱۲

۶۰۔ انور الجندی: (حاشیہ) ۲۳۳

(ب)

۶۱۔ باقر شریف القرشی: ۵۴، ۶۷، ۱۸۴

۶۲۔ امام بخاریؒ: (حاشیہ) ۱۳۴

۶۳۔ مولانا برہان الدین سنبھلی: ۳۱

(ت)

۶۴۔ مولانا محمد تقی عثمانی: (حاشیہ) ۱۲۷

(ج)

۶۵۔ حضرت جابر بن عبداللہ ۱۸۷، ۲۱۸، ۲۶۵

۶۶۔ جعفر بن زبیرؓ: ۱۶۱

۶۷۔ (حضرت) جعفر طیار: ۲۱۸، ۲۲۲، ۲۳۲

۶۸۔ جویریہ بن بدر تمیمی: ۲۱۳

(ح)

۶۹۔ (حضرت) حبیب: دیکھئے حبیب بن مسلمہؓ

۷۰۔ (مولانا) حبیب الرحمٰن اعظمیؒ: ۱۳۳

۷۱۔ (حضرت) حبیب بن مسلمہ: ۳۳، ۱۴۰

۷۲۔ حبیب بن مظاہر: ۱۶۹، ۲۱۸

۷۳۔ حجاج: دیکھئے، حجاج بن یوسف

۷۴۔ حجاج بن یوسف: ۱۶۷، ۲۶۴

۷۵۔ حجار بن الجبر عجلی: ۱۸۲، (حاشیہ) ۲۱۹، ۲۲۲

۷۶۔ حجر بن عدی: ۱۶۴ (حاشیہ) ۱۷۷ (حاشیہ) ۲۲۵

۷۷۔ حر بن یزید تمیمی: ۲۰۲

۷۸۔ حر بن یزید حنظلی: ۲۰۷، ۲۱۱ تا ۲۱۳، ۲۲۳، ۲۲۸، ۲۳۹

۷۹۔ (حضرت) حسن بصری: ۲۳۶، ۲۷۱

۸۰۔ (حضرت) حسن بن علیؓ: ۳، ۱۳، ۳۲، ۳۳، ۴۷، ۸۴، ۴۹ تا ۶۰، ۶۴، ۶۵، ۶۸، ۸۷ (حاشیہ) ۱۳۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۷۴، ۲۲۱، ۲۶۶، ۲۷۲، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۷

۸۱۔ حسن مجتبیٰؓ: دیکھئے حضرت حسنؓ

۸۲۔ (حضرات) حسنینؓ: ۵۳، ۵۵، ۶۰، ۱۶۰، ۱۷۴

۸۳۔ (حضرت) حسینؓ: ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۶

۳۴تا۳۶، ۴۷، ۴۸، ۵۵(حاشیہ)۵۸تا۶۱، ۶۳تا ۷۰
۸۵، ۹۳، ۹۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۳تا ۱۱۸،
۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۷۱،
۱۷۶، ۱۷۷، ۱۸۲تا ۲۰۱، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۸تا ۲۱۸، ۲۲۰،
۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۹، ۲۴۱تا ۲۶۰، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۶تا ۲۶۸،
۲۷۱، ۲۷۳تا ۲۸۰، ۲۸۱تا ۲۸۹، ۲۹۱تا ۲۹۵
۸۳۔(حضرت مولانا) حسین احمد مدنی: ۱۶
۸۵۔ حصین بن عبد الرحمٰن: ۲۰۴، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۷۱، ۲۹۵
۲۱۰، ۲۱۳
۸۶۔ حصین بن نمیر: ۲۰۵، ۲۰۷
۸۷۔(حضرت)حمزہؓ: ۲۱۸، ۲۲۲، ۲۳۲
۸۸۔ حمید: دیکھیے حمید بن مسلم
۸۹۔ حمید بن مسلم: ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۶،
۲۵۷
۹۰۔(ڈاکٹر) حمید اللہ (محمد حمید اللہ)۶، ۸

(خ)

۹۱۔ خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی: ۴۱

(ذ)

۹۲۔(حافظ): ذہبی ۷۳

(ر)

۹۳۔(حضرت مولانا) رشید احمد گنگوہی: ۱۳۵
۹۴۔ رفاعہ بن شداد: ۱۶۹

(ز)

۹۵۔(حضرت) زبیر بن العوامؓ ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۵۰، ۵۱،
۲۷۰، ۲۷۲، ۲۹۶
۹۶۔ زحر بن قیس: ۲۲۹
۹۷۔ زہیر بن قین: ۲۲۴تا ۲۲۷، ۲۳۶
۹۸۔ زیاد: ۳۷، ۸۷تا ۸۹، ۹۹، (حاشیہ) ۱۰۰، ۱۰۳، ۲۱۸، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۸، ۲۴۳
(حاشیہ)۱۷۷، ۲۵۸،(حاشیہ)۲۷۷
۹۹۔ زیاد بن ابی سفیان
۱۰۰۔ زیاد بن ابیہ دیکھیے — دیکھیے زیاد
۱۰۱۔ زیاد بن سمیہ
۱۰۲۔(حضرت)زید بن ارقم: ۲۱۸
۱۰۳۔(حضرت) زین العابدین (علی بن الحسینؓ) ۱۶۵،
۲۰۱، ۲۳۴، ۲۳۷، ۲۴۴(حاشیہ) ۲۵۲، ۲۵۵، ۲۶۲،
۱۰۴۔ زینب الکبریٰ: ۱۸۸، ۲۳۱، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۶۰

(س)

۱۰۵۔ سعد بن عبیدہ: ۲۴۱
۱۰۶۔ سعد بن مسعود ثقفی: ۱۷۴
۱۰۷۔(حضرت) سعد بن ابی وقاصؓ: ۴۸، ۱۶
۱۰۸۔(شیخ) سعدی (شیرازی): ۱۱۳
۱۰۹۔(حافظ) سعید احمد: ۱۳
۱۱۰۔ سعید بن العاصؓ ۶۲، ۷۸، ۸۲، ۸۳، ۸۴، حاشیہ ۱۰۵
۱۱۱۔ سعید بن عثمانؓ: ۱۲۶
۱۱۲۔(حضرت) سعید بن المسیب: ۲۷۱
۱۱۳۔ سقراط: ۲۳۵
۱۱۴۔ سلیمان بن صرد: ۱۶۹
۱۱۵۔ سمیہ: ۲۲۵
۱۱۶۔(حضرت) سہل بن سعد ساعدی: ۱۲۸

(ش)

۱۱۷۔ شبث بن ربعی: ۱۶۸، ۱۸۲، ۲۱۹، ۲۲۲
۱۱۸۔(علامہ) شبلی نعمانی: (حاشیہ) ۵۶
۱۱۹۔(امام) شعبی: ۴۸
۱۲۰۔ شمر بن ذی الجوشن: ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۶،
۲۱۸، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۸، ۲۴۳

۱۲۱۔ شیخ الہند (مولانا محمود الحسنؒ): ۱۴

(ص ض)

۱۲۲۔ مصعب بن زبیر: ۲۶
۱۲۳۔ ضحاک بن قیس (فہری) ۳۳، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۳۲،
۱۵۵

(ط)

۱۲۴۔ طبری: دیکھیے ابن جریر طبری:
۱۲۵۔(حضرت) طلحہ (بن عبید اللہ) ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۵۰،
۵۱، ۲۷۰
۱۲۶۔(ڈاکٹر) طٰہٰ حسین ۲۲۳

(ع)

۱۲۷۔(حضرت) عائشہ: ۴۴، ۴۵، ۵۰، ۵۱، ۹۵، ۹۶، ۹۷،
۱۱۰، ۱۱۴، ۱۹۴(حاشیہ) ۲۲۳، ۲۷۰
۱۲۸۔(حضرت) عباس (برادر حضرت حسینؓ) ۲۱۷
۱۲۹۔ عبد الرزاق المقرم: (حاشیہ) ۵۴، (حاشیہ) ۱۹۶
۱۳۰۔(حضرت) عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ ۹۳ تا ۹۸، ۱۰۰،
۱۰۱، ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۱۳ تا ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۳۷،
۱۳۸، ۱۵۲، ۱۵۴، ۲۸۲تا ۲۸۴
۱۳۱۔ عبد الرحمٰن بن الحرث بن ہشام: ۱۸۶
۱۳۲۔ عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید: ۳۴، ۶۲
۱۳۳۔(حضرت) عبد الرحمٰن بن عوف: ۱۳۱
۱۳۴۔(مولانا) عبد الشکور فاروقی: (حاشیہ) ۲۰۴
۱۳۵۔ عبد اللہ بن ابی الحصین ازدی: ۲۴۲، ۲۴۴
۱۳۶۔ عبد اللہ بن اویس عامری: ۱۵۷
۱۳۷۔(حضرت) عبد اللہ بن بدیلؓ (حاشیہ) ۵۲
۱۳۸۔(حضرت) عبد اللہ بن جعفرؓ: ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۱،
۲۵۶، (حاشیہ) ۲۶۴، ۲۶۵
۱۳۹۔(حضرت) عبد اللہ بن زبیرؓ: ۶۹، ۸۵، ۹۳، ۹۸،
۹۹، ۱۰۱، ۱۰۴(حاشیہ) ۱۰۸، ۱۱۰ تا ۱۲۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴،
۱۳۶، ۱۳۷، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۵،
۱۶۷، ۱۷۴(حاشیہ) ۱۸۹، ۱۹۱، ۲۴۴، ۲۸۲، ۲۸۴، ۲۹۵
۱۴۰۔ عبد اللہ بن سبا (منافق) ۷، ۶۲، ۲۲۱(حاشیہ)
۲۴۴، (حاشیہ) ۲۸۴، ۲۸۵
۱۴۱۔(حضرت) عبد اللہ بن سلامؓ: ۴۲
۱۴۲۔ عبد اللہ بن سلیمؓ: ۱۹۶
۱۴۳۔ عبد اللہ بن شریک عامری: ۲۴۱
۱۴۴۔(حضرت) عبد اللہ بن عباسؓ: ۳۴، ۶۰(حاشیہ)
۶۹، ۹۳، ۹۴، ۹۸، ۱۱۰، (حاشیہ) ۱۱۴، ۱۲۰، ۱۴۹، ۱۶۷،
۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۹۱، ۲۶۵، ۲۷۱
۱۴۵۔(حضرت) عبد اللہ بن عمرؓ: ۴۸، ۴۹، ۶۹، ۹۰، ۹۳،
۹۸تا ۱۰۱، ۱۰۴، (حاشیہ) ۱۱۴، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۶،
۱۳۴، ۱۳۷، ۱۳۹ تا ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۴،
۱۵۶، ۱۶۰، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۸۴، ۲۶۵، ۲۷۱، ۲۸۲،
۲۸۴، ۲۸۴، ۲۹۵، ۲۹۶
۱۴۶۔ عبد اللہ بن اسلم حضرمی: ۱۷۱
۱۴۷۔(حضرت) عبد اللہ بن مطیعؓ ۱۶۷، ۱۷۰، ۱۸۴،
۲۶۵
۱۴۸۔ عبد اللہ بن یقطر: ۱۹۸
۱۴۹۔ عبد الملک بن مروان: ۲۷۰، ۲۹۵
۱۵۰۔ عبید اللہ بن زیاد: دیکھیے ابن زیاد
۱۵۱۔ عتبہ بن ابی سفیانؓ: ۸۰
۱۵۲۔(مولانا) عتیق احمد بستوی: ۴۱
۱۵۳۔(حضرت) عثمان بن عفانؓ ۳۲، ۳۷، ۴۳، ۴۴،
۴۵، ۶۲، ۶۳، ۱۰۵، (حاشیہ) ۱۲۶، ۱۲۹، ۱۳۷، ۱۸۵،
۲۸۴، ۲۸۴، ۲۸۵
۱۵۴۔ عروہ (عروۃ المرادی): ۱۷۷

۱۵۵۔ عروہ بن مسعود ثقفی: ۷۱

۱۵۶۔ عقبہ بن سمعان: ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۲۲۰

۱۵۷۔ (حضرت) علی اکبر (صاحبزادہ) ۲۱۷

۱۵۸۔ (حضرت) علی بن ابی طالب: ۲، ۱۳، ۳۲، ۳۷، ۳۸، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۹ تا ۵۳، ۵۶، ۵۸، ۶۰، ۶۳، ۶۴، ۱۰۰۔۱۰۱ (حاشیہ) ۱۰۶، ۱۲۱، ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۳۵ تا ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۶۲ (حاشیہ) ۱۶۴، ۱۷۳، ۱۸۱، ۱۸۷، ۱۹۵، ۲۲۸، ۲۳۲، ۲۳۸، ۲۶۶، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۶، ۲۹۱، ۲۸۲

۱۵۹۔ (حضرت) علی بن الحسینؓ: دیکھئے زین العابدین

۱۶۰۔ علی بن مجاہد: ۸۶

۱۶۱۔ (حضرت) علی بن موسیٰ بن جعفر الصادقؒ: ۱۳۱

۱۶۲۔ (مولانا) علی نقی (المعروف نقن صاحب) ۵۶، ۵۷، ۱۳۶، ۱۷۵ (حاشیہ) ۱۹۱ (حاشیہ) ۲۲۰ (حاشیہ) ۲۳۴، ۲۵۷

۱۶۳۔ (حضرت) عمار بن یاسرؓ: ۷۴

۱۶۴۔ عمارہ حنفی: ۱۶۰

۱۶۵۔ (حضرت) عمر بن الخطابؓ ۷۱، ۷۳ تا ۷۷، ۸۷ (حاشیہ) ۱۱۲، ۱۲۸، ۲۸۲

۱۶۶۔ (حضرت) عمر بن سعد بن ابی وقاصؓ ۱۷، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۷، ۲۸، ۶۱، ۱۷۳، ۲۰۳ تا ۲۱۶، ۲۲۲، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۶ تا ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۶۱، ۲۶۷، ۲۷۳، ۲۸۵، ۲۸۶

۱۶۷۔ (حضرت) عمروؓ: دیکھئے عمرو بن العاصؓ

۱۶۸۔ عمر بن الحجاج: ۲۱۶، ۲۲۲

۱۶۹۔ (حضرت) عمرو بن العاصؓ ۳۳، ۵۲ (حاشیہ) ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱

۱۷۰۔ عمرو بن سعید (الاشدق) ۱۰۵، ۱۸۹، ۲۹۱

۱۷۱۔ (حضرت) عیسیٰ علیہ السلام ۲۲۱، ۲۳۵

(ف)

۱۷۲۔ (حضرت) فاطمہ (بنت الرسولؐ) ۱۳، ۲، ۳۲، ۱۶۲، (حاشیہ) ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۳۲، ۲۴۶

۱۷۳۔ فرزدق: ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۹

۱۷۴۔ فقرو: دیکھئے انوار حسین

(ق)

۱۷۵۔ (سید) قطب: ۳

۱۷۶۔ قاسم (بن حسینؓ): ۲۳۳، ۲۳۴

۱۷۷۔ قیس بن اشعث: ۱۶۸، ۲۱۹ (حاشیہ) ۲۲۲، ۲۲۵

۱۷۸۔ (حضرت) قیس بن سعدؓ: ۵۲ (حاشیہ)

۱۷۹۔ قیصر روم: ۲۸۲

(ک)

۱۸۰۔ (مولانا) کریم بخش سنبھلی: ۱۴

۱۸۱۔ کسریٰ: ۲۸۲

(م)

۱۸۲۔ مالک: دیکھئے مالک بن انس

۱۸۳۔ (امام) مالک بن انسؓ: ۳۵، ۱۲۲

۱۸۴۔ مامون الرشید: ۱۳۱

۱۸۵۔ مجالد بن سعید: ۲۶

۱۸۶۔ مجاہد: ۲۷۱

۱۸۷۔ محفز بن ثعلبہ: ۲۵۸، ۲۵۹

۱۸۸۔ (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم: دیکھئے آنحضرت ﷺ

۱۸۹۔ (حضرت) محمد الباقر: ۱۵۹، ۱۶۰، ۲۰۰ تا ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۱۴ (حاشیہ) ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۵۵

۱۹۰۔ محمد بن ابی بکر صدیق: ۷

۱۹۱۔ محمد بن اشعث: ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۹۷، ۲۱۹

۱۹۲۔ (حضرت) محمد بن حنفیہؒ ۱۴۲، ۱۶۱، ۱۶۶ تا ۱۷۰، ۱۸۳، ۲۳۶، ۲۶۵

۱۹۳۔ محمد بن سعد صاحب طبقات: ۹۵، ۹۶، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۷

۱۹۴۔ (شیخ) محمد بن عبدالوہاب نجدی: ۱۶

۱۹۵۔ محمد بن عمرو حزم: ۱۰۸

۱۹۶۔ محمد حسان نعمانی: ۴۲

۱۹۷۔ (مولوی) محمد حسن سنبھلی: ۱۵

۱۹۸۔ (مولانا) محمد منظور نعمانی: ۱۱، ۱۹

۱۹۹۔ محمد ہادی حسین: ۲۲۹ (حاشیہ)

۲۰۰۔ محمود احمد عباسی: ۱۵۴ (حاشیہ) ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴

۲۰۱۔ مختار بن عبید ثقفی: ۱۷۳، ۱۷۷، ۲۴۳

۲۰۲۔ مختار: دیکھئے مختار بن ابی عبید ثقفی

۲۰۳۔ (مولانا) سید محمد مرتضیٰ: ۴۱

۲۰۴۔ مروان: دیکھئے مروان بن حکم

۲۰۵۔ مروان بن حکم: ۹۰، ۱۰۱، ۱۰۴، (حاشیہ) ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۵۵ تا ۱۵۸

۲۰۶۔ مسعودی (مؤرخ) ۱۸۶

۲۰۷۔ مسلم بن عقبہ المُرّی: ۱۵۳

۲۰۸۔ مسلم بن عقیل: ۱۸، ۴۴، ۱۶۹ تا ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۱۸، ۲۶۶، ۲۷۸، ۲۸۵

۲۰۹۔ مسلم بن عوسجہ: ۱۷۵ (حاشیہ)

۲۱۰۔ (حضرت) مسور بن مخرمہ: ۱۸۷، ۲۶۵

۲۱۱۔ مسیب بن عقبہ فزاری: ۶۴

۲۱۲۔ مسیب بن نجبہ: ۱۶۹

۲۱۳۔ مسیلمہ کذاب: ۷۱ (حاشیہ)

۲۱۴۔ مصحفی: (شاعر) ۱۹

۲۱۵۔ (حضرت) معاویہؓ (بن ابی سفیان) ۱۳، ۳۱، ۳۲، ۳۳، (حاشیہ) ۳۴، ۳۵ تا ۵۰، ۵۲ تا ۶۲، [illegible] ۶۹، ۷۸ تا ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۹ تا ۹۲، ۹۶ تا ۱۲۳، ۱۲۵ تا ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵ تا ۱۴۳، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱ تا ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۳ (حاشیہ) ۱۶۹، (حاشیہ) ۱۷۱، ۱۷۳، ۱۷۶، ۱۸۸، ۱۹۱، ۲۴۲، ۲۶۷، [illegible] ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۸۱ تا ۲۸۶، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۳

۲۱۶۔ (حضرت) مغیرہ بن شعبہؓ ۳۰، ۳۱، ۵۲ (حاشیہ) ۶۹ تا ۷۶، ۷۸ تا ۸۷، ۸۸ (حاشیہ) ۹۱، ۱۳۲، ۱۶۷، ۲۸۳

۲۱۷۔ منصور: (عباسی خلیفہ) ۲۷۰

(ن)

۲۱۸۔ (حضرت) نعمان بن بشیرؓ: ۱۷۰، ۱۷۲

(و)

۲۱۹۔ (حضرت) واثلہ بن واقد اللیثی: ۱۸۷، ۲۶۵

۲۲۰۔ واقدی (مؤرخ) ۹۵

۲۲۱۔ ولید (۱) ۳۳

۲۲۲۔ ولید بن عقبہ بن ابی سفیان: ۱۵۵ تا ۱۶۱، ۱۹۱، ۱۹۲

(ہ)

۲۲۳۔ ہانی بن ثبیت: ۲۷

۲۲۴۔ ہانی بن عروہ: ۱۷۳، ۱۷۵ تا ۱۷۹، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۲۵، ۲۷۸

۲۲۵۔ ہرقل: ۱۰۱

۲۲۶۔ ہند (والدہ حضرت معاویہؓ) ۴

(ی)

۲۲۷۔ یحییٰ بن سعید: ۱۸۹

(۱) ان کے بارے میں تحقیق نہیں ہو سکی۔ بعض قرائن سے گمان ہے کہ شاید یہ ولید بن عقبہ ابی معیط ہیں۔ قرائن کے لئے دیکھئے الاصابہ۔ (ابن حجر)

۲۲۸۔ یزید بن حارث: ۲۱۹، ۲۲۲
۲۲۹۔ یزید بن معاویہ: ۲، ۳، ۱۴، ۱۷، ۲۰، ۲۴ تا ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۶، ۴۷، ۴۸، ۵۸، ۶۴، ۶۸، ۶۹، ۷۸، ۷۹، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۱، ۹۳، ۹۶، ۹۸ تا ۱۲۳، ۱۲۵ تا ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۲ تا ۱۴۵، ۱۵۱ تا ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۵، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۷، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۹۱، ۱۹۲، ۲۰۵، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۵۷ تا ۲۶۴، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۰، ۲۷۳ تا ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۱ تا ۲۹۶
۲۳۰۔ یزید بن مقنع عذری: ۱۰۶

مقامات وممالک

(ا)، (ب)، (پ)، (ت)، (ث)

۱۔ اجین: ۱۶
۲۔ احد: ۲۲۳
۳۔ اذرح: ۱۳۳
۴۔ بحرین: ۷۲
۵۔ بریلی: ۱۵، ۱۹
۶۔ بصرہ: ۳۷، ۴۵، ۴۶، ۵۷، ۵۸، ۶۲، ۷۳، ۷۴، ۷۹، ۸۷، ۸۸، ۱۷۲، ۲۷۰، ۲۷۷، ۲۷۸
۷۔ بطن عقبہ: ۱۹۹
۸۔ بطن مرو: (مرالظہران) ۱۱۱
۹۔ بغداد: ۱۳۱
۱۰۔ پاکستان: ۱
۱۱۔ پیرس: ۲
۱۲۔ تبوک: ۷۲، ۷۶، ۷۹
۱۳۔ تمیم: ۱۹۲، ۱۹۳
۱۴۔ تہران: ۲۰۳ (حاشیہ)
۱۵۔ ثعلبیہ: ۱۹۹

(ج)، (ح)، (خ)

۱۶۔ جیرون: ۲۶۲
۱۷۔ حاجر: ۱۹۷
۱۸۔ حجاز: ۹۱، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۵ (حاشیہ) ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۷، ۱۱۸، ۲۳۵
۱۹۔ حدیبیہ: ۷۰، ۷۱، ۷۶
۲۰۔ حمص: ۶۲
۲۱۔ خوارین: ۱۳۲
۲۲۔ حیرہ: ۷۳ (حاشیہ)
۲۳۔ خراسان: ۱۲۶، ۱۳۱، ۲۷۰

(د)، (ذ)، (ر)، (ز)

۲۴۔ داراب گرد: ۵۶، ۵۷، ۵۸
۲۵۔ دار عباس: (مکہ) ۱۶۷
۲۶۔ دمشق: ۵۴، ۵۷، ۷۸، ۷۸، ۸۲، ۸۵، ۱۰۲، ۱۰۳ (حاشیہ) ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۵۵، ۱۹۲، ۲۰۹، ۲۳۰، ۲۵۷، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۷، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۹۲
۲۷۔ دیوبند: ۱۴
۲۸۔ ذوحم (پہاڑ) ۲۰۷
۲۹۔ ربذہ: ۵۰، ۵۱
۳۰۔ رے: ۲۰۳
۳۱۔ زبالہ: ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۶۶

۳۲۔ زورود: ۱۹۹

(س)، (ش)، (ص)، (ط)، (ع)

۳۳۔ سنبھل: ۱۱، ۱۲، ۳۱
۳۴۔ شام: ۳۶، ۵۰، ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۳۴ (حاشیہ) ۱۴۲ (حاشیہ) ۱۷۰، ۲۰۵، ۲۰۹، ۲۶۳
۳۵۔ صفاح: ۱۹۵، ۱۹۶
۳۶۔ صفین: ۴۶
۳۷۔ طائف: ۷۱، ۷۳
۳۸۔ عراق: ۳۴، ۳۶، ۶۱، ۶۶، ۷۳ (حاشیہ) ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۶۳، ۲۶۵، ۲۷۰
۳۹۔ عرب: ۵۱، ۵۲، ۵۳
۴۰۔ عرفات: ۱۹۳
۴۱۔ غوطہ دمشق: ۱۲۷

(ف)، (ق)، (ک)، (ل)

۴۲۔ فارس: ۲۰۳ (حاشیہ)
۴۳۔ قادسیہ: ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۵، ۲۰۹، ۲۶۶
۴۴۔ کربلا: دیکھئے متفرقات میں واقعہ کربلا۔
۴۵۔ کوفہ: ۱۷، ۲۰، ۳۴، ۵۶، ۵۸، ۶۱، ۶۲، ۶۵، ۶۶، ۷۳، ۷۴، ۷۶، ۷۷، ۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۷، ۸۸ (حاشیہ) ۱۰۵، ۱۲۱، ۱۳۹، ۱۵۹، ۱۶۵، ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۷، ۱۹۰، ۱۹۲، ۱۹۵، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۱۴ (حاشیہ) ۲۱۶، ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۲۶، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۸، ۲۸۵، ۲۸۸، ۲۹۲
۴۶۔ لکھنؤ: ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳
۴۷۔ لندن: ۲۰، ۴۰، ۱۳۰

(م)، (ن)، (و)، (ہ)، (ی)

۴۸۔ مدائن: ۱۷۳
۴۹۔ مدینہ: ۳۴، ۴۵، ۵۰، ۵۱، ۹۰، ۹۸، ۱۰۵ (حاشیہ) ۱۰۸ (حاشیہ) ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۵۹ تا ۱۶۲، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۱ (حاشیہ) ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۷۰، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۹۵
۵۰۔ مراد آباد: ۱۱
۵۱۔ مزدلفہ: ۱۹۳
۵۲۔ مصر: ۷، ۶۲
۵۳۔ مکہ: ۱۶، ۳۴، ۵۰، ۷۱، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۹ (حاشیہ) ۱۰۰، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۲۰، ۱۵۹ تا ۱۶۳، ۱۶۵ تا ۱۶۹، ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۸، ۲۰۹، ۲۸۳، ۲۸۴
۵۴۔ منیٰ: ۱۸۳، ۱۸۷، ۱۹۳
۵۵۔ موصل: ۲۰۹
۵۶۔ نخلہ: ۹۳، ۹۷، ۱۱۹
۵۷۔ نخلہ شامیہ: ۹۶
۵۸۔ نخلہ محمود: ۹۶ (حاشیہ)
۵۹۔ نینوی: ۱۰۹
۶۰۔ وادی فاطر: ۹
۶۱۔ نئی دہلی: ۹
۶۲۔ ہندوستان: ۱، ۳۱، ۴۰
۶۳۔ یمن: ۱۹۰ (حاشیہ) ۱۹۱
۶۴۔ یوپی: ۱۱۰

۴-اقوام۔ طبقات۔ قبائل مسالک۔ فرق

(ا)

۱۔ ازواج مطہرات: ۹۶

۲۔ اعرابی: ۲۰۳، ۲۷۷

۳۔ آل سعود: ۱۶

۴۔ امام۔ (ائمہ) ۹۳، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۹ (حاشیہ) ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۲۱۵، ۲۷۱، ۲۷۲

۵۔ امت، امت محمدیہ، امت مسلمہ: ۲۹، ۳۱، ۶۳، ۷۶، ۷۷، ۸۹، ۹۰، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۹۳

۶۔ اموی: ۸۶، ۱۵۸، ۱۷۰، ۲۳۹

۷۔ انبیاء علیہم السلام: ۲۱۵، ۲۶۳

پیغمبر: ۲۲۱

نبی: ۲۴۳ (۲۶۳)

۸۔ انصار: ۷۲، ۱۷۱

۹۔ انگریز: ۵

۱۰۔ اولوالامر: ۱۰۴

۱۱۔ اہل انجیل: ۲۲۱

۱۲۔ اہل بصرہ، بصری، بصرے والے: ۴۳، ۵۸، ۱۰۲، ۱۷۴

۱۳۔ اہل بیت: ۱۶۲، ۱۹۵، ۲۱۱، ۲۳۳، ۲۴۳، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۸، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۸۷

۱۴۔ اہل تاریخ، مورخین: ۹۰، ۱۹۲، ۲۵۱

۱۵۔ اہل حجاز: ۱۵۳

۱۶۔ اہل حل وعقد: ۱۳۰

۱۷۔ اہل سنت: ۱۵، ۳۲، ۳۳، ۲۴۷، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۸۹

۱۸۔ اہل شام، شامی، شام والے: ۵۰، ۵۹، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۵۳، ۱۸۶، ۲۶۲

۱۹۔ اہل شوریٰ: (شوریٰ) ۷۵، ۷۶، ۱۱۲

۲۰۔ اہل عراق: عراقی، عراق والے: ۲۶، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۸۷

۲۱۔ اہل عرب: ۲۵۶

۲۲۔ اہل علم: ۳۱، ۳۶، ۵۶، ۲۷۱، ۲۷۲

۲۳۔ اہل علم ودین: ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۷۱

۲۴۔ اہل قبلہ: ۳۹

۲۵۔ اہل کوفہ، کوفی، کوفہ والے: ۴۳، ۶۱، ۶۵، ۶۷، ۷۵، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۹۰، ۱۹۵، ۱۹۸، ۲۱۱، ۲۴۳، ۲۶۶، ۲۸۲، ۲۸۴، ۲۸۵

۲۶۔ اہل مدینہ، مدنی، مدینہ والے: ۳۹، ۹۰، ۹۱، ۱۰۲، ۱۱۳، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۳۸، ۱۴۲، ۱۶۰، ۱۶۵، ۲۶۳، ۲۷۰، ۲۷۱

۲۷۔ اہل مصر، مصری: ۴۳

۲۸۔ اہل مکہ، مکی، مکہ والے: ۱۱۳، ۱۶۹

(ب)

۲۹۔ بدری صحابہؓ: ۳۸

۳۰۔ بنو امیہ، بنی امیہ: ۴، ۱۳۱، ۱۳۴، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۹۷، ۲۴۳، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۷۰

۳۱۔ بنو طے: ۲۵۶ (حاشیہ)

۳۲۔ بنو ثقیف، برادران مسلم ۱۹۹، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۸۵

۳۳۔ بنو ہاشم، بنی ہاشم، ہاشمی: ۴، ۱۱۳، ۲۱۹، ۲۴۳، ۲۶۲

۳۴۔ بنی عبدالمطلب: ۱۶۵

۳۵۔ بنی عبد مناف: ۱۵۷

۳۶۔ بنی کلب: ۱۲۷

(ت)، (ث)

۳۷۔ تابعین: ۱۰۵، ۱۰۶، ۲۶۹

۳۸۔ ترک: ۲۰۷

۳۹۔ ثقفی: ۲۶۴

(ح)، (خ)

۴۰۔ حبشی: ۱۰۰

۴۱۔ حنفی: ۱۱

۴۲۔ خاندان سادات: ۲۹۲

۴۳۔ خاندان، خانوادۂ نبوت: ۲۳۸، ۲۵۷، ۲۶۲

۴۴۔ خلفائے اربعہ: ۱۳۰

۴۵۔ خلفائے راشدین: ۵۸، ۱۳۷، ۲۶۳

۴۶۔ خارجی، خوارج: ۴۷، ۵۲، ۱۷۳، ۲۷۲

(د)، (ر)، (س)، (ش)

۴۷۔ دیلم: ۲۰۷

۴۸۔ رافضی، رافضیت: ۱۳، ۸۰

۴۹۔ رہبان واحبار: ۳۵

۵۰۔ سابقین اولین: ۷۴، ۷۷، ۱۴۲

۵۱۔ سبائی: ۲۳۱، ۲۳۲

۵۲۔ سبط رسولؐ: ۲۲۵، ۲۷۲

۵۳۔ سرداران قبائل: ۱۷۹

۵۴۔ سنی: ۱۳، ۳۰، ۲۴۸، ۲۵۵، ۲۹۵

۵۵۔ شیخینؓ: ۱۲۹، ۱۳۰

۵۶۔ شہدائے کربلا: ۲۵۷

۵۷۔ شیعان علیؓ۔ شیعان عراق: ۳۴، ۸۸، ۱۲۹، ۱۷۶

۵۸۔ شیعہ، اہل تشیع: ۱۱، ۳۲، ۳۳، ۵۳، ۵۶، ۵۷، ۷۷، ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۲۹، ۲۳۶، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۶۰

۵۹۔ شیعی (جذبہ، نقطۂ نظر وغیرہ) ۲۴، ۱۳۹، ۲۲۷

۶۰۔ شیعیت: ۴، ۵، ۶، ۲۴، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۸۱، ۲۲۷، ۲۳۲ (حاشیہ) ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۶

(ص)

۶۱۔ صحابہ، صحابی، اصحاب کرام: ۵، ۳۱، ۳۳، ۳۹، ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۷۷، ۷۸، ۹۱، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۴، ۱۶۷، ۱۷۱، ۱۸۷، ۲۶۳، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۸، ۲۸۲، ۲۸۹

(ع)

۶۲۔ عباسی (خاندان) ۱۳۱

۶۳۔ عثمانی، عثمانی الاصل: ۲۲۶، ۲۲۷

۶۴۔ عشرۂ مبشرہ: ۱۲۹، ۲۹۶

۶۵۔ عمائدین قریش: ۱۵۷

(ف)، (ق)

۶۶۔ فاسق: ۱۱۷

۶۷۔ فاسق و فاجر: ۳۳، ۳۴، ۱۷۳، ۲۸۹، ۲۹۵

۶۸۔ فقہاء: ۳۰، ۱۸۶

۶۹۔ قاتلانِ حسینؓ: ۷، ۱۴۷، ۲۴۳، ۲۶۳

۷۰۔ قاتلانِ عثمانؓ: ۵۰، ۲۷۳

۷۱۔ قافلہ، قافلۂ حسینؓ: ۱۲۲، ۱۶۷، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۹، ۱۹۳، ۲۹۶، ۲۹۹، ۲۰۱، (حاشیہ) ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۳۹، ۲۳۰

۷۲۔ قافلۂ حسین کی باقیات: ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۷، ۲۶۲

۷۳۔ قبائل، قبائلی، قبیلہ: ۹۱، ۱۷۳

۷۴۔ قبیلہ ثقیف: ۸۷

۷۵۔ قبیلہ خزرج: ۲۵۹

۷۶۔ قراء: ۲۲۵

۷۷۔ قریش، قریشِ مکہ، قریشی: ۷۱، ۷۸، ۱۳۰، ۱۳۳، ۱۵۲، ۱۵۶، ۱۵۹، ۲۶۶

(م)

۷۸۔ متاخرین: ۱۳۲

۷۹۔ مجوسی: ۲۱۱

۸۰۔ محدثین: ۲۴

۸۱۔ مرتد: ۳۸، ۷۷

۸۲۔ مصری: ۴۳

۸۳۔ معصومین: ۳۱

۸۴۔ ملت، ملتِ اسلام: ۷۰، ۱۳۰، ۱۳۲، ۲۲۵، ۲۷۹

۸۵۔ منافق: ۷۷، ۲۶۳

۸۶۔ مورخین: دیکھئے اہلِ تاریخ

۸۷۔ مومن: ۳۵

۸۸۔ مہاجرین: ۷۲

(ن)، (و)، (ی)

۸۹۔ نصاریٰ، نصرانی: ۶، ۲۱۱، ۲۳۵

۹۰۔ ورثاء عثمانؓ: ۲۷۳

۹۱۔ وفد، وفود: ۵۱، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۶۹

۹۲۔ یمنی: ۱۹۲

۹۳۔ یہود، یہودی: ۱۶، ۳۶، ۲۱۱

۴۔ اہم متفرقات

بیعت، جنگیں، خروج، شرائط مصالحت، شہادت و قتل، صلح و فتح، ولیعہدی

الف — بیعت

۱۔ بیعت الرضوان: ۷۰، ۷۹

۲۔ بیعت عثمانی: ۱۲۹

۳۔ بیعت برائے حضرت حسینؓ: ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸

۴۔ بیعت برائے یزید: ۶۹، ۸۸، ۹۸، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۳۶

ب — جنگیں

۱۔ غزوۂ احد: ۴، ۵

۲۔ غزوۂ بدر: ۴، ۵، ۲۶۲

۳۔ غزوۂ تبوک: ۷۲، ۷۶، ۷۹

۴۔ جنگ جمل: ۲ (حاشیہ) ۳۴، ۳۶، ۳۸، ۶۳، ۱۶۳، ۲۷۲

۵۔ جنگ صفین: ۲ (حاشیہ) ۳۴، ۳۶، ۳۸، ۶۳، ۱۶۳، ۱۸۱، ۲۲۸، ۲۷۲

۶۔ جنگ یمامہ: ۷۳

ج — خروج

۱۔ مختلف حضرات کے خروج: ۶۷، ۶۸، ۸۵، ۱۸۷، ۱۹۳، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲

د — شرائط مصالحت

۱۔ شرائط حضرت حسن بن علیؓ: ۵۳، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۰

۲۔ حضرت حسینؓ کا سہ رخی فارمولا: ۱۷، ۲۰، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۲۰۳، ۲۲۵، ۲۳۹، ۲۶۴، ۲۷۹

ہ — شہادتیں اور قتل

۱۔ حضرت حسینؓ: ۱۴، ۳۱، ۱۳۸، ۱۴۵، ۱۵۹، ۱۶۴، ۲۰۷، ۲۴۲، ۲۴۶، ۲۷۰، ۲۷۵، ۲۸۸، ۲۹۳

۲۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ: ۲۹۵

۳۔ حضرت عبداللہ بن مطیعؓ: ۱۶۷

۴۔ حضرت عثمان بن عفانؓ: ۵، ۷، ۳۳، ۳۴، ۴۵، ۶۲، ۷۹، ۲۷۲، ۲۸۱

۵۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب: ۴۷، ۵۲، ۸۰، ۱۷۴

و — صلح و فتح

۱۔ صلح حدیبیہ: ۷۰، ۷۱، ۷۶

۲۔ صلح حضرت حسنؓ و معاویہؓ: ۴۳، ۴۷، ۵۳، ۵۹، ۸۷، ۲۶۷، ۲۷۲، ۲۷۴

۳۔ فتح مکہ: ۴

ز — ولیعہدی

۱۔ ولی عہدی علی بن موسیٰ بن جعفر الصادقؒ: ۱۳۳

۲۔ جعفر یزید بن معاویہؓ: ۳۱، ۳۴، ۳۷ (حاشیہ) ۶۴، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۸، ۸۱ تا ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۹۰ تا ۹۳، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۵ (حاشیہ) ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۵، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۲۶ تا ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۴۵، ۱۵۱، ۲۸۳، ۲۸۴

ح — واقعات

۱۔ واقعہ تحکیم: ۳۲، ۳۷، ۱۲۳، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۸۱

۲۔ واقعہ حرہ: ۱۶۷، ۲۹۵

۳۔ واقعہ کربلا: ۳، ۴، ۵، ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۹، ۶۱، ۱۰۵ (حاشیہ) ۱۶۷، ۱۷۳، ۱۹۳، ۲۰۱ تا ۲۰۵، ۲۰۸ تا ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۲۳، ۲۲۶ تا ۲۲۸، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۴۱ تا ۲۴۳، ۲۴۹، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۷، ۲۵۹، ۲۶۱، ۲۶۵، ۲۶۸، ۲۷۵، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۸، ۲۹۵

☆☆☆

کتابیات

وہ کتابیں جن کا کوئی حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے

۱ - **القرآن المجید**

(الف)

۲-الاصابہ فی تمییز الصحابہ (عربی) از ابن حجر عسقلانی
۳-اسپرٹ آف اسلام (انگریزی) از جسٹس امیر علی

(ب)

۴- البدایہ والنہایہ (عربی) از حافظ ابن کثیر دمشقی

(ت)

۵۔ تاریخ ابن خلدون (عربی) از عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون
۶۔ تاریخ طبری (عربی) از ابو جعفر بن جریر طبری
۷۔ تاریخ کامل (عربی) از ابن اثیر
۸۔ تقریب التہذیب (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

(ج)

۹۔ جامع ترمذی (عربی) از امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی

(ح)

۱۰۔ حیاۃ الامام الحسینؓ از باقر شریف قرشی
۱۱۔ حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق (اردو) از مولانا محمد تقی عثمانی

(خ)

۱۲۔ خلاصۃ الکلام (عربی) شیخ زینی دحلان
۱۳۔ خلافت وملوکیت (اردو) سید ابوالاعلیٰ مودودی
۱۴۔ خلافت معاویہ ویزید (اردو) محمود احمد عباسی

(د)

۱۵۔ الدرر السنیہ (عربی) از شیخ زینی دحلان

(ر)

۱۶۔ روح اسلام (اردو) از محمد ہادی حسن
۱۷۔ رجوم المدنیین از مولانا سید حسین احمد مدنی

(س)

۱۸۔ سنن ابوداؤد (عربی) از امام ابوداؤد سجستانی
۱۹۔ سیر اعلام النبلاء (عربی) از حافظ ذہبی

(ش)

۲۰۔ شرح نہج البلاغۃ (عربی) از ابن حدید
۲۱۔ شہید انسانیت (اردو) سید علی نقی صاحب مجتہد
۲۲۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ (اردو) ــــــ از مولانا محمد منظور نعمانیؒ

(ص)

۲۳۔ صحیح بخاری (عربی) از امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ
۲۴۔ صحیح مسلم (عربی) از امام مسلم قشیریؒ

(ع)

۲۵۔ العواصم والقواصم (عربی) از ابوبکر بن العربی

(ف)

۲۶۔ الفاروق (اردو) از مولانا شبلی نعمانی
۲۷۔ فتح الباری (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانیؒ

(ل)

۲۸۔ لسان المیزان (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی

(م)

۲۹۔ مروج الذہب (عربی) از المسعودی
۳۰۔ مشکوٰۃ المصابیح (عربی) از خطیب تبریزی
۳۱۔ مصنف عبدالرزاق (عربی) از ابوبکر بن عبدالرزاق
۳۲۔ المعارف (عربی) از ابن قتیبہ
۳۳۔ معجم البلدان (عربی) از احمد بن یعقوب
۳۴۔ مقتل الحسینؓ (عربی) از عبدالرزاق موسوی المقرم
۳۵۔ مقدمہ ابن خلدون (عربی) از ابن خلدون
۳۶۔ منہاج السنۃ (عربی) از امام ابن تیمیہؒ
۳۷۔ موطا (عربی) از امام مالکؒ
۳۸۔ میزان الاعتدال (عربی) از حافظ ذہبی
۳۹۔ نہج البلاغۃ (عربی) از شریف الرضی

☆☆☆

تصحیح

حصہ دوم میں کاپی جوڑتے وقت، غلطی سے بعض صفحات کی ترتیب غلط ہوگئی۔ اس کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے براہ کرم تصحیح فرمالیں اور موجودہ صفحہ نمبروں کی جگہ اصل صفحہ نمبر درج فرمالیں۔

موجودہ صفحہ نمبر	اصل صفحہ نمبر
۳۴۲	۳۴۳
۳۴۳	۳۴۲
۳۴۶	۳۶۰
۳۶۰	۳۴۶

کتابیات

وہ کتابیں جن کا کوئی حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے

۱- القرآن المجید

(الف)

۲-الاصابہ فی تمیز الصحابہ (عربی) از ابن حجر عسقلانی

۱۵- الدرر السنیہ (عربی) از شیخ زینی دحلان

(ر)

۱۶- روح اسلام (اردو) از محمد ہادی حسن

۱۷- رجوم المدنیین از مولانا سید حسین احمد مدنی

(س)

۱۸- سنن ابوداؤد (عربی) از امام ابوداؤد بجستانی

۱۹- سیر اعلام النبلاء (عربی) از حافظ ذہبی

(ش)

۲۰- شرح نہج البلاغۃ (عربی) از ابن حدید

۳۴- مقتل الحسینؓ (عربی) از عبدالرزاق موسوی المقرم

۳۵- مقدمہ ابن خلدون (عربی) از ابن خلدون

۳۶- منہاج السنۃ (عربی) از امام ابن تیمیہؒ

۳۷- موطا (عربی) از امام مالکؒ

۳۸- میزان الاعتدال (عربی) از حافظ ذہبی

۳۹- نہج البلاغۃ (عربی) از شریف الرضی

☆☆☆

حصّہ دوم

اس کتاب کے منظرِ عام پر آجانے سے جہاں ایک بہت بڑی علمی اور تحقیقی ضرورت پوری ہوئی وہیں بہت سے علمی مباحثوں اور قلمی معرکوں کا دروازہ بھی کھلا۔ کتاب کی مخالفت اور موافقت میں مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف سطحوں پر مختلف نوع کے ردِ عمل کا اظہار بھی ہوا۔۔۔ لیکن.... اس ردِ عمل کی انتہائی ناخوشگوار، منفی، اور افسوسناک شکل یہ تھی کہ برِ صغیر ہند و پاک کے قدیم و عظیم علمی مرکز۔۔۔ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں "سرکاری سطح پر" کتاب اور صاحبِ کتاب کو مہم جوئی کے سے انداز میں آڑے ہاتھوں لیا گیا۔

ماہنامہ "الفرقان" (لکھنؤ) نے ندوۃ العلماء کے ترجمان جریدے "تعمیرِ حیات" (لکھنؤ) کے جواب میں مؤلف مدظلہ کی توضیحات و تصریحات اور دیگر ممتاز اہلِ علم کی تائیدات۔۔۔ کئی اشاعتوں میں شائع کیں۔ یہ سارا مواد۔۔ کتاب کے موضوع و متن سے بہت متعلق اور اپنی جگہ پر بہت اہم، مفید اور نافع تھا۔ لہٰذا کتاب کے تازہ ایڈیشن میں "حصہ دوم" کے عنوان سے اس قیمتی مواد کو کتاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

(ناشر)

مولانا عبد العلی فاروقی

حضرت معاویہؓ اور یزید کی ولی عہدی

(خانوادۂ امام اہلسنت حضرت مولانا محمد عبد الشکور فاروقیؒ کے چشم و چراغ دار العلوم فاروقیہ کاکوری کے ناظم اور ماہنامہ البدر کے مدیر مولانا عبد العلی فاروقی کی تازہ تصنیف "تاریخ کی مظلوم شخصیتیں" ادارہ الفرقان میں تبصرہ کے لئے آئی ہے ــــ فی الحال اس کا ایک باب ہم ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ کسی قریبی فرصت میں کتاب پر تبصرہ کا فرض بھی ادا کیا جائے گا۔ اس کتاب میں جن دس "مظلوم شخصیتوں" کا تذکرہ ہے ان میں ایک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ ان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں فاضل مصنف کے خیال میں ان میں بنیادی حیثیت ... دو اعتراضوں کی ہے۔" اول یہ کہ انھوں نے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کی منعقدہ خلافت کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کرکے ان کے خلاف جنگ کے میدان میں آگئے۔ اور صلح صفائی ہو جانے کے باوجود حضرت علیؓ کے خاندان اور ان کے ہمدردوں کی عداوت ان کے دل سے ختم نہ ہو سکی جس کا موقع بموقع اظہار ہوتا رہا ــــ دوم یہ کہ انھوں نے [illegible] کی سنت" اور خلفائے راشدینؓ کے خلاف اپنے بعد اپنی جانشینی کے لئے اپنے بیٹے کو نامزد کر کے نہ صرف ملوکیت کی بنیاد رکھی بلکہ ایک ایسا فتنہ پیدا کر دیا جس نے اسلام کے حسین پیکر کو مسخ کر دیا۔"

ہم نے اپنے محترم ناظرین کے مطالعہ کیلئے اس باب کے صرف اُس حصہ کا انتخاب کیا ہے جس میں دوسرے اعتراض کا جائزہ لیا گیا ہے ــــ البتہ حضرت معاویہؓ

...ے متعلق باب کے شروع کی تمہیدی سطروں کو بھی نقل کرنا ہم نے موضوع کے لحاظ سے مناسب سمجھا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ایک جلیل القدر صحابیِ رسول اور امت کے ایک عظیم محسن کے متعلق ایک شدید غلط فہمی اور سنگین بدگمانی کو دور کرنے میں یہ مضمون بہت معاون ثابت ہوگا۔

خدا کرے ایسا ہی ہو ——— مدیر]

حضرت معاویہؓ کاتبِ وحی تھے، حضرت معاویہؓ اسلامی تاریخ کے پہلے امیر البحر تھے، جن کی قیادت میں سب سے پہلی بحری جنگ لڑی گئی، اور حضرت معاویہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی سالے یعنی ام المومنین حضرت اُمِ حبیبہؓ کے بھائی تھے، ان تمام خوبیوں کے باوصف ان کی شخصیت کو مجروح کرنے اور ان کے "ناکردہ گناہوں" کی فہرست تیار کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم المرتبت اور "ہدایت یافتہ" صحابیؓ کی طرف سے مسلمانوں کو بدظن کرنے کی جس طرح منظم انداز میں سازش کی گئی ہے، تاریخ شاید اس سے گھناونی اور بدنما مثال نہیں پیش کرسکتی۔

اگر حضرت معاویہؓ پر جادۂ حق سے انحراف کرنے، خانوادۂ رسالت کی بے حرمتی کرنے، خلافتِ اسلامیہ کی جگہ ملوکیت و بادشاہی نظام قائم کرنے اور موروثی حکومت کی داغ بیل ڈالنے جیسے الزامات ان دشمنانِ صحابہؓ ہی کی طرف سے عائد کئے جاتے، جو سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا حضرت عمر فاروقؓ جیسے اکابر صحابہؓ پر بھی ملامت کے تیر برساتے نہیں ڈرتے تو چنداں حیرت و افسوس کی بات نہ ہوتی لیکن حیرت تو ان "دوستوں" پر ہوتی ہے جو ایک طرف "صحابیت" کے بلند مقام کا اعتراف کرتے ہوئے اہلِ سنت و جماعت کے متفق علیہ عقیدے الصحابۃ کلہم عدول[1] (تمام

[1] چودھویں صدی کے ایک نامور اور خوش فکر محقق نے "عدالتِ صحابہؓ" کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے یا ان کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں عادل تھے، یعنی روایت کے سلسلہ میں انھوں نے عدالت و راستبازی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا، رہ گیا ان کی عملی زندگی کا معاملہ تو اس میں ان سے لغزشوں اور گناہوں کا صدور بھی ہوا ہے اور پھر اس سلسلہ میں حضرت ماعزؓ اور غامدیہؓ وغیرہ کے (باقی صـ پر)

اصحابِ رسول عادل ہیں) کا دم بھرتے ہیں، اور دوسری طرف "مشاجرات صحابہؓ" کی نازک بحث چھیڑ کر حضرت معاویہؓ بلکہ ان کے پورے خاندان بنو اُمیہ پر طبری، واقدی، یعقوبی اور مسعودی کی پامال اور مکذوبہ روایات کا سہارا لے کر ایسی ایسی تہمتیں باندھتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ!

یزید کی ولی عہدی

حضرت معاویہؓ کے "جرائم" کی فہرست میں ان کا یہ "جرم" بھی بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے بعد امارت کیلئے اپنے بیٹے یزید کو نامزد کرکے "جبرًا" اس کی بیعت کرادی، اور اس طرح انھوں نے خلفائے راشدینؓ کی سنت کیخلاف شخصی و موروثی حکومت کی

(باقی صـ کا) واقعات پیش کرکے محقق موصوف نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ عدالت کا ان کا بیان کردہ مفہوم مراد لینے کے بعد صحابہؓ تنقید سے بالاتر نہیں رہے، اور ان کے "مشاجرات" کے درمیان "حَکَم" بن کر فیصلہ دینا کوئی معیوب بات نہیں قرار پاتی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ صرف روایت ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی عادل تھے، اور حق تعالیٰ نے ان کو گناہوں سے "محفوظ" کردیا تھا، اور اگر کسی صحابی سے اتفاقاً کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو ان کو بلاتاخیر توبہ کی توفیق ملی، جیسا کہ محقق موصوف کے بیان فرمودہ ماعزؓ و غامدیہؓ کے واقعات سے ظاہر ہے اور اس طرح وہ التائب من الذنب کمن لاذنب لہ کے زمرہ میں داخل ہوگئے، کسی صحابی کیلئے گناہوں پر اصرار کرنا اور ظلم و طغیان کو اپنی مستقل پالیسی بنا لینا تو ثابت ہی نہیں کیا جاسکتا، اور اگر یہ ثابت ہوجائے تو ایسے کسی فرد کو ہرگز ہرگز عادل نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ گناہوں کو مستقل پالیسی بنا لینے والا شخص تو کھلا ہوا فاسق ہی کہا جائیگا، جہاں تک نقل و روایت کی حد تک عدالت کا معاملہ ہے تو ہمارے آج کے دور میں بھی ایسے لوگ مل جائیں گے جو باوجود دوسرے گناہوں کے مرتکب ہونے کے راستباز ہوتے ہیں، اور نقل و روایت کے معاملہ میں کسی قسم کی خرد برد نہیں کرتے پھر کیا انکے دیگر گناہوں سے صرف نظر کرکے ان کو عادل قرار دیا جائیگا؟ اور ایسی صورت میں اہلسنت کے عقیدے الصحابۃ کلہم عدول کی کیا اہمیت باقی رہ جائے گی اور اس سے صحابہؓ کی کون سی فضیلت ثابت ہوجائے گی اور اس کا فائدہ کیا ہوگا؟

بنیاد رکھ دی، جبکہ حکومت کا یہ تصور اسلامی تعلیمات اور اسلام کے اعلیٰ نصب العین کے قطعاً مخالف تھا، پھر یزید کی شراب نوشی زناکاری اور دیگر فسق و فجور کے افسانے جوڑ کر جرم کی سنگینی میں اس طرح اضافہ کیا جاتا ہے کہ کسی امیر کا اپنے لائق و صالح فرزند کو اپنے بعد امارت کیلئے نامزد کرنا ہی اس کو متہم کرنے کیلئے کافی ہے چہ جائیکہ حضرت معاویہؓ کا اپنے "رسوائے زمانہ فرزند" یزید کو اصحابِ رسولؐ اور بہت سے تابعین عظام جیسے اخیار امت کی موجودگی میں اپنا ولی عہد مقرر کرکے اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کرنا ایک ایسا مکروہ و شنیع فعل ہے جس کی نظیر اسلام کی پچھلی تاریخ سے نہیں پیش کی جا سکتی، چنانچہ اس "ہوا و ہوس" پر مبنی فیصلے نے اسلامی تاریخ پر بدترین اثرات ڈالے۔ اور پھر جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری سے حضرت معاویہؓ بری نہیں ہو سکتے۔

اس الزام یا "جرم" کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ہم درج ذیل سوالات قائم کر رہے ہیں، جن کے جوابات سے صورت حال کی واقعی اور حقیقی تصویر سامنے آئے گی۔

۱۔ کیا حضرت معاویہؓ نے قانون و اخلاق کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر محض اس لئے کہ یزید ان کا بیٹا تھا اس کو اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کرکے جبراً بیعت کرا دی تھی؟

۲۔ ایک امیر کے بعد دوسرے امیر کے تقرر کا "اسلامی طریقہ" کیا ہے اور اس سلسلہ میں خلفائے راشدین کی وہ سنت کیا ہے جس کی خلاف ورزی کرکے حضرت معاویہؓ "مجرم" بنے؟

۳۔ کیا باپ کے بعد بیٹے کا امیر بننا، یا باپ کا اپنے بیٹے کی امارت پر رضامند ہونا، یا خود اسے اپنے بعد امارت کے لئے مقرر کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے جرم ہے؟

۴۔ کیا امیر کے لئے اپنے تمام اصحاب زمانہ سے افضل و برتر ہونا ضروری ہے؟

۵۔ کیا یزید کو اس کے ہمعصر لوگ بھی شراب نوش، زناکار اور فاسق و فاجر ہی کی حیثیت سے جانتے تھے اور حضرت معاویہؓ بھی اس کے ان معائب پر مطلع تھے؟

۶۔ یزید کے ہاتھ پر ولی عہدی اور پھر امارت کی بیعت کرنے والے کون لوگ تھے اور ان کی بیعت سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے؟

ہم چاہتے ہیں کہ ان سوالات کے جوابات تاریخی افسانوں اور سبائی روایات کے بجائے ان صحیح اور معتبر ذرائع سے دیں جن کے انکار کی کوئی جرأت نہ کر سکے، ساتھ ہی بقدر ضرورت ان "سبائی کارروائیوں" کی نشان دہی بھی کر دیں جن کے ذریعہ منظم طور پر ایک صحابی رسول کی سیرت و کردار کو داغدار کرکے اسے ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

پہلے سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ یہ ایک بہتان ہے جو خوف خدا سے بے نیاز ہو کر ایک ایسی شخصیت پر باندھا گیا ہے جس کی عدالت و ثقاہت کو چیلنج کرنا امت کے اجماعی عقیدے پر ضرب لگانے کے مرادف ہے، کیونکہ یزید کی ولی عہدی کی تحریک نہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہوئی نہ خود یزید کی طرف سے، بلکہ اس کی تحریک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی جو ایک جلیل القدر صحابی رسول تھے، پھر یہ تحریک بھی اس لئے نہیں ہوئی کہ یزید کو حضرت معاویہؓ کی فرزندی کا شرف حاصل تھا بلکہ امت کو فتنہ و فساد سے بچانے اور اتحاد برقرار رکھنے کیلئے ہوئی، چنانچہ "الکامل" کی وہ سبائی روایت جس کا سہارا لے کر حضرت معاویہؓ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے، اس میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے یزید کی ولی عہدی کی تحریک کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ سے کہا کہ "امیر المومنین" آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمانؓ کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے، اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کرکے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف برپا نہ ہو"[1] ظاہر ہے کہ یزید کا صرف فرزند معاویہؓ ہونا اختلافات اور خون خرابے سے بچنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے حضرت مغیرہؓ کا یزید کی ولی عہدی کی تحریک کرتے ہوئے یہ دلیل دینا کہ یزید کے ولی عہد مقرر ہو جانے سے اختلاف برپا نہ ہوگا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے خیال میں یزید کے اندر اس بات کی صلاحیت موجود تھی کہ وہ امت کو اختلافات اور خون خرابے سے بچا سکے، اور یہ چیز جہاں ایک طرف یزید کے کردار پر ایک صحابی رسول کی شہادت ہے وہیں حضرت مغیرہؓ کے اس جذبۂ خیر کو بھی ظاہر کرنے والی ہے کہ

[1] الکامل ج ۳ ص ۲۴۹

انکے اس مشورہ کی غرض نہ حضرت معاویہؓ کی خوشنودی تھی نہ یزید کی بلکہ انکے پیش نظر امت کا اتحاد تھا جس کو بنائے رکھنے کیلئے انھوں نے یہ مخلصانہ تجویز حضرت معاویہؓ کے سامنے رکھی تھی۔

اس وضاحت کے بعد اس الزام کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو جبراً ولی عہد مقرر کرکے اس کی بیعت کرا دی۔

دوسرے سوال کے جواب میں علامہ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں :-

"خلافت کا انعقاد کئی صورتوں سے صحیح ہو سکتا ہے، اس میں سب سے اول افضل اور صحیح ترین صورت یہ ہے کہ مرنے والا خلیفہ اپنی پسند سے کسی کو ولی عہد نامزد کر دے، چاہے یہ نامزدگی حالت صحت میں ہو، بیماری کی حالت میں ہو یا عین مرنے کے وقت ہو، اسکے عدم جواز پر نہ کوئی نص ہے نہ اجماع، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کو، اور ابوبکرؓ نے عمرؓ کو اور جس طرح سلیمان بن عبدالملک نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو نامزد کیا، یہ صورت ہمارے نزدیک مختار و پسندیدہ اور اسکے علاوہ دوسری صورتیں ناپسندیدہ ہیں، کیونکہ اس صورت میں امت کا اتحاد اور امور اسلام کا انتظام قائم رہتا ہے، نیز اختلاف اور شور و شرابے کا خوف نہیں رہتا۔ اسکے برعکس دوسری صورتوں میں یہ متوقع ہے کہ ایک خلیفہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد امت میں انارکی اور امور شریعت میں انتشار پیدا ہو جائے اور حصول خلافت کی کوشش لوگوں کے اندر طمع کے جذبات پیدا کر دے"[1]

علامہ ابن حزم کی اس تشریح سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنا ولی عہد مقرر کرکے "اسلامی قانون" کی خلاف ورزی نہیں کی۔ بلکہ انتخاب امیر کے سلسلہ میں سب سے افضل اور صحیح ترین طریقہ اپنایا کیونکہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارتاً اور خلفائے راشدین میں سے خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کی صراحتاً سنت ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی بھی یہی [illegible] ہے کیونکہ انھوں نے بھی اپنے بعد امارت و خلافت کے لئے چھ آدمیوں کو نامزد [illegible] تاکہ

---

[1] الفصل فی الملل والاھواء والنحل ج ۴ ص ۱۶۹ منقول از خلافت و ملوکیت از صلاح الدین یوسف ص ۴۷۲

پس ان ہی میں سے کوئی ایک خلیفہ ہوگا، البتہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اس طریقہ کو نہیں اپنایا، یا نہ اپنا سکے تو اس کا نتیجہ حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کی خلافت کے بارے میں اختلاف و انتشار کی صورت میں ظاہر ہو کر رہا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ تینوں میں سے کوئی صورت اسلامی قانون کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ باپ کے بعد بیٹے کی امارت قائم ہونے یا باپ کے اپنے بیٹے کو امارت کے لئے نامزد کرنے کی کہیں کوئی ممانعت نہیں ہے، اور کسی گری پڑی روایت سے بھی اس ممانعت کا ثبوت نہیں فراہم کیا جا سکتا ہے، پھر حضرت معاویہؓ اور یزید سے پہلے حضرت علیؓ اور ان کے بعد انکے بیٹے حضرت حسنؓ کی خلافت قائم ہونا اور اس پر کسی بھی حلقہ کی طرف سے یہ اعتراض نہ ہونا کہ "باپ کے بعد بیٹے کی امارت اسلامی قانون کے لحاظ سے غلط ہے" امت کے اس اجماع کو ثابت کرتا ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کا امیر ہونا کوئی جرم نہیں ہے، علاوہ ازیں جب حضرت علیؓ سے انکے آخر وقت میں یہ دریافت کیا گیا کہ کیا ہم آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ تو اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا "میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو"[1] حضرت علیؓ کے اس جواب سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ بھی باپ کے بعد بیٹے کی امارت و خلافت میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے ورنہ وہ یہ جواب دیکر یہ کہتے کہ "یہ طریقہ اسلامی قانون کے لحاظ سے غلط ہے، اس لئے تم لوگ ایسا نہ کرنا" یا کم سے کم یہ کہتے کہ "میرے لئے اپنے بیٹے کو اپنے بعد خلافت کیلئے نامزد کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے جرم ہے اس لئے میں یہ کام نہیں کر سکتا" پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت علیؓ سے یہ دریافت کرنے والے ایک صحابی رسول حضرت جندبؓ بن عبداللہ تھے، اگر باپ کا اپنے بیٹے کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کرنا اسلامی قانون کے خلاف ہوتا تو حضرت جندبؓ خود ہی اس سلسلہ میں حضرت علیؓ سے استفسار نہ کرتے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات بھی محض حضرت معاویہؓ پر اعتراض جڑنے کیلئے اٹھائی

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۳۲۳

گیا ہے ورنہ امیر المومنین او خلیفۃ المسلمین کیلئے امارت وخلافت کی اہلیت تو شرط ہے لیکن اس کا اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے افضل ہونا ضروری نہیں ہے نہ ہی عملاً اس کا اہتمام ہو سکتا ہے، کیونکہ فضیلت کا کوئی ایک مقرر پیمانہ نہیں ہے جسکی بنیاد پر کسی شخص کو من کل الوجوہ افضل قرار دیا جا سکے۔

یہ صحیح ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور پھر امارت کے وقت اکابر صحابہؓ اور بہت سے ایسے تابعینؒ موجود تھے جن کو ہر طرح یزید پر فضیلت حاصل تھی، لیکن کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود حضرت معاویہؓ اپنے دور کے تمام اصحابؓ سے افضل تھے؟ اور پھر ان سے پہلے حضرت حسنؓ کی خلافت کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعید بن زیدؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے بہت سے اکابر صحابہؓ موجود تھے جن کو علم و فضل میں حضرت حسنؓ پر برتری حاصل تھی، اسکے باوجود حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ ہی خلیفہ مقرر ہوئے، ایسی صورت میں یزید کی ولی عہدی یا خلافت پر افضل و مفضول کی بحث چھیڑنا "بغض معاویہؓ" کے ایک حسین عنوان سے زیادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

پانچویں سوال کے جواب کے سلسلہ میں سب سے قوی شہادت تو حضرت محمد بن علیؓ (محمد بن الحنفیہ) کی ہے جس کو حافظ ابن کثیرؒ نے یوں نقل کیا ہے۔

"حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے داعی حضرت عبداللہ بن المطیعؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت محمد بن علیؓ بن ابی طالب کے پاس گئے اور درخواست کی کہ آپ (یزید کی) بیعت توڑ دیں، لیکن انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ ابن المطیع نے کہا کہ یزید شراب پیتا ہے، نماز نہیں پڑھتا ہے اور کتاب اللہ کے احکام کی اسے پرواہ نہیں ہے۔ محمد نے فرمایا کہ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی میں یزید سے ملا ہوں، انکے ساتھ رہا ہوں میں نے ان کو نماز کا پابند، خیر کا متلاشی، فقہ کا سائل اور سنت کا متبع پایا"۔ ......الخ۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۳۳، یہ روایت کافی طویل ہے جس میں آگے ذکر ہے کہ ابن المطیع نے ہر چند کوشش کی کہ محمد بن الحنفیہ کسی طرح یزید کی بیعت توڑ کر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حمایت پر آمادہ ہو جائیں حتیٰ کہ یہ پیشکش بھی کی کہ اگر آپ خود یزید کے بجائے خلافت کی بیعت لینا چاہیں تو ہم آپ کی خلافت تسلیم (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت علیؓ کے فرزند حضرت محمد نے یزید سے اپنی ذاتی واقفیت کی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن المطیع کے اس بیان کی تردید کی کہ یزید شراب پیتا ہے، نماز نہیں پڑھتا ہے اور کتاب اللہ کے احکام کی پرواہ نہیں کرتا، پھر ان کی اس تاویل پر کہ یزید نے نماز کی پابندی وغیرہ جیسے نیک عمل آپ کو دکھانے کیلئے کئے ہونگے، "جواباً عبداللہ بن المطیع سے جب یہ استفسار کیا کہ کیا تم نے خود یزید کو شراب پیتے دیکھا ہے؟ اسکے جواب میں انھوں نے کہا کہ "اگرچہ میں نے خود نہیں دیکھا مگر میرے نزدیک یہ بات سچی ہے" اس تفصیل سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ یزید کے ہمعصروں میں بھی اسکے فسق و فجور کا چرچا تھا، جس کی بنیاد پر حضرت ابن المطیعؓ جیسے بزرگوں کو یزید کے فسق کا یقین ہو گیا تھا، لیکن حضرت محمد بن الحنفیہ جیسے بزرگوں کا اپنے ذاتی علم و واقفیت کی بنیاد پر یزید کو اس الزام سے بری قرار دیتے ہوئے اس کی نمازوں کی پابندی، خیر کی تلاش، اور سنت کی اتباع کی گواہی دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یزید پر دشمنوں کی طرف سے اس کی شراب نوشی و دیگر منکرات میں ملوث ہونے کا پروپیگنڈہ اور بات ہے لیکن اس کے لئے کوئی معتبر عینی گواہ نہ تھا۔

اسی طرح بخاری شریف کی ایک روایت سے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واضح طور پر یہ موقف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی قیادت میں اہل مدینہ کی یزید کے خلاف چھیڑی جانے والی مہم کو بغاوت تصور کرتے تھے اور انھوں نے اپنے خاندان والوں کو سختی کے ساتھ اس سے منع کیا تھا۔ الفاظ روایت یہ ہیں:-

عن نافع قال لما خلع اهل	حضرت نافع سے روایت ہے کہ جب اہل مدینہ
المدینة یزید بن معاویة جمع	نے یزید کی بیعت توڑ دی تو حضرت عبداللہ
ابن عمر حشمه وولده فقال	بن عمرؓ نے اپنے مخصوصین و اولاد کو جمع کیا
انی سمعت النبی صلی الله علیه وسلم	اور کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ
یقول، ینصب لکل غادر لواء	فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن ہر بغاوت

(حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) کرنے کو تیار ہیں، مگر حضرت محمد بن الحنفیہ یزید کی بیعت توڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

یوم القیامۃ وانا قد بایعنا	کرنیوالے کیلئے ایک جھنڈا گاڑا جائیگا، اور
ھذا الرجل علی بیع اللہ ورسولہ	ہم نے اس شخص (یزید) سے اللہ اور اسکے رسول
وانی لا اعلم غدرا اعظم من	کے نام پر بیعت کی ہے اور میں اس سے بڑی کوئی
ان یبایع رجل علی بیع اللہ	غداری نہیں جانتا کہ کسی شخص سے اللہ اور
ورسولہ ثم ینصب لہ القتال	اسکے رسول کے نام کی بیعت کی جائے پھر اسی کے
وانی لا اعلم احدا منکم خلعہ	مقابلہ میں قتال کیلئے کھڑا ہوا جائے اور
ولا تابع فی ھذا الامر الا کانت	مجھے یہ علم نہ ہو کہ تم میں سے کسی نے یزید کی بیعت
الفیصل بینی وبینہ۔	توڑ دی اور اس معاملہ میں کوئی حصہ لیا، ورنہ
(بخاری ج ۲ ص ۱۰۵۳)	میرے اور ایسا کرنیوالے کے درمیان کوئی تعلق نہ رہے گا۔

حضرت ابن عمرؓ کا یزید کی بیعت پر قائم رہنے کیلئے یہ اصرار، اپنے متعلقین و اولاد کو اہتمام کے ساتھ جمع کرکے بیعت کے پابند رہنے اور خلاف ورزی کی صورت میں ان سے ترک تعلق کر لینے کی دھمکی دینا، اور یزید کے خلاف قتال کو غدر سے تعبیر کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یا تو ان کو "فسق یزید" کے پروپیگنڈے کا علم نہ تھا، یا وہ اس پروپیگنڈے پر اعتماد نہ کرکے اس کو امارت و خلافت کے منصب کے لئے موزوں قرار دیتے تھے، اور یزید کے ہاتھ پر کی ہوئی بیعت کو وہ اللہ اور اسکے رسول کی بیعت گردانتے تھے، اور اس سلسلہ میں اہلِ مدینہ کی مخالفانہ کارروائیوں کو خلاف حق اور غداری سمجھتے تھے۔

اسی طرح بلاذری کی انساب الاشراف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے افقہ و اعلم صحابی کی یزید کے بارے میں یہ شہادت موجود ہے۔

ان ابنہ یزید لمن صالحی	بیشک معاویہؓ کا بیٹا یزید انکے گھرانے کے نیک
أھلہ فالزموا مجالسکم	لوگوں میں سے ہے تو تم لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہو
واعطوا طاعتکم و بیعتکم۔	اور اسکی فرمانبرداری اور بیعت پر قائم رہو۔

یزید کے ہمعصروں میں سے یہ وہ چند نام ہیں جن کی عظمت و جلالت پر ہر مسلمان کو کامل اعتماد

ہے، اور جنھوں نے اپنے اقوال و اعمال کے ذریعہ یزید کی شراب نوشی اور دوسری فسق و فجور کی داستانوں کی تغلیط کی ہے۔ اب اگر انکے مقابلہ میں کچھ ہم عصر ایسے ہوں بھی جو یزید کو شراب نوش و ناکارہ اور فاسق و فاجر گردانتے ہوں تو اولاً تو ان کی بات ان اکابر صحابہؓ کے مقابلہ میں اہمیت نہیں رکھتی، پھر اگر وہ بہت ہی قابلِ لحاظ و احترام شخصیات ہوں تو بھی یہی سمجھا جائیگا کہ وہ لوگ یزید مخالف پروپیگنڈے سے اسی طرح متأثر ہو گئے جس طرح حضرت عبداللہ بن المطیع متأثر ہو گئے کیونکہ کسی بھی معتبر معاصر نے یہ گواہی نہیں دی ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے یزید کو فسق و فجور میں مبتلا دیکھا ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ یزید کے معائب اور فسق و فجور پر کیونکر مطلع ہوں گے؟

چھٹے سوال کا جواب یہ ہے کہ بیعت کرنے والوں میں اکابر صحابہ بھی تھے، اور تابعین عظام بھی، پھر اصحاب کرام میں اصحاب بدر بھی تھے، اصحاب بیعت الرضوان بھی، اور اصحاب بیعت عقبہ اولیٰ بھی، چنانچہ بیعت کرنے والے ممتاز اصحابِ رسول ؐ میں سے چند یہ تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت کعب بن عمرؓ، حضرت صہیب بن سنانؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت عمرو بن ابی سلمہؓ، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت عوف بن مالکؓ، حضرت ابوامامہ باہلیؓ، حضرت ضحاک بن قیسؓ، حضرت مالک بن حویرثؓ، حضرت عمرو بن امیہؓ، حضرت عقبہ بن نافعؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت مقدام بن معدیکربؓ، حضرت ثابت بن ضحاکؓ وغیرہم۔

یہ اور ان سے زائد دیگر اصحابِ رسول ؐ، تابعین عظام اور صلحائے امت کے یزید کی امارت کو تسلیم کرکے اس کی بیعت کر لینے سے درج ذیل نتائج بدیہی طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حضرت معاویہؓ نے یزید کی بیعت جبراً نہیں لی تھی، ورنہ اتنی بڑی تعداد میں خیر القرون کے افراد اس بیعت پر اتفاق نہ کرتے، اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت معاویہؓ اتنے بڑے زبردست تھے کہ ان کے سامنے کسی کا بس نہ چل سکا تو ان کی وفات کے بعد ان سب ہی کو

یاکم ازکم ان کی بڑی تعداد کو یزید کی بیعت توڑ دینا چاہیئے تھی۔

۲ ۔حضرت معاویہؓ کا یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا کوئی غیر شرعی یا غیر اخلاقی کام نہ تھا، بلکہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے امت کے مفاد کا یہی بہترین تقاضا تھا، اور اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو صحابۂ کرامؓ جیسی پاکباز جماعت کی ایک بڑی تعداد کو حق سے منحرف اور مداہنت کار تسلیم کرنا پڑے گا۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

۳ ۔یزید بن معاویہؓ اونچے درجہ کا متقی و پرہیزگار شخص نہ سہی لیکن سبائی پروپیگنڈے اور من گھڑت روایتوں کے ذریعہ یزید کے فسق و فجور اور حدود اللہ سے تجاوز کی جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں، اور جس طرح اسلام کی "قانونی خلافت و امارت" کے لئے اسے نااہل گردانا جاتا ہے، یزید کے ہم عصر صحابہؓ اور تابعین کی غالب اکثریت اسے غلط اور بے اصل سمجھتی تھی، ورنہ یہ ماننا ہوگا کہ یہ "اخیار امت" حمیت دینی اور شعور ملی سے محروم تھے، اس لئے انھوں نے "ایک فاسق و نااہل" فرد کے ہاتھ پر بیعت قبول کرلی تھی۔

۴ ۔حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنی "خواہش نفس" کی تکمیل کے لئے ولی عہد نہیں مقرر کیا تھا، نہ ہی ان کے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا، اور نہ ہی اس سلسلہ میں انھوں نے کسی زور زبردستی سے کام لیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی تحریک اور بصرہ، مدینہ اور کوفہ وغیرہ کے اکثر اہل الرائے اصحاب کے مشورے اور پُرجوش حمایت پر انھوں نے یزید کو ولی عہد مقرر کیا، اور چند اصحابؓ کے سوا باقی تمام لوگوں نے برضا و رغبت پہلے یزید کی ولی عہدی کی اور پھر امارت کی بیعت کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو اپنے بعد امارت کے لئے نامزد کرکے نہ کسی سلامی قانون کی خلاف ورزی کی نہ ہی خلفائے راشدین کی کسی "متفق علیہ" سنت سے بغاوت کی، نہ ہی ان کا یہ فیصلہ "ہوا و ہوس" پر مبنی تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے [illegible] ت کو متحد کرنے کا جو عظیم الشان اور بے مثال کارنامہ انجام دیا تھا اور اس کیلئے جد [illegible] یا

برداشت کی تھیں اس کا فطری تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے بعد بھی اس اتحاد کے برقرار رہنے کے خواہشمند تھے، اور جب پوری مملکت اسلامیہ کے اہل الرائے افراد کی غالب اکثریت نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ اس مقصد کے حصول کیلئے آپ کے بعد یزید کا امیر ہونا اور آپ کی طرف سے اس کا ولی عہد مقرر کردینا ہی بہتر اور مناسب طریقہ ہوگا، تو انھوں نے یزید کو ولی عہد مقرر کرکے اس کی بیعت عام لے لی۔

اب رہے وہ حوادث جو یزید کے دور امارت میں پیش آئے تو ظاہر ہے کہ نہ حضرت معاویہؓ عالم الغیب تھے جو اپنی وفات کے بعد پیش آنے والے حوادث سے مطلع ہوتے، نہ ہی وہ قضا و قدر کو ٹالنے پر قدرت رکھتے تھے، البتہ انھوں نے اپنی دور اندیشی، تدبیر اور سیاسی بصیرت کے ذریعہ یہ اندازہ ضرور کرلیا تھا کہ یزید کو اپنے دورِ امارت میں کچھ مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اور انھوں نے حضرت حسین رضؓ بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہما کے سلسلہ میں واضح طور پر یزید کو کچھ وصیتیں بھی کی تھیں اور ہم یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اگر یزید نے حضرت معاویہؓ کی ان وصیتوں پر پوری طرح عمل کیا ہوتا تو ہماری تاریخ ان صدموں سے دوچار نہ ہوتی جن کی وجہ سے یزید کا دور امارت بدنام ہوا، اور جن کے ذریعہ "سبائیوں" کو اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کا موقع مل گیا۔[1]

---

[1] ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) اگست ۱۹۹۲ء از ص ۱۶ تا ۲۸

مرحوم مولانا مطلوب الرحمٰن ندوی نگرامی

تصویر کا دوسرا رُخ

[آج سے پچاس، باون سال پہلے کی بات ہے کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے ایک سلسلۂ مضامین "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" کے عنوان سے الفرقان میں شروع فرمایا تھا۔ اس میں بنو امیہ کی حکومت کے بارے میں مولانا مرحوم کا قلم بہت تیز چلا۔ شبلی اسکول کے فاضل مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی نگرامی مرحوم نے اس پر اسی عنوان سے تعاقب فرمایا کہ مولانا نے بنو امیہؓ کی یک رُخی تصویر پیش کی ہے اور وہ بھی جذباتی مبالغے کے ساتھ۔
—— زمانے کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ آج شبلی اسکول (ندوہ) ہی سے مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب والے موقف کی حقانیت پر اصرار ہو رہا ہے۔ مناسب معلوم ہوا ہے کہ اس میں اعتدال کیلئے مولانا نگرامی مرحوم کے مضمون کا متعلقہ حصہ آج دوبارہ شائع کر دیا جائے —— مدیر]

اس میں شک نہیں کہ بنی اُمیّہ کے دور میں خلفائے راشدین کا . . . .
تقویٰ۔ زہد۔ ایثار، کسر نفس۔ خوف خدا ذمہ داریوں کا احساس موجود نہ تھا، خلافت اب خدمت خلق کا نام نہ تھا، بلکہ خلافت ملوکیت اور شہنشاہیت کا نام تھا لیکن باایں ہمہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ خلفاء بنی اُمیہ رعایا پروری، خلق کی عام راحت رسانی، تمدنی و معاشرتی اصلاحات علوم و فنون کی خدمت، دین و مذہب کی اشاعت سے غافل نہ تھے۔ اب اگر اُن کی زندگی میں نقائص کا پہلو بھی پایا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ اُن کی زندگی کے صرف نقائص ہی کو منتشر عام پر لا کر تاریخ اسلام کے ایک طویل سلسلہ کو گندہ کر دکھایا جائے۔ کاش مولانا کا قلم جہاں انکے نقائص کو جمع کرنے کیلئے گردش میں آیا انکے ان محاسن کی طرف بھی توجہ کر سکتا جسکے لئے مسلمان قیامت تک ممنون و احسانمند رہیں گے نقائص کے اظہار کیلئے بھی ایک ثقہ عالم کو یہ زیبا نہ تھا کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر گردش قلم کے پابند ہو جائیں اور قلم سے جو کچھ نکل جائے اُس پر ذمہ دارانہ نظر ثانی نہ فرمائیں کاش مولانا کسی ماہر نفسیات کے اس قول کی طرف توجہ فرما سکتے

عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

مولانا بنی امیہؓ کے مثالب میں رقمطراز ہیں:۔

"امام (ابو حنیفہ) کی ولادت باسعادت بنی امیہ کے اس عہد میں ہوئی تھی جب سارا عالم ان کے خونچکاں مظالم سے تھرا رہا تھا دنیا کے ان متوالوں سے وہ سب کچھ سرزد ہو چکا تھا جس کی نظیر اسلام ہی کیا شاید تاریخ عالم میں موجود نہیں فرات کے ساحل پر اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے اور ان کے خاندان کے پیاسے شہیدوں کے بہتے ہوئے لہو سے یہ اپنی حرص و آز کی پیاس بجھا چکے تھے رسول کا منوّر و پاک شہر حرّہ کے واقعہ میں لوٹا جا چکا تھا اور اس بُری طرح لوٹا جا چکا تھا کہ جان و مال ہی نہیں عصمتیاں حرم کی آبرو و ناموس تک کی پروا نہیں کی گئی رسول کی مسجد میں سعید بن مسیّب کے سوا ایک زمانہ تک نماز پڑھنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا اللہ کا گھر کعبہ تک بھی دنیا طلبی کی اس بھٹی کی چنگاریوں سے نذرِ آتش ہو چکا تھا جو اس خاندان کے سینوں میں جل رہی تھی خلافتِ اسلامی کے پہلے خلیفہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر بیت اللہ کی چوکھٹ پر اُن ہی کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپ چکے تھے (ظالم الامتہ) حجاج کی بے پناہ تلوار لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں معمولی باتوں میں اُڑا چکی تھی جن میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین بھی شامل تھے۔

الغرض بنی اُمیہ اور ان کے سنگدل و سیاہ دل ولاۃ (گورنروں) کی بدتمیزیوں کے اس بے پناہ طوفان نے ایک ایسا دہشت ناک مہیب منظر دنیائے اسلام میں قائم کر دیا تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ دم بخود تھا۔"

بنی امیہ کے مثالب میں جس چیز کو مولانا گیلانی نے بہت درد انگیزی کے ساتھ رقم فرمایا ہے وہ حادثہ کربلا" واقعہ حرّہ" اور حضرت عبداللہ بن زبیر کا واقعۂ شہادت ہے' اس میں شک نہیں ہے کہ یہ واقعات مسلمانوں کے ادبار و نکبت کے آثار و علامات میں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان حادثات کا سراسر ذمہ دار بنی اُمیہ ہی کو قرار دے کر اُن کو "دنیا کا متوالا" نواسۂ رسول کے خون سے حرص و آز کی پیاس بُجھانے والا، 'دنیا طلب' "بدتمیز" کہنا کہاں تک قرینِ انصاف ہے؟ مولانا نے حادثۂ کربلا کی طرف اشارہ جس انداز میں

کیا ہے علماء [illegible] کے نزدیک یہ انداز کسی طور پر محمود نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی تصنیف "حسین و یزید" میں تفصیلی طور پر علماء حق کے طرز عمل کو واضح کیا ہے جہاں کسی افراط تفریط کی گنجائش نہیں رکھی ہے میں اس وقت قصداً حادثۂ کربلا کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتا کہ بارہا اس واقعہ کی تفصیلات مسلمانوں کے سامنے آچکی ہیں۔ اور یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں بڑا دخل خود اُن کے معاونین شیعان علیؓ کو تھا۔

واقعہ حرّہ میں بے شک تین دن تک باشندگان مدینہ کو مصائب کا سامنا رہا اور یزید کی فوجیں اپنا تسلط قائم کرنے کیلئے سرگرم پیکار رہیں لیکن کیا مولانا نے اس پر غور فرمانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آخر واقعہ حرّہ پیش کیوں آیا ارباب تاریخ لکھتے ہیں کہ ۶۳ھ میں اہلِ مدینہ نے عثمان بن محمد بن ابی سفیان والی مدینہ کو جو بنی امیہ کی طرف سے مدینہ پر مقرر تھے عضو معطل بنا دیا اور عبداللہ بن حنظلہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی بنی امیہ کے افراد کو جو مدینہ میں موجود تھے ہر طرف سے گھیر لیا یہ مروان کے گھر میں محصور ہو گئے ان کی تعداد حالانکہ ایک ہزار تھی لیکن اہل مدینہ کے جم غفیر کے سامنے یہ ایک ہزار کی جمعیت بے حقیقت تھی یزید کو خبر پہنچائی گئی اُس نے اہل مدینہ کے اس طرز عمل پر افسوس کیا اور حسرت سے کہا ؎

لقد بدّلوا الحلم الذی فی سجیتی	فبدّلت قومی غلظۃً بلیان	(تاریخ کامل جزء ۴ ص۴۴)

میں نے اپنی طبیعت میں جس طرح حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تھا (مدینہ کے) لوگوں نے (اپنے طرزِ عمل سے) اس کو بدل دیا پس میں نے بھی اپنی قوم کی نرمی کو سختی سے بدل دیا۔

پھر اُس نے مسلم بن عقبہ کو حکم دیا کہ فوج لے کر مدینہ پہونچیں اور بنی اُمیّہ کو اہلِ مدینہ کے شدائد سے نجات دلائیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی تاکید کر دی:۔

ادع القوم ثلاثا فان اجابوک	انھیں تین مرتبہ صلح اور اطاعت کی دعوت
والا فقاتلھم۔ (تاریخ کامل جزء ۴ ص۴۵)	دینا اگر وہ مان جائیں تو بہتر ہے ورنہ پھر جنگ کرنا۔

پھر کہا:۔

فاذا مضت الثلاث فاکفف	جب تین دن گزر جائیں تو جنگ روک دینا

عن الناس وانظر علی بن الحسین	علی بن حسین کا خیال رکھنا اور انکی ایذا رسانی
فاکفف عنہ واستوص بہ خیراً فانّہ	سے باز رہنا اُن سے اچھی طرح پیش آنا کیونکہ
لم یدخل مع النّاس وانہ قد اتانی	وہ اس معاملہ میں لوگوں کے ساتھ شریک نہیں
کتابہ۔ (تاریخ کامل جزء ۴ ص۴۵)	ہیں ان کا خط میرے پاس آگیا ہے۔

مسلم بن عقبہ فوج لے کر مدینہ روانہ ہوئے اس وقت اہلِ مدینہ کا جو رویہ بنی اُمیّہ کے محصورین کے ساتھ تھا اس کو مؤرّخ ابن اثیر لکھتے ہیں:۔

فبلغ اھل المدینۃ خبرھم فاشتد	جب اہلِ مدینہ کو مسلم بن عقبہ کے آنے کا حال
حصارھم لبنی امیہ بدار مروان	معلوم ہوا تو انھوں نے بنی امیہ پر اپنا محاصرہ
وقالوا واللہ لا نکفّ عنہ حتّی نستنزلکم	اور سخت کر دیا اور محصورین سے کہا خدا کی قسم
ونضرب اعناقکم او تعطرنا عھد	ہم تم سے باز نہ رہیں گے یہاں تک کہ تم کو ذلیل
اللہ ومیثاقہ ان لا تبغونا غائلۃ	کر دیں تمھاری شان و شوکت خاک میں ملا دیں
ولا تدلوا لنا علی عورۃ ولا تظاھروا	اور تمھاری گردنیں اُڑا دیں ہاں اگر تم ہم سے
علینا عدوًّا فنکفّ عنکم و نخرجکم	بحلف وعدہ کرو کہ اب ہماری دشمنی نہ کرو گے
عنّا۔ (تاریخ کامل جزء ۴ ص۴۵)	ہمارے ممالک محروسہ پر حملہ آور نہ ہو گے اور
	ہم سے مقابلہ نہ کرو گے تو ہم تمھیں یہاں سے
	نکال دیں گے۔

مسلم بن عقبہ مدینہ پہونچے تو اہلِ مدینہ کو مخاطب کر کے کہا:۔

انّ امیر المومنین یزعم انّکم	امیر المومنین آپ لوگوں کو شریف سمجھتے
الاصل وانّی اکرہ اراقۃ دمائکم	ہیں اور میں بھی آپ کا خون بہانا بُرا سمجھتا
وانّی اؤجّلکم ثلاثاً فمن ارعوی	ہوں لہذا میں تین دن کی مہلت دیتا ہوں
وراجع الحق قبلنا منہ	پس جو اپنے طرزِ عمل سے باز آجائے گا اور

وانصرفت عنکم۔	راہِ حق اختیار کرے گا میں اُس سے اس کو
(تاریخ کامل جز ۴ صـ۴۶)	قبول کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔

جب تین دن گزر گئے تو مسلم بن عقبہ نے ایک موقع پھر صلح جوئی کا نکالا اور قبل اس کے کہ مدینہ پر حملہ کرے اہلِ مدینہ سے پوچھا:۔

یا اھل المدینۃ ما تصنعون تسالمون	اے اہلِ مدینہ تے کیا فیصلہ کیا؟ کیا کروگے؟
ام تحاربون فقالوا بل نحارب۔	جنگ یا صلح؟ اہلِ مدینہ نے جواب دیا
(تاریخ کامل جز ۴ صـ۴۶)	ہم جنگ کریں گے۔

مسلم بن عقبہ نے پھر کہا:۔

لا تفعلوا بل ادخلوا فی الطاعۃ۔	ایسا نہ کرو بلکہ اطاعت قبول کرلو۔

(تاریخ کامل جز ۴ صـ۴۶)

اہلِ مدینہ اپنی ضد پر قائم رہے بالآخر جنگ شروع ہوئی اور تین دن تک معرکہ ہوتا رہا بیشک مسلم بن عقبہ نے اپنا تسلط قائم کرنے کی ہر تدبیر کی البتہ "عصمتیانِ حرم کی ناموس" کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اُسکے وہی ذمہ دار ہیں ـــــ اب حالات آپ کے سامنے ہیں اسی کو واقعۂ حرہ کہا جاتا ہے آپ ہی فیصلہ کریں کہ ان واقعات کے پیش نظر بالکلیہ بنی اُمیہ ہی کو قصور وار ٹھہرا کر ان کے لئے (جن میں بہت سے تابعی اور صحابی بھی تھے) غیر شائستہ الفاظ کا استعمال کہاں تک مناسب ہے ـــــ؟

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

حضرت عبداللہ بن زبیر کے واقعہ شہادت اور استحلال کعبہ کے ذکر میں بھی مولانا نے صرف جذبات ہی سے کام لیا ہے اور اصل حالات کی تحقیق سے آنکھیں بند کرکے سارا الزام بنی اُمیہ ہی کے سر رکھدیا ہے حالانکہ واقعات تاریخ میں تفصیلی طور پر موجود ہیں اگر مولانا تحقیق کی زحمت فرماتے تو حالات روز روشن کی طرح سامنے آجاتے مولانا نے شہادت عبداللہ بن زبیر اور استحلال کعبہ کے سلسلہ میں بنی اُمیہ پر جو اعتراض فرمایا ہے خُسنِ تو اور ملاحظہ فرمایئے کہ مشہور دشمن اسلام جرجی زیدان نے "التمدن الاسلامی"

میں یہی اعتراض بنی اُمیہ پر کیا تھا اُس دور کے عالم محقق حضرت علامہ شبلی رح نے تاریخ کی روشنی میں اعتراض کی اصل حقیقت واضح کردی تھی امام تاریخ حضرت علامہ شبلی رح الانتقاد میں لکھتے ہیں:۔

ان ابن الزبیر ادّعی الخلافۃ	حضرت ابن زبیر دعویدار خلافت بن کر حرمین
فملک الحرمین والعراق	اور عراق پر قابض ہوگئے تھے اور قریب تھا کہ
وکاد یغلب علی الشام وکان	وہ شام پر بھی قابض و متصرف ہوجائیں اُن کا
امرہ کلّ یومٍ فی ازدیادٍ۔	اثر و اقتدار روز بروز ترقی پر تھا۔

آگے لکھتے ہیں:۔

ان ابن الزبیر لمّا استولی علی الحرمین	حضرت ابن زبیر جب حرمین پر قابض ہوگئے
اخرج بنی امیّۃ من المدینۃ فخرج	تو بنی امیہ کو مدینہ سے نکال دیا چنانچہ مروان
مروان وابنہ عبد الملک	اور عبد الملک بھی مدینہ سے نکلے اور عبد الملک
وھو علیل مجدّر فاستولی علی	اُن دنوں چیچک میں مبتلا تھے انھوں نے شام میں اپنی
الشام وصدرت من ابن الزّبیر	حکومت قائم کی اسکے علاوہ حضرت ابن زبیر
افعال نقموا علیہ لاجلھا فمنھا	سے بعض ایسے افعال کا صدور رہوا جو لوگوں کیلئے
انّہ تحامل علی بنی ھاشم واظھر	باعث ناگواری ہوئے اور جنکی وجہ سے لوگوں نے
لھم العداوۃ والبغضاء حتّی	اُن پر اعتراضات کئے ازانجملہ یہ کہ ابن زبیر نے
انہ ترک الصلوٰۃ علی النّبی	بنی ہاشم کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت
فی الخطبۃ ولمّا سألوہ عن	نہیں کیا یہاں تک کہ خطبہ میں نبی صلی اللہ
ھذا قال ان للنبی اھل سُوءٍ	علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھنا بند کردیا اور
یرفعون رؤسھم اذا سمعو۔	جب لوگوں نے ان سے اسکی وجہ دریافت کی
(الجزء الثانی من الیعقوبی صـ۳۱۱)	تو کہا (اس عہد میں) نبی کے اہلِ خاندان

بُرے لوگ ہیں جب خطبہ میں نبی پر درود و سلام سنتے ہیں تو (کبرونخوت سے) اپنا سر اونچا کرتے ہیں۔

ومنها انه هدم الكعبة ومع ان هدمها لم يكن الا لترميمها واصلاحها ولكن لم يكن هذا مالوفا للناس ولذالك تحرز النبي عليه السلام عن ادخال الحطيم في الكعبة فاتخذ الحجاج هذه الامور وسيلة لاغراء الناس على ابن الزبير ولعل ابن الزبير كان مضطرا الى هذه الاعمال ولكن من شريطة العدل ان نوفي كل ولهٖ قسطه فاذا اعتذرنا لابن الزبير فعبد الملك احق منه اعتذارا فان ابن الزبير هو البادي والبادي اظلم ويظهر من هذا ان عبد الملك ما اراد الحط من شان الكعبة ومن شرفها ولكن اضطر الى قتال ابن الزبير فوقع ما وقع عرضا غير مقصود بالذات ولذالك لما نصب الحجاج المناجيق على الكعبة حولها عن الكعبة وجعل للغرض الزيادة التي زادها

اُن امور میں سے جنھوں نے لوگوں کو حضرت ابن زبیر کی مخالفت پر آمادہ کیا کعبہ کا گرانا بھی تھا ہر چند کہ حضرت ابن زبیر نے کعبہ کو اسکی از سر نو تعمیر و اصلاح کے لئے منہدم کیا تھا لیکن لوگ اس کو ناپسند کرتے تھے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود حطیم کو کعبہ میں ملا لینے کی خواہش کے اسکے انہدام سے احتراز فرمایا حجاج نے انھیں اُمور کو اچھال کر لوگوں کو حضرت ابن زبیر کے خلاف اُبھارا اور شاید حضرت ابن زبیر نے مجبوراً یہ سب کچھ کیا لیکن (اسکو مانتے ہوئے) تقاضائے انصاف یہی ہے کہ ہم فریقین کے معاملات میں عدل سے کام لیں پس اگر ہم حضرت ابن زبیر کو معذور سمجھ سکتے ہیں تو عبدالملک زیادہ مستحق ہیں کہ معذور سمجھے جائیں کیونکہ (زیادتی کی) ابتدا حضرت ابن زبیر ہی نے کی تھی اور پہل کرنے والا زیادہ خطاوار ہوتا ہے اس سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ عبدالملک نے کعبہ کی بے حرمتی کا قطعاً قصد نہیں کیا بلکہ وہ ابن زبیر سے جنگ کر رہے تھے اور مقصود بالذات ابن زبیر [illegible]

للحجاج وانما كان نصب المناجيق على الزيادة الذي زادها ابن الزبير ولما كانت متصلة بالكعبة نال الاحجار من الكعبة ولكن بعد ما انتهت القتال اول ما فعله الحجاج كان امره بكنس المسجد الحرام۔

غرض کعبہ مکرمہ کی اہانت نہ تھی اور اسی لئے اس نے اصل کعبہ کو چھوڑ کر اس حصہ عمارت کے رُخ پر منجنیقیں نصب کی تھیں جس کو حضرت ابن زبیر نے از خود کعبہ میں شامل کر لیا تھا لیکن چونکہ یہ کعبہ سے متصل تھی اس لئے پتھر کعبہ مکرمہ میں بھی پہونچے اور اسکو نقصان پہونچا لیکن جب جنگ ختم ہو گئی تو سب سے پہلا حکم جو حجاج نے دیا ہے وہ مسجد حرام کی صفائی کے متعلق تھا۔

خلیفہ عبدالملک نے جس وقت حجاج کو حضرت عبداللہ بن زبیر سے جنگ کیلئے روانہ کیا تو اس کی فہمائش بھی کر دی تھی کہ اگر حضرت ابن زبیر امن طلب کریں اور اطاعت قبول کر لیں تو اُن سے تعرض نہ کیا جائے بلکہ ابن اثیر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قرطاس امان لکھ کر حجاج کے حوالہ کر دیا تھا۔

فبعثه وكتب معه امانا لابن الزبير ومن معه ان اطاعوا۔ (تاریخ کامل جزء ۴ صفحہ ۱۳۵)

حجاج کو روانہ کیا اور اس کو حضرت ابن زبیر اور آپ کے ساتھیوں کیلئے بشرط اطاعت "امان نامہ" لکھکر دیدیا۔

چنانچہ دس ہزار آدمیوں کو حجاج نے اُن کی اطاعت پر امن دے دیا جن میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے دو صاحبزادے حمزہ اور خبیب بھی تھے۔

فلما كان قبيل مقتله تفرق الناس عنه وخرجوا الى الحجاج بالامان خرج من عنده نحو عشرة الاف وكان ممن فارقه ابناه حمزة وخبيب اخذا لانفسهما امانا۔ (تاریخ کامل جزء ۴ صفحہ ۱۳۶)

حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت سے کچھ پہلے لوگوں نے حضرت ابن زبیر کا ساتھ چھوڑ دیا اور حجاج سے امن طلب کیا ان لوگوں کی تعداد دس ہزار تھی اور ان میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے دو صاحبزادے حمزہ و خبیب بھی تھے۔

ابن الزبیر صرح بذالک العلامۃ البشاری فی احسن التقاسیم۔	جو نقصان پہونچا وہ بالکل غیر ارادی طور پر (محض اس لئے کہ عبد اللہ ابن زبیر نے کعبہ میں پناہ لی تھی۔)
ثم ان من مسائل الفقہ ان البغاۃ اذا تحصنوا بالکعبۃ لا یمنع ھذا عن قتالھم ولذالک امر النبی فی وقعۃ الفتح بقتل احد ھم وھو متعلق باستار الکعبۃ وابن الزبیر کان عند اھل الشام من البغاۃ والمارقین عن الدین۔	چنانچہ حجاج نے اس سلسلہ میں اس قدر احتیاط برتی کہ جب کعبہ پر منجنیقیں نصب کی ہیں تو اصل کعبہ سے اُس کا رُخ پھیر کر اُس زمین کی طرف کر دیا جو ابن زبیر نے کعبہ کو وسیع کرنے کے لئے خود اس میں شامل کی تھی۔ علامہ بشاری نے احسن التقاسیم میں اس کی تصریح کی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مسائل

فقہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ باغی جب کعبہ میں پناہ گزیں ہو جائیں تو اُن کی یہ پناہ گزینی جنگ و قتال سے روک نہیں سکتی اسی لئے رسول اللہؐ نے فتح مکہ میں ایک کافر کے جو غلاف کعبہ پکڑے ہوئے کعبہ میں پناہ گزیں تھا قتل کرنے کا حکم دیدیا تھا اور حضرت ابن زبیر بھی اہلِ شام کے نزدیک باغی تھے۔

ولو کان اراد الحجاج الاستھانۃ بالحرم فما کان مرادہ من رمتہ واصلاحہ بعد قتل ابن الزبیر ومعلوم ان تعمیر الحجاج ھو الیوم کعبۃ الاسلام وقبلۃ المسلمین کافۃ۔	اور اگر حجاج نے حرم کی اہانت کا ارادہ کیا تھا تو ابن زبیر کے قتل کے بعد اُس نے خانہ کعبہ کی اصلاح و تعمیر کیوں کی درانحالیکہ حجاج ہی کی تعمیر تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے۔

علامہ شبلی مرحوم آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

قد منا ان الکعبۃ لم تکن غرضا	ہم اس کا پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ حجاج کی

حضرت ابن زبیر نے چونکہ اطاعت قبول نہیں کی اسلئے جنگ ہوئی اور حضرت عبد اللہ بن زبیر شہید ہوئے۔

یہ ہے حضرت ابن زبیر کی شہادت کا واقعہ کیا تقاضائے انصاف اور مقتضائے عدل یہی ہے کہ ساری ذمہ داری بنی اُمیہ کے حکمرانوں ہی کے سر رکھ دی جائے یا حالات ان تمام ذمہ داریوں کو طرفین میں تقسیم کر دیتے ہیں مجھ لانا نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر حضرت ابن زبیر کو شہید کیا گیا حالانکہ تاریخ کامل، تاریخ طبری اور دوسری تاریخوں میں موجود ہے کہ آپ مقام حجون میں شہید ہوئے۔

مظالم حجاج کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے متعلق بھی میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ حجاج کے جذبۂ رحم پر اس کا جذبۂ ظلم غالب تھا اسکے مزاج میں غضب کی تیزی تھی وہ اپنی سخت گیریوں میں ضرب المثل ہے لیکن ذرا اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر حجاج کو اس ظلم و ستم پر آمادہ کس چیز نے کر دیا تھا کیا مولانا اس موقعہ پر ان بغاوتوں کو فراموش کر دینگے جو دم بدم بنی اُمیہ کے حدود سلطنت میں رونما ہو رہی تھیں جہاں تاریخ میں مولانا نے حجاج کے مظالم ملاحظہ فرمائے ہیں اُسی کے پہلو بہ پہلو ان بغاوتوں کا حال بھی تفصیل کے ساتھ موجود ہے جنھوں نے حجاج کی تلوار کو بے نیام ہونے پر مجبور کر دیا تھا غیر ذمہ دار جماعتوں کا ذکر نہیں اس سلسلہ میں علوی بزرگوں کا دامن بھی آلودگی سے پاک نہیں ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قرۃ العینین میں لکھتے ہیں کہ علویوں نے ایک سو مرتبہ سے زیادہ خروج کیا لیکن ہمیشہ یہ خروج سوائے خونریزی کے بے نتیجہ رہا۔

میں حجاج کی صفائی اور پاکیزگی کا ہرگز قائل نہیں لیکن میرے نزدیک مورخ اور مبصر کا فرض یہ ہے کہ وہ واقعات کا صرف ایک ہی رُخ نہ دیکھے بلکہ حالات کے استقصا کی کوشش کرے میں نے حجاج کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ملک کے ایک وسیع النظر اور بیدار مغز عالم مولانا ابو الکلام آزاد کی ایک تحریر سے جو ۱۲ راگست ۱۹۲۷ء کے الہلال میں شائع ہوئی ہے اس کی تائید ہوتی ہے، مولانا لکھتے ہیں:۔

"عراق شروع سے شورش پسند قبائل کا مرکز تھا یہاں کی بے چینی کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی والیوں پر والی آتے تھے اور بے بس ہو کر لوٹ جاتے تھے لیکن حجاج بن یوسف کی تلوار نے اپنی ایک ہی ضرب میں عراق کی ساری شورہ پشتی ختم کر ڈالی خود اس کے عہد کے لوگوں کو

اس پر تعجب تھا۔ قاسم ابن سلام کہا کرتے تھے کوفہ کی خودداری و نخوت اب کیا ہوگئی؟ انھوں نے امیر المومنین علی کو قتل کیا حسین ابن رسول کا سر کاٹا مختار جیسا صاحب بزرگ ہلاک کر دیا مگر حجاج کے سامنے بالکل ذلیل ہو کر رہ گئے۔"

میری محدود واقفیت کا جہاں تک تعلق ہے اس امر کو اسلام کے محاسن میں شمار کیا گیا ہے کہ اس نے موت کے بعد نام لے کر کسی مرنے والے کی تنقیص کی اجازت نہیں دی ہے۔ اور خصوصاً اس شخص کی تنقیص کی جس نے اپنی زندگی میں اپنے کردار پر ندامت کے آنسو بہائے جس نے خدا سے مغفرت چاہی اور جو اپنے کئے پر پشیمان ہوا ان حالات میں یزید اور حجاج بھی اسکے مستحق تھے کہ اُن کو "رسوائے زمانہ" کا خطاب مولانا نہ دیتے جیسا کہ مولانا نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے۔ ہمیں شک نہیں کہ یزید سے زندگی میں اہم غلطیاں ہوئیں لیکن ساتھ ہی اُس کی مغفرت کی بشارت بھی زبان نبوی سے ایک طرح مل چکی ہے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رسالہ حسین و یزید میں لکھتے ہیں کہ بخاری میں عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"سب سے پہلے قسطنطنیہ پر جو فوج لڑے گی اُس کی بخشش ہو گی"۔

اور معلوم ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جس فوج نے قسطنطنیہ پر لڑائی کی اس کا سپہ سالار یزید ہی تھا، کہا جا سکتا ہے کہ یزید نے یہ حدیث سن کر ہی فوج کشی کی ہوگی لیکن اس سے اسکے فعل پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔

ان حالات میں یزید کے معاملہ میں بھی زبان و قلم پر پورا قابو رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

حجاج کے متعلق مولانا ابو الکلام آزاد بعنوان "انسانیت موت کے دروازے پر" لکھتے ہیں کہ جب اسکی موت کا وقت قریب ہوا اُسکو اپنے مظالم یاد آئے اور ان مظالم پر منفعل ہو کر کہنے لگا۔

ان ذنبی وزن السموات والارض وظنی بخالقی ان یحابی

میرے گناہ آسمان اور زمین کے برابر بھاری ہیں مگر مجھے اپنے خالق سے امید ہے کہ رعایت کریگا

فلئن منّ بالرضاء فهو ظنی ولئن مر بالکتاب عذابی

اگر وہ اپنی رضامندی کا احسان مجھ پر کرے تو یہ اس کا احسان ہے اور یہی میری اُمید ہے

لیکن اگر وہ عدل کر کے میرے عذاب کا حکم دے۔

لم یکن ذاک منه ظلما وهل یظلم رب یرجی لحسن ماب

تو یہ اُس کی طرف سے ہرگز ظلم نہیں ہوگا کیا یہ ممکن ہے کہ وہ رب ظلم کرے جس سے صرف بھلائی ہی کی توقع کی جاتی ہے۔

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا یہ موقع اس قدر رقت انگیز تھا کہ مجلس میں کوئی بھی اپنے آنسو نہ روک سکا ابو منذر نے جب حجاج کو مرض الموت میں اسکے مظالم پر بہت زیادہ فضیحت کی اور بہت سخت سست کہا تو راوی کہتا ہے کہ حجاج مبہوت ہو گیا دیر تک سناٹے میں رہا پھر اُس نے ٹھنڈی سانس لی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر کہا:۔

الٰہی مجھے بخش دے کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں تو مجھے نہیں بخشے گا پھر یہ شعر پڑھا ؎

رب ان العباد قد ایاسونی ورجائی لك الغداة عظیم

الٰہی بندوں نے مجھے نااُمید کر ڈالا حالانکہ میں تجھ سے بڑی ہی امید رکھتا ہوں۔

حضرت حسن بصریؒ سے حجاج کا یہ قول بیان کیا گیا تو وہ پہلے تو متعجب ہوئے کیا واقعی اُس نے یہ کہا؟ کہا گیا ہاں اُس نے ایسا ہی کہا ہے۔ فرمایا تو شاید (یعنی شاید اب بخشش ہو جائے) (الہلال ۱۲ اگست ۱۹۲۷ء)

غرض جو مرنے سے پہلے اپنے کردار پر اس طرح نادم ہوا اور پروردگار عالم سے معافی چاہے اس کو بُرے الفاظ سے یاد کرتے ہیں کیا ہم کو احتیاط نہ برتنا چاہیئے؟

حضرت مولانا نے دو چار اور جزئی واقعات عمال و سلاطین بنی اُمیہ کے سلسلۂ مضمون میں درج فرما کر مثالب بنی اُمیہ کی فہرست مکمل کی ہے لیکن میں ان واقعات سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ میں انبیاء کرام کے علاوہ کسی کی معصومیت کا قائل نہیں یقیناً ہر شخص اور ہر جماعت میں کچھ نہ کچھ نقائص اور کچھ نہ کچھ خوبیاں ہوتی ہیں بنی امیہ کے افراد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے ان میں بھلائیاں بھی تھیں اور بُرائیاں بھی، البتہ میں اس امر کا مخالف ہوں کہ کسی کی بُرائیوں کو اس طور پر اُچھالا جائے کہ اسکی بھلائیاں بھی بُرائیوں کے پردے میں گم ہو کر رہ جائیں حضرت مولانا نے چونکہ بنی اُمیہ کے حق میں اسی "انصاف" کو

روا رکھا جس سے بنی اُمیہؓ کے متعلق عام طور پر شدید اور واقعات کے خلاف بدظنی پھیلنے کا اندیشہ ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اختتام کلام پر اُن کی اُن خدمات کو بھی اجمالی طور پر بیان کر دیا جائے جو مولانا گیلانی کی زبان میں ان دنیا کے متوالوں "نواسۂ رسول کے خون سے حرص و آز کی پیاس بجھانے والوں" دنیا طلب اور بدتمیزوں نے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں انجام دی ہیں۔

قرآن کریم کی خدمت

جوں جوں عجمیوں سے اہلِ عرب کا اختلاط بڑھا اور زبان و لہجہ کے اختلاف نے تلاوتِ قرآن پر بُرا اثر ڈالنا شروع کیا حجاج بن یوسف نے اس خطرہ کا بروقت احساس کیا قرآن کریم کے حروف پر نقطے اور اعراب لگوائے تاکہ عرب و عجم یکساں طور پر اس کی تلاوت کر سکیں اور لفظی تحریف کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ (ابن خلکان ذکر حجاج)

علامہ شبلیؒ حجاج کے اس عمل خیر پر تحریر فرماتے ہیں:۔

وَاللّٰہ ھٰذا اعظم میزّۃ بیّنھا	خدا کی قسم یہ اسلام کے حق میں اتنی بڑی
الاسلام لایساویھا میزّۃ واعظم	بھلائی ہے کہ کوئی بھلائی اس کا مقابلہ نہیں
مِنّۃٍ من بھا علی الدین لایوازیھا	کر سکتی اور دین پر اتنا بڑا احسان ہے کہ
منّۃٌ۔ (الانتقاد ص۴۸)	اس احسان کے برابر کوئی احسان نہیں ہو سکتا۔

پھر حجاج نے اعراب اور نقطے لگوا کر قرآن کے بہت سے نسخے مختلف دیار و امصار میں بھجوائے۔ ولید لوگوں کو انعام و اکرام دیکر حفظ قرآن پر آمادہ کرتے تھے اور جو لوگ حفظِ قرآن میں سستی کرتے تھے انھیں سزا دیتے تھے چنانچہ ولید کے زمانہ میں حافظوں کی تعداد حدِ شمار سے خارج ہو گئی تھی۔

فن تفسیر "بنی امیہؓ" ہی کے زمانہ میں "مدوّن ہوا" "ابن جبیرؒ" پہلے مفسر ہیں جنھوں نے سب سے پہلے عبد الملک کے کہنے سے تفسیر کو کتابی شکل میں جمع کیا ان کے بعد مجاہد نے عبد الملک کے ہی حکم پر یہ خدمت انجام دی۔ (میزان الاعتدال ذہبی)

حدیث و فقہ کی خدمت

جس طرح سلاطین بنی اُمیہ کو قرآن کریم کی نشر و اشاعت سے غایت درجہ شغف تھا اسی طرح حدیث و فقہ کی خدمت بھی ان کا دلچسپ مشغلہ تھا جو علماء حدیث و فقہ کی خدمت میں مصروف رہتے انکے ساتھ یہ سلاطین ہمیشہ اچھا سلوک کرتے اُنکی خدمت میں ہدایا بھیجتے۔ اُن کی عزت و تکریم کرتے چنانچہ عبد الملک نے ایک مرتبہ حجاج کو جب امیر الحج بنا کر روانہ کیا تو یہ حکم دیدیا تھا کہ "مناسک" میں "ابن عمرؓ" کی تقلید کریں کیونکہ وہ بہترین فقیہ ہیں۔

حضرت مولانا گیلانی کی زبان میں "بنی امیہ کے سنگدل اور سیاہ سینہ گورنروں میں متعدد بزرگ ایسے تھے جن کے متعلق تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ اُنکے سینے علوم حدیث اور اسکے اسرار و معارف کا گنجینہ تھے۔ سالم بن عبد اللہ۔ قاسم بن محمد، شعبی، میمون بن مہران، زہری، ایوب بن ابی تمیمہ، قبیصہ بن ذوئیب، رجاء بن حیوۃ، دربار بنی امیہ میں بہت با رسوخ تھے اور ان میں سے اکثر مختلف جگہوں پر اس حکومت کی طرف سے گورنری کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں ان کی زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ نقلِ حدیث اور روایت کے امام ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر احادیث نبوی کو کتابی شکل میں جمع کر لیا جاتا تو انکے ضائع ہو جانے کا اندیشہ قوی تھا چنانچہ انھیں حالات کے پیش نظر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تمام دیار اسلامی میں احکام و فرامین جاری کئے۔

انظروا احادیث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ	سرورِ دو عالم کی احادیث جمع کرتے
علیہ وسلم فاجمعوہ۔	جاؤ۔

راس المحدثین ابوبکر بن حزم کو لکھا:۔

انظر ما کان من سُنّۃٍ او حدیثٍ	رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی حدیث
فاکتب لی فانی خِفتُ دروسَ	و سنت کو جمع کرو کیونکہ مجھے علم اور علماء
العلم وذھابَ العلماء۔	کے مٹنے کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔

چنانچہ ابوبکر بن حزم نے کئی کتابیں حدیث کی لکھیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ لوگوں کو فرامین لکھتے اور ان فرامین میں لوگوں کو سنت و فقہ کی تعلیم دیتے۔

علم تاریخ، مغازی و سیر کی خدمت

تاریخ و سیر کی تدوین بھی سلاطین بنی امیہؓ ہی کے ایما سے ہوئی چنانچہ وہب بن منبہ المتوفی ۱۱۴ھ محمد بن مسلم زہری المتوفی ۱۲۴ھ موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ نے اپنی کتب تاریخ بنی امیہ کے عہد میں اور انھیں کے ایماء سے لکھیں عوانہ نے کتاب التاریخ اور سیرۃ معاویہ کی تالیف کی حضرت معاویہؓ نے صنعاء سے مشہور مورخ عبید بن شریہ کو بلاکر حکم دیا کہ وہ ملوک عجم کے حالات اُن کے طرز حکومت اور اُن کے سیاسی نقطۂ نظر کے متعلق ایک مفصل تاریخ لکھیں چنانچہ انھوں نے کتاب الامثال اور اخبار الماضیین تیار کیں، ہشام کے زمانۂ حکومت میں انھیں کے حکم سے جبلہ نے شاہانِ فارس کی تاریخ کا عربی میں ترجمہ کیا۔

علم نحو و صرف کی خدمت

ابن خلکان جلد اوّل صفحہ ۲۴۰ میں ہے کہ ابوالاسود دؤلی نے زیاد والیِ عراق سے اجازت چاہی کہ انھیں عربی نحو و صرف کے قواعد ترتیب دینے کی اجازت دی جائے زیاد نے اس وقت تو اجازت نہیں دی لیکن کچھ دنوں کے بعد خود زیاد ہی نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ابوالاسود دؤلی سے کہا۔

ضع للناس الذی نهيتك ان	ہاں اُن اصول و قوانین کو مرتب کر ڈالو
تضع لهم۔	جن کی میں نے تم کو ممانعت کردی تھی۔

چنانچہ ابوالاسود نے نحو و صرف کے قواعد مرتب کئے پھر عنبسہ بن معدان، میمون، عبداللہ حضرمی عیسیٰ بن عمر اور خلیل وغیرہ نے ابوالاسود کے اصول کو تفصیل کے ساتھ لکھا یہ سارے نحوی بنی اُمیہ ہی کے دور میں گزرے۔

شعر و ادب کی خدمت

شعراء اور اربابِ ادب کی ہمت افزائی بھی بنی اُمیہ کے سلاطین کی علمی خدمات کا ایک جزء ہے فرزدق، دارمی، جریر خطفی، اخطل تغلبی، عمرو بن ربیعہ قرشی وغیرہ اپنے قصائد، سلاطین و عمال کے

دربار میں پیش کرتے اور انعام پاتے۔

یہ خدمات جو علوم و دینیات سے متعلق تھیں ان پر اجمالی طور پر بحث کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن انتظامی اور رفاہی کارگزاریوں کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے جو بنی اُمیّہ کے بدنام سلاطین و عمال کے ہاتھوں انجام پہونچیں۔

ارباب تاریخ متفق ہیں کہ ان سلاطین نے عام رعایا کی راحت رسانی کیلئے بے شمار نہریں کھدوائیں جا بجا کنوئیں تعمیر کئے، سڑکیں بنوائیں، نئے نئے شہر بسائے شفا خانے قائم کئے، جذامیوں، اندھوں اپاہجوں، مسکینوں کیلئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کئے ان کے کام کاج کیلئے آدمی نوکر رکھے حضرت عمرؓ کے بعد انہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ سرائے اور مہمان خانے کھولے، یتیموں کی پرورش گاہیں بنائیں اور انکے لئے معلم مقرر کئے، خرید و فروخت میں آسانی پیدا کرنے کیلئے سکہ رائج کیا، غرض وہ سب کچھ کیا جو ایک بیدار مغز، رعایا پرور و خیر خواہ سلطنت اپنے زیر سایہ لوگوں کے ساتھ کر سکتی ہے، خانہ کعبہ او مسجد نبویؐ کے سنہرے کلس اور نادر نقش و نگار اسی بدنام حکومت کے نامۂ اعمال کا ایک جزء ہیں اسلام کی آواز انہی کے زمانہ میں عراق، عرب اور شام سے نکل کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلی اور انھوں نے اسلامی فتوحات کی وہ نظیر قائم کی جس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے انہی کے زمانہ میں طرابلس، طنجہ، اندلس، ریم، سندھ، قبرص فتح ہوئے۔ یہ اسلام کا جھنڈا لے کر چین کی سرحد تک پہونچے، ٹیونس اور مراکش خراسان اور فارس، طبرستان، جرجان، سجستان و خوارزم، ماوراء النہر اور افغانستان میں رایت اسلامی انہی کے ہاتھوں لہرایا۔

یہ نہایت ہی مختصر طریقہ پر دُنیا کے ان متوالوں، سیاہ دل اور سیاہ سینہ انسانوں کی خدمات بیان کردی گئیں، سُنا ہے کہ اسلام کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ "الحسنات یذھبن السیئات" لیکن کیا معلوم کہ اس اصول سے ان تیرہ بختوں کو بھی کچھ فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے گا یا نہیں؟

ختم کلام پر حضرت مولانا گیلانی سے مجھے اپنی اس جراءت کی معافی مانگنا ہے اور چلتے چلتے اتنی گزارش بھی کرنی ہے

لہ شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر	کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۲ء از ص ۴۲ تا ۵۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صفحات آگے پیچھے ہیں لہٰذا مطالعہ میں مندرجہ ذیل صفحات کی ترتیب قائم رکھیں ۳۴۱-۳۴۳-۳۴۲-۳۴۴ پڑھیں - اس کے بعد ۳۴۵ کے بعد ۳۶۰-۳۴۷ پڑھیں - پھر ۳۵۹ کے بعد ۳۴۶-۳۶۱ پڑھیں -

نگاہِ اوّلیں

برادرِ معظم مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے مقدمے میں مومن کی ذمہ داری کے زیرِ عنوان لکھا تھا:

"یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسین سے ہے۔ حضرت معاویہ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں، اور اگر ہے تو پہلے حضرت علی سے ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذاتِ اقدس کی طرف یہ تمام رشتہ داریاں لوٹتی ہیں ان کی مبارک تعلیم نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کر دیا ہے، باقی تمام رشتہ داریوں کا درجہ اس کے بعد رکھا ہے۔"

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (سورۂ نساء - آیت - ۱۳۵)

اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اللہ کے۔ اگرچہ گواہی تمھارے اپنے خلاف ہو، یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ

اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ کے لیے انصاف کے گواہ بن کر۔ اور کسی

شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔

قوم کی دشمنی تمھیں بے انصافی پر آمادہ نہ کرے انصاف ہی کرو کہ یہ قریبِ تقویٰ ہے۔

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یزید کے لیے اور حضرت حسین کے لیے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ ہوں۔

اَلْعَیْنُ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ یَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی بِہٖ رَبُّنَا

آنکھوں میں نم ہے اور دل میں غم، مگر زبان سے بس وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔

جس وقت یہ سطریں لکھی گئی تھیں اس وقت کسے خبر تھی کہ بہت جلد قدرت کی جانب سے ایک میزان نصب ہونے والی ہے جس پر مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں ہم لوگوں کے اندرونی حال کی برسرِ عام جانچ ہوگی اور مومن کے معیار اور اس کی ذمہ داری کے بارے میں ہمارے اپنے "قال" کے آئینہ ہی میں ہمارے اپنے "حال" کو، یعنی ہمارے اپنے معیار کو، ہمارے احساسِ ذمہ داری اور حق و صداقت کے ساتھ ہمارے رشتے کو برسرِ عام ناپا جائے گا؟ اُس وقت کسے خبر تھی کہ اس آزمائش سے کامیاب گزرنے کے لئے ہمیں عنقریب اپنے خلاف، اور ان لوگوں کے خلاف جو کم از کم ہم لوگوں کی نگاہ میں نسبی نہ سہی علمی و معنوی طور پر ہی سہی "والدین اور اقربین" کا درجہ رکھتے ہیں، برسرِ عام گواہی دینی پڑے گی اور آنکھوں میں نم اور دل میں غم کے ساتھ وہ کہنا پڑے گا جو کم از کم ہمارے علم و فہم کے مطابق ہمارے رب کو پسند ہے اور جس سے گریز اُسے ناپسند ہوگا۔

اب آئیے اس اجمال کی کچھ تفصیل سن لیجئے۔

۶، ۷ مارچ کی بات ہے یہ سننے میں آیا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان پندرہ روزہ "تعمیرِ حیات" میں ادارہ الفرقان کی تازہ پیش کش واقعۂ کربلا پر تبصرہ کے ضمن میں صحابہ کرام کے پورے ایک اہم گروہ کے بارے میں نہایت گستاخانہ خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔

[illegible] نے راقم السطور کو اس کی خبر دی، انھوں نے تبصرہ کے اس حصہ کے بارے میں

کتاب پر تبصرہ جس عجلت سے کیا گیا تھا اُس سے اور تبصرہ کے انداز سے تبصرہ نگار کے دل و دماغ کی جو کیفیت صاف ظاہر ہو رہی تھی، اللہ کا شکر ہے اور والد ماجد اطال اللہ بقاءہ کے سایہ کی برکت کہ ہم لوگ اس کے ردِّ عمل میں اُس قسم کی کسی کیفیت میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اور مشورہ و غور و فکر کے بعد یہی طے پایا کہ اس کی بھرپور کوشش کی جائے کہ اس غلطی کا مناسب استدراک اربابِ ندوہ ہی کی طرف سے ہو جائے اور کسی اور کو اس سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہ بولنا پڑے، نیز یہ کہ کوشش کے علاوہ اس کے لئے دعاؤں کا زیادہ سے زیادہ اہتمام بھی کیا جائے۔ آئندہ صفحات میں آپ ان کوششوں کی تفصیلات اور اُن کی ناکامی کی عبرتناک و المناک داستان پڑھیں گے۔ مختصراً یہاں اتنا سن لیجئے کہ اس سلسلہ میں دو خط تو خود بھائی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی) نے لکھے۔ ایک مولانا عبد اللہ عباس صاحب کے نام اور دوسرا ایڈیٹر تعمیر حیات کے نام، اور دو خط والد ماجد مدظلہٗ نے حضرت مولانا علی میاں کے نام لکھے۔ بھائی صاحب کے خطوط "تعمیر حیات" میں اشاعت تو در کنار، جواب کے قابل بھی نہیں سمجھے گئے[1]۔ والد ماجد مدظلہٗ کے خطوط کے جواب میں مولانائے مخدوم و محترم کی طرف سے جو خطوط موصول ہوئے اور ان کا جو ردِّ عمل (RESPONSE) ہلا اس کی پوری تفصیل آئندہ صفحات میں آپ پڑھ ہی لیں گے۔ ہم اس بارے میں اپنا تأثر ابھی ظاہر نہ کریں تو بہتر ہے۔ صرف اتنا عرض کر دیں کہ ہم ابھی تک اس صدمہ (SHOCK) سے نکل نہیں پائے ہیں جو اس تجربے سے ہمیں پہنچا ہے۔ اسے ہماری ناتجربہ کاری پر محمول کر لیجئے یا بھولے پن اور سادہ لوحی پر کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے حضرت مولانا علی میاں توہین صحابہ بلکہ تکفیر صحابہ جیسے سنگین موضوع پر اس قدر بے اعتنائی اور بے نیازی کا رویہ برتیں گے کہ اُن کے ایک محب محترم و مخدوم اور دیرینہ رفیق و صدیق کے بار بار توجہ دلانے کے باوجود اُن کی زبان سے ایک جملہ بھی اس بارے میں سننے کو ہمارے کان ترس جائیں گے!! اور پھر

[1] یہ مضمون کتابت کے لئے بھیجا جا چکا تھا کہ آج ۵ مئی کو بھائی صاحب کو مولانا عبد اللہ عباس صاحب کا جواب ملا ہے۔

ہمارے تأثر بھی نقل کیا کہ "کوئی شیعہ بھی اس سے زیادہ گندہ تبرا صحابہ پر کیا کرے گا"

ایک ندوی ہونے کے ناطے میرے ذہن نے اُن صاحب کی اس روایت کو مبالغہ ہی پر محمول کیا تھا اور اگلے دن جب تعمیر حیات کا وہ شمارہ ملا تو اسی امید کے ساتھ پڑھنے کے لیے ہاتھ میں لیا کہ یہ روایت غلط ہی ثابت ہو گی، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا، وہ روایت بالکل صحیح اور اُن صاحب کا تأثر بالکل درست نکلا۔ واقعی تبصرہ ایسے ہفوات و شطحات پر مشتمل تھا کہ الامان الحفیظ! اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا کہ اور نہ کسی طرح یہ باور کرنے پر دل آمادہ تھا کہ اصحابِ رسول کے ایک بڑے گروہ کے بارے میں یہ جملے واقعی ندوے کے معتمد تعلیم جناب مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی صاحب کے قلم سے نکلے ہیں اور ندوے ہی کے ترجمان تعمیر حیات میں ایک ایسے کالم میں چھپے ہیں جس میں اخبار و ادارے ہی کا موقف شائع ہوتا ہے[1]۔ (یاد رہے کہ مولانا عبد اللہ عباس صاحب کا یہ مضمون کتاب پر تعمیر حیات کے تبصرہ کے طور پر شائع ہوا تھا اور کسی اخبار یا رسالہ میں کسی کتاب پر تبصرہ کو تبصرہ نگار کی ذاتی رائے نہیں بلکہ اس اخبار یا رسالہ کا سرکاری موقف سمجھا جاتا ہے۔ الا یہ کہ اس میں اس کے خلاف کوئی صراحت موجود ہو۔) راقم الحروف کو ایک ندوی ہونے کے ناطے یہ سوچ کر مزید خفت محسوس ہو رہی تھی کہ ندوے کے دینی و علمی مزاج معیار کے بارے میں یوں ہی عام شہرت مستند دینی و علمی حلقوں میں جیسی کچھ ہے اُسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اب اس تبصرہ سے اس شہرتِ عام کی جیسی توثیق ہو گی، وہ بھی بالکل ظاہر ہے۔ خاص کر اس بنا پر کہ یہ تبصرہ ندوے کے کسی عام مدرس یا فاضل کا لکھا ہوا نہیں بلکہ ندوے کے نظام تعلیم و تربیت کے ذمہ دار اعلیٰ کا لکھا ہوا ہے، جس کے حوالے قوم نے اپنے ہزاروں نوجوان اُن کی سیرت سازی کے لیے کیے ہوئے ہیں! بہر حال شروع شروع میں تو طبیعت پر رنج و الم اور خفت و ندامت جیسی کیفیات چھائی رہیں اور اس کے بعد اس سوچ کا مرحلہ شروع ہوا کہ کیا کیا جائے؟

[1] بہتر ہو گا کہ ناظرین الفرقان آگے بڑھنے سے پہلے اسی مقام پر وہ پورا تبصرہ پڑھ لیں۔ ناظرین کی سہولت کے پیشِ نظر وہ تبصرہ بعینہٖ اسی شمارے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ ۱ صفحہ ۲۹

اگر توجہ دلانے میں اُن کے وہ محب مخدوم و محترم تنہا ہوتے تو کم از کم ان لوگوں کے لئے جو ان کے مزاج سے زیادہ قریبی واقفیت نہیں رکھتے یہ گمان کرنے کی گنجائش تھی کہ تبصرہ کے بارے میں ان کے شدت احساس کا اصل سبب اُن کے بیٹے کی تصنیف کی توہین بنی ہوگی نہ کہ توہین صحابہ، مگر ہم یہ گمان کیسے کر لیتے کیونکہ ہمارا مشاہدہ تو یہ رہا کہ جس نے بھی تبصرہ پڑھا اس نے یہی تاثر لیا کہ اس میں صحابہ کرام کے ایک پورے اور اہم گروہ پر کھلا ہوا تبرا کیا گیا ہے۔ ایسے متعدد لوگوں نے حضرت مولانا علی میاں کو اپنے تاثرات سے باخبر بھی کیا، (ان میں سے کئی حضرات نے از خود ہی اپنے خطوط کی نقلیں ادارہ الفرقان کو بھی بھیجیں جن میں سے دو تین خطوط آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ بھی فرمائیں گے) مگر ان سب کوششوں کا جو نتیجہ نکلا، وہ ہم لوگوں کے لیے کس قدر مایوس کن، اور ہمیں کیسی آزمائش میں ڈال دینے والا ثابت ہوا، سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم کن الفاظ میں بیان کریں کہ بات پوری ادا بھی ہو جائے اور بزرگوں کی شان میں کوئی ناروا گستاخی اور بے ادبی کا گناہ بھی ہم سے سرزد نہ ہونے پائے ــــ کتنی آسان سی بات تھی، چند سطروں پر مشتمل ایک بیان حضرت مولانا مدظلہ کا آجاتا کہ مولوی عبداللہ عباس صاحب کے مضمون میں صحابہ کرام کے ایک گروہ کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ غلط اور بے بنیاد ہیں۔ ہم اُن سے اظہار برات کرتے ہیں ــــ یا حضرت مولانا مدظلہ اپنے شاگرد مولانا عبداللہ عباس صاحب سے فرما دیتے کہ فوری طور پر اپنے تبصرہ کے اُس حصہ سے اپنی برأت اور معذرت خواہی پر مشتمل بیان دو۔ مگر ہوا کیا؟ صرف یہ کہ اُس مضمون کے اثر کو زائل کرنے کے لئے پہلے تو تعمیر حیات (۲۵ مارچ) میں حضرت مولانا مدظلہ نے اپنا ایک پرانا مضمون شائع کرایا جس میں مجموعی طور پر صحابہ کرام کے مرتبہ و مقام اور اُن کی شکل و وجود میں اعجاز نبوت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہ مضمون پرانا تھا اور اس کا بڑا حصہ ایک کتاب کے مقدمے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ اور اس قسم کے کسی تمہیدی نوٹ سے بھی خالی تھا جس سے اس کی دوبارہ اشاعت کی علت اور مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی والے مضمون کے سیاق سباق کی طرف اشارہ ہی ہو جاتا۔ پھر جب مختلف لوگوں کے ردعمل سے حضرت مولانا مدظلہ کو احساس ہوا کہ معاملہ کو ٹال دینے کی یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی تو ایک دوسرا تازہ مضمون سپرد قلم فرمایا۔

جس کا عنوان تھا:

"ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا صحابہ کرام کے بارے میں مسلک و عقیدہ
صحابہ کرام کے تعارف اور ان کی سیر و سوانح کے سلسلے میں ندوۃ العلماء کے
سرپرستوں اور فضلاء کا امتیاز اور کارنامہ"

اس مضمون کی تمہید میں مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کے حوالہ سے حضرت مولانا مدظلہ نے تحریر فرمایا۔

"مضمون میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض ایسے خیالات اور تاریخی تجزیہ و تبصرہ آیا ہے جس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی ہے، جو پیش نظر ہے۔"

آئندہ صفحات میں آپ یہ پورا مضمون خود پڑھیں گے اور دیکھ کر آپ خود ہی فیصلہ کر سکیں گے کہ کیا اس مضمون سے وہ ضرورت پوری ہوئی جس کی طرف ان کے بے شمار خیر خواہوں نے انہیں توجہ دلائی تھی اور اس کے جس حقیقت کے واضح تر اظہار پر مشتمل ہونے کی بات خود حضرت مولانا نے والد ماجد مدظلہ کے نام اپنے مکتوب میں فرمائی تھی، وہ "حقیقتِ منتظر" کیا وہی تھی جس کے حضرت مولانا کی طرف سے واضح تر اظہار کا انتظار کیا جا رہا تھا یا وہ کوئی اور حقیقت تھی جس کے اظہار کی سوائے خود حضرت مولانا کے، کسی اور کو شاید ہی کوئی ضرورت محسوس ہوئی ہو، یعنی یہ کہ ندوۃ العلماء اور اس کے بانیوں اور ذمہ داروں کا وہی عقیدہ و مسلک ہے جو عام اہل سنت کا ہے ... اور یہ کہ صحابہ کرام کے تعارف اور ان کی سیر و سوانح کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء نے بہت قابل قدر کام کیا ہے ...."

الفاظ کے درجہ حرارت کا فلسفہ ہم نے حضرت مولانا مدظلہ ہی سے سنا تھا۔ اسی کی روشنی میں ان دونوں مضمونوں، یعنی مولانا عبداللہ عباس صاحب اور حضرت مولانا مدظلہ کے مضمونوں کا درجہ حرارت ناپا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نکلے گا ــــ یہ دونوں مضمون آپ الفرقان کے اسی شمارہ میں پڑھیں گے لہذا ان کے اقتباسات یہاں پیش کرنا بے ضرورت ہوگا۔ تاہم چند جملے تو سنتے ہی چلئے مولانا عباس صاحب فرماتے ہیں:

آپ نے اپنے مکتوب میں عزیزوں اور احباب سے خواہش کی ہے کہ اس بارے میں عجلت نہ کی جائے اور اسے کوئی محاذ نہ بنایا جائے۔ اس عاجز کے خیال میں اس کی واحد شکل یہی ہے کہ آپ کی طرف سے اس بارے میں وہ کیا جائے جو شرعی واخلاقی طور پر آپ کے ذمّے ہے۔

میں یہ بھی واضح کردوں کہ مسئلہ مولوی عتیق الرحمٰن کی کتاب یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کے بارے میں دو مختلف نقطہائے نظر کا نہیں ہے کہ اس بارے میں پوری اُمّت کا ایک نقطۂ نظر پر متفق ہو جانا کوئی آسان یا متوقع امر نہیں ہے۔ میری فکر وتشویش بلکہ رنج والم کا اصل سبب صحابہ کرام کے ایک پورے گروہ کے بارے میں وہ گمراہ کن اور بے بنیاد خیالات ہیں جن کا بڑی بے باکی کے ساتھ تبصرہ میں اظہار کیا گیا ہے۔ اور جن سے آپ کے اور ندوے کے نام پر دشمنانِ اصحاب رسول کے ہاتھ میں وہ زبردست ہتھیار آتا ہے کہ وہ جسقدر بھی فائدہ اٹھائیں کم ہے ــــــ اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔ والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

والد ماجد کے اس دوسرے خط کے جواب میں مولانا نے اپنے گذشتہ مضمون کی بابت انکے تأثر سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے ایک نئے مضمون کے بارے میں اطلاع دی کہ تعمیر حیات میں اشاعت کیلئے بھیجا جا رہا ہے اس خط کا متن ملاحظہ فرمائیے:۔

محبی مخدوم ومحترم دامت فیوضہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج پہلے سے بہتر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ صحت وقوت عطا فرمائے اور فیوض وبرکات قائم اور وسیع تر فرمائے ماہ مبارک اور اس کے بیشتر اور بعد آپ اور آپ کے متعلقین کے لئے منزل پڑھنے کے بعد

عوتی عش ۱۹ اٹھتے ہیں ــــ ؟؟؟

اِن سوالوں کے جواب کی تلاش میں ایک طویل سفر کرنا پڑا اور پھر ان کا جو جواب حضرت مولانا کی بے شمار نئی وپرانی تحریروں اور تقریروں کے از سرِ نو جائزہ سے ہمیں دریافت ہوا۔ اُس کی طرف آپ بھائی صاحب کے مضمون میں اشارہ پڑھیں گے۔ یہاں اس کے بارے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس تازہ دریافت نے ہم لوگوں کو حیرت واستعجاب کی منزل سے تو نکال دیا۔ البتہ سنی معاشرہ کے مختلف شعبوں مثلاً مطالعۂ تاریخ طرزِ فکر، عقائد اور تصورِ دین کو شیعیت کے نہایت دور رس اور گہرے اور بسا اوقات مخفی اثرات سے پاک کرنے کے اس کام کو مستقل مزاجی کے ساتھ جاری رکھنے کی شدید ترین ضرورت کا سگنل بھی دے دیا جو ادارۂ الفرقان نے بنام خدا چھیڑ رکھا ہے اور جس سلسلہ کی تازہ ترین کاوش واقعۂ کربلا نامی کتاب کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی اہمیت کے ساتھ نوٹ کرنے کی ہے کہ اس کتاب کے بالکل شروع میں والد ماجد حضرت مولانا نعمانی مدظلہ نے سنی معاشرہ پر شیعیت کے اثرات کا تذکرہ اپنے گھر سے بلکہ اپنی ذات سے ہی چھیڑا تھا۔ انھوں نے اپنے مختصر سے ابتدائیہ میں اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں اپنے گھرانے، اور خود اپنے ذہن پر شیعہ مذہب اور شیعی پروپیگنڈے کے اثرات صاف صاف بیان کئے تھے اور اس سلسلہ میں کسی توجیہ کسی تاویل کا سہارا لینے کے بجائے اپنے عام معمول کے مطابق صاف صاف اعتراف کا راستہ اختیار کیا تھا۔

پھر بھائی صاحب نے اپنے مقدمہ میں (صد ۲۲ پر) "سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات" کی جب بات چھیڑی تو وہاں بھی مثال کے طور پر سب سے پہلے والد ماجد کے اسی بیان اور اعتراف کا حوالہ دینا انھوں نے مناسب سمجھا لہذا گزارش ہے کہ آئندہ صفحات میں جو لوگ ندوۃ العلماء کے کچھ ذمہ داروں اور کارکنوں کے بعض خیالات کا تجزیہ پڑھیں کہ ان میں شیعیت کی روح بولتی ہوئی نظر آتی ہے ـــ وہ یاد رکھیں کہ اس تجزیہ کا آغاز خود اپنے ہی شیعیت زدہ افکار و [illegible] کے حوالے اور اپنے ہی گھر میں رائج شیعی رسوم کے تذکرے سے کیا گیا تھا [illegible]

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مجھے ہے حکم اذاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اسی سال (۱۹۹۲ء) کے شروع میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے مقدمے میں اس قسم کی کتاب کی ضرورت پر کلام کرتے ہوئے لکھا گیا تھا اور اسی پر مقدمہ ختم ہوتا تھا کہ:۔

"ہمیں پورا احساس، بلکہ تجربہ ہے ...... کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق نازک قسم کے جذبات سے جڑ گیا ہو ایک صدیوں اور نسلوں سے جمے ہوئے تأثر اور تصوّر کو چھیڑنا ایک پُرخطر کام ہے۔ مزید یہ اس لئے بھی ایک دشوار کام ہے کہ خود اپنے جذبات کی دنیا بھی اس "ایمانداری" کے ہاتھوں جگہ جگہ آزمائش میں پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اُنک کا عمومی تصوّر کچھ نہ کچھ ہم سبھی کو ورثے میں ملا ہے۔ مگر یہ معاملہ جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے' ان معاملات میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دینی زاویۂ نظر کو مجموعی طور سے بہت متأثر کیا ہے' یہ ان معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے شعور کو مجروح کیا ہے جن معاملات نے انصاف پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے' اور حقیقت بینی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی دین تھی اُس سے اُمّت کو بحیثیت مجموعی محروم کیا ہے' اُمّت کا ہر حلقہ (خاص طور سے ہر دینی حلقہ) جو آج اپنے آپ کو معیار حق بنائے ہوئے ہے اور اس طرح حق سب سے زیادہ مشتبہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے' یہ ایسے ہی

معاملات کا رفتہ رفتہ اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے اوّلین اسلامی اور انسانی تقاضوں کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قربان کر دیا جاتا رہا ہے۔ ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش' پرانے حلقوں کے باہمی بُعد میں اضافہ اور ان میں سے ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے نئی باہمی تقسیمیں، یہ سب عذاب اسی انصاف پسندی، حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کے فقدان کا ہے، اس عذاب سے اُمّت کے نکلنے کی کوئی صورت اسکے بغیر نہیں ہے کہ جہاں جہاں سے اس فساد کی ابتداء ہوتی نظر آتی ہے' وہاں وہاں سے اصلاح کے کام کی ہمّت کی جائے۔

پیش نظر کتاب اصلاً تو والد ماجد مدظلہ' کے ایماء کی تعمیل ہے' مگر جس خاص شکل میں اور جس انداز پر یہ تیار ہوئی ہے وہ میرے انہی مذکورہ بالا احساسات کا نتیجہ ہے' برسہا برس سے بڑی شدت کے ساتھ احساس ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی اور انصاف پسندی جس پر تمام دینی اور دنیوی سعادتوں کا مدار ہے ایک عنقا صفت شئی ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سعادت بھی ہمارے یہاں عنقا ہو گئی ہے عاقبت کی خیر تو خدا جانے ہم پر وہاں کا حال وہیں جا کے کھلے گا، دنیا کی ہر سعادت سے' بحیثیت قوم و ملّت محرومی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جو قوم بھی حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرے گی اور مزعومات کو عقائد بنا لے گی وہ لازماً پسماندگی اور محرومی ہی کو اپنا مقدّر بنائے گی۔ اللہ رب العزّت سے دعا ہے کہ اپنا یہ حال بدلے۔ اور یہ کتاب اس تبدیلیٔ حال میں مددگار ہو۔" وآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہِ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

اس نوعیت کی کتاب کے سلسلے میں اگر کسی کو یہ بتایا جائے کہ اس پر کوئی عالمانہ، سنجیدہ اور ...ان نقد و نظر پیش کرنے کے بجائے محض ایک معاندانہ غیظ و غضب اور معاصرانہ تحقیر و تذلیل ...ایک مخالفانہ پروپیگنڈائی مہم کا نشانہ اسے ہماری اپنی ایک ایسی مرکزی اسلامی تعلیم گاہ

ی طرح سے بنایا گیا ہے جس کی ہم سبھی عزت کرتے ہیں اور بقول اس کے موجودہ ذمہ دار وارکے' اسکے وجود نے "اسلامی فکر و شعور، بحث و نظر اور علمی بصیرت اور دوربینی کا ایک دلآویز و درخشاں باب تحریر" ہوا ہے، تو کیا یہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہوگی؟ ــــ اور پھر اگر یہ بھی علم میں آئے کہ اس کتاب کے ساتھ یہ سلوک (اسکو "عالمانہ طرزِ بیان" کی حامل کتاب مانتے ہوئے بھی) تعلیم گاہ کے کسی غیر ذمہ دار یا نسبتاً کم مرتبہ ہاتھ سے نہیں ہوا ہے، بلکہ تعلیم گاہ کے معتمد تعلیم جیسے اُس اہم منصب پر فائز ہاتھ سے ہوا ہے جس منصب پر کبھی ملک کے مانے ہوئے اہلِ علم و نظر رونق افروز رہ چکے ہیں، تو کیا اس خبر پر یقین لانا اور بھی مشکل نہ ہو جائے گا؟ ــــ لیکن یہ دنیا عجائبات اور محیّر العقول باتوں کے سلسلے میں کب بخیل رہی ہے؟ عقلیں حیران ہوا کرتی ہیں اور آدمی مان لینے پر پھر بھی مجبور۔ اس لئے کہ واقعہ واقعہ!

ہماری اس تعلیم گاہ اور دانشکدے کا نام ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) اور اسکے موجودہ معتمد تعلیم ہیں جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا ندوی نے ندوۃ العلماء کے ترجمان پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے جو ایک طویل و عریض مضمون معاصر تعمیر حیات ۱۰ر مارچ ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں تحریر فرمایا ہے اُس کا حال صرف وہی نہیں ہے جس کا اندازہ اوپر کی سطروں سے کیا گیا ہوگا۔ اور جو ندوۃ العلماء کی شہرت کے پیشِ نظر بجائے خود انتہائی تعجب کے لائق ہے۔ بلکہ اِس معاندانہ رنگ کے غیظ و غضب اور تحقیر و تذلیل کے ساتھ ساتھ جس کا نشانہ کتاب اور اُس کا مصنّف ہے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ایک پورے گروہ کو بھی اس تبصرے میں تقریباً خارج از اسلام کر دیا گیا ہے جو فتح مکّہ تک اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدّمقابل رہا تھا اور اس فتح کے بعد یا اس کے دوران میں ہی اسلام میں داخلے پر راضی ہو سکا تھا تبصرہ نگار معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کا کہنا ہے کہ :۔

"کربلا کا واقعہ بنو امیّہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE)

تھا۔ وہ عداوتیں جو ظہورِ اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں اُبھر کر سامنے آئیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے ۲۱ سال تک شدّ و مدّ سے قائم رہیں، غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقے کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اسکے سربراہ ابوسفیان تھے۔ اسی طرح غزوۂ اُحد میں اُن کا اور اُن کی اہلیہ جگر خوارِ حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں۔ فتح مکّہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہیدؒ کے استسلام کیا) مگر اس استسلام[1] کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے......"

اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں تھیں، اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا، مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا......"

سچ یہ ہے کہ نفسِ کتاب کے بارے میں جو کچھ اس تبصرے میں لکھا گیا یا "سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ جیسی" جس جذباتی کیفیت کا مظاہرہ اس کے مصنف کے حق میں کیا گیا، جسے جاننے کے لئے قارئین کو پورا تبصرہ حرف بہ حرف پڑھنے کا موقع آئندہ صفحات میں دیا جائے گا[2]، وہ اگرچہ خود بھی ندوہ کی شہرت اور اسکی معروف روایات کی روشنی میں اور پھر ندوہ اور اس کے خورد و کلاں سے ہمارے چالیس پینتالیس سالہ ایسے تعلقات کی روشنی میں جن کی بدولت ہم لوگوں کے کم ایسے جاننے والے ہیں جو ہمیں "یک جان دو قالب" کی نظر سے نہیں دیکھتے، ہماری حیرت اور استعجاب ہی نہیں بلکہ رنج و الم کے لئے بہت کافی ہونا چاہئے تھا لیکن اس تبصرے کا

---

[1] یعنی سپر اندازی [2] اسکے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۱ (ص ۲۹)

ہے تصریحات کی نمائندگی اوپر کا اقتباس کرتا ہے اور جو تبصرے کے ¾ حصہ کو گھیرے ہوئے ہے، جس میں تشیعیت کی روح ہی نہیں، اسکی تبرائی زبان بھی علی الاعلان بولتی ہوئی مل رہی ہے، اس پر اپنی حیرت اپنے استعجاب اپنے رنج اور الم کے اظہار کیلئے تو ہم الفاظ ہی نہیں پاتے۔

ندوۃ العلماء کے تعلیمی نظام کا معتمد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ایسے ناگفتہ بہ خیالات اپنے دل دماغ ہی میں نہیں رکھتا بلکہ ندوے کے ترجمان کے صفحات میں دل کھول کر اُن کا بیان بھی کرسکتا ہے۔ اور اس ترجمان کا ایڈیٹر اور اسکے معاونین کا عملہ جسکی نظر سے تعمیر حیات میں شائع ہونے والا ہر مضمون طباعت کے مرحلے سے پہلے یقیناً کسی نہ کسی مرحلے میں گزرتا ہوگا، اس تشیعیت پرور مضمون کو اسی طرح طباعت کے مرحلے تک پہنچ جانے دیتے ہیں! وہ ندوہ جس کی نظامت پر آج حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فائز ہیں جن کے دور میں ندوے کو ایک نیا اعتبار ہندو پاک کے مستند دینی حلقوں میں حاصل ہوا ہے، اور جن کی نظامت عملاً اختیار کُل کا مفہوم رکھتی ہے، اُس ندوے میں آج وہ ہو رہا ہے جو کبھی اسکے نسبتۃً گئے گزرے دور میں بھی نہ ہوا تھا؟

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

راقم الحروف کیلئے اس بات کا تصور بھی ممکن نہ تھا کہ حضرت مولانا کے زیر نظامت ندوے کے بارے میں کسی بھی مسئلے پر اپنے ایسے خیالات اور احساسات کا اظہار جیسے کہ یہاں ظاہر کئے جارہے ہیں برسرِ عام کیا جائے۔ لیکن اسے بدقسمتی کے سوا کیا کہا جائے کہ اس جسارت سے بچنے کی جو واحد شکل تھی کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب خود اس معاملے میں مداخلت فرمائیں اسکے لئے جو بہتر سے بہتر کوشش اپنے نزدیک ہوسکتی تھی وہ اختیار کی گئی۔ اور پھر اسکے نتیجے کا پورے صبر و ضبط کے ساتھ انتظار کیا گیا حتیٰ کہ آج دم تحریر اُس تبصرے کی اشاعت پر کامل ۱½ ماہ گزر چکا ہے لیکن بدقسمتی کہ :۔

......کچھ نہ دوا نے کام کیا

اور اس لئے آج الفرقان کے صفحات پر اس جسارت کے لئے تیار ہونا پڑ رہا ہے جس کی نہ الفرقان اور اہلِ الفرقان سے کسی بھی واقف کار کو توقع ہوگی اور نہ خود ہمارے خواب و خیال تک میں اس کا گزر ہوسکتا تھا۔

حضرت مولانا علی میاں کے ساتھ اور دار العلوم ندوۃ العلماء اور اسکے اکابر و اصاغر کے ساتھ ہم لوگوں کے تعلقات کی جو نوعیت قریب بینتالیس سال سے رہی ہے، اب اگرچہ اسکے بہت نمایاں دور کو دیکھنے اور جاننے والے بہت زیادہ نہیں رہ گئے، لوگ اٹھتے جاتے ہیں پھر بھی ابھی کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر محسوس کرتے ہونگے کہ ایسے پائیدار اور پُر از اعتماد قریبی تعلقات دنیا میں کم ہوا کرتے ہیں۔ ہم بہر حال اسی طرح سوچتے ہیں اور ان تعلقات میں نشیب و فراز کے مراحل بھی آتے جانے کے باوجود راقم الحروف اپنے بارے میں اور اسی طرح اپنے والد ماجد کے بارے میں بلا کسی تذبذب اور تحفظ کے کہہ سکتا ہے کہ اِن تعلقات کی حلاوت کو کسی بڑی سے بڑی شکایت کی تلخی بھی ایک آنی جانی تلخی سے زیادہ متاثر نہ کرسکی۔ ادھر کافی دن ہوگئے ہیں کہ ہم لوگوں کی راہیں کچھ الگ الگ سی ہوچکی ہیں۔ انتراک عمل کے مواقع ختم سے ہوگئے لیکن سوائے بہت قریبی لوگوں کے کم ہی کوئی اس حقیقت کو محسوس کرتا ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے تعلقات کی کیفیت میں راہوں کی اس گونہ علیحدگی کا نشان الحمد للہ اب تک نمایاں نہیں ہونے پایا ہے۔

ہر چند کہ تعمیر حیات کا تبصرہ اپنے لب و لہجے کی زبان سے صاف پکار رہا تھا کہ تعلقات کی یہ جنت اگر کبھی آباد تھی بھی جس کا تذکرہ ہم کر رہے ہیں، تو زیادہ سے زیادہ اس دن تک آباد تھی جس دن تک کہ "واقعۂ کربلا" پر ایک نئے مطالعے کی روشنی نہیں ڈالی گئی تھی اُس گناہ" کے بعد سے بہر حال اس کا خیال ایک خام خیالی اور "احمقوں کی جنت" کا مصداق ہے، لیکن ہم بہر حال بآسانی اس خیالی جنت سے بھی نکلنے کو آمادہ نہ تھے۔ اس لئے ہر ممکن طور سے

کوشش بھی کی گئی کہ اس انتہائی قابلِ حیرت، قابلِ شکایت اور قابلِ اعتراض تبصرے
پر الفرقان میں لب کشائی نہ کرنا پڑے۔ اور اسکے بجائے حضرت مولانا علی میاں تعمیرِ حیات
ہی کے ذریعے مناسب اور شایانِ شان انداز میں اس شکایت و اعتراض کا ازالہ فرمادیں

بہرحال بدقسمتی غالب رہی، جو ایک عرصے سے اہلِ اسلام کا مقدر ہے، اور حضرت مولانا
ہماری کسی کوشش کے نتیجے میں بھی اپنے آپ کو اُس بات پر آمادہ نہ کرسکے جس کی ہم بجا طور سے
توقع بھی رکھتے تھے، اور مولانا کا فرض بھی سمجھتے تھے۔ اس لئے اُس مقصد سے وفاداری کی خاطر
جس مقصد سے اصلاً کتاب (واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر) لکھی گئی تھی یعنی اصحابِ رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جماعت پر کربلا کے واقعہ کی آڑ میں جو سب وشتم کے تیر آزمائے
جاتے ہیں اور پروپیگنڈے کی ہوائیاں اُڑائی جاتی ہیں نیز انکی ایک دوسری جماعت کو جو
کم ہمت، رخصت پسند اور زورِ باطل کے آگے سرنگوں ہوجانے والا باور کرایا جاتا ہے، تاریخی
حقائق کی روشنی میں ان تمام ایمان سوز کوششوں کی حقیقت اُجاگر کی جائے اور اس بارے
میں مسلکِ اہلِ سنت کو مشتبہ نہ ہونے دیا جائے، اس کی خاطر اپنی زندگی کا یہ سخت ترین اور
مشکل ترین فیصلہ ناگزیر ہوا کہ ضرورت کی حد تک اور حدود کی حسبِ توفیق ممکن رعایت کے
ساتھ کچھ عرض کیا جائے لیکن اس سے پہلے وہ کوششیں سامنے آجانی چاہئیں جو اس
فیصلے سے بچنے کے لئے کی گئیں اور ناکام رہیں۔

(۱)

تبصرے میں جہاں تک کتاب اور اسکے مصنف کے متعلق قابلِ شکایت حصّے کا
تعلق تھا، اُس کے لئے تو خود راقم الحروف نے، ادباً حضرت مولانا کے بجائے تبصرہ نگار کو
مخاطب کرتے ہوئے ایک عریضہ لکھا لیکن اصل میں تمام تر گذارش حضرت مولانا ہی سے
مقصود تھی جس کی بنا پر ایک کاپی حضرت مولانا کی خدمت میں بھی ارسال کی گئی۔ اس عریضے
متن کے لئے دیکھئے ضمیمہ ۲ (ص۳۹) نیز ایڈیٹر تعمیرِ حیات کے نام ایک مراسلہ بھیج کر
درخواست کی گئی کہ وہ اسے اپنے مؤقر جریدے میں جگہ دیدیں۔ (اسکے متن کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ ۳
(ص۴۲) ان دونوں میں سے صرف آخر الذکر کی محض رسید اب تک مل سکی ہے جب کہ تعمیرِ حیات کی دو
اشاعتیں نکل چکی ہیں۔ لہذا سمجھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی چیز وہاں شائع نہ ہوسکے گی۔

(۲)

رہا تبصرے کا وہ حصہ جس میں اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گروہ کے بارے
میں خالص شیعی زبان اور شیعی ذہنیت کا وہ مظاہرہ کیا گیا تھا جس کا نمونہ شروع کے صفحات
میں دکھایا جاچکا ہے۔ اُسکے لئے خود والد ماجد کو شدید تقاضہ تھا کہ وہ مولانا علی میاں کو
اس بارے میں لکھیں اور دریافت کریں کہ کیا وہ اس سے راضی ہیں؟ اس معاملے میں والد ماجد
مدظلہٗ کی حسّاسیت کا اندازہ کرنا کسی بھی ایسے آدمی کیلئے مشکل نہیں ہے جس نے اُن کی کتاب
"ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" پڑھی ہے، نیز الفرقان کا وہ دو حصوں پر مشتمل ضخیم
خاص نمبر دیکھا ہے جو شیعہ اثنا عشریہ کے کفر و اسلام کے بارے میں اُن کے استفتاء اور اُس کے
جواب میں سیکڑوں علماء کے جوابات پر مشتمل ہے۔ اور اسکے ساتھ وہ اُن کی صحت کے نہایت
کمزور اور نازک موجودہ حال سے بھی واقف ہے۔ ایسا انسان جب دیکھے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء
جہاں انھوں نے کئی سال تک حدیث کا درس دیا ہے جس کی انتظامیہ کے وہ مدتوں رکن رہے
ہیں۔ اور جس کا تمام تر سر رشتہ مولانا علی میاں جیسے اُن کے رفیقِ قدیم کے ہاتھ میں ہے، وہاں اصحابِ
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی گروہ کے خلاف شیعیت کی زبان بولتی سنائی دے رہی ہے تو پھر
اس کا جو حال ہوگا وہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے نہایت کرب کے عالم میں
حسبِ ذیل مکتوب حضرت مولانا کی خدمت میں خصوصی قاصد کے ذریعہ رائے بریلی روانہ کیا:۔

۱۵ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ

صدیقِ محترم جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضٰی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے مزاجِ گرامی ہر طرح بعافیت ہو

میرا جو حال ہے وہ آپ کے علم میں ہے فطری طور پر بات ہر آن آگے ہی بڑھ رہی ہے دعاؤں کا محتاج و سائل ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے آپ کے حق کے مطابق دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔

اس وقت یہ خط آپ کو تعمیر حیات (۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء) میں مولوی عبداللہ عباس صاحب کے مضمون واقعۂ کربلا ..... کے ان حصوں کی طرف توجہ دلانے کے لئے لکھ رہا ہوں جن میں کربلا کے سانحے کو بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا منطقی نتیجہ اور بالخصوص بدر کی شکست کا انتقام بنایا گیا ہے۔ اور یہ کہ یہ لوگ مجبوراً مسلمان تو ہو گئے تھے مگر جس طرح انگریزوں کے دلوں میں صلیبی جنگوں کی شکست کا غم و غصہ اب تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا، نیز یہ کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا، وغیرہ وغیرہ ـــ واقعہ یہ ہے کہ اس کو سن کر اور پھر خود پڑھ کر مجھے جو تکلیف اور حیرت ہوئی ہے اسے اپنے اس وقت کے حال میں پوری طرح بیان کرنے سے بھی میں قاصر ہوں اگر معذور نہ ہوتا تو اس سلسلے میں رائے بریلی کا سفر کرتا۔ اب ان سطروں کے ذریعہ آپ کو توجہ دلا کر یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اس سے راضی ہیں؟ یا اپنی اور ندوے کی طرف سے برأت اور بیزاری کا اظہار کرنا پسند کریں گے؟

مجھے اس مضمون سے جو شدید تکلیف پہنچی اور جس نے آپ سے یہ دریافت کرنے پر مجبور کیا اس میں خاص دخل آپ کی ذات سے رفاقت اور للّٰہی مودّت کے تعلق کے علاوہ اس کو بھی ہے کہ مولوی عبداللہ عباس صاحب کی حیثیت صرف ایک ندوی فاضل کی نہیں بلکہ وہ دارالعلوم کے معتمد تعلیم کے اس منصب پر فائز ہیں جو تعلیمی،

علمی اور دینی لحاظ سے اعلیٰ ترین منصب ہے اور جس پر خود آپ اور آپ سے پہلے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فائز رہے۔

والسلام
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

والد ماجد کے اس خط کے جواب میں حضرت مولانا کا جو مکتوب گرامی موصول ہوا وہ یہ تھا۔

۲۱ رمضان المبارک

رفیق مخدوم و مکرم، گرامی مرتبت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب دامت فیوضہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ، آپ کے خادم عزیزی مولوی ضیاء الرحمٰن مکتوب گرامی لائے، اس وقت کسی کام میں سخت مشغولیت تھی، انکی موجودگی میں پڑھ نہیں سکا، انکو جلد جانے کا تقاضا تھا۔ عنایت نامہ پڑھا تو قلب و دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ یاد نہیں آتا کہ اس سے پیشتر قریب زمانہ میں کسی تحریر یا اثر یا واقعہ کا ہوا ہو، "تعمیر حیات" میں اس مضمون کے نکلنے کے بعد ہی ہم نے اسکے اثر کے زائل کرنے اور ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کے ذمہ داروں کے مسلک و طرز فکر کے اظہار کیلئے اپنا ایک طاقتور و مدلّل مضمون صحابۂ کرام کے مرتبہ اور انکی تشکیل و جود میں اعجاز نبوت کے ظہور کو سامنے لانے کیلئے فوراً اشاعت کیلئے بھیجدیا جو اسی اشاعت میں شائع ہوگا، ممکن ہے پرچہ چھپ گیا ہو۔ یہ وہ مضمون ہے جس کا بڑا حصہ آپ کی معرکۃ الآرا کتاب کے مقدمہ کے طور پر لکھا گیا تھا، پھر کچھ اضافہ کیا گیا اس سے زیادہ وضاحت اور تلافی کی کوشش بھی کی جائیگی۔ افسوس ہے مولوی عبداللہ صاحب ندوی اس وقت یہاں نہیں ہیں امید ہے عید کے بعد آئیں، کوشش کی جائیگی کہ انکے قلم سے بھی کوئی ایسی چیز شائع ہو جس سے یہ بدنمائی یا بدنامی دور ہو۔ اپنے احباب اور عزیزوں سے امید ہے کہ عجلت نہ کریں اور اسکو کوئی محاذ نہ بنائیں کہ اس سے اور زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے اور جہاں تک خبر نہیں پہونچی وہاں تک بھی

پہونچ جائیگی، اس سلسلہ میں ذرا انتظار اور حکمت کی ضرورت ہے۔

خدا کرے مزاج اور صحت پہلے سے بہتر ہو، ہم بھی سخت ضعف اور صحت کی کمزوری کے شکار رہے، رونے برے بھلے ہوئے ہیں۔ عزیزان گرامی مولوی عتیق الرحمٰن اور سجاد میاں کو سلام۔

آپ کا علی

اپنی کتاب "المرتضیٰ" (اردو ترجمہ) کے تیسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ بھیج رہے ہیں، حضرت معاویہؓ کے بارہ میں ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ اہلِ سنت کا صحیح نقطۂ نظر اور فکر سامنے آجائے۔

حضرت مولانا کے اس مکتوب سے ایسا ظاہر ہونا تھا جیسے کہ آپ کو خود بھی تعمیر حیات کے تبصرے کی شناعت اور قباحت کا احساس تھا، مگر اسکے اثر کے ازالے کے لئے جس نوعیت کا اپنا مضمون چھپوانے کی بات آپ نے اسی مکتوب میں لکھی تھی اس سے بالکل امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ کسی بھی طرح سے وہ کسی ازالۂ اثر کا کام دے گا۔ چنانچہ وہ چھپ کر آیا تو کسی ایسے مضمون کی حیثیت سے اسکی شناخت ہی ممکن نہ تھی جو کسی دوسرے مضمون کے اثرات بد زائل کرنے کیلئے لکھا گیا ہو، لیکن اسکی جو دوسری پہچانیں حضرت مولانا نے اپنے مکتوب میں درج فرمادی تھیں اُن کی بنا پر والد ماجد کیلئے اور راقم الحرف کیلئے کہ اسکی نظر سے بھی مولانا کا گرامی نامہ گزرا تھا، اُسکو پہچان لینا بہر حال ممکن ہوگیا۔

یہ ایک دوسرا صدمہ تھا جو والد ماجد کو تعمیر حیات کے تبصرے کی اشاعت کے بعد اپنے ضعف کے اس عالم میں کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا ہے، حضرت مولانا کے اس مضمون کی اشاعت سے اُٹھانا پڑا۔ اسی لئے کہ وہ کسی طرح بھی یہ گمان نہیں کرسکتے تھے کہ اُن کے مولانا علی میاں کے یہاں عزتِ صحابہ کے مسئلے میں ایسے تہاونوں کو بھی خدانخواستہ راہ مل سکتی ہے یا کوئی [illegible] اس معاملے میں دامن گیر ہوسکتی ہے۔ مگر اُن کی اُمید یا کہئے کہ احساسِ فرض نے ساتھ نہ چھوڑا اور ایک دفعہ پھر ایک خصوصی قاصد ہی کا ذریعہ اختیار کرکے ذیل کا خط

حضرت مولانا کی خدمت میں رائے بریلی روانہ کیا۔

۲۸ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ

صدیق محترم جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

گرامی نامہ محررہ ۲۱ رمضان المبارک مع المرتضیٰ (تیسرا ایڈیشن) مل گیا تھا، آپ نے اپنے جس مضمون کا ذکر فرمایا تھا اس کیلئے تعمیر حیات کا انتظار رہا۔ کل وہ بھی آگیا تو آپ کا مضمون پڑھوا کر سنا، سچی بات یہ ہے کہ وہ میری توقع کے تو بالکل برخلاف نکلا۔ کیونکہ اس میں تو مولوی عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کی طرف اشارہ بھی نہیں ہے۔ اس سے اگر کچھ معلوم ہوتا ہے تو یہ کہ مجموعی طور پر جماعت صحابہ اور صحبت نبوی کی تاثیر کے بارے میں آپ کے خیالات یہ ہیں ——— اس عاجز نے جو آپ کو لکھا تھا، اس کا مقصد تو یہ تھا کہ مولانا عبداللہ صاحب کے مضمون کے بارے میں آپ پر خاص ذمہ داری اس لئے عائد ہوتی ہے کہ آپ جس ادارے کے ناظم ہیں۔ اسی ادارے کے وہ رکن رکین بلکہ معتمد تعلیمات ہیں۔ اور وہ مضمون اسی ادارے کے ترجمان کے تبصرے کی حیثیت سے شائع ہوا ہے۔

اگرچہ آپ کے مزاج اور افتادِ طبع سے شاید یہ عاجز دوسرے بہت سے حضرات سے زیادہ واقف ہے، لیکن پھر بھی امید تھی کہ مسئلہ کی غیر معمولی سنگینی کی وجہ سے آپ اس مضمون کے اس حصہ کے بارے میں جس میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سخت ناروا خیالات کا اظہار ہے، ضرور کچھ نہ کچھ فرمائیں گے۔ اور اس طرح ایک بڑے فتنہ کا تدارک آپ ہی کے ذریعہ ہوجائے گا۔ مگر آپ کا یہ مضمون سن کر جیسی مایوسی ہوئی، اسکے اظہار کے لئے بخاص کر آپ کی دیرینہ رفاقت اور آپ کے اوصاف واخلاق کی دلی قدر کی وجہ سے مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے۔ اسی طرح اس گروہ میں بدلے کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا۔ احمد امین نے فجر الاسلام اور اس کے مقدمہ میں طٰہٰ حسین نے اس کی نشان دہی کی ہے۔"

اب ذرا ان جملوں کے درجۂ حرارت کو ناپئے! اور پھر حضرت مولانا مدظلہ کے قلم سے نکلے ہوئے اُن جملوں کا درجۂ حرارت دیکھئے جو ابھی ہم نے نقل کئے ہیں۔ بلکہ احتیاطاً اُس پورے مضمون کا ہی درجۂ حرارت ناپ لیجئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کیا کسی بھی پیمانے سے، اِس کو اُس کا "تریاق" یا "بدرقہ" قرار دیا جا سکتا ہے؟؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا مدظلہ کے اس مضمون اور اس کے بین السطور کو پڑھ کر جیسا شدید جھٹکا ہم لوگوں کو۔ جو ان کی جوتیوں میں جگہ مل جانے کو بھی باعث شرف سمجھتے رہے ہیں۔ لگا، وہ اس صدمہ سے کہیں زیادہ شدید تھا جو مولانا عبداللہ عباس صاحب کے خیالات جان کر ہمیں پہنچا تھا۔

ذہنی صدمے (SHOCK) کی اس کیفیت کی گرفت ہماری عقلوں پر جب کچھ ڈھیلی پڑی تو ایک سوال بڑی شدت سے ہم لوگوں کے ذہنوں میں ابھرا کہ آخر، صحابہ کرام کے ایک مخصوص گروہ کے بارے میں ایسے ناروا خیالات کے متعلق حضرت مولانا مدظلہ کی طرف سے ایسا ٹھنڈا ردِ عمل کیوں ظاہر ہو رہا ہے، کیوں ایسا ہے کہ جس مضمون میں کھل کر صحابہ کرام کے ایک پورے گروہ کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کا دل کبھی صاف نہیں ہوا، یہاں تک کہ آپ صلعم کی وفات کے بعد بھی (پورے زمانۂ خلافت راشدہ میں) ان کے دل کی۔ معاذ اللہ یہی کیفیت رہی..... اُس کے بارے میں ان کے دل پر وہ چوٹ کیوں نہیں لگی جو بالکل عامی مسلمانوں کے دل پر لگی ہے اور اُس گروہ صحابہ کے دفاع میں ان کا وہ زورِ قلم کہاں چلا گیا جس پر اچھے اچھے اہلِ قلم

پابندی سے دعا کی سعادت حاصل کرتا رہا اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا

گرامی نامہ ملا، آپ نے مضمون کے بارہ میں جو تبصرہ اور اپنا تاثر تحریر فرمایا وہ بالکل صحیح تھا۔ رمضان کی مشغولیت اور صحت کی موجودہ حالت میں اتنا ہی کر سکا کہ اپنا ایک پرانا مضمون جو صحابہ کرام کے بارہ میں اصولی اور تاریخی جائزہ کے طور لکھا تھا اس کو اشاعت کے لئے دیدیا، اب آپ کے مکتوب اور تبصرہ کے بعد اس سے زیادہ اور واضح تر اظہار حقیقت کی ضرورت سمجھی اور ایک مفصل مضمون جس میں خاص طور پر نام لیکر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے شرفِ صحابیت اور ان کے درجہ و منزلت کے بارہ میں اظہار خیال کیا گیا ہے "تعمیر حیات" کو بھیجا جا رہا ہے، وہ ان شاء اللہ ۲ اپریل کی اشاعت میں شائع ہوگا، اس مضمون میں صحابۂ کرام کے بارہ میں اہلِ سنت کے عقیدہ و مسلک کا پورا اظہار ہے، اور ساتھ ہی ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کا بھی یہی عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ اور صحابہ کرام کے حالات و مناقب کے پیش کرنے اور انکے سیر و سوانح کی ترتیب و اشاعت میں اسکے سرپرستوں اور فضلاء کا جو حصہ رہا ہے وہ بھی بیان کیا گیا ہے، البتہ حضرت حسینؓ کے اقدام اور واقعۂ کربلا کے بارہ میں ائمہ اہلِ سنت و محققین کا مسلک اور اپنا عقیدہ و مسلک بھی صفائی کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، جس پر ہم جینا اور مرنا چاہتے ہیں، ان شاء اللہ مضمون چھپتے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا جائیگا۔

آپ سے دعا کی درخواست ہے۔ اور امید ہے کہ ضرور فرماتے ہوں گے۔

والسلام مع الاکرام
آپ کا
ابوالحسن علی
رائے بریلی - ۳ شوال ۱۴۱۲ھ

محترم مولانا کے اس گرامی نامے کو پڑھ کر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایک فتنے اور آزمائش کا جو بادل مولانا کے شاگرد اور ندوے کے معتمد تعلیم مولانا عبداللہ عباس ندوی نے اپنے زورِ علم و قلم سے ہم لوگوں پر مسلط کر دیا ہے، مولانا اُسکے صاف کرنے میں باوجود اپنے رفیق قدیم اور مُحبِّ مُخلص کی مکرر توجہ دہانی کے کوئی واقعی دلچسپی لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ وہ ایک نیا مضمون اس قصے کے نام پر لکھنا گوارا فرماتے ہیں مگر پہلے مضمون کی وہ کمی جس کی طرف توجہ دلانا ہی والد ماجد کے دوسرے خط کا مقصود تھا (یعنی یہ کہ پہلے مضمون میں مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کی طرف سرے سے کوئی اشارہ بھی نہیں کیا گیا تھا چہ جائیکہ اس سے براءت اور اسکی اشاعت پر معذرت جو اصل ضرورت تھی) اس کمی کو اپنے دوسرے مضمون میں پورا کر دینے کے کسی ہلکے سے ہلکے ارادے کے اظہار سے بھی مولانا کا خط بالکل ساکت ہے۔ اور اس سے زیادہ المناک بات یہ ہے کہ یہ دوسرا مضمون جو ۲۵ / اپریل کے تعمیر حیات میں نکلا ہے۔ اس میں اگرچہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ مولانا عبداللہ عباس کے تبصرے کی پیدا کردہ ضرورت کی بنا پر لکھا گیا ہے، مگر وہ ضرورت یہ نہیں بتائی گئی ہے کہ اس سے صحابۂ کرام کے ایک گروہ کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، جس گروہ کیلئے کہا گیا ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا، بلکہ ضرورت یہ بتائی گئی ہے کہ:

"اس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی۔"

اور پھر اس وضاحتی مضمون میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ اہلِ ندوہ صحابۂ کرام کے بارے میں وہی عقائد رکھتے ہیں جو اہلِ سنّت کے عقائد ہیں۔

گویا حضرت مولانا کے پہلے گرامی نامے سے جو یہ سمجھا گیا تھا اور جس کا اظہار اوپر کے صفحات میں کیا گیا ہے کہ مولانا عبداللہ صاحب کے مضمون سے آپ کو از خود بھی تشویش اور اُسکے اثرات زائل کرنے کی فکر ہے، وہ تشویش و فکر مضمون کے اُن مہلک اثرات کیلئے نہیں تھی،

جو صحابہ کرام کے کسی گروہ کے بارے میں صحیح العقیدہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر پڑ سکتے تھے بلکہ صرف اُس بدگمانی کیلئے تھی جو تعمیر حیات میں ایک ذمہ دار ندوی کے قلم سے اس طرح کا تبرائی مضمون دیکھ کر ندوہ اور اہلِ ندوہ کے عقائد کے بارے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ اب ہم مولانا عبداللہ عباس کو کیا کہیں؟

بہرحال جو کچھ بھی کوشش اس تبصرے کے سلسلے میں اس بات کیلئے کی جا سکتی تھی کہ الفرقان کے صفحات پر کچھ نہ لانا پڑے اور مولانائے محترم کے ذریعے تعمیر حیات ہی کے صفحات میں یہ فتنہ دفن ہو کر رہ جائے، وہ ہر کوشش حضرت مولانا کے اس تازہ مضمون کے بعد مکمل ناکامی سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ اور اب اسکے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ ایک کتاب پر تبصرے کے نام سے اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی محبت کے پردے میں اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت جو گمراہ کن اور فتنہ و انتشار انگیز خیالات ندوہ جیسی مؤقر اسلامی تعلیم گاہ کے منبر سے نشر کئے گئے ہیں ان پر حسب توفیق علمی اور دینی تنقید کا فرض ادا کیا جائے ———

اس تنقیدی فریضہ کیلئے ہم آئندہ صفحات میں ایک دوسرے مضمون کی بساط بچھاتے ہیں۔ آیئے وہاں چلیں۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ۔ ا ے

ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) مئی جون ۱۹۹۲ء از ص ۱۳ تا ص ۲۸

ضمیمہ ۱

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر

تعمیر حیات کا تبصرہ

از قلم مولانا عبداللہ عباس ندوی

[ذیل میں ادارۂ الفرقان کے زیر اہتمام شائع ہونے والی تازہ کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان "تعمیر حیات" کا تبصرہ شائع کیا جا رہا ہے جو ندوے کے معتمد تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کے قلم سے معاصر کی اشاعت ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا ہے۔

الفرقان کے اس شمارے میں متعدد مضامین اسی تبصرہ کے متعلق ہیں جنھیں پڑھ کر بہت سے قارئین کو ضرورت محسوس ہوگی کہ یہ تبصرہ بھی ان کے سامنے ہو اسی ضرورت کے ماتحت یہ تبصرہ بعینہٖ شائع کیا جا رہا ہے۔ اور نقل میں کوئی تبدیلی نہ ہو اس غرض سے الفرقان کے کاتب سے کتابت کرانے کے بجائے "تعمیر حیات" ہی کے مضمون کا فوٹو لیا گیا ہے۔]

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف مولانا عتیق الرحمن سنبھلی نے آج سے ۲۷ سال پہلے ایک طویل مضمون اس عنوان پر لکھا تھا جس میں مزید اضافوں کے ساتھ اس کو کتابی

شکل دی ہے۔ "تعمیر حیات" میں یہ کتاب برائے تبصرہ آئی ہے اس لئے اس کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اس ۲۶۴ صفحات پر مشتمل کتاب کا مفترضہ تحقیقی نتیجہ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ :— "یزید ایک مسلمان خدا ترس پاک سیرت خلیفہ برحق تھا جس کی ولی عہدی عین کتاب و سنت کے مطابق اور اسلامی مقاصد کے لئے عمل میں آئی تھی اور اس کے مقابلہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش شہنشاہیت کے طالب بلا وجہ اپنی جان گنوانے والے شخص تھے"

نتیجہ بحث اگرچہ محمود عباسی اور اس کتاب کا ایک ہی ہے لیکن عباسی کے لہجہ و بیان میں جو بے حیائی اور بے باکی ہے اس سے یہ کتاب پاک ہے، اول الذکر کا طرز بیان مجادلانہ تھا اس کا عالمانہ ہے لیکن (THESIS) دونوں کا ایک ہی ہے، تحقیق کی تکنیک یہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں (ابن کثیر، ابن اثیر، طبری) میں جو واقعات مصنف کے مفترضہ عقیدہ کو تقویت پہنچاتے ہیں ان کو بغیر کسی جرح کے ایک تسلیم شدہ حقیقت کی طرح قبول کیا ہے، اور جہاں ان کے رجحان کے خلاف بات ملی اس کو یا تو استغفر اللہ، نعوذ باللہ کہہ کر قصہ مختصر کر دیا یا اس کے راویوں پر جرح کی اور شخص متعلق کے دوسرے اعمال حسنہ کو گواہ بنا کر اس کے خلاف شہادت

کو خلاف عقل قرار دیا، اور اگر اس سے بھی کام نہ چلا تو اس کو رافضیت و شیعیت کے خانہ میں ڈال دیا۔

تحقیق کا یہ راستہ بہت ہموار اور آسان اور "نئے مطالعہ کی روشنی" کا دعوی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، فاضل مصنف نے کربلا کی ایک روایت کو اپنی تحقیق کا شاہکار سمجھ کر اپنی کتاب میں متعدد جگہ دہرایا ہے، اور ایک تسلیم شدہ حقیقت کی طرح پیش کیا ہے، اس لئے سب سے پہلے ہم اسی پر ایک نظر ڈالتے ہیں، چونکہ مصنف نے بھی آغاز کلام اسی سے کیا ہے اور شاید یہی نئے مطالعہ کی وہ روشنی ہے جو ان کو نظر آگئی ہے۔

ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم

مصنف لکھتے ہیں: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ آمادگی ظاہر کی تھی کہ :

"(وإمّا) أن أضع يدي في يد يزيد بن معاوية فيرى فيما بيني وبينه رأيه"

اس عبارت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ یا تو مجھے چھوڑ دو میں خود یزید بن معاویہ سے جا کر صلح جویانہ انداز میں بات کر لوں، پھر وہ میرے حق میں اپنی رائے دے۔

"وضع اليد في اليد" دست در دست دادن، فارسی کا محاورہ ممکن ہے جن کے معنی بیعت کرنے اور سپرد کرنے کے ہوں تو بعید نہیں ہے عربی میں بھی اسی

اسے عام استعمال میں یہ محاورہ نہیں ہے، یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جہاں مبایعت کا ذکر ہے وہاں۔ بایع، بایعنا، ایبایع ہی آیا ہے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا تذکرہ بھی کہیں کہیں اس کے بعد آتا ہے، وہ بھی ہر جگہ نہیں کنایہ بھی نہیں ہے، اگر کنایہ ہے تو دوستی کے لئے مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے کا مفہوم رکھتا ہے۔ مصنف اور مصنف کے جتنے ہمنوا اور ہم خیال ہیں وہ ایک مثال بھی تلاش کر کے کلام عرب سے پیش کریں کہ "وضع الید فی الید" کسی نحوی ترکیب سے بغیر ذکر مبایعت اس مفہوم میں بولا گیا ہو، ہاں فارسی میں یہ محاورہ ہو سکتا ہے جس کا مفہوم بیعت ہو تو تعجب نہیں چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کی طرف منسوب شعر اسی بیعت کے مفہوم میں ہے۔ ؎

سر داد ونداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

اس میں بھی "سر داد" کا قرینہ مفہوم کا تعین کر رہا ہے۔

مصنف نے جس شد ومد سے مکرر سہ کرر اس جملہ کو دہرایا ہے کہ ان کے لئے اس تسامح کا اعتراف دشوار ہوگا، لیکن ان کے غور کرنے کے لئے ایک گوشہ اور ہے اگر بفرض محال ان کے سمجھے ہوئے مفہوم کو مان لیا جائے کہ یہ کنایہ بیعت سے ہے تو پھر "فیری فیہ بینی وبینہ رایہ" کا کیا موقع رہ جاتا ہے، اور کیا اس سے آپ کے فرض کردہ مفہوم کی تردید نہیں ہوتی؟ یعنی جب بیعت کر ہی لی تو پھر "وہ دیکھے میرے اور اس کے درمیان اس کی کیا رائے ہوتی ہے" کا سوال کہاں باقی رہ جاتا ہے؟

روایات کا تضاد اور اس کا سبب

مصنف کے قائم کردہ مقدمات میں سب سے پہلے یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

"چنانچہ اس واقعہ (واقعۂ کربلا) اور اس کے پس منظر کے واقعات کے سلسلہ میں جہاں بظاہر صحیح اور قابل قبول روایات موجود ہیں وہیں نہایت منکر اور ناقابل قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے"

'صحیح اور قابل قبول' جو بظاہر ہیں وہ کیا درحقیقت بھی صحیح ہیں اور آپ کو جو منکر اور ناقابل قبول روایات نظر آتی ہیں وہ کیا واقعی منکر ہیں، اس کا فیصلہ تو لکھنے والے کا پہلے سے قائم کیا ہوا نظریہ یا رجحان ہی کر سکتا ہے، آپ جس کو جھوٹ من گھڑت کہہ رہے ہیں اس کے جھوٹے اور من گھڑت ہونے کی کیا دلیل ہے یہی نا کہ وہ آپ کے مفروضہ کے خلاف ہے کیا اسی کا نام نئے مطالعہ کی روشنی ہے اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو بدنام

سلمان رشدی بھی یہی کہتا ہے کہ "خیالات واوہام نے تقدس کا جال بنا ہے"۔

درحقیقت مصنف کو جو الجھن پیش آئی ہے اس کے دو اسباب ہیں۔

ایک یہ کہ انھوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کر کے ایک اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا، کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (COSEQUENCE) تھا، وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے ۲۱ سال تک شد ومد سے قائم رہیں غزوہ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اس کے سربراہ ابو سفیان تھے اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے، اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ وغضب کا اظہار کیا تھا۔

حضرت ابو سفیان نے احتجاج کیا تھا کہ اب وہ دن آگیا ہے کہ یہ پسماندہ ہم اشراف پر فوقیت دیئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق کے خلاف حضرت علی کو اکسانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے۔

اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم وغصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔ احمد امین نے فجر الاسلام اور اس کے مقدمہ میں طہ حسین نے اس کی نشاندہی کی ہے، ممکن ہے یہ تجزیہ غلط ہو مگر یہ غلط نہیں ہے کہ حرہ اور کربلاء کے واقعات کو ان خلفشارات سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، لہذا ریسرچ کا نقشۂ عمل (SYNOPSIS) یہ ہونا

چاہیئے تھا کہ پہلے ایک عمومی جائزہ اس وقت کی عقلیت کا لیا جاتا اور نفسیاتی تجزیہ کیا جاتا کہ یہ کشمکش کہاں سے شروع ہوئی اور کس طرح درجہ بدرجہ بڑھی اور کیونکر کم ہوئی اور پھر کس طرح اور کن عوامل کے ماتحت ابھری، اس حادثہ کا سرا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے نہیں غزوہ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے تو تاریخی احداث کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی۔

واقعات جو تاریخ کی کتابوں میں متضاد و متناقض ہیں اس کا سبب کوئی معمہ نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے خلافت راشدہ کے بعد "ملکیت عضوض" کا دور شروع ہوا تو قدرتاً دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جس کو حکومت وقت سے وابستگی تھی خواہ جان بچانے کی خاطر یا طمع کی وجہ سے یا مسلمانوں میں آپس کی خانہ جنگی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر وہ سمجھتا تھا کہ مناسب یہی ہے کہ جس کا غلبہ ہے اس کی تائید کی جائے، دوسرا طبقہ وہ تھا جو اصل دین کی پامالی پر رنجیدہ تھا، اسلامی روح جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے پیدا ہوئی تھی اس کا گلا گھونٹا جا رہا تھا نبیذ کے پردے میں شراب عام تھی (اس وقت کے شعرا ابونواس اور بشار بن برد کے کلام سے اس وقت کا معاشرہ دیکھا جا سکتا

ہے) جواری و قینات کی اتنی کثرت تھی کہ ابوالفرج الاصبہانی نے اغانی میں ۱۸ ہزار دھنیں اور لاتعداد فواحش و منکرات کے قصے قلمبند کر دیے ہیں، جن کی پرورش دربار شاہی سے ہوتی تھی، عدلیہ کا یہ حال تھا کہ حاکم وقت کے دیوان عام میں ایک چمڑے کا ٹکڑا (نطع) بچھا رہتا تھا اور بغیر کسی دلیل و بحث اور بغیر کسی الزام کے جس کو چاہا اس پر کھڑا کر دیا اور جلاد نے اس کی گردن اتار دی، شاہی ٹھاٹ باٹ کسی طرح بھی کسریٰ کے دربار سے کم نہ تھا، لہٰذا وہ لوگ جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ ان کے زہد و ورع اور احتیاط و تقویٰ کی باتیں جانتے تھے اور دوسرے خلفاء راشدین کے ورع و احتیاط کو دیکھے ہوئے یا سنے ہوئے تھے وہ اس فسق و فجور کی گرم بازاری سے نالاں تھے، ان لوگوں میں اسلام سے وابستگی کا جذبہ بھی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت و محبت بھی تھی۔

وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر شے کو عزیز رکھتے تھے آپ کے خانوادے کی انصار مدینہ کی کسمپرسی دیکھ رہے تھے کہ ان کا حال ایسا ہو گیا ہے جیسے وہ مفتوح قوم کے افراد ہوں جن سے فاتح قوم انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے یہ لوگ ان پر ترس بھی کھاتے تھے اور ان کی بلند سیرت اور اعلیٰ کردار کے

چشم دید گواہ تھے، مگر خروج کی عزیمت اپنے اندر نہیں پاتے تھے اور ان کا حال کم و بیش وہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ہمدرد کا حال تھا جو اپنا ایمان پوشیدہ رکھے ہوئے تھا اور وقت آنے پر کلمۂ حق ادا کرنے سے اس نے دریغ نہیں کیا۔

فقال رجل مؤمن من آل فرعون یکتم ایمانه اتقتلون رجلا ان یقول ربی الله۔

اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن شخص جو ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا کہنے لگا کہ تم اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے میرا پروردگار اللہ ہے۔

ایسے حضرات کی روایات بھی تاریخ میں ملتی ہیں، وہ دور کسی روایت کو تحریری شکل میں منضبط کرنے کا نہیں تھا، واقعات پیدائش، حوادث کا حوالہ کبھی موسموں سے دیا جاتا اور کبھی کسی بڑے حادثہ کی نسبت سے بتایا جاتا، واقعات قلم بند کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا، تیسری صدی ہجری میں جب گزشتہ ڈیڑھ سو برس کی روایتیں ایک دوسرے سے سن سنا کر تدوین دور میں پہنچیں تو ان کے اندر جتنا بھی تضاد نہ ہو کم ہے، اور ان قصوں کے راوی دونوں طرح کے لوگ، حکومت کے ہوا خواہ بھی اور اس کے بدخواہ بھی، اس طرح تاریخ کی کتابیں ایک طرح کا اسٹور بن گئیں جن

میں دونوں طرح کی روایتیں موجود ہیں روایات کی تنقیح کا دار و مدار ان اقتباسات سے فائدہ اٹھانے والے کے ذوق و رجحان پر رہ گیا، صحیح اور منکر روایات کا تعین بعد میں آنے والا کاتب اپنے عقیدہ کے مطابق ہی کر سکتا ہے۔

ان قصوں کو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حکومت وقت کا ساتھ دینے والوں کو اپنی بات مشہور کرنے کا زیادہ موقع تھا ان پر پابندی نہیں ہوتی بلکہ ان کی ہمت افزائی ہوتی ہے، وہ رائی کا پہاڑ بنا سکتے ہیں اور پہاڑ کو رائی بنا سکتے ہیں

اور جو لوگ ڈرے سہمے "یکتم ایمانه" کی حیثیت والے ہیں وہ اپنی نسل کو صحیح حالات سے باخبر کرنے کے لئے اپنی معلومات زبانی منتقل کراتے ہیں اور ان کے اندر بھی بعض تناقض پایا جاتا ہے کہ وہ سب مشورہ کر کے ایک رپورٹ تو تیار نہیں کرتے تھے مختلف مقامات کے لوگ تھے جن کے درمیان مسافات طویل تھیں۔

حکومت وقت کے خلاف زبان کھولنا آسان کیا، اپنی موت کو دعوت دینا ہوتا ہے، وہ دور جس میں کربلا کا واقعہ پیش آیا، ایک شخصی حکومت کا تھا، حاکم وقت کے دو لبوں کے درمیان سارا قانون (بین الشفتین) تھا آج بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جو شخص حکومت وقت کی مسلمہ پالیسی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اس کو کس ...

گرفتار کر لیا جاتا ہے، سزا دی جاتی ہے
اور اس ڈر سے لوگ برملا حکومت کے
خلاف زبان نہیں کھولتے حالانکہ چشم
زدن میں اس کی گردن نہیں اڑا دی جاتی،
اس کو دیواروں میں زندہ نہیں چن دیا جاتا
بلکہ جب خوف و ہراس کا اس دور میں
یہ حال ہے تو جب یہ سب کچھ ہوتا تھا۔
اس وقت کتنے ایسے دل گردہ والے ہوں گے
جو اپنے مشاہدات و تجربات کا ریکارڈ رکھ
سکتے تھے لہذا قدرتاً سرکاری علماء سے
وفاداری ثابت کرنے اور افراد کی روایات
کو مجروح کرنے کے اسباب موجود رہے اموی
حکومت اور اس کے بعد عباسی عہد کے
ابتدائی دو سو سال ایسے گزرے ہیں جب کہ
تمام خلفائے بنی عباس ناصبی عقیدہ
رکھتے تھے اس کا ایک نمونہ حضرت امام نسائی
رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مسجد اموی میں جو برتاؤ
کیا گیا اور جس کا تذکرہ تمام سیر و سوانح کی
کتابوں میں موجود ہے کہ ان سے بر سر منبر
حضرت معاویہ کے مناقب دریافت کئے
گئے انھوں نے ایک حدیث سنائی جس
سے ان شامیوں کو حضرت معاویہ کی
توہین معلوم ہوئی انھوں نے منبر سے گھسیٹ
کر اتارا اور ان کے خصیوں پر لاتیں مارتے
ہوئے باہر لائے اور اسی میں ان کی شہادت
واقع ہوئی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے
کہ اس دور میں کلمۂ حق کہنا کس کے بس
میں تھا۔ واضح رہے کہ امام نسائی وہ ہیں
جن کی سنن، صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہے
اور وہ شیعہ یا رافضی نہیں تھے۔ بلکہ اہل سنت
کے ائمہ میں تھے۔

تشیع کا الزام :

طبری کے بارہ میں ابن کثیر نے لکھا کہ
"کان یتشیع لعلی" اور اس سے
یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ لکھنؤ کے تبرائی شیعوں
کی طرح عقیدہ بدا کے قائل، تحریف قرآن
اور افک ام المؤمنین کو صحیح ماننے والا شخص
تھا اور اس طرح جن لوگوں کے بارہ میں
یہ لفظ مؤرخین اور سیرت نگاروں نے استعمال
کیا ہے ان سب کو ساقط الاعتبار قرار دے کر
ان کی روایات کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے
حالانکہ یہ محض سیاسی اصطلاح تھی جو لوگ
بنو امیہ کے مخالف تھے اور خانوادۂ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت رکھتے تھے
ان کے لئے یہ لفظ رجال کی کتابوں میں بکثرت
مستعمل ہے، علامہ ابو زہرہ نے ائمۂ مذاہب
اربعہ حضرت امام ابو حنیفہ، امام شافعی،
امام احمد بن حنبل اور امام مالک کی علیحدہ علیحدہ
سیرت و سوانح عصر حاضر کے تحقیقی انداز میں
لکھی ہیں۔ اس میں سوائے امام مالک کے
تینوں بزرگوں کے بارہ میں لکھا ہے کہ ان
کے اندر شیعیت تھی۔ خاص طور پر امام
ابو حنیفہ کی شیعیت تو اس درجہ دکھائی ہے
کہ جب حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہما نے

ہشام بن عبد الملک کے خلاف خروج
کیا تو امام اعظم سے دریافت کیا گیا کہ آیا
یہ جہاد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:
خروجه يضاهي خروج رسول الله
صلى الله عليه وسلم يوم بدر، و
امدّ جنده بالمال ولكنه كان ضعيف
الثقة في انصاره ولذا قال في
الاعتذار عن حمل السيف معه [1]
زید بن علی رضی اللہ عنہ کا خروج رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کے خروج کے مثل
ہے انھوں (امام ابو حنیفہ) نے فوج
کی مال سے مدد کی، لیکن ان کو انصار زید
پر بھروسہ کم تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ
تلوار اٹھانے سے معذرت کر لی تھی۔
حضرت زید بن علی کا خروج
در اصل حضرت حسین کے خروج علی یزید
کا اتباع تھا اس لئے دلالۃ النص سے
سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک
حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے
خروج کی کیا حیثیت ہوگی۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں
"فيه نزعة شيعية" کا اظہار ان کے
استاد حضرت امام مالک کی مجلس میں کیا گیا
مگر وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹے اور پوری
جرأت ایمانی کے ساتھ یہ شعر کہا:

فإن كان رفضاً حب آل محمد
فليشهد الثقلان إني رافضي [2]

"اگر آل محمد کی محبت ہی رفض ہے تو جن
و انس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔"
لوگوں کو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ
کے عقائد میں بھی شیعیت جھلکتی ہوئی دکھائی
دیتی ہے کیونکہ وہ حضرت سیدنا علی بن ابی
طالب کرم اللہ وجہہ کی خلافت راشدہ کے
بارہ میں اگر کسی نے تردد کا اظہار کیا تو انکو
غصہ آ جایا کرتا تھا اور بقول ابو زہرہ وہ
فرماتے تھے:

من لم يثبت الإمامة لعلي فهو
أضل من حمار"

جو حضرت علی کی خلافت کا قائل
نہیں ہے وہ حمار سے زیادہ گمراہ ہے
اور ان کا یہ بھی قول تواتر سے منقول ہے کہ:
الخلافة لم تزين عليا بل علي
زينها. خلافت نے علی کو شرف نہیں
بخشا بلکہ علی نے خلافت کو عزت دی۔
اور فرماتے تھے: علي بن أبي طالب
من أهل بيت لا يقاس بهم أحد
علی ابن ابی طالب اہل بیت رسول اللہ
سے ہیں ان پر کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا
نیز فرمایا:
ما لأحد من الصحابة من الفضائل
بالاسانيد الصحاح مثل ما لعلي
رضي الله عنه. (یعنی صحیح حدیثوں میں علی کے جتنے
فضائل ہیں وہ کسی کے بھی نہیں ہیں)

اسی طرح بخاری کے رواۃ اور نقاد

---
[1] ابو حنیفہ حیاته و عصره لابی زہرہ ص ۱۶۰۔ دار الفکر العربی قاہرہ
[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو [illegible] ص ۱۴۲

شیعیت کا سراغ لگایا گیا ہے حالانکہ ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جس کو خلافت راشدہ کی اس ترتیب پر اعتراض ہو جو پیش آئی، حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ ہر ایک کو اپنی جگہ پر خلیفہ راشد اور اپنے اپنے وقت میں ہر ایک کو دوسروں کے مقابلہ میں اشرف و افضل سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود محض اہل بیت نبوی سے عقیدت و محبت کی بنا پر ان کو شیعیت سے قریب بتایا گیا، لہٰذا ابن کثیر نے اگر طبری کے بارہ میں تشیع کا الزام لگایا یا رواۃ الاحادیث کے بارہ میں کسی کو شیعہ کہہ دیا گیا تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہ امامیہ یا زیدیہ قسم کے شیعہ تھے اور ان کی روایتیں ناقابل اعتبار ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مصنف نے کربلا کا واقعہ بیان کرنے اور اس کے پس منظر کو واضح کرنے میں جن روایات کو منکر اور گمراہ کن کہا ہے ان کے منکر اور گمراہ کن ہونے کا سبب یہ کافی نہیں ہے، یا صرف اس لیے کہ وہ مصنف کے لئے العیاذ باللہ اور استغفر اللہ کے ضمن کی چیز ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی صفائی اور ان کا دفاع صحابہ سے خوش عقیدگی کا تقاضا ہے مصنف نے ان کو گورنری کے طمع سے بری قرار دیا ہے یہ اچھی بات ہے مگر اس حسن ظن کے اور لوگ بھی تو مستحق ہیں ... کرشمہ جوارح

اور پروردہ آغوش علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کی طرف ہے اسی طرح کا دفاع کیوں نہیں کیا جاتا جب کہ دوسروں کا دفاع کرنے کی بنیاد معروضی نہیں محض خوش گمانی پر قائم ہے لیکن حضرت حسین کے سلسلہ میں صرف اموی عہد کی ان ظالمانہ اور مجرمانہ سرکاری رپورٹوں کو بنیاد بنا کر تحقیق کی عمارت کھڑی کی گئی اور سرکاری سطح کی تیار کردہ عوام پسند نقولوں سے مرتب کی ہوئی تقریروں کو جو حضرت معاویہ اور یزید کی طرف منسوب ہیں ان کو عقیدت کے چوکھٹے میں سجا کر پیش کیا جاتا ہے۔

.. مصنف نے یزید کے اشعار اور اس دور کے نظم و نثر کے مجموعوں کو ناقابل التفات سمجھا ہے جو اس عہد کی ایسی تصویریں ہیں جو جانب داری کے زنگ و لوث سے دور ہیں، اسی طرح عصر حاضر کے محققین جن کا طرز بحث موضوعی ہے اور فکری طور پر وہ کسی گروہ کے پابند نہیں ہیں جیسے عباس محمود العقاد، عبدالقادر مازنی، سید قطب، احمد امین وغیرہ ان کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

مصنف، انداز تحقیق وہی ہے جس کو آجکل کی اصطلاح میں PRESUMPTIV (STUDY.) کہا جاتا ہے پھر بھی یقین ہے کہ کتاب مصنف کے ہم خیال طبقہ میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی، البتہ چلتے چلاتے

" ... کی املاء کا وہ فقرہ نقل کر دینا چاہتا ہوں جو انھوں نے ابوبکر ابن العربی کی "العواصم من القواصم" کے رد "شر القاصمہ" میں تحریر فرمایا ہے، وہ کتاب میرے سامنے اس وقت نہیں ہے مگر اس کا مفہوم یاد ہے۔

"حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی مخالفت ناشی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت سے، وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا دل صاف نہیں رکھتے اور نہ ہی آپ سے اپنی بیزاری و کراہت کو ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں وہ اس راستہ سے اپنے دل کا بخار نکالتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے:

قد نعلم انه ليحزنك الذي يقولون فانهم لا يكذبونك ولكن الظالمين بآيات الله يجحدون

ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں تم کو رنج پہنچاتی ہیں مگر تمہاری تکذیب نہیں کرتے، بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ لوگ حضرت ... حسین سے نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عناد کا اظہار کرتے ہیں"

اس تبصرہ میں صرف اصول بحث اور طریق فکر سے بحث کی گئی ہے پوری کتاب کے تمام مندرجات پر بحث کرنا اور ان کا رد لکھنا نہ پیش نظر ہے اور نہ اس کا وقت ہے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی اس طرح کے مسائل پر گفتگو کرنا چاہتا تو وہ یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔

تلك امة قد خلت، لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون ۔

یہ جماعت گزر چکی ان کو ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے اعمال کا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہ ہوگی۔

ضمیمہ ۲

(عریضہ بخدمت جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی)

دفتر الفرقان لکھنؤ

۷ ارمارچ ۹۲ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر آپ کا تبصرہ تعمیرِ حیات (۱۰ ارمارچ ۹۲ء) میں پڑھا۔ مجھے اس تبصرے پر قدرتی طور سے اُس وقت بھی حیرت ہوتی جبکہ اسکی یہ حیثیت آپکے ذاتی تبصرے کی ہوتی۔ کیونکہ میرا بہت گہرا نہ سہی پھر بھی کم از کم چالیس[۴۰] برس کا اس درجہ کا تعلق آپ سے ضرور تھا کہ اپنے اور اپنی کتاب کے بارے میں اس انداز کے تبصرے کی توقع آپ سے نہیں کر سکتا تھا، چاہے وہ کتنی ہی ناپسند آپ کو ہوتی۔ لیکن یہ تبصرہ اور بھی زیادہ حیرت کا باعث اس بنا پر ہوا ہے کہ آپ کے قلم سے یہ ندوۃ العلماء کے ترجمان "تعمیرِ حیات" کے تبصرے کی حیثیت سے نکلا ہے۔ اور مزید برآں آپ خود ندوے کے اُن فرزندوں ہی میں سے نہیں جن پر ندوہ فخر کرتا ہے بلکہ اُسکے تعلیمی ... جیسے اعلیٰ منصب پر بھی فائز ہیں۔ اور ناظم ندوہ حضرت مولانا علی میاں کے نائب کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس پہلو سے آپ کے تبصرے پر میری حیرت دو باتوں پر مبنی ہے:۔

۱۔ یہ کہ ندوے کی تحریک "وصل" کے لئے اُٹھی تھی، نہ کہ "فصل" کے لئے۔ اسکے مقاصد کی تحریر میں ایک مقصد کا بیان آج بھی بایں طور پایا جاتا ہے کہ "اتحادِ ملّی اور اسلامی اُخوّت کے جذبات کو فروغ دیا جائے۔ (روداد چمن۔ مرتبہ سید محمد الحسنی مرحوم ص ۲۴)

۲۔ یہ کہ میں اگرچہ ندوے کا فرزند نہیں ہوں۔ مگر ۱۹۴۸ء سے، جب سے کہ میں نے اپنے والد ماجد

کے ساتھ لکھنؤ میں قیام اختیار کیا، میرا تعلق ندوہ اور اہلِ ندوہ سے بالکل ایسا ہی رہا ہے جیسا کہ ایک گھرانے کے افراد کا ہوتا ہے۔ خود آپ سے بھی شناسائی کی داغ بیل اُسی وقت سے پڑی۔ اور اس ضمن میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کے ساتھ میرے والد ماجد کے خصوصی اور رفیقانہ تعلق کی بنا پر جو خصوصیت اُس وقت سے آج تک چلی آرہی ہے وہ ندوے کے اندر کس سے مخفی ہے؟

ان دونوں باتوں کے پیشِ نظر میری سمجھ میں بالکل نہیں آسکا کہ ندوے کا آپ جیسا فرزند جو موجودہ انتظامیہ میں ایک اعلیٰ منصب پر بھی فائز ہے اُس نے ندوے کی روایت اور اسکے مقاصد کی اُس اہم دفعہ کے ہوتے ہوئے جو اُخوّتِ اسلامی کے جذبات کی پاسبانی اور فروغ دہی چاہتی ہے، اور اُس پر مستزاد ندوہ اور اربابِ ندوہ کے ساتھ میرے اور میرے گھرانے کے نہایت قریبی اور خصوصی تعلق کے ہوتے ہوئے کیونکہ یہ جائز سمجھا کہ وہ میرے ساتھ تقریباً وہ معاملہ کرے جو ابھی کچھ دن پہلے اس نے عصمت چغتائی نام کی ایک ترقی پسند ادیبہ کے ساتھ اُسے "آگ کا لحاف" اڑھا کر کیا تھا، یا بدنام رشدی کا مماثل مجھے ٹھیرائے؟

آپ نے میری کتاب پڑھ کر محسوس کیا کہ میرے دل میں معاذ اللہ عداوتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا روگ پایا جاتا ہے۔ کتاب تبصرے کے لئے جانے اور تبصرہ شائع ہونے کے بیچ میں آپ سے کئی بار ملاقات ہوئی، کیا اُخوّتِ اسلامی کے ماتحت اور مزید اُن رشتوں کے ماتحت جن کا میں نے اوپر تذکرہ کیا، میرا یہ حق نہیں سمجھا جانا چاہیئے تھا کہ آپ مجھے میری ایمان سوز بدنصیبی کی طرف ایسے مناسب انداز میں توجہ دلا دیتے جس سے توقع کی جا سکتی کہ میں اپنی اس بدنصیبی کا احساس کر کے اُس سے نجات پانے کی کوششیں کروں گا۔ اور آپ کا احسان مند ہوں گا؟ اس کے بجائے آپ نے مجھے سمجھانے اور برادرانہ انداز سے متنبہ کرنے کے تمام مواقع نکال کر یہ تبصرہ شائع کرایا جس میں پوری پوری صلاحیت اس[؟] کی ہے کہ وہ مجھ پر شیطان سوار کرادے۔ اور یہ جو چالیس[۴۰] بیالیس[۴۲] برس کی ایک یگانگت اور باہمی

تعلق واحترام کی صورت بنی ہوئی ہے وہ چشم زدن میں سوخت ہو کر اپنی جگہ ایک "مہابھارت" کو جنم دیدے!۔۔۔ ہر چند کہ مجھے آپ کا جیسا اچھا لکھنا نہ آتا ہو مگر اس میں تو شاید آپ کو بھی شک نہ ہوگا کہ تھوڑا بہت تو میں بھی لکھ ہی لیتا ہوں، اور ایک زمانہ پہلے تو اس طرح کے معرکوں کا بہت عادی رہا ہوں، مگر اللہ کا شکر ہے کہ اپنوں سے سر ٹکرانے کی تو پہلے بھی عادت نہ تھی۔ اور اب تو طبیعت کا انداز اسقدر بدل گیا ہے کہ بڑی سے بڑی اختلافی بات بھی بالکل غیر جذباتی انداز ہی میں کرنے کو جی چاہتا ہے۔

انداز سے قطع نظر آپ کے تبصرے کے نکات پر بھی کئی باتیں کہنے کی تھیں۔ مگر اس سلسلے میں آپ سے مخاطب ہو کر کچھ بھی کہنے کو اس لئے طبیعت آمادہ نہیں کہ آپ نے ایک کتاب کو "عالمانہ" تسلیم کرنے کے باوجود اُس کے ساتھ بجائے عالمانہ کے مخاصمانہ اور معاندانہ معاملہ کرنا پسند کیا ہے۔ یہ اوپر کی بات بھی صرف اس مجبوری سے لکھی ہے کہ ندوہ اور اہل ندوہ کے اور بالخصوص حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء سے جو تعلق چالیس برس پہلے قائم ہو گیا تھا، اس کو جس آزمائش میں آپ کے اس تبصرے نے ڈال دیا ہے شاید میری اس گذارش کے نتیجے میں اس سے خلاصی کی کوئی سبیل نکل آئے۔ اور اسی لئے میں اس کی ایک کاپی حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں بھی ارسال کر رہا ہوں۔

والسلام

خیر اندیش

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ضمیمہ ۳

(مراسلہ بخدمت ایڈیٹر صاحب تعمیر حیات)

از عتیق الرحمٰن سنبھلی

لکھنؤ ۱۸ مارچ ۹۲ء

محترمی ایڈیٹر صاحب تعمیر حیات لکھنؤ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے میری کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر اپنے مؤقر جریدے کی اشاعت ۱۰ مارچ ۹۲ء میں تبصرہ شائع فرمایا ہے۔ میں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔

تبصرہ نگار اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہے ضروری نہیں کہ وہ رائے صاحب کتاب کو پسند ہی آئے۔ یا وہ اسے مبنی بر انصاف ہی سمجھے۔ لیکن کتاب کے بارے میں تبصرہ نگار کے قلم سے اگر کوئی ایسا بیان نکل گیا ہو، جو واقعہ اور اصلیت کے بالکل ہی خلاف ہو یا ایسی کوئی بات لکھدی گئی ہو جس سے کتاب یا مصنف کے بارے میں خواہ مخواہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہو، تو یہ توقع کرنا غالباً معقول ہوگا کہ مصنف اگر اس سلسلے میں کوئی وضاحت یا اظہار حقیقت کرنا چاہے تو مدیر جریدہ کی طرف سے اس کو تعاون میسر آئے گا۔ میں اسی توقع پر مذکورہ تبصرہ کی چند باتوں کے بارے میں نہایت اختصار سے کچھ وضاحت یا اظہار حقیقت یہاں کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ آپ کے فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ:۔

"اس ۲۶۴ صفحات پر مشتمل کتاب کا مفروضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ:۔ "یزید ایک مسلمان خدا ترس پاک سیرت، خلیفۂ برحق تھا، جس کی ولیعہدی عین کتاب وسنت کے مطابق اور اسلامی مقاصد کیلئے عمل میں آئی تھی۔ اور اُسکے

مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب بلا وجہ اپنی جان گنوانے والے شخص تھے"۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میری کتاب کے بارے میں آپ کے تبصرہ نگار کا یہ بیان واقعے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ کتاب کے ۲۶۴ صفحات میں سے کسی ایک صفحے اور ایک سطر کے اندر میرے قلم سے میرے علم کی حد تک کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے مذکورۂ بالا نتیجہ نکالا جا سکتا ہو۔

غالب گمان یہ ہے کہ تبصرہ نگار کو اپنے اُن خاص خیالات کی وجہ سے جو انھوں نے بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنے اس تبصرے میں واقعۂ کربلا سے متعلق ظاہر کئے ہیں، یہ کتاب اتنی ہی ناگوار گزری ہے جتنی کہ محمود احمد عباسی مرحوم کی کتاب گزری تھی جس کا انھوں نے اس موقع پر نام بھی لیا ہے۔ اس لئے جو بات اس کتاب کے حق میں کہی جانی بجا تھی وہی اُنکے نزدیک میری کتاب کے حق میں لکھدی جانی بھی بجا ہو گئی۔ حقیقت اللہ بہتر جانتا ہے۔

میری کتاب کے باب ششم میں ایک جگہ (ص ۱۳۱-۱۳۰) یزید کے بعض مشہور عیبوں کی روایات کو اُسکے ایک خطبے کی بنیاد پر مستبعد ٹھیرایا گیا تھا۔ مگر پھر فوراً ہی یہ خیال کر کے کہ معاملہ بڑا نازک ہے کہیں خواہ مخواہ کسی نازک طبع کو غلط فہمی نہ ہو۔ فوراً ہی ایک استدراکی پیراگراف لکھا گیا کہ:۔

"...... یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورہ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں، ریچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب و کباب میں غرق، لہو و لعب میں مست اور زنا و قمار کا رسیا نظر نہیں آتا .... رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی پرہیزگار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جا سکتا ہو بھی سکتا ہے۔ اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا ......" ص ۱۳۱

تعمیرِ حیات کا تبصرہ پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ احتیاط بھی کسی کام کی نہ ثابت ہوئی۔ قالی اللہ المشتکی۔

رہا حضرت حسین رضؓ کا معاملہ تو کتاب کا ہر قاری بذاتِ خود دیکھ سکتا ہے کہ کتاب میں

جہاں جہاں آپ کا ذکر آتا ہے (اور آپ سے زیادہ آتا ہی کس کا ہے؟) وہاں کس انداز سے، کن الفاظ سے، اور کن صیغوں میں یہ ذکر آتا ہے۔ یہ ادب و اکرام کے صیغے ہیں یا تنقیص و تخفیفِ شان کے انداز؟ البتہ اگر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنّف کی طرف سے آپ کی عظمتِ شان کی تمامتر نگہداری کے باوجود واقعات کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ بالعموم آپ کے شایانِ شان نظر نہیں آتی۔ تو مجھے بھی اعتراف ہے کہ اُس کا یہ احساس صحیح ہے۔ اور یہ بھی اعتراف ہے کہ میرا اپنی جیسی تمام کوشش کے باوجود واقعات کی تصویر آپ کے لحاظ سے اس سے بہتر شکل میں پیش کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔ اور بے شک اس تصویر کے سامنے آنے پر آپ کے حفظِ شان کے اُن تمام اہتمامات اور رعایتوں کے باوجود جو کتاب میں ملحوظ رکھی گئی ہیں، ایک قاری کا وہ تأثر بھی ہو سکتا ہے جس کا اظہار تبصرہ نگار کے الفاظ کرتے ہیں کہ معاذ اللہ آپ نے محض طلبِ اقتدار اور ناعاقبت اندیشی میں اپنی جان گنوا دی۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں محمود احمد عباسی جیسے لوگوں کا پاؤں پھسل گیا ہے ــــ لیکن اگر وہ قاری بے صبری نہیں کرتا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کیلئے مصنف کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کتاب کے آخری باب تک پہنچ جاتا ہے تو وہاں اُسے امام ابن تیمیہ ملیں گے جو اسکی مشکل کو حل کرنے کیلئے فرما رہے ہونگے کہ یہ جو واقعات کا ایک عجیب سا سلسلہ اور سمجھنے نہ سمجھانے کا ایک معمہ نظر آ رہا تھا، یہ بس "اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ" (سورۂ یوسف) کی ایک کرشمہ آرائی تھی: تاکہ سبطِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شہادت کے مرتبے سے سرفرازی ملے ــــ الغرض کتاب نے جس نتیجے تک پہنچانے کی کوشش کی ہے وہ تو یہ ہے۔ آگے آدمی کی مرضی ہے وہ جہاں چاہے پہنچے۔

۲۔ فاضل تبصرہ نگار نے یوں تو میری اس کتاب کی بنا پر مجھے حضرت حسینؓ ہی سے نہیں خود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغض و عداوت کا مجرم ٹھیرا دیا ہے۔ مگر اس کے لئے انھوں نے کتاب کے کسی مقام کا کسی بھی طور سے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس لئے میں اس پر کوئی گفتگو نہ کرونگا۔ البتہ اپنے اس تأثر کے تحت کہ واقعۂ کربلا کا مصنّف معاذ اللہ حضرت حسینؓ کی تذلیل و تنقیص کے درپے ہے، موصوف نے ایک گفتگو یہ کی ہے کہ حضرت حسینؓ کی یزید کے پاس جانے کی پیشکش کے

الفاظ میں جو "وضع الید فی الید" کی تعبیر آتی ہے اُس کا یہ مفہوم بیان کرنا کہ آپ یزید سے بیعت یا خود سپردگی کیلئے تیار ہو گئے تھے صحیح نہیں ہے۔ اور اسکی کوئی سند عربی محاورے سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ اسکے بجائے صحیح مفہوم (یا اُن کے اصل الفاظ میں "واضح مفہوم") یہ ہے کہ آپ "صلح جو انداز میں یزید سے بات چیت کیلئے" تیار ہو گئے تھے۔ اس بارے میں وضاحت کے لئے میری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ موصوف نے خود اپنے بیان کردہ مفہوم کیلئے بھی عربی محاورے کی کوئی سند نہیں پیش کی ہے۔ مگر راقم الحروف انکے قول ہی کو سند سمجھ کر اُن کی اس تصحیح یا ترمیم کو بلا کسی بحث کے بسر و چشم قبول کر لینے کیلئے تیار ہے، اگر اس میں حضرت حسین کی عزّت و حُرمت کا پاس زیادہ ہے۔ مگر اصل معاملے میں اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اصل معاملہ یہ نہیں ہے کہ حضرت حسین بیعت و سپردگی کیلئے تیار ہوئے تھے یا صلح جویانہ بات چیت کیلئے۔ اصل معاملہ جس کی بنا پر کتاب میں وضع الید فی الید کے الفاظ پر زور دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ یزید کی خلافت و حکومت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہو گئے تھے۔ یعنی یہ کوئی ایسا باطل نہیں تھا کہ اس سے کسی حال میں صلح کی ہی نہ جا سکتی ہو۔ کسی حال میں اُسے گوارا ہی نہ کیا جا سکتا ہو۔ غور فرمایا جائے تو صلح جوئی کے لئے تیار ہونے سے بھی یہی بات لازم آتی ہے۔

۳۔ خاکسار نے کتاب کے مقدمہ میں صراحۃً لکھا ہے کہ واقعۂ کربلا کی روایات میں جھوٹ اور سچ کی اس بلا کی آمیزش ہے کہ جن روایات کو ہم نے کسی بنیاد پر صحیح یا قابلِ ترجیح قرار دیا ہے ان کو بھی فی الواقع اور سو فی صد صحیح کہنے کی ذمہ داری ہم نہیں اُٹھا سکتے۔" کتاب کے مقدمے میں اس صراحت کے ہوتے ہوئے تبصرہ نگار کا یہ لکھنا کہ جن کتابوں کو مصنف نے بظاہر صحیح اور قابلِ قبول قرار دیا ہے کیا ضروری ہے کہ وہ درحقیقت بھی صحیح ہوں؟ اسکو سوائے اس کے کیا سمجھا جائے کہ خاکسار مصنف کی یہ صراحت فاضل تبصرہ نگار کی نظر سے چوک گئی۔

۴۔ آپ کا تبصرہ یہ تأثر دیتا ہے کہ مصنّف نے طبری اور ابن اثیر کو شیعہ قرار دیا ہے اور اس بنیاد پر ان کی روایتیں رد کر دی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ کہیں مصنف نے

ان مؤرخین کو شیعہ قرار دیا ہے اور نہ ان کی روایتیں اس بنیاد پر رد کر دی ہیں بلکہ کتاب کا زیادہ تر مواد انہی دونوں کی روایتوں پر مبنی ہے۔

والسلام
خیر اندیش
عتیق الرحمٰن سنبھلی

○

اسوۂ سلیمانی

غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمدان کے خطا کار قلم سے حضرت کعب بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید لکھی گئی تھی جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے

اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی براءت کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش
عذر بہ درگاہ خدا آورد

(سیرۃ النبی جلد اول۔ دیباچہ طبع چہارم) ازخامۂ عنبر شمامہ سید سلیمان ندوی

(ضمیمہ ۴) ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا

صحابہ کرام کے بارے میں مسلک و عقیدہ

صحابۂ کرامؓ کے تعارف اور انکی سیر و سوانح کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء کے سرپرستوں اور فضلاء کا امتیاز اور کارنامہ

از:- مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

اس ضمیمہ کا جواب ملاحظہ ہو [illegible]

"تعمیر حیات" کی اشاعت مورخہ ۱۰ / مارچ ۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس صاحب ندوی کا ایک مضمون "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض ایسے خیالات اور تاریخی تجزیہ و تبصرہ آیا ہے جس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، اسلئے ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی ہے، جو پیش نظر ہے۔

ندوۃ العلماء کے بانی، ذمہ دار اور کارکن اہل سنت والجماعۃ کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے متفقہ اور تحقیقی مسلک کے مطابق "الصحابۃ کلھم عدول" (صحابۂ کرام سب صادق و امین اور معتبر ہیں) کے قائل ہیں۔ اور ان کا ایمان ہے کہ تربیت نبوی اور شرف صحابیت کی وجہ سے وہ سب حیاتِ جاہلیت (عہد قبل اسلام) کے اثرات سے ممکن اور زیادہ سے زیادہ قابلِ تصور حد تک پاک اور محفوظ ہو گئے تھے۔ محققین اور راسخین اہلِ سنت کا عقیدہ ہے کہ امت کا بڑے سے بڑا صاحب صلاح و فضائل فرد، صاحب کرامات و خوارق بزرگ کسی غیر مشہور سے غیر مشہور صحابی کے درجہ کو نہیں پہونچتا ہے۔ کہ صحبتِ نبوی مقبولیت عند اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

حضرت ابوسفیان بن حربؓ (والد امیر معاویہ رضی اللہ عنہما) اسی جماعت کے فرد ہیں۔ اور شرفِ صحابیت کے علاوہ ان کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انکی صاحبزادی حضرت ام حبیبہؓ ازواج مطہرات میں سے ہیں، حضرت ابوسفیان نہ صرف اسلام سے مشرف ہوئے بلکہ جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوئے، اور اس میں پامردی اور اور استقامت دکھائی اور زخمی ہوئے جو انکی قوت ایمانی اور اخلاص کی دلیل ہے۔

اسی کے ساتھ ائمۂ اہل سنت اور اس گروہ کے تمام محقق و معتبر علماء اور نمائندوں کا اس پر اتفاق ہے کہ خلافت راشدہ امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ پر ختم ہوگئی، حضرت معاویہؓ اور ان کے جانشینوں کی حکومت احادیث صحیحہ کے مطابق (جن میں خلافت راشدہ کی مدت کے بارے میں تیس سال کی پیشین گوئی فرمائی گئی ہے)[1] خلافت راشدہ نہیں تھی، یہی حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ[1] اور آخر میں امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کا مسلک اور تحقیق ہے، [2]

اسی طرح گروہ اہل سنت یزید بن حضرت معاویہؓ کو اس دور خیر و برکت میں جماعت صحابہ اور صالحین امت پر حکومت کرنے کا مستحق نہیں سمجھتا اور ان کو (معتبر تاریخ و سیر کی روشنی میں) اس دینداری اور صلاح و تقوی کے معیار پر پورا اترتا ہوا نہیں پاتا۔ جو ایک مسلمان حاکم اور فرماں روا کے لئے (کم سے کم) اس عہد میں ضروری تھا، بلکہ ان کو بہت سے ایسے مشاغل و عادات کا مرتکب و عادی جانتا ہے۔ جو شرعی حیثیت سے قابل تنقید و مذمت ہیں، پھر انہیں کے عہد میں واقعہ حرہ جیسا سنگین اور قابلِ شرم واقعہ پیش آیا جس کی کوئی تاویل ممکن نہیں، یہی رائے امام احمد بن حنبل[3] اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کی ہے[4] وہ دونوں سخت الفاظ میں یزید کی مذمت کی ہے لیکن وہ لعن و طعن، سب و شتم اور تبرا سے محترز اور مجتنب اور رفض و تشیع سے بیزار اور اس کے منکر و مخالف تھے۔[5]

اس کے نتیجہ میں اور اس پس منظر میں محققین اہل سنت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو درست سمجھتے ہیں، جو انہوں نے یزید کے معاملہ اور مقابلہ میں اختیار کیا اور ان کو برسر صواب، شہید راہ حق

---

[1] ملاحظہ ہو ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۱۴۶ ج ۱

[2] "خلفائے راشدین" از مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی، ص ۲۱ مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ ۱۴۱۱ھ ۱۹۹۱ء

[3] ملاحظہ ہو فتاوی ابن تیمیہ ج ۴ ص ۴۸۳ طبع اول ۱۳۸۱ھ الریاض

[4] فتاوی ابن تیمیہ ج ۴ ص ۴۸۰

[5] ملاحظہ ہو شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی معرکۃ الآراء کتاب "منہاج السنۃ"

اور امت کے لئے ایک نمونہ پیش کرنے والا باور کرتے ہیں۔

اگر ایک جمہی جمائی حکومت کے خلاف جس کا حاکم و فرماں روا مسلمان ہو، لیکن اس کی سیرت غیر اسلامی اور اس کے اخلاق و عادات قابل تنقید ہوں اور اس سے مسلمانوں کے اخلاق اور اسلامی معاشرہ پر برے اثرات کے پڑنے کا اندیشہ ہو، کسی قسم کا اقدام "خروج و بغاوت اور انتشار انگیزی کے مرادف قرار دیا جائے تو پھر خاندان سادات ہی کے ان تین صاحب عزیمت افراد، زید شہید، محمد ذی النفس الزکیہ، اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ المحض کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی، جن میں سے اول الذکر نے اموی خلیفہ ہشام ابن عبد الملک ابن مروان اور دو[2] آخر الذکر حضرات نے خلیفہ منصور عباسی کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا جو بہر حال یزید سے غنیمت اور کہیں بہتر تھے، اور دو عظیم الشان فقہاء اور مذاہب فقہیہ اہل سنت کے جلیل القدر بانی امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے ان کی کھل کر تائید و حمایت فرمائی، حضرت زید بن علی بن حسین نے جب ہشام ابن عبد الملک کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو امام ابو حنیفہؒ نے دس ہزار درہم ان کی خدمت میں بھیجے اور حاضری سے معذرت کی۔ [1]

جہاں تک ندوۃ العلماء کے ادارہ اور اس کے فضلاء اور نمائندوں کے احترام صحابہ کے عقیدہ اور جذبہ اور ان کے کارناموں اور عظمت کے اظہار و اشاعت کے کارنامہ کا تعلق ہے، کم ادارے اور مجالس علمیہ (نہ صرف ہندوستان میں بلکہ موجودہ عالم اسلام میں) اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں، اسی ادارہ کے ایک سرپرست اور نامور نمائندہ علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے "الفاروق" جیسی عظیم الشان تصنیف نکلی، جس کی کسی اسلامی زبان میں اپنی طاقت اور برجستگی، محکم استدلال اور بلند علمی معیار میں مثال نہیں ملتی، ندوۃ العلماء کے دوسرے جلیل القدر حامی و داعی اور سرپرست رکن، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے قلم سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سیرت میں "سیرۃ الصدیقؓ" کے نام سے، وہ کتاب نکلی جو اپنی تاثیر اور ایمان افروزی میں کم سے کم اردو میں بے مثال ہے، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ کی "سیرت عائشہؓ" وہ فاضلانہ و محققانہ کتاب ہے جس کے

---

[1] ملاحظہ ہو مناقب ابی حنیفہ ج ۱ ص ۵۵
تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" از مولانا سید مناظر حسن صاحب گیلانی

ترجمہ کی خود عربی میں ضرورت پڑی تھی، ندوہ کے ممتاز فضلاء مولانا عبد السلام ندویؒ کے قلم سے "اسوۂ صحابہؓ" (۱-۲) جیسی شاندار اور مفصل کتاب اور "اسوۂ صحابیات" حاجی معین الدین ندوی کے قلم سے "خلفائے راشدین" اور ان کے اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے قلم سے "مہاجرین" اور آخر الذکر کے قلم سے "سیر الانصار" کے بعض حصے نکلے۔ [1]

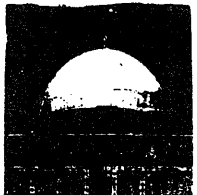

الحمد للہ اس ادارہ کے ذمہ دار اور نمائندے اب بھی اسی عقیدہ و مسلک اہل سنت پر قائم ہیں، اور اب بھی اردو عربی اور انگریزی میں اس مبارک عہد اور اس کے رہنماؤں اور اسلام کے اولین اور بہترین نمائندوں کے تعارف ان کے حالات اور کارناموں کی اشاعت اور ان کے اتباع اور احترام کی دعوت کا وسیع اور مؤثر کام کر رہے ہیں، ان کی تصنیفات کے تراجم ترکی، انڈونیشی، انگریزی اور فرنچ زبانوں میں کئے جا رہے ہیں اور ان ملکوں کا علمی طبقہ انکو وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے

---

[1] یہ سب کتابیں علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سرپرستی میں قائم اور جاری عالمی شہرت کے ادارہ دار المصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے شائع ہوئیں اور علمی حلقوں میں مقبول و متداول ہیں۔

---

[1] ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) مئی جون ۱۹۹۲ء از ص ۲۹ تا ص ۴۹

عتیق الرحمٰن سنبھلی

زاغوں کے تصرّف میں عُقابوں کا نشیمن

تعمیر حیات کا تبصرہ آپ نے پڑھ لیا۔ اب تک کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو یہ تبصرہ پڑھ کر ہم سے ملا ہو اور یہ سوال نہ کیا ہو کہ کیا ان تبصرہ نگار صاحب کو صحابۂ کرام کے ایک گروہ کے ساتھ بغض کے علاوہ آپ سے بھی کوئی عداوت و عناد ہے؟ ہو سکتا تھا کہ ہمارے اس بیان کو مبالغے یا اپنی مظلومیت کا تأثر دینے کیلئے افسانہ طرازی پر محمول کر لیا جاتا۔ مگر اللہ کی کارسازی کے قربان، کہ اُس نے ایک طرح سے "وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا"[1] (شہادتِ یکے از اہلِ خانہ) کی صورت پیدا فرما دی۔ آئندہ صفحات میں آپ اس تبصرے کا ایک اور تجزیہ پڑھیں گے جو ایک ایسے ندوی فاضل کے قلم سے ہے جو اپنے علمی خلوص اور ترقیوں کی بدولت اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ مطالعہ علوم اسلامیہ (ISLAMIC STUDIES) کے پروفیسر کا منصب رکھتے ہیں۔ راقم کو اُن سے کوئی تعارف اور ملاقات یاد نہیں جو امسال فروری میں علی گڑھ کے سفر سے پہلے ہوئی ہو، اگرچہ وہ اس طرح ملے جیسے ایک واقف کار ہی نہیں ایک محب اور قدرداں ملتا ہے، (کیونکہ بقول اُن کے وہ الفرقان پڑھنے والوں میں سے تھے، اور ندوے کی طالب علمی کے دور سے مجھے جانتے تھے) اور بہت ہی خلوص اور تواضع کے ساتھ اپنی یونیورسٹی میں پہنچنے والے اس مسافر کی پذیرائی کی مجھے وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ (پروفیسر لیسین مظہر صدیقی) صاحب بھی اس تبصرے سے نہ صرف بدمزہ ہونگے بلکہ اس کا ایک

[1] سورۂ یوسف آیت ۲۶ (قصہ حضرت یوسف علیہ السلام)

مفصّل علمی اور اخلاقی رد لکھنے کو اس طرح مضطرب ہوں گے کہ:-

گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا[1]

کے مصداق اُن کا یہ سولہ صفحات کا تجزیہ اُس وقت (۱۶ اپریل کو) لکھنؤ آجائے گا جبکہ یہاں اس معاملہ میں لکھنا نہ لکھنا ابھی طے بھی نہ ہوا ہو گا۔ اللہ ان کو اس خلوصِ علم اور اعانتِ حق کی اعلیٰ تر جزاء عطا فرمائے۔ اپنے اس مضمون کے ساتھ عنایت نامے میں پروفیسر صدیقی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ:-

"تعمیر حیات" کے شمارہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کا دلخراش تبصرہ پڑھ کر دماغ کھول اُٹھا۔ اس تبصرے پر استدراک بھیج رہا ہوں، ہو سکے تو الفرقان میں شائع کرا دیں"۔

اپنا پہلا تأثر اس تبصرے کو پڑھ کر یہ تھا کہ کیا ندوہ ملّتِ اسلامیہ ہند کی "زبانِ ہوشمند" بھی اب نہیں رہا؟ حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بارے میں اپنے مطالعے اور تأثر کا نچوڑ بایں الفاظ رقم کیا تھا کہ ؎

ہے دلِ روشن مثالِ دیوبند
اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند

اسی شعر کی تلمیح راقم کے اس تأثر میں تھی۔ دوسرے لوگوں نے اپنے اسی قسم کے تأثر کو "بغض و عداوت" ہونے کے الفاظ سے ظاہر کیا۔

ندوے کی "زبانِ ہوشمند" کا بہترین نمونہ تو مولانا شبلی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بعد، آج خود ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی ذات عالی میں موجود ہے ہمیں مولانا کی جن چیزوں سے عقیدت و محبت رہی اور بڑھتی گئی ان میں سے ایک نہایت

[1] فارسی شاعر کا مصرعہ، جس کا مفہوم ہے کہ مکّے والے ابھی سوئے ہی پڑے تھے کہ ہزاروں میل دور چینی مسلمان احرام باندھ کے کھڑے بھی ہو گئے۔

اہم چیز بھی تھی اور اسے بقدر توفیق اُن سے اخذ کرنے کی بھی کوشش کی آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ایماء پر ردِّ قادیانیت میں کتاب لکھی تو خود قادیانی پریس کا تبصرہ یہ تھا کہ اُن کی زبان میں بڑی شائستگی ہے' اس پہلو سے کوئی شکایت نہیں کی جا سکتی۔ مولانا ایک مُرتد اور مدّعی نبوتِ کاذبہ کی تردید میں کتاب لکھیں اور شائستگی زبان پر حرف نہ آنے دیں۔ اور اُن کے تلمیذ رشید' مولانا عباس ندوی' خود مولانا ہی کے سابق منصبِ مُعتمدیٔ تعلیم' پہ سرفراز ہو کر بھی' مولانا کی شائستہ زبانی کی روش سے اس حد تک بے اعتنائی برتیں کہ ایک ایسے شخص کی کتاب پر لکھتے ہوئے بھی اس شائستہ روش کو اپنانے کی ضرورت نہ سمجھیں جس شخص کا یہی نہیں کہ ندوہ، اُسکے منتسبین اور اکابر و اصاغر سے مختلف سطحوں کا ۴۳ برس پرانا تعلق ہے، بلکہ اُس نے اُن کے استاذ محترم کی، اپنی عقیدت و محبت کی بنا پر، جو مختلف طرح کی قلمی خدمات ایک طویل مدّت تک انجام دی ہیں اُن میں سے ایک خدمت یہ بھی تھی کہ تبصرے کے لئے الفرقان میں کتاب آئی تو بعض دفعہ پوری کتاب کی تلخیص کر کے قارئین الفرقان تک پہنچا دی، جس سے تبصرہ نگار ناواقف یقیناً نہیں ہو سکتے، اس شخص کی پہلی کتاب پر ندوے کے پرچے میں' وہ بھی خود مولانا کے زیرِ سایہ خالص معاندانہ قسم کی سنگ باری کرتے ہوئے کچھ تو سوچا ہی تھا کہ اس کے احساسات پر کیا گزرے گی۔ اور اس گزرے دور کی کیا کیا بات اسے یاد نہ آئے گی!

تبصرے کے روایتی طور پر کچھ آداب بھی ہیں۔ کوئی کتاب سختی سے قابلِ تنقید بھی ہو اور اسکی کمزوریاں نمایاں کرنا ضروری ہوتا ہے، تب بھی اگر وہ کسی بہت ہی مردود و مغضوب اور ناقابلِ رعایت قسم کے فرد یا حلقے و ادارے کی طرف سے نہیں ہوتی تو تبصرے کی اسی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے' اور اپنی رائے کو کسی تعصب کی بدگمانی سے بچانے کیلئے کتاب میں کوئی خوبی اور اچھا پہلو بھی تلاش کر کے نوٹ کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی قابلِ لحاظ

حلقے یا فرد کی کتاب زیرِ تبصرہ ہے تب تو تبصرے میں توازن کی رعایت کا کچھ زیادہ ہی اہتمام کیا جاتا ہے۔ دارالمصنفین ہمارے ملک میں ایک نمونہ کا علمی ادارہ ہے' اتفاق سے یہ بھی ندوی الاصل۔ اُسی کے ایک تبصرے کی مثال اس موقع پر زیادہ موزوں رہے گی۔

مولانا علی میاں صاحب کی کتاب "المرتضیٰ" پہلی بار اشاعت پذیر ہوئی۔ دارالمصنفین کے مجلّہ معارف نے اُس پر بہت مفصل تبصرہ کیا۔ شروع میں اس کا ایک مجموعی تعارف کرایا، پھر تفصیل سے خوبیاں دکھائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ حالانکہ مُبصّر کو کمزوریاں بھی اتنی لمبی نشاندہی کرنی تھی کہ آخر کے پورے چھ صفحے اس کی نذر ہوئے۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ جون ۱۹۸۹ء) اسکے برعکس "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر تعمیرِ حیات کے فاضل تبصرہ نگار نے تبصرہ کا آغاز ہی کتاب کے بارے میں ہٹلر کے نامور وزیرِ اطلاعات و نشریات گوبلز کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا فن اپناتے ہوئے اِس صدفی صد کذب و افتراء سے کیا ہے کہ:

"اس ۴۲۶ صفحات پر مشتمل کتاب کا مفروضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ یزید ایک مسلمان خدا ترس پاک سیرت خلیفۂ برحق تھا جس کی ولی عہدی عین کتاب و سنت کے مطابق اور اسلامی مقاصد کیلئے عمل میں آئی تھی۔ اور اُس کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش شہنشاہیت کے طالب اور بلاوجہ جان گنوانے والے تھے۔"

تعمیرِ حیات (بلکہ الفرقان کا بھی) کون قاری سوچ سکے گا کہ ندوے کے ذمہ داروں میں تعلیمی نظام کی نگرانی اور ذمہ داری کے اعتبار سے نمبر ایک ہستی جو تعمیرِ حیات کے صفحات میں انھیں مختلف قسم کے دینی افادات سے بھی نوازتی رہتی ہے' وہ ایک کتاب کی طرف سے اپنے حلقۂ قارئین کا دل و دماغ مسموم کرنے کیلئے سو فی صد کذب بیانی کا ارتکاب بھی کر سکتی ہے؟

[illegible] مر حال اس بیان کے برعکس سو فی صد یہ ہے کہ کتاب میں کہیں مصنّف نے یزید کے بارے میں [illegible] سے ایک بات بھی کہی ہے۔ اور نہ حضرت حسینؓ کی بابت اپنے قارئین نہ [illegible]

خبیث نتیجے تک پہنچا یا ہے۔ ہاں ہر شخص کے کلام کی ممکن حد تک اچھی وجہ تلاش کرنے کی جو اپنی طبیعت ایک عرصے سے بحمد اللہ بن گئی ہے، اُسکی بنا پر تعمیر حیات کے فاضل تبصرہ نگار کی اس سو فی صد کذب بیانی کی بھی ایک توجیہہ کی جا سکتی ہے، اور وہ یہ کہ انھوں نے پوری کتاب پڑھی نہیں، یا پڑھی تو ایک ایسے اشتعال اور مخالفانہ جذبات کے عالم میں پڑھی کہ نہ پڑھنے ہی کے برابر رہی۔ اور یہ جو کچھ انھوں نے بالکل خلاف واقعہ لکھا یہ صرف اُس تأثر کا نتیجہ تھا جو بظاہر اپنے خاص خیالات کی وجہ سے کتاب کے وہ اجزاء پڑھ کر اُن کے دل میں قائم ہو گیا تھا جو کتاب کی اشاعت سے پہلے الفرقان میں رفتہ رفتہ نکل گئے تھے، جن میں کتاب کا مقدمہ بھی شامل تھا۔[1]

یہ بات اس لئے قرین قیاس ہے کہ ندوے ہی کے ایک نوجوان استاد مولوی سید سلمان صاحب ندوی، جو مولانا علی میاں صاحب کے نہایت قریبی عزیزوں میں بھی ہوتے ہیں انھوں نے بھی کتاب کا مقدمہ الفرقان (بابت مئی جون ۱۹۹۱ء) میں شائع ہوتے پر ایک زوردار تردیدی مضمون، جو خاص طور سے یزید کے فاسق و فاجر اور ملعون ہونے کے دلائل پر مشتمل تھا، اپنے ایک پرچے میں سپرد قلم کیا تھا۔ اور پھر حضرت مولانا علی میاں صاحب نے انہی دنوں (جولائی ۱۹۹۱ء) میں لکھنؤ میں "شہدائے اسلام" نامی جلسوں کے سالانہ پندرہ روزہ پروگرام میں حصہ لیتے ہوئے جو تقریر فرمائی، اُس میں بھی راقم کی کتاب کے مقدمے سے خفگی اور اُسکی تردید کی صاف جھنکار اُن سامعین کو سنائی دی تھی جو وہ مقدمہ اور دوسرے شائع شدہ ابواب پڑھ کر ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔ اور پھر خود میرے کانوں تک یہ جھنکار تقریر کے ایک ماہ بعد ہی خود مولانا ہی کے ذریعے اس طریقے سے پہنچی کہ حضرت مولانا اپنے سالانہ معمول کے مطابق

---

[1] تبصرے کے وقت موصوف کے اشتعال اور عدم توازن کی ایک نہایت کھلی دلیل یہ ہے کہ آج تک ایسا تبصرہ کسی نے نہ پڑھا ہوگا جس میں تبصرہ شروع کرنے سے پہلے یہ بتانے کا خیال بھی نہ رہے کہ کتاب کہاں سے مل سکتی ہے؟ کیا قیمت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اول سے آخر تک غور سے دیکھ لیجئے کہیں ان باتوں کا ذکر نہیں ہے۔

گزشتہ ماہ اگست یا ستمبر ۱۹۹۱ء میں آکسفورڈ (OXFORD) تشریف لے گئے۔ تو میں ایک خاص وجہ سے ـــــ جس کا شاید کہیں آگے ذکر آجائے ـــــ اپنے معمول کے خلاف لندن ہی میں انتظار کر کے مولانا کی واپسی کے وقت ملاقات کر لینے کے بجائے اس بار آکسفورڈ ہی چلا گیا۔ بلکہ دو دفعہ گیا۔ اور دوسری دفعہ رات میں وہاں ٹھیرا بھی۔ تو صبح کو ناشتے کی میز پر جہاں میرے علاوہ مولانا کے بھانجے مولانا سید محمد رابع صاحب، آپ کے خادم عثمان صاحب، میزبان فرحان نظامی صاحب اور اُن کے والد ماجد پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی تشریف رکھتے تھے، مولانا بڑے نظامی صاحب سے مخاطب ہو کر کچھ اپنے یہاں کے ذخیرۂ خطوط کی بات کر رہے تھے جس میں اُن کے بزرگوں کے نام اکابر وقت اور سلاطین وقت کے خطوط کا خاصہ ذخیرہ ہے، بس اسی سلسلۂ گفتگو میں کچھ اس طرح کا جو تذکرہ آیا کہ دوسرے لوگ اُن کے بزرگوں کو اہلبیت کی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے کیسا کیسا اکرام اور اظہار نیاز کرتے تھے، تو ایک دم بات اپنے طبعی حدود سے نکلی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اُس اقدام پر آگئی جس کے نتیجے میں آپ کی شہادت ہوئی، اور اس بارے میں یہ کہتے ہوئے کہ کسی نے حضرت حسین کے اقدام کو غلط قرار نہیں دیا، امام ابن تیمیہ نے بھی یہ لکھا اور مجدد الف ثانی نے بھی یہ لکھا۔ مولانا کی آواز میں ایک برہمی کی آہٹ سنائی دینے لگی، نظر اُٹھا کر دیکھا تو چہرے پر بھی کھلے آثار تھے۔ اسکی کوئی وجہ بجز اسکے سمجھ میں نہ آئی کہ جیسے مولانا نے بھی الفرقان میں شائع شدہ کتاب کے اجزاء پڑھ لئے یا کسی سے اُنکے بارے میں کچھ سن لیا ہے اور وہ ناگوار خاطر ہوا ہے، جیسے کہ بہت سے اُن لوگوں کو ہوا ہوگا جو اس مسئلے میں اُس موروثی اور روایتی طرز فکر کو ناقابلِ نظرثانی بلکہ نہایت مقدس سمجھتے ہیں، جس پر نظرثانی کی اپیل کتاب کے مقدمے میں کی گئی تھی، اور کتاب میں اس نظرثانی والے نہج کو برتا بھی گیا ہے۔ اور اب اس موقع کی مناسبت سے کہ اہلِ بیت کا تذکرہ ہے مجھے سامنے پا کر مولانا کی وہ تہ نشین ناگواری بے ساختہ اُبھر آئی جو کہ مولانا کی مجلس میں اپنی نوعیت کا یہ میرے لئے بالکل پہلا تجربہ تھا۔ غیر معمولی حیرت میں ڈوبا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ ہاں یہ سوچا کیا کہ اگر ایسی بات تھی تو مولانا اپنے بزرگانہ اور مشفقانہ انداز میں

یہ فرما سکتے تھے۔ ناشتے کے بعد مجھے لندن واپس ہونا تھا۔ اور مولانا کو کسی ڈاکٹر کے یہاں جانا۔ مجلس ختم ہوگئی۔

اب تک کی یہ بات تمام تر قیاس و گمان پر مبنی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ کے سامعین کو بھی محض وہم ہوا ہو۔ اور اس خاکسار کو بھی۔ مگر مولانائے محترم کی آکسفورڈ سے واپسی پر بس کوئی ایک مہینہ ہی گزرا ہوگا کہ ایک دن ڈاک میں مولانا کی مجلس تحقیقات و نشریات (لکھنؤ) کا مرسلہ ایک پیکٹ وصول ہوا جس میں لکھنؤ کے جلسۂ شہدائے اسلام کی وہ تقریر بھی مطبوعہ شکل میں بھیجی گئی تھی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ راقم اُس وقت تک اس تقریر سے بالکل بے خبر تھا۔ کتابچے کا عنوان تھا۔

"خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں قدرت و حکمت الٰہی کی کارفرمائی

اور

حضرت حسینؓ کے اقدام میں اُمّت کے لئے رہنمائی"

اِسکو پڑھتے پڑھتے جب حضرت حسینؓ کے اقدام کی بات اس میں آئی تب مجھے بعینہٖ وہ الفاظ پڑھنے کو ملنے لگے جو مولانا کی زبان سے آکسفورڈ میں ناشتے کی میز پر سنے تھے۔ وہاں اس تقریر کے ایک دو جملے ہی مولانا نے دُہرائے تھے، یہاں پورا کلام پڑھنے کو ملا جس میں ایک گھن گرج اور للکار کی کیفیت تھی، تو بات بالکل صاف ہوگئی کہ یہ خاکسار اور اُسکے خیالات کے ہمنوا اور متأثرین ہی تقریر کے اس حصے کے اصل مخاطب تھے، اور اس بات پر اگر کسی مزید شہادت کی بھی ضرورت تھی تو راقم کے نام اس تقریر کا بھیجا جانا، جو کہ کوئی عام معمول کی بات نہ تھی، بالکل کافی و وافی شہادت تھی۔[1]

الغرض فاضل تبصرہ نگار کے اردگرد سے تعلق رکھنے والے یہ واقعات اس بات کا بہت کافی قرینہ ہیں کہ وہ بھی کتاب کی اشاعت سے قبل اس کا مقدمہ اور دوسرے بعض اجزاء الفرقان میں پڑھ کر اسی طرح مشتعل ہوگئے ہوں اور پھر یا تو کتاب پڑھنے کو طبیعت ما رے کر روادار نہ ہوئی ہو اور یا پیشگی قائم ہوئے اپنے تأثرات ہی اس میں بھی پڑھتے چلے گئے۔

[1] اس مسئلے میں مولانائے محترم کے خیالات کا جائزہ بھی کسی مناسب سیاق و سباق میں انشاء اللہ لیا جائے گا۔

توجیہ کے ذریعے دانستہ کذب و افتراء کی فردِ جرم تبصرہ نگار پر سے ہٹائی جاسکتی ہے ۔۔۔ ہمیں ایسا کرنے میں اس وجہ سے خوشی ہوگی کہ وہ ایک ایسی اسلامی درسگاہ کے ایک اعلیٰ عہدہ دار ہیں جس کی عزّت پر ہم نہیں چاہتے کہ کوئی حرف آئے۔ مگر کسی ذمہ داری کی ادائیگی میں ایک سنگین غیر ذمہ دارانہ رویّے کا الزام تو پھر بھی اُن پر آکر رہے گا۔ اور اس سے اُن کو بچانے کی ہمارے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔

دانستہ کذب و افتراء نہ سہی غیر ذمہ داری کی انتہا کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہئے کہ کتاب کے باب نمبر ۶ میں جس کا عنوان ہے "یزید کی ولی عہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟ اور مخالف حضرات کو اختلاف کیوں؟" اس بات پر گفتگو کرتے ہوئے کہ حضرت معاویہ کی وفات کے وقت یزید کی دینی اور اخلاقی حالت تاریخ کی روشنی میں کیا ظاہر ہوتی ہے؟ اُسکے بحیثیت "امیر المؤمنین" اوّلین خطبے کی روشنی میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ:۔

"اس خطبے کی عبارت اس کا مضمون اور اس کا لہجہ ہر چیز اس شخص (یزید) کے بارے میں اُس عام خیال کی تردید کرتی ہے جو کسی واقعی بنیاد کے بغیر صرف اس لئے پھیلنے میں کامیاب ہوگیا ہے کہ اس شخص کی حکومت کے زمانے میں اُس کے حکّام اور لشکریوں کے ہاتھوں ریحانۂ رسولؐ، جگر گوشۂ بتولؓ حضرت حسینؓ کی شہادت المناک واقعہ پیش آیا۔ اور اُس نے اپنے حکّام سے کوئی باز پرس نہ کی اس لئے ایسے آدمی کے متعلق جو بھی بُرائی کسی نے سنا دی وہ قابل یقین ہوگئی"۔ (صفحہ ۱۳۱)

ور اس کے بعد لکھا گیا کہ:۔

"مگر ہے یہ یقیناً اسلامی انصاف کے خلاف بات کہ کسی کے ایک جُرم کی سزا میں اس جُرم سے پہلے کی اُسکی زندگی کو بھی خواہ مخواہ بدنام کیا جائے، ہاں جن لوگوں کے نزدیک جھوٹ سچ ہر طریقے سے صحابۂ کرام کو بدنام کرنا ایک کارِ ثواب ہے اُن کیلئے

بالکل ٹھیک ہے کہ وہ پروپیگنڈے کا یہ تیر بھی جو بہت موقع کا ہے صحابہ کرام ہی کو نشانہ بنانے کی نیت سے چلائیں"۔ (ص۱۳۱)

مگر پھر فوراً ہی یہ خیال کر کے کہ یہ بات جو کہی گئی، کتنی ہی معقول ہو اور کیسے ہی محتاط انداز میں کہی گئی ہو، پھر بھی معاملہ یزید جیسے (بدنام) آدمی کا ہے۔ پتہ نہیں کون نازک مزاج اس بات کا بھی بتنگڑ بنا دے۔ اس لئے فوراً ہی اگلے پیراگراف میں لکھا گیا کہ :-

"یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورہ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں ریچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب وکباب میں غرق، لہو ولعب میں مست اور زنا و قمار کا رسیا نظر نہیں آتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے۔ ...... رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی پرہیزگار ہو یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جاسکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا"۔ (ص۱۳۱)

کتاب کے یہ اقتباسات سامنے رکھئے اور پھر اُس بیان میں کسی سچائی یا واقعیت کو تلاش کیجئے جو فاضل تبصرہ نگار نے اِس کتاب کی بابت یزید کے سلسلے میں بایں الفاظ دیا ہے کہ اس کتاب کا نتیجۂ بحث یہ ہے کہ :-

"یزید ایک مسلمان، خدا ترس، پاک سیرت، خلیفۂ برحق تھا"

کیا اس بیان میں سچائی اور واقعیت کا ایک ذرّہ بھی کتاب کے مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں کسی کو نظر آتا ہے؟ اور کیا یہ امکان بھی کوئی پڑھا لکھا آدمی اِن اقتباسات کو پڑھنے کے بعد محسوس کر سکتا ہے کہ شاید کتاب میں کسی اور جگہ ایسی کوئی بات کہی گئی ہو جس سے تبصرہ نگار کے بیان اور الزام کی تائید ہو جائے؟

مذکورہ بالا الفاظ کے آگے یزید کے بارے میں کتاب کا (مفروضہ) "نتیجۂ ... گیا ہے کہ (وہ) "خلیفۂ برحق تھا جس کی ولی عہدی علی کتاب وسنت ...

اور ... مقاصد کیلئے عمل میں آئی تھی"۔

اس الزام کا بھی یہی حال ہے کہ آدمی پورے بھروسے کے ساتھ کہہ سکتا ہے "سُبحانک هٰذا بُهتَانٌ عَظِيم" اور پھر اسکی دستاویزی تردید کیلئے قارئین کو حوالہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ یہی چھٹا باب جسکے اقتباسات ابھی پیش کئے گئے اسے اول سے آخر تک پڑھنے کی زحمت کریں ورنہ کم از کم شروع کے ۱۴ صفحے (ص۱۱۱ تا ۱۲۴) تو بہرحال پڑھیں وہاں سے تبصرہ نگار کے اس الزام کی قلعی بھی اُن پر کھل جائے گی۔ کتاب کا اتنا لمبا اقتباس ظاہر ہے کہ یہاں نہیں پیش کیا جاسکتا البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ قارئین کرام کتاب کے محوّلہ صفحات (ص۱۱۱ تا ۱۲۴) میں دیکھیں گے کہ یزید کی ولی عہدی کے بارے میں ایک حد تک تائیدی رائے ابن خلدون کے یہاں ملتی ہے جس کا اقتباس مذکورہ صفحات میں دیا گیا ہے، مگر اس میں بھی کہیں یزید کو "خلیفۂ برحق" ٹھہرانے کی بات نہیں ملتی ہے۔ رہا کتاب کا مصنف تو اُس نے اپنی طرف سے تو اس سلسلے میں کوئی ایک لفظ کہا ہی نہیں ہے، البتہ ابن خلدون کی رائے کے ایک جزو کو قابلِ تسلیم بتاتے ہوئے دوسرے ایک جزو پر پورے صفحے کی تنقید کرتے ہوئے اسے قابل بحث ٹھہرایا ہے۔ الزامات کے اسی جائزے کی روشنی میں اگر یہ کہا جاتا ہے کہ تبصرہ نگار نے کتاب پڑھنے کی زحمت ہی نہیں اُٹھائی یا اُٹھائی تو ایسی اُٹھائی کہ وہ نہ اُٹھانے ہی کے برابر رہی تو کیا غلط ہے؟

یزید کی بات تمام ہوئی، اب حضرت حسینؓ کی بابت فردِ جرم (چارج شیٹ) پر آجایئے۔ وہی جو اقتباسات چھٹے باب میں سے اوپر دیئے گئے ہیں، اُن میں کا پہلا اقتباس از سرِ نو پڑھنا شروع کیجئے اور ان الفاظ پر آجایئے ...... "ریحانۂ رسولؐ جگر گوشۂ بتول کی شہادت کا المناک واقعہ ..... کیا جس کتاب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر اس پیرایۂ بیان میں کیا جاتا ہو وہاں اس کا کوئی امکان بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو "ناعاقبت اندیش شہنشاہیت کے طالب، بلاوجہ اپنی جان گنوانے والے"۔ بتایا گیا ہو؟

... معلوم ہے کہ "پھول کی" ایسی "پتیوں" سے یوں تو "ہیرے کا جگر" کٹ سکتا ہے مگر

آدمی جیسی ذی حس مخلوق میں پھر بھی کچھ لوگ ہوتے ہیں جن پر "کلام نرم و نازک" [illegible] نہیں ہو سکتا۔ اور وہ نہیں سمجھ سکتے کہ شہادت کے ذکر کے ساتھ حضرت حسینؓ کیلئے "ریحانۂ رسول" (رسول اکرمؐ کا پھول) اور "جگر گوشۂ بتولؓ" کی تعبیر اختیار کرنا مصنف کے دل و دماغ کے بارے میں کس بات کی شہادت دیتا ہے ایسے لوگوں کی رعایت سے مزید کہنا پڑے گا کہ کتاب میں شروع سے آخر تک کہیں بھی حضرت حسینؓ کے اقدام اور اسکے انجام کے بارے میں اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں لگایا گیا، کوئی رائے نہیں دی گئی۔ اس لئے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے اپنی تفصیلات کی روشنی میں یہ ایک بہت ہی نازک اور پیچیدہ معاملہ تھا۔ اس پر اظہار رائے کتاب کے اندر اگر ملتا ہے تو وہ یا تو حضرت حسینؓ کے معاصر صحابۂ کرامؓ کے کلام میں ہے۔ اور یا کتاب کے آخری باب میں امام ابن تیمیہؒ کے اقتباسات ہیں، جو کہ اُن کی عظیم المرتبت کتاب منہاج السنۃ سے لئے گئے ہیں۔ یہ امام ابن تیمیہؒ کی وہ کتاب ہے جس کی توصیف میں تبصرہ نگار کے استاذ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنی کتاب دعوت و عزیمت کی جلد دوم میں (جو کہ پوری کی پوری امام ابن تیمیہ ہی کی شخصیت، کمالات اور کارناموں کے بیان میں ہے) تحریر فرمایا ہے، اور یاد رکھنے کے لائق تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"ابن المطہر حلّی کی کتاب "منہاج الکرامہ"[1] کے جواب میں انھوں نے "منہاج السنۃ" کے نام سے جو کتاب لکھی وہ اُنکی تمام تصانیف میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے ابن تیمیہؒ کے علمی تبحر، وسعتِ نظر، حاضر دماغی، حفظ و استحضار، پختگی اور اتقان اور ذہانت و طباعی کا اگر صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو دیکھنا چاہیئے مصنف "منہاج الکرامہ" کی عبارت نقل کرنے کے بعد جب اُن کے علم و حمیّتِ دینی کو جوش آتا ہے اور اُن کے علم کے سمندر میں طوفان اُٹھتا ہے اور تفسیر و حدیث، تاریخ و سیر کے معلومات کا

[1] "الف زنان" یہ کتاب ابن تیمیہ ہی کے زمانے میں شیعیت کی حمایت اور سنیت کے ردّ اور مخالفت میں [illegible] امام ابن تیمیہ نے اپنی دو جلدوں کی ضخیم کتاب میں اس کی ہر ہر بحث کا جائزہ لیا ہے۔

لشکر امنڈتا ہے تو بے اختیار اُن کے فریق مقابل سے کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

"یٰاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُہٗ وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ○"[1] (ص ۲۸۶ طبع چہارم)

کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے "واقعۂ کربلا ....." کے غریب مصنّف پر تو اس درجہ کرم فرمایا کہ اس کا بوجھ اُٹھائے نہیں اُٹھتا۔ مگر ابن تیمیہؒ کے کلام پر ایک لفظ نہ فرمایا! غالباً وہی بات کہ پڑھا نہیں گیا۔ اور یا پھر وہی یٰاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ[2] الآیہ کا مشورہ اپنے لئے بھی نہایت مناسب سمجھا گیا جو مولانا سید ابوالحسن علی صاحب نے ابن المطہر حلّی کو دینا تجویز کیا تھا!

بات ناتمام رہے گی اگر یہ نہ بتایا جائے کہ ابن تیمیہؒ اگرچہ یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کے اقدام کی صحت کے قائل ہونے سے انکار کرتے ہیں اور اُنہی کے کیا وہ تو ایک صاف کھلے شرعی اصول اور عقائد اہلِ سنت کی بنا پر حضرت عائشہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے اُن اقدامات کی صحت کا قول بھی اپنے لئے ممکن نہیں پاتے جن کے نتیجے میں جمل اور صفّین کی باہمی خونریزی مسلمانوں میں ہوئی۔ مگر اتنی ہی صفائی کے ساتھ اور بلا کسی شک و شبہے اور تحفظ کے وہ ان تینوں بزرگوں کو مقبولانِ بارگاہِ حق اور جنت الفردوس کے ساکنوں میں جانتے ہیں اور اِن کے اقدامات کی خطا کو اجتہادی خطا سمجھتے ہیں جس میں مجتہد نہ صرف معذور ہوتا ہے بلکہ ماجور بھی۔

محمود احمد عباسی کی کتاب اور واقعۂ کربلا کا مصنّف

کتاب کی بابت مندرجہ بالا صدفی صد کذب باخلاف واقعہ بیان کے بعد ایک اور

[1] النمل - ۱۸ - قرآن پاک کی ۲۷ ویں سورہ نمل کے یہ الفاظ آیت ۱۸ میں آئے ہیں ان کا ترجمہ ہے کہ "اے چیونٹیو اپنے بلو[ں] [میں] گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کا لشکر (جو آرہا ہے) انجانے میں تمہیں کچل ڈالے

[2] [illegible] اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ الخ

”ششش شاید قارئین کے دل و دماغ کتاب کیلئے بالکل ہی بند کر دینے کے جذبے ہی میں جناب تبصرہ نگار نے اس عنوان سے کی ہے کہ محمود احمد عباسی مرحوم کی کتاب (خلافتِ معاویہؓ و یزید) جس کے حصے میں بہت سوں کی قدردانی کے ساتھ بڑی بدنامی بھی اپنے وقت میں آئی تھی، اس کتاب کو اس موقع پر یاد کر کے حکم لگایا ہے کہ ان کی زیرِ تبصرہ کتاب اور محمود احمد عباسی کی کتاب میں صرف لہجے اور اندازِ بیان کا فرق ہے، ورنہ ”نتیجۂ بحث“ دونوں کا ”ایک ہی ہے“۔

... کس کس بات پر فریاد کی جائے۔ ایسا ظلم تو زمانے میں کم ہی ہوتا ہے، محمود احمد عباسی کی کتاب سے دو تین جگہ تو اسی کتاب کے اندر اختلاف کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص۱۳۶ (حاشیہ) اور ص۱۷۱ اسکے علاوہ اُس کتاب پر راقم الحروف ہی کے قلم سے الفرقان (بابت رمضان شوال و ذی قعدہ ۱۳۷۹ھ) میں بہت مفصّل تبصرہ اسکے پہلے ہی ایڈیشن پر نکلا تھا۔ اس میں جیسی تنقید اس کتاب پر کی گئی ہے، اگر خودستائی نہ کہا جائے تو شاید دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، آیئے اس کے چند ٹکڑے یہاں بھی پڑھ لیجئے۔

(۱)

”کتاب اب تک جس انداز میں بھی متعارف ہوئی ہو، ہمارے نزدیک مؤلف کا اصل مطمح نظر اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ بنی اُمیہ سے شروع ہونے والا عہدِ خلافت جو مشہور تاریخی روایات کی روشنی میں اپنے بعض پہلوؤں کے لحاظ سے اسلامی تاریخ پر ایک افسوسناک اور وحشت انگیز دھبہ بن کر نمایاں ہو گیا ہے۔ اس سے متعلق روایات کو من وعن مان لینے کے بجائے حتی الامکان روایات کی تنقیح کی جائے، اور واقعات کی ایسی توجیہ کی جائے کہ وہ اسلامی تاریخ کے چہرے پر بدنما داغ بن کر نمایاں نہ رہیں۔

لیکن اسکے ساتھ ہماری رائے یہ بھی ہے کہ اس کام میں جس توازن کی ضرورت تھی عباسی صاحب اس توازن کو بالکل نہیں برت سکے ہیں جس کے نتیجہ میں یہ کاوش ایک سخت قسم کے ردّعمل کی سی صورت اختیار کر گئی ہے، علاوہ ازیں تو

اپنے مطمح نظر کی تحصیل کی خاطر بعض باتیں تحقیقی دیانتداری سے مختلف قسم کی ... کر گئے ہیں۔

(۲)

”اموی خلافت کا پس منظر تیار کرنے میں عباسی صاحب نے بڑے جانبدارانہ بلکہ غیر دیانتدارانہ طریقوں تک سے کام لیا ہے۔ اور اُن کی اس ردِّعمل والی غیر منصفانہ روش کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ اب جو لوگ اس کتاب کے جواب لکھ رہے ہیں وہ بھی ردِّعمل ہی کی کیفیت میں ڈوب کر لکھ رہے ہیں۔ اور اس طرح صحابہ کے احترام اور انکے معاملات میں کفِ لسان کا مسلک اس ردّعمل کی چکی میں بُری طرح پس رہا ہے۔“

(۳)

غرض یہ ہے عباسی صاحب کا معاملہ کہ وہ یزید اور اس کے اعوان کی فضیلت و مدح میں نہ صرف ہر رطب و یابس کو سر آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں، بلکہ واعظانہ نکات آفرینی تک سے دریغ نہیں کرتے لیکن سیدنا حسینؓ کی مدح و ستائش پر اسی طرح چیں بہ جبیں ہوتے ہیں جیسے کہ اُن کے گھر سے کچھ جا رہا ہو اور دور از کار قیاس آرائیوں کا پورا زور صرف کر کے چاہتے ہیں کہ اس مدح و ستائش کا ایک ایک لفظ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں۔“

(۴)

”کتاب کی دوسری اہم بحث حضرت حسینؓ اور یزید کے نزاع کی حقیقت اور اُس کے شرعی محاکمہ کی ہے۔ اس بحث میں بھی مؤلف نے حسبِ عادت بڑی افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایک طرف وہ یزید کی پوزیشن مضبوط کرنے کیلئے غیر ثابت شدہ دعوؤں اور عبارت آرائی و سخن پروری کے فن سے کام لیتے ہیں۔ دوسری طرف حضرت حسینؓ کا کیس کمزور کرنے کیلئے مستشرقین کا گندہ اسلحہ

کرنے سے بھی نہیں چوکتے"۔ (الفرقان ماہ رمضان، شوال، ذی قعدہ ۱۳۷۹ھ)

اس سے زیادہ اس کرم فرمائی پر کیا کہا جائے؟ ہاں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ طرزِ بیان کے اعتبار سے اس کتاب کو عباسی کی کتاب کے مقابلہ میں "عالمانہ" ہی نہیں بنا دیا گیا بلکہ یہ بھی کہ:-

"عباسی کے لہجہ و بیان میں جو بے حیائی اور بے باکی ہے اس سے یہ کتاب پاک ہے"۔

سبحان اللہ! کیا کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان اور تعریف و اعتراف ہے کہ "بے حیائی سے پاک ہے"۔ ع تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم

۱۰ کالم کے لمبے چوڑے نام نہاد "تبصرے" میں ۲۶۴ صفحے کی کتاب کے اندر متعین طور سے صرف ایک جگہ انگلی رکھ کر کوئی تنقید کی گئی ہے، ورنہ یا (بقول ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی) "جلے دل کے پھپھولے پھوڑے گئے ہیں" یا کچھ تحقیق و ریسرچ کے اصول و قواعد سکھائے گئے ہیں اور یا اصحاب نبیؐ کے ایک گروہ کو دشمنِ نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) بنا کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا گیا ہے ـــــ اور وہ واحد متعین تنقید بھی ایسی الجھی ہوئی ہے کہ جیسے درمیان تحریر وہ خود بے یقینی اور کشمکش کا شکار ہو گئے ہوں۔ حضرت حسینؓ کے بارے میں اس روایت کو کتاب میں بار بار دہرائے جانے پر کہ آخری مرحلے میں "یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے" کو تیار ہو گئے تھے، ایک اندازِ تکدر میں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"فاضل مصنف نے کربلا کی ایک روایت کو اپنی تحقیق کا شاہکار سمجھ کر اپنی کتاب میں متعدد جگہ دہرایا ہے۔ اور ایک تسلیم شدہ حقیقت کی طرح پیش کیا ہے"......

تبصرہ نگار کے ان الفاظ سے ہر سمجھدار قاری یہی سمجھے گا کہ اب اس روایت کی "تسلیم شدہ" حیثیت کو چیلنج کیا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اُس مفہوم کو چیلنج کیا جاتا ہے جو مفہوم اس روایت میں حضرت حسینؓ کے الفاظ (وَاِمَّا ان اضع یدی فی ید یزید بن معاویۃ الخ) کا کتاب کی بحث سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ آپ بیعت یا سپردگی کیلئے اور اپنا فیصلہ یزید پر چھوڑنے کیلئے آمادہ ہو گئے تھے۔ فرماتے ہیں:-

"وضع الید فی الید" دست در دست دادن۔ فارسی کا محاورہ ممکن ہے جس کے معنیٰ بیعت کرنے اور سپرد کرنے کے ہوں تو بعید نہیں ہے عربی میں کہیں کسی لغت یا کسی استعمال میں یہ محاورہ نہیں ہے[1]۔ یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جہاں مبایعت کا ذکر ہے، وہاں بایع، بایعنا اور لیبایع ہی آیا ہے اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھنے کا تذکرہ بھی کہیں کہیں اسکے بعد آتا ہے وہ بھی ہر جگہ نہیں۔ کنایہ بھی نہیں ہے۔ اگر کنایہ ہے تو دوستی کرنے اور مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے کا مفہوم رکھتا ہے"۔

روایت میں حضرت حسینؓ کی طرف منسوب اُن الفاظ کے ساتھ جن کا ترجمہ ہے کہ "یا پھر یہ صورت قبول کر لو کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں" مزید یہ الفاظ بھی بیشتر روایتوں میں ملتے ہیں "فیری فیما بینی وبینہ رأیہ" یا "فیحکم فیّ ما رأی"۔ اِن الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاضل تبصرہ نگار نے مصنّف کو توجہ دلائی ہے کہ اگر "ہاتھ میں ہاتھ دینے" یا رکھنے کا مفہوم بیعت ہی لینے پر مصنّف کو اصرار ہے تو سوچنا چاہیئے کہ پھر آگے کے ان الفاظ کی یہاں کیا تُک بیٹھے گی جن کا مطلب ہے کہ "پھر وہ (یزید) دیکھے کہ میرے اور اُسکے درمیان اُسکی کیا رائے ہوتی ہے"؟

[1] اگر کسی قاری کو اس عبارت کا مطلب سمجھنے میں دقت ہو تو یہاں تک عبارت کا جو مطلب سمجھ میں آتا ہے مطلب یہ ہے کہ فارسی محاورے میں ممکن ہے کہ دست در دست دادن کے معنیٰ بیعت یا سپردگی کے ہوں، عربی میں یہ نہیں ہیں۔

"یعنی جب بیعت کرہی لی تو پھر وہ دیکھے کہ میرے اور اُس کے درمیان اُس کی کیا رائے ہوتی ہے کا سوال کہاں باقی رہ جاتا ہے؟"

محترم تبصرہ نگار کی اصل بحث کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ کہے بغیر اب نہیں رہا جاتا کہ آخر یہ کونسی اردو ہے جو انھوں نے اس تنقیدی بحث میں استعمال کی ہے؟ اوپر بھی قارئین کیلئے .. دکی کچھ زیادہ ہی ضرورت محسوس کرکے ایک توضیحی حاشیہ لکھنا پڑا (ورنہ حاشیہ طلب تو اس درمیان میں اور بھی کئی جگہیں تھیں) اور اب "فیریٰ فیما بینی وبینہ رأیہ" کا یہ ترجمہ یا مطلب جو انھوں نے لکھا ہے کہ "پھر وہ دیکھے کہ میرے اور اُسکے درمیان اُس کی کیا رائے ہوتی ہے" لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہ، یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم کی اردو ہے! آخر کس عالم میں انھوں نے یہ تبصرہ لکھا ہے کہ نہ الفاظ ٹھیک نہ اُن کا دروبست ٹھیک؟ سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ عبارت کو ٹھیک کرنے کا اُن کے پاس وقت نہیں تھا تو تبصرہ چھپوانے کی آخر ایسی عجلت کیا تھی کہ اسے اگر ریسرچ کا موضوع بنایا جائے تو عجلت کے اعتبار سے شاید ایک ریکارڈ تبصرہ ثابت ہوگا؟ جنوری کے آخر ہفتے میں کتاب بھیجی گئی اور ۱۰ مارچ کے شمارے میں تبصرہ نکل آیا، ورنہ لوگوں کو کتاب بھیج کر اکثر تقاضے کرنا پڑتے ہیں تب کہیں اُن کی باری آتی ہے۔

بہرحال اب اصل بحث پر آیئے۔ فاضل تبصرہ نگار نے سب سے آخر میں جو سوال مصنف کے غور و فکر کیلئے اٹھایا ہے، جو ابھی اوپر مذکور ہوا، اولاً اسکے بارے میں گزارش ہے کہ تبصرہ نگار نے "ہاتھ میں ہاتھ دینے" کا جو مفہوم مصنف کی طرف بذات خود منسوب کیا ہے وہ ہے "بیعت کرنا اور سپرد کرنا" (بیعت یا سپردگی) پس اگر آگے آنے والے الفاظ "فیریٰ فیما بینی وبینہ رأیہ" کے ساتھ اِسکی کوئی تُک نہیں بیٹھتی تھی کہ "وضع الید فی الید" (ہاتھ میں ہاتھ دینے) کے معنی بیعت کرنے کے لئے جائیں تو دوسرا متبادل لفظ "سپردگی" کا موجود تھا اسے رکھ کر دیکھنا چاہئے تھا کہ آیا اُسکے ساتھ بھی بات بنتی ہے یا نہیں؟ یعنی اگر روایت کا مفہوم یوں بیان

.. جائے کہ "ایک صورت یہ ہے کہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ (یعنی اپنی سپردگی) دے دوں .. پھر .. جو سمجھے فیصلہ کرے" تو کیا اب بھی کوئی اشکال باقی رہے گا؟ پھر آخر یہ سوال .. اپنے لئے وہ "سپرد کرنے" کا لفظ جو چند ہی سطریں پہلے شامل ہوچکا تھا کیوں فراموش کردیا گیا؟ یہ کوئی ذمہ دار لوگوں کا طریقہ تو نہیں ہے، جن کے سپرد قوم نے اپنے نونہال تعلیم و تربیت کے لئے کر رکھے ہوں!

چیلنج خیر یہ تو ضمنی معاملہ تھا۔ اس "ہاتھ میں ہاتھ دینے" کے محاورے کی بحث میں اصلی چیز تو جناب تبصرہ نگار کا وہ دعویٰ ہے جو اوپر اُنہی کے الفاظ میں نقل ہوچکا کہ "وضع الید فی الید (یعنی ہاتھ میں ہاتھ دینا) یہ عربی محاورے میں بیعت یا سپردگی کے معنی میں کہیں نہیں بولا جاتا۔ اور پھر اس دعوے کو انھوں نے اس چیلنج کی زبان میں بھی پیش کیا ہے کہ:-

"مصنف اور مصنف کے جتنے ہم نوا اور ہم خیال ہیں وہ ایک مثال بھی تلاش کرکے کلام عرب سے پیش کریں کہ وضع الید فی الید کسی نحوی ترکیب سے بغیر ذکر مبایعت اس مفہوم میں بولا گیا ہو۔"

اس سے تو انکار نہیں کہ تبصرہ جب پہلی بار پڑھا تو یا ذاتی طور پر دلخراش ہونے کا تاثر ہوا تھا اور یا اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گروہ کے خلاف ہرزہ سرائی کا۔ مگر آج کے عام رنگِ زمانہ میں کون آسانی سے یقین کرے گا کہ اُن اوّلین تاثرات کے بعد سے ذاتی تاثر کی جگہ شاید تمام کی تمام ہی اِس احساس اور تأثر نے لے رکھی ہے کہ جو لوگ اندھی بہری وابستگی اور عقیدت کے درجے سے ذرا بلند سطح کا تعلق ندوہ اور اربابِ ندوہ سے رکھتے ہیں۔ اور ندوہ اور بالخصوص حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ (ناظم ندوۃ العلماء) سے الفرقان اور اہلِ الفرقان کا

له .. یہ حقیقت .. یہ ہے کہ بیعت اور سپردگی میں سوائے اسکے کوئی فرق نہیں کہ بیعت ایک اصطلاح .. جس .. ہاتھ .. اطاعت کا مفہوم بھی شامل ہے جبکہ سپردگی کے لفظ کو یہ بات حاصل نہیں ہے .. اور .. استعمال .. گویہ فرق سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ بیعت کرکے آدمی اپنے آپ کو کسی کے سپرد ہی کرتا اور ہاتھ میں دیتا ہے۔

علماء بھی جانتے ہیں وہ کیسی آزمائش میں اس تبصرے سے پڑے ہوں گے۔ ....

...... اور پھر اب جو نظامت ندوۃ العلماء کی طرف سے مایوس کر دیئے جانے پر اس تبصرے پر جائزے کی جو روشنی ہمیں ڈالنی پڑ رہی ہے، اگر اُسے وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ پڑھ سکے تب تو اللہ ہی جانتے کہ کیا کیا اسکے اثرات و عواقب نہ صرف اُن پر بلکہ پورے ہندوستان پر بالخصوص اور عالمِ اسلام پر بالعموم ہوں گے، فالی اللہ المشتکی۔

خیر یہ چیلنج آپ غور فرمایئے، کیا بعینہٖ اُس چیلنج کا ہم قافیہ اور ہم وزن نہیں ہے، جو ہم قرآن پاک میں اللہ رب العزت کی طرف سے مشرکین و کفار کے نام پڑھا کرتے ہیں۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	(اے پیغمبر) آپ کہیئے کہ اگر جنّ و انس
عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ	سب اس بات پر تُل جائیں کہ اس
لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ	قرآن جیسی کتاب بنالیں تب بھی ممکن
بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝	نہیں کہ وہ ایسا کرلیں، ہر چند کہ ایک
(بنی اسرائیل - ۸۸)	اُن میں سے دوسرے کی مدد پر لگا ہو۔

یا

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا	پس لے آؤ (بنا کر) اس کی ایسی ایک
شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	ہی سورت اور بلا لو اپنے حمائتیوں
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ (البقرہ - ۲۳)	کو (بھی) اگر تم سچے ہو۔

جہاں تک اللہ اور اُسکے رسول کی بتائی ہوئی صداقتوں کا سوال ہے ہر مؤمن کیلئے روا ہے کہ وہ اُنکے بارے میں منکرین کو قرآن و حدیث کے جیسے آہنگ ہی میں چیلنج کر دے مگر اس سے باہر بشری علوم و معلومات کے دائرے میں چیلنج کی وہ زبان جو خالقِ کائنات اور عالم الغیب والشہادۃ ہی کو زیبا ہے، جو بھی اختیار کرے وہ اپنی حد سے بڑھنے کا ارتکاب کرے گا۔ اور اسی لئے صحیح معنیٰ میں اہل علم و دانش ایسا کیا نہیں کرتے۔ اور راقم کو

یہ کہتے ہوئے افسوس ہے کہ معتمد صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء نے چیلنج کی یہ زبان اختیار کرکے اپنے منصب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ رہیں مثالیں تو ان کی تلاش میں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ کتاب جس کسی کے پاس ہو وہ ص۱۸۱ کھولے جہاں سے دسواں باب شروع ہوتا ہے۔ ص۱۸۱ کو پڑھتا ہوا ص۱۸۲ پر آئے وہاں وہ حضرت حسینؓ کی پیش کش کے سلسلے میں یہ عبارت پائے گا:-

"عمر (بن سعد) نے آپ کی اس پیش کش کو قبول کرکے ابن زیاد کو اطلاع بھیجی مگر وہاں سے جواب آیا کہ یوں نہیں بلکہ اُنھیں پہلے میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھنا ہوگا۔ "لا ولا کرامۃ حتیٰ یضع یدہ فی یدی"۔

فقال لہٗ الحسین لا واللہ	اس پر حسینؓ نے کہا کہ نہیں، یہ تو بخدا
لا یکون ھٰذا ابدا۔[لہ]	کبھی نہیں ہوگا۔

کیا ابن زیاد کے بارے میں بھی یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت حسینؓ کو یزید کے پاس جانے دینے سے قبل اس بات پر بضد تھا کہ آپ اس سے "دوستانہ اور مساویانہ" حیثیت سے بات کریں؟ یا اسکے بجائے ابن زیاد کی ضد کہ "لا ولا کرامۃ حتّٰی یضع یدہٗ فی یدی" کا واحد اور قطعی مفہوم اُسکے ہاتھ پر یزید کی بیعت، یا خود سپردگی و سپر اندازی ہوتا ہے؟ جسے انگریزی میں شاید (SURRENDER) کہتے ہوں گے۔ اور اگر خدانخواستہ اب بھی وہی ضد ہے تو پتہ نہیں حضرت حسینؓ اسے "لا واللہ لا یکون ھٰذا ابدا" کے الفاظ سے قطعی ناقابلِ قبول ٹھہرا کر بجائے "دوستانہ اور مساویانہ" حیثیت میں ابن زیاد سے ملنے کے اور کیا چاہتے تھے؟

اسکے بعد امید تو نہیں کرنی چاہیئے کہ کوئی "ایں و آں" باقی رہ جائے۔ تاہم کیا حرج ہے کہ اگر ہم یہیں کچھ صفحوں کے بعد جو ایک روایت میں کچھ دوسرے الفاظ کے ذریعہ ابن زیاد

[لہ] طبری ج ۶ ص۲۲

مذکورہ بالا قول کا گویا ترجمہ کر دیا گیا ہے وہ بھی پیش نظر کر دی جائے۔

قال ابو مخنف..... ثم انّ	ابو مخنف (اپنی سند سے) بیان کرتا ہے کہ
عبید اللہ بن زیاد دعا شمر	پھر عبید اللہ بن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن
بن ذی الجوشن فقال لہ	کو بلایا۔ اور کہا کہ میرا یہ خط لیکر عمر بن
اخرج بھذا الکتاب الی عمر بن	سعد کے پاس جاؤ جس کے مطابق
سعد فلیعرض علی الحسین	اُسے چاہیئے کہ حسین اور اُن کے ساتھیوں
واصحابہ النزول علی حکمی	سے غیر مشروط سپراندازی کا مطالبہ کرے
فان فعلوا فلیبعث بھم	اور وہ اگر اسکو مان لیں تو انھیں میرے
الی سلمًا.....[۱]	پاس پابجولاں (قیدی بناکر) حاضر کرے۔

تیسری شہادت خود مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی شہرۂ آفاق کتاب المرتضیٰ کی ہے، جس کا عربی سے اردو ترجمہ خود انہی تبصرہ نگار (مولانا عبد اللہ عباس ندوی) کے قلم سے ہے، اس ترجمے کے تیسرے ایڈیشن میں عبید اللہ بن زیاد اور حضرت حسینؓ کے اسی قصہ کے بیان میں یہ عبارت آئی ہے:۔

"عبید اللہ بن زیاد نے عمر بن سعد کو بھیجا تو حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ تین باتوں میں سے میرے لئے ایک بات مان لو، یا تو مجھے چھوڑ دو جیسے آیا ہوں واپس جاؤں، اگر اس سے انکار کرتے ہو تو مجھے یزید کے پاس لے چلو، اسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں، وہ جو پسند کرے فیصلہ کرے[۲]....."

"وہ جو پسند کرے فیصلہ کرے" یہ الفاظ ہاتھ میں ہاتھ دینے کے کونسے مفہوم کی گواہی دیتے ہیں؟ سپردگی و سپراندازی کے مفہوم کی؟ یا کسی دوسرے مفہوم کی؟

محترم تبصرہ نگار نے چونکہ شدّتِ جوش میں اس خاطیٔ و عاصی مصنف ہی کو چیلنج

---

[۱] طبری ج٦ ص ۲۳۶ [۲] المرتضیٰ اردو ایڈیشن سوم ص ۲۴۷

نہ دیا تھا بلکہ "مصنف کے جتنے ہم نوا و ہم خیال ہیں" ان سب کو بھی انھیں صریح الفاظ کے ساتھ جوابدہی کا مکلّف بنا دیا تھا اس لئے ان میں سے بعض نے بھی ہماری معلومات میں ذیل کی دو مثالوں کا اور اضافہ کیا ہے۔

۱۔ حیاۃ الصحابہ۔ مؤلفہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رحؒ کی جلد اول میں حضرت عکرمہ ابن ابی جہل کے اسلام کے قصے میں حسب ذیل روایت آئی ہے کہ جب وہ فتح مکہ کے موقع پر یمن کو فرار ہوئے تو راہ میں کشتی طوفان میں آگئی اور اُس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ آئے:۔

اللھم انّ لک علیّ عھدًا ان	اے اللہ میں عہد و اقرار کرتا ہوں کہ اگر
عافیتنی مما انا فیہ ان آتیَ	اس مصیبت سے تو نے مجھے نجات عطا
محمدًا حتّٰی اضع یدی فی یدہ	فرمائی تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے
فلا اجدنّہ الا عفوًّا	پاس پہنچ کر اپنا ہاتھ انکے ہاتھ میں رکھدونگا
کریمًا.....[۱]	مجھے امید ہے کہ وہ بجز ایک شریف اور
	عفو فرما کچھ اور نہ ثابت ہوں گے۔

۲۔ اور غضب خدا کا حیاۃ الصحابہ پر (اسی جلد اول میں) حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا جو مقدمہ ہے اُس میں بھی یہی محاورہ بظاہر اسی معنیٰ میں استعمال فرمایا گیا ہے:۔

انھا تاریخ رجال جاءتھم دعوۃ	یہ (کتاب) اُن لوگوں کی تاریخ ہے جنھیں
الاسلام فآمنوا بھا وصدّقتھا	اسلام کی دعوت ملی اور وہ اس پر ایمان
قلوبھم وما کان قولھم	لائے، اُنکے دلوں نے اسکی تصدیق کی اور
اذا دعوا الی اللہ ورسولہ	(جیسا کہ قرآن میں ہے) جب انھیں اللہ اور
الّا ان قالوا (ربّنا انّنا	اسکے رسول کی طرف بلایا گیا تو اُن کا قول

---

[۱] ص ۱۸۱ (حاشیہ)

سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا)

ووضعوا ایدیھم فی ید الرسول ....

بجز اسکے کچھ نہ تھا کہ "اے ہمارے پروردگار ہم نے ایک مُنادی کو سنا جو ایمان کے لئے صدا دیتا تھا کہ (اے لوگو) اپنے رب پر ایمان لاؤ سو ہم ایمان لائے" اور اپنے ہاتھ انھوں نے رسول کے ہاتھ میں دیدیئے.....

اور یہ سب کچھ الگ، ذرا سوچنے کی بات ہے کہ ہمارے کونسے رشتہ دار (خدانہ کردہ)، غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے کہ اسکی جلن مٹانے کو ہمیں کچھ اور نہ ملا تو کربلا کا قصہ لکھ کر ہی یہ حساب اس طرح چکایا کہ یزید کے مقابلے میں سبط رسول علیہ السلام کی ہیٹی دکھائی اور اسکے لئے عربی محاوروں کا مفہوم تک بدل ڈالا؟ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

کتاب کے مقدمے میں اس گنہگار راقم الحروف نے اسی قسم کے لایعنی خیالات واعتراضات کے خلاف آگاہی کیلئے (جن کی کسی دانشگاہ کے ماحول سے اُٹھنے کی تو ہرگز توقع نہ تھی) ایک بالکل صاف اور سیدھی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لئے لکھا تھا کہ:۔

"یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے، حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے....." (ص۔ ۔)

کیا یہ کوئی ایسی بات بتائی جارہی تھی جس کے ماننے میں کوئی دقّت ہو؟ یزید اور ان کے والد حضرت معاویہؓ سے ہمارا کیا واسطہ اور کیا ناتہ تھا اگر حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا پائے مبارک درمیان میں نہ ہوتا۔ اور جب اس رشتے سے کسی دوسرے کے ساتھ ہمارا ناتہ بنے گا تو پہلے علی اور حسن وحسین (رضی اللہ عنہم) آئیں گے یا یزید ومعاویہؓ؟ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ!

واقعۂ کربلا اور غزوۂ بدر

ایڈیٹر تعمیر حیات کے نام راقم الحروف کے خط میں جو وہاں نہیں شائع ہوا اور الفرقان کی اس اشاعت میں آپ پڑھ چکے ہوں گے، تبصرہ کی چار باتوں کے سلسلے میں مختصر طور پر اور بیحد نرم لہجے میں کچھ عرض کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں ان اشاروں سے اپنی غلطی کا، جو خالص بے مغز اشتعال کا نتیجہ تھی، جسکی لپیٹ میں صحابۂ کرامؓ کے ایک پورے گروہ کا ایمان واسلام تک آگیا، احساس کرلیا جائے اور مناسب تلافی کی تدبیر کی جائے۔

مزید برآں صحابہ کرام کے مسئلے کے پیش نظر ندوے کے سربراہ وسرپرست جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو بھی اس بارے میں توجہ دلانا مناسب سمجھا گیا، جس کی پوری روداد آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔ مگر جیسا کہ ابھی پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا، توقع کے بالکل برخلاف ہر جگہ سے مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اور مایوسی بھی، وہ جس کے کما حقہ بیان پر اب تک مولانا علی میاں صاحب کے ساتھ لحاظ ملاحظے کے اُس تعلق کی بنا پر جو مدتوں سے طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، خود کو آمادہ نہ کیا جاسکا۔ اس مایوسی کے بعد کوئی چارہ اسکے سوا نہیں رہ گیا کہ تبصرہ کی اُس بے سوادی اور بد توفیقی کو، جسے علم ودانش اور نکتہ رسی کی معراج جان کر "تعمیر حیات" کے ۲½ صفحے میں پھیلایا گیا تھا۔ اور جسے فوراً ہی لکھنؤ کے شیعہ حلقے کے ایک روزنامے نے ایک متاعِ عزیز کے طور سے سر آنکھوں پہ سجالیا، کھول کر بیان کیا جائے۔

تعمیر حیات کے نام خط کے چار نکات میں سے دو زیادہ اہم تھے اُنھی کو تین عنوانات میں تقسیم کرکے اب تک گفتگو کی گئی۔ باقی دو (یعنی نمبر ۳ اور نمبر ۴) کو کسی مزید تفصیل کی حاجت نہ تھی اس لئے ان کو اس جگہ مکرر نہیں چھیڑا گیا ہے۔ اب آگے جس نکتے پر گفتگو کرنا مقصود ہے، واقعۂ کربلا میں غزوۂ بدر کی کارفرمائی کا وہ جاہلی نظریہ جسے تبصرہ [illegible] مصری مصنفین طٰہٰ حسین اور احمد امین سے اخذ کرکے اسلامی تاریخ کے مطالعے میں

"... پروردگار" پایا اور واقعۂ کربلا ....." کے مصنف کو بھی توجہ دلائی ہے کہ وہ اگر اس روشنی میں واقعہ کو دیکھتا تو اُسے جو الجھن اس مطالعے میں پیش آئی ہے وہ نہ آتی یعنی مصنف نے جو اپنی کتاب میں اس بات پر کئی جگہ الجھن کا اظہار کیا ہے کہ ہماری تاریخی کتابوں میں اس واقعے اور اس کے پس منظر کے سلسلے میں جہاں بظاہر صحیح اور قابلِ قبول روایات موجود ہیں وہاں اللہ جانے کیوں کر نہایت منکر اور ناقابلِ قبول روایات کا بھی ڈھیر لگا ہوا ہے، یہ الجھن اُسے بقول تبصرہ نگار اس لئے پیش آئی کہ اُس نے "حادثہ کا سرا حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد (کے واقعات) سے" ملایا نہ کہ "غزوۂ بدر کے واقعات سے" ورنہ یہ اگر یہ سرا "غزوۂ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے" تو تبصرہ نگار کے نزدیک "تاریخی احداث کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی"!

تبصرہ نگار نے اپنے اس مشورے کی بنیاد کہ واقعۂ کربلا کو غزوۂ بدر سے مربوط کر کے دیکھا جائے، اپنے اس خیال یا دعوے پر رکھی تھی کہ :۔

"کربلا کا واقعہ بنو امیہؓ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE) تھا۔ وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں اُبھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۲۱ بلکہ ساڑھے ۲۱ سال تک شد و مد سے قائم رہیں۔

"واقعۂ کربلا ....." کا یہ خاکسار مصنّف سچّے دل سے خوشی محسوس کرتا اگر اس حلقے کے تبصرے میں بھی اُسے اپنے موضوع کے سلسلے کی کوئی مفید اور معاون بات ہاتھ آتی۔ مگر اولاً تو تبصرہ نگار نے غلط سمجھا کہ مصنّف کی الجھن روایتوں کے تضاد میں تھی، جس کا حل انھوں نے مذکورہ بالا نظریے میں بتایا ہے۔ "واقعۂ کربلا ....." کے مصنّف کی الجھن روایتوں کے تضاد میں نہیں بلکہ اس بات میں تھی کہ ہمارے مؤرخین نے کیوں کر بدیہی طور سے منکر اور ناقابلِ قبول روایات کا ڈھیر اپنی [illegible] ابوں میں لگا رکھا ہے؟ اور یہ الجھن ان کی مفروضہ الجھن سے بہت مختلف قسم کی

[illegible]۔ دوم یہ کہ کالم کے کالم اس نظریے کی تشریح اور توصیف میں لکھنے کے باوجود [illegible] تبصرہ نگار سے یہ نہ ہو سکا کہ اس قضیے کے سلسلے کی صرف دو متضاد روایتیں بھی [illegible] لیے اور نظریے کے آسمان سے ذرا عمل کی زمین پہ اُتر کر اُن [illegible] روایتوں کے حل (یا تطابق) میں اس نظریے کی کارفرمائی ہمیں دکھا دیتے ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

سوم یہ کہ یہ نظریہ اس قدر جاہلی اور سراسر غیر اسلامی ہے کہ لیفرضِ محال اس سے ہزار عقدے بھی حل ہوتے ہوں اور "کھل جا سم سم" کا تماشہ دیکھنے کو ملتا ہو تب بھی اسے بہت دور سے سلام۔ اور یہ جاہلی نظریہ لانے کیلئے اُنھیں "بازار مصر" میں جانے اور احمد امین و طٰہٰ حسین کا احسان اُٹھانے کی ضرورت کیا تھی، یہاں ہندوستان بلکہ خاص لکھنؤ شہر میں اس نوعیت کی کیا چیز نہیں ملتی؟ نہایت شستہ اور دھلے دھلائے خیال کئے جانے والے شیعہ مجتہد سید علی نقی صاحب قبلہ تک کی مشہور و معروف کتاب "شہید انسانیت" ہی میں یزید کے منہ سے یہ شعر سنوائے گئے ہیں، جن میں یہ واقعۂ کربلا پوری طرح غزوۂ بدر سے جُڑا ہوا نظر آ رہا ہے :۔

لیت اشیاخی ببدر شہدوا   جزع الخزرج من وقع الاسل

کاش میرے بدر (میں کام آنے) والے بزرگ آج ہوتے اور نیزوں کی [illegible] سے خزرج (انصار) کی جزع فزع دیکھتے![1]

لاھلوا واستھلوا فرحا   ولقالوا یا یزید لا تشل

تو خوشی سے چیختے چلّاتے اور کہتے کہ یزید بس [illegible]

---

[1] اس شعر میں خزرج یعنی انصار خزرج کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ یہ شعر واقعۂ [illegible] کے سلسلے میں گھڑا گیا ہوگا۔ مگر جناب آتش صاحب نے واقعۂ کربلا کے ذیل ہی میں اسے درج کیا ہے۔ [illegible] ۲۹ (مطبوعہ [illegible] لکھنؤ)

بابائے ندوہ اور فرزندِ ندوہ

واقعۂ کربلا میں غزوۂ بدر کی کارفرمائی کا یہ شیعی نظریہ جسے مبصّر تعمیر حیات نے
چند مصری مصنفین کی سند پر پیش کیا ہے اس پر اور اس کے لئے دیئے گئے دلائل و شواہد پر بات
مکمل کرنے سے پہلے ایک عبرت کا باب درمیان میں کھولنا ہے۔ اور وہ یہ کہ بابائے ندوہ علامہ
شبلی نعمانی، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سب سے پہلے معتمد تعلیم رہے ہیں اُن کا ایک مختصر سا رسالہ
عربی میں الانتقاد ہے۔ جو بنو اُمیہ پر جُرجی زیدان کے حملوں کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ کوئی
اُسے دیکھے اور آج کے معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا عبداللہ عباس کے یہ فرمودات دیکھے
جن میں جُرجی زیدان ہی کے کچھ تیر اُٹھا کے بنو امیّہ پر آزمائے گئے ہیں تو بے اختیار غنی کاشمیری کا
شعر یاد آتا ہے ؎

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن　　　که نورِ دیده‌اش روشن کند چشمِ زلیخا را[1]

مولانا عبداللہ عباس صاحب دورِ بنو اُمیّہ کے وہ "حالات" پیش کرتے ہوئے جنھوں نے
حضرت حسینؓ اور اُن کے بعد کچھ دوسروں کو اموی حکومت کے خلاف اقدام پر مجبور کیا،
ابوالفرج الاصبہانی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ اُس نے اپنی کتاب۔

"اغانی میں ۱۸ ہزار دُھنیں اور لاتعداد فواحش و منکرات کے قصے قلمبند
کردیئے ہیں جن کی پرورش دربارِ شاہی سے ہوتی تھی"۔

اب "فرزند" کے مقابلے میں ذرا "بابا" کی سنئے:

جُرجی زیدان نے اپنی کتاب التمدّن الاسلامی میں عربوں کی تصویر بگاڑنے کی غرض
سے خصوصی طور پر بنو امیّہ اور اُن کے عہدِ خلافت کو نشانہ بنایا۔ اور اس نشانہ بازی میں اُس نے

۱۔ غنی، پیرِ کنعاں کی سیاہ بختی" یہ تو نظر کرو کہ ان کا نورِ نظر اور زلیخا کی آنکھ کا نور بن جائے! یہ اس شعر کا
اردو مفہوم ہے۔

الزامات (یا اسکی اپنی زبان میں بیانِ واقعات و حالات) کیلئے جو ماخذ اپنائے ان میں اہم ترین
ماخذ یہی ابوالفرج الاصبہانی کی الاغانی تھی۔ ہر چند کہ جرجی زیدان نے اپنی اس کتاب میں مولانا
شبلی کے بھی کافی حوالے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ دیئے تھے جس کا مولانا نے اپنے اس رسالے کے شروع
میں تشکر کے ساتھ ذکر کیا ہے[1]، (ص۲) مگر مولانا نے اسی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ "اپنی مدح کے صلے میں
عربوں کی ہجو سننے پر راضی ہو جاؤں یہ کبھی نہ ہوگا......" ایک ایک اعتراض اور اُس کے ماخذ کو لیا اور
علمی دنیا میں زیدان کی پوری رسوائی کا سامان کر دیا۔ اسی ذیل میں بار بار اغانی کے حوالوں کی
بے بضاعتی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ایک جگہ کچھ زیادہ کہنے پر مجبور ہوتے ہوئے فرماتے ہیں (ترجمہ)

"ہم ابھی کہہ آئے ہیں کہ اغانی قصہ کہانیوں کی کتاب ہے۔ پس اگر کوئی سرسری سا مسئلہ
ہو یا کوئی تفریحی اور وقفۂ استراحت (RELAXATION HOUR) کی بات چیت ہو تو اُسکے اور
اس جیسی دوسری کتابوں کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر کوئی سنجیدہ موضوع
ہے اور کسی ایسے معرکۃ الآراء مسئلے کا میدان ہے جس میں کسی کا تخت اور کسی کا تختہ ہوتا ہو
تب اس جیسی کتاب ادنیٰ التفات کے لائق نہیں"۔

"پھر مزید یہ کہ صاحبِ اغانی شیعی ہے۔ اُسے کوئی بھی ایسی چیز ملے جو معاویہ کو
عیب لگاتی ہو تو اُسے تو وہ دل جان سے قبول کرنے کو تیار رہتا ہے خواہ کیسی ہی
لچر اور محض جھوٹ ہو"۔ (ص۲۶)

فواحش و منکرات کے بعد اس دورِ بنو امیہ کے ظلم و جور کا "حال" بیان کرتے ہوئے مولانا
عبداللہ عباس صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"عدلیہ کا یہ حال تھا کہ حاکم وقت کے دیوانِ عام میں ایک چمڑے کا ٹکڑا (نطع) بچھا
رہتا تھا اور بغیر کسی دلیل و بحث اور بغیر کسی الزام کے جس کو چاہا اس پر کھڑا کر دیا
جلاد نے اسکی گردن اُتار دی"۔

۱۔ مولانا کا یہ رسالہ الانتقاد ۱۹۱۲ء میں مطبع آسی محمود نگر لکھنؤ سے چھپا ہے۔ ندوے کے کتب خانہ میں نمبر ۵۴۹ [illegible] پر [illegible]

"وہ دور جس میں کربلا کا واقعہ پیش آیا، ایک شخصی حکومت کا تھا حاکم وقت
کے دولیوں........ کے درمیان سارا قانون تھا"

مولانا شبلی حضرت معاویہؓ کے زمانے کا نہیں قریب ۵۰ برس بعد ہشام بن عبدالملک کا حال جرجی زیدان کے جواب میں لکھتے ہیں کہ :۔

"سفیان ثوری کے استاد سلیمان اعمش، جو کہ ایک عجمی غلام تھے ان کو خلیفہ ہشام نے ایک خط اس فرمائش میں لکھا کہ مناقب عثمانؓ اور مساوئ علیؓ میں میرے لئے ایک رسالہ تحریر فرمادیں تو آپ نے وہ خط لیکے اپنی بکری کے منہ میں دیدیا اور کہا جاؤ کہدینا یہ تمہارے خط کا جواب ہے"

ایک بات اس سلسلے میں بڑے پتے کی مولانا شبلی نے یہ فرمائی ہے (صفحہ ۲۳) جو تاریخ کے طالب علموں کو نوٹ کرلینی چاہئے کہ کسی قوم کے ایک دو آدمی اگر غلط حرکات (مثلاً ظلم وجبر) کے عادی پائے جائیں تو اُسے عام طور سے قوم اور جماعت کا معمول اور کردار بتا دینا (GENERALISATION) کوئی اچھی حرکت نہیں ہے۔ بنو اُمیہ میں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اُن کا انکار نہیں کیا جائے گا۔ مگر پورے قبیلے کو مجرم ٹھہرانا یہ صرف بدخواہوں کا شیوہ ہے۔

ہماری تاریخی کتابیں عہد عباسی میں تیسری اور چوتھی صدی میں مرتب ہوئی ہیں۔ مولانا عبداللہ عباس نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ بات جو بالکل معقول تھی کہ روایتیں تو سب طرح کی تھیں لیکن حکومت کے طرفداروں کی روایتوں کو زیادہ مشہور ہونے کا موقع ملا مخالفوں کی بات دبی رہی بنی امیہ کے جور وظلم کی حکایت کے درمیان میں اس طرح کہی گئی ہے جس سے تأثر ہوتا ہے کہ گویا دونوں کا پلہ بنی امیہ کے حق میں جھک گیا حالانکہ واقعہ برعکس ہے جیسا کہ مولانا شبلی جرجی زیدان سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں :۔

"مورخین جو سب کے سب عہد عباسی کے ہیں اُن میں سے کوئی دم نہیں رکھتا تھا کہ محاسن بنی امیہ کو بیان کرے۔ اور اگر کسی سے یہ غلطی سرزد ہوگئی تو پھر اُسے ہتک وایذاء وغیرہ طرح طرح کے مصائب کا سامنا پڑتا تھا جسکی مثالوں کی تاریخ کے صفحات میں کچھ کمی نہیں ہے۔ (وکم لنا من امثال هذا لاتی استقراره ...)
(صفحہ ۳۲)

اصل بحث کی طرف رجوع

اس جاہلی یا شیعی نظریے کی صداقت منوانے کیلئے کہ سانحۂ کربلا میں دراصل غزوۂ بدر کا حساب چکایا گیا تھا، ایک تو خاندانِ بنو ہاشم اور خاندانِ بنو امیہ کی "دیرینہ عداوتوں" کا افسانہ سنایا جاتا ہے، جسے سنانے والوں کو آج تک باوجود اسکے شرم نہیں آتی کہ اہل علم نے ان دونوں خاندانوں کے درمیان شادی بیاہ کے اُن رشتوں کی مکمل فہرستیں پیش کردی ہیں جو واقعۂ کربلا سے پہلے بھی ہوتے رہے اور بعد میں بھی۔ اور سب چھوڑیئے عمّ نبی (علیہ السلام) حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کی اور یزید کے دادا ابوسفیانؓ بن حرب کی اس دوستی کو کیسے ان "دیرینہ عداوتوں" کے افسانے میں فِٹ کیا جائے گا جو فتح مکہ کے موقع پر حضرت عمرؓ کی تلوار اور ابوسفیان کے بیچ میں حائل ہوئی اور اس سے کم پر راضی نہ ہوئی کہ نہ صرف ابوسفیان کا اسلام دربارِ نبویؐ میں قبول فرمالیا جائے بلکہ اُن کے گھر کو مانندِ حرم "جائے امن" قرار دیدیا جائے؟[۱]

دوسری دلیلِ "صداقت" معتمد صاحب نے ذیل کے الفاظ میں پیش فرمائی ہے کہ :۔

"غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقے کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اُسکے سربراہ ابوسفیان تھے۔ اسی طرح غزوۂ اُحد میں اُن کا اور اُن کی اہلیہ جگر خوارِ حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے۔ اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دُہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ وغضب کا اظہار کیا تھا"

ان ... ات کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ :۔

"اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا۔ مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کی شکست کا غم و غصّہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے اُن کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا۔"

کیسے بار بار کہا جائے؟ اور نہیں تو کیسے نہ کہا جائے؟ کہ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی بڑی اسلامی و دینی درسگاہ کے معتمد تعلیم کے ارشادات ہیں! صحاح میں تو حضرت ہندؓ کے "غیظ و غضب" والی روایت (کم از کم ہماری تلاش کی حد تک) کہیں نہیں ملتی۔ البتہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کے حوالے سے حسبِ ذیل روایت ملتی ہے:۔

قالت فجاءَ ھندُ بنت عتبۃ	آپ نے فرمایا کہ پھر ہند بنت عتبہ آئیں
قالت یارسول اللہ ما کان	اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ (کل تک)
علیٰ ظھر الارض أھل خِباءٍ احبُّ	روئے زمین پر کوئی دوسرا گھرانہ ایسا
اِلیَّ ان یذلّوا من اھل خبائِك	نہ تھا جس کی ذلت مجھے آپ کے گھرانے
ثُمّ ما اصبح الیوم علیٰ ظھر	کی ذلت سے بڑھ کر منظور ہو، اور آج
الارضِ اھل خباءٍ احبُّ اِلیَّ اَن	روئے زمین پر کوئی دوسرا گھرانہ نہیں
یعزّوا من اَھلِ خبائِك۔[1]	ہے جس کی عزت آپ کے گھرانے کی
	عزت سے بڑھ کر محبوب ہو۔

اور اس کے جواب میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بایں الفاظ روایت ہو[illegible]

[1] صحیح بخاری ج اول کتاب [illegible] باب ذکر ہند بنت عتبہ۔

قال وایضاً والّذی نفسی بیدہٖ[1]

[illegible] کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

قال ابن التین فیہ تصدیق	ابن تینؒ نے فرمایا ہے کہ آنحضرتؐ کے اس
لھا فیما ذکرتہ .... وقال	ارشاد میں ہند کے قول کی تصدیق فرمائی
غیرہٗ: المعنی لقولہ "وایضاً"	گئی ہے ..... اور دوسروں نے کہا ہے کہ
ستزیدین فی المحبۃ کلّما تمکّن	لفظ "ایضاً" سے آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ
الایمان من قلبك وترجعین	تمہاری یہ محبت اور بڑھے گی جیسے جیسے
من البغض المذکور حتّٰی	تمہارے دل میں ایمان جمے گا۔ اور بغض
لا یبقیٰ لہٗ اثرٌ۔[2]	سے اس طرح پاک ہو جاؤ گی کہ اس کا
	کوئی شائبہ باقی نہ رہے گا۔

کیا اسکے بعد بھی کہا جائے گا کہ "ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت بھول گئے؟" "عقلاً محال بات ہے؟" کسقدر بے خبری اس جملے میں مقام نبوتؐ و محمد عربیؐ سے ٹپک رہی ہے۔ جس کے اعجاز سے پتھر گویا ہو گئے ہوں، اشجار حرکت میں آ گئے ہوں۔ ایک پیالہ آب چشمۂ جاری بن گیا ہو۔ اُسکے دست اعجاز اور نفس مسیحائی و نظر کیمیا اثر کی تاثیرات کی طرف سے خاص اسی انسانی میدان میں اشکال جو اس کی اثر نمائی کا اصل میدان تھا؟ کیا فضالہ بن عمیر کے جیسے مشہور واقعات بھی ذہن میں نہیں جو اسی فتح مکّہ کے موقع پر اپنی دشمنی کے جذبات سے مجبور ہو کر عین حالتِ طواف کعبہ میں حضورؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے نکلا تھا۔ اور حضورؐ کے دست مبارک کی اُسکے سینے پر ایک دستک نے اُسکی عداوت کو سراپا محبت بنا دیا۔

پل بھر میں معاملہ کچھ سے کچھ ہو جانے کا ایک ہی واقعہ تھوڑے ہی ہے۔ زیادہ کی تو اس [illegible] گنجائش نہیں لیکن حضرت عمرو بن عاص کا ایسا ہی واقعہ یہاں او[illegible]

[1] ایضاً [2] فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۱ طبع سعودیہ۔

کیونکہ وہ بھی اُنہی اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں جن سے کتنے ہی سُنّیوں کا دل بھی شیعی روایتوں نے میلا کر رکھا ہے۔ صحیح مسلم کی طویل روایت ہے جس میں حضرت عمروؓ کے آخری وقت کا حال بیان ہوا ہے، اُنکے اور اُنکے صاحبزادے کے درمیان اُس وقت کی گفتگو کا بیان کرتے ہوئے راوی حضرت عمرو کے الفاظ نقل کرتے ہیں کہ:۔

...... لقد رأیتُنی وما احدٌ اشدَّ بغضًا لرسول الله صلی الله علیه وسلم منّی ولا احبَّ الیَّ ان اکون قد استمکنتُ منه فقتلتهٗ فلو متُّ علی تلك الحال لکنتُ من اهل النار فلما جعل الله الاسلام فی قلبی اتیت النبی صلی الله علیه وسلم فقلتُ ابسط یمینك فلأبایعك فبسط یمینه قال فقبضت یدی قال ما لك یا عمرو قال قلتُ اردت ان اشترط قال تشترط بماذا قلتُ ان یغفرلی قال اما علمت یا عمرو ان الاسلام یهدم ما کان قبله وان الهجرة تهدم ما کان قبلها وان الحج یهدم ما کان قبله وما کان احدٌ احبَّ الیَّ من رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا اجلَّ فی عینی منه وما کنتُ اطیق ان املأ عینی منه اجلالًا له ولو سُئلت ان اصفه ما اطقتُ لانی لم اکن املأ عینی منه [1]

...... میرا ایک زمانہ وہ تھا کہ مجھ سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت رکھنے والا اور اس بات کی آرزو رکھنے والا کوئی دوسرا نہ تھا کہ مجھے قابو ملے اور آپ کو قتل کر دوں۔ میں اگر اس حال میں مرجاتا تو دوزخ میرا ٹھکانہ تھا۔ پھر جب اللہ نے میرے دل میں اسلام ڈالدیا تو میں آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اپنا ہاتھ دیجئے میں بیعت کروں۔ آپ نے دستِ مبارک بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ نے فرمایا یہ کیا؟ میں نے عرض کی میں کچھ شرط کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا، کیا شرط کروگے؟ عرض کیا شرط یہ ہے کہ بخشدیا جاؤں۔ فرمایا، عمرو کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام اپنے سے پہلے کا سب کچھ مٹا دیتا ہے۔ ہجرت اپنے سے پیشتر کا سب کچھ مٹا دیتی ہے اور حج اپنے سے پہلے کے ہر گناہ کو مٹا دیتا ہے۔ اور پھر اسکے بعد میرا حال یہ ہوا کہ کوئی اور نہ تھا جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب ہو اور میری نگاہ میں آپ سے بڑھ کر محترم ہو۔ اور آپ کی عظمت کے مارے مجھ میں تاب نہ تھی کہ نظر بھر کے آپ کو دیکھ لوں چنانچہ اگر مجھ سے کوئی کہتا کہ آپ کا حلیہ بیان کروں تو میں نہ کرپاتا، کیونکہ میں نے کبھی آپ کو آنکھ بھر کے دیکھا ہی نہ تھا۔؛

عرض یہ ہے کہ آن کی آن میں لوگوں کے دلوں کی دنیا بدل جانا، یہ تو ہمارے سرکارؐ کے یہاں اللہ کے حکم سے صبح و شام کی بات تھی۔ ہند اور ابو سفیان (رضی اللہ عنہما) کے دلوں کی بابت آخر یہ بے یقینی کیوں ہو؟ اور مزید یہ ہے کہ وہ جو روایت حضرت ہند کے غیظ و غضب کی تاریخ کی کتابوں میں آتی ہے جس کی طرف تبصرہ نگار نے صحاح کی روایت کہہ کر اشارہ کیا ہے اُسکے بارے میں حافظ ابن کثیر کا تبصرہ یہ ہے کہ "هذا اثرٌ غریبٌ وفی بعضه نکارةٌ"[2] اسکے بعد اس روایت کی جو اوقات رہ جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ علاوہ ازیں یہی "غیظ و غضب" والی روایت اس طرح بھی نقل ہوئی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ جو آنحضرت کی طرف سے عورتوں کی بیعت لے رہے تھے انھوں نے جب ہند سے یہ باتیں سنیں اور ایک خاص سوال کے نتیجے میں اسکو بیچایا تو ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔[3] اگر ہند کے سوال و جواب

۱؎ صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب الاسلام یہدم ما قبلہ ۲؎ تفسیر ابن کثیر۔ سورۃ الممتحنہ آیت بیعت

۳؎ ایضاً۔ عربی کے الفاظ ہیں۔ نضحك عمر بن الخطاب حتّی استلقیٰ

تنسب کے ماتحت ہوتے تو کیا حضرت عمرؓ سے اس پر ہنسنے کی توقع کی جا سکتی

نہایت افسوس ہے کہ معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء نے احمد امین اور طٰہٰ حسین کے حوالے سے الفاظ کے برائے نام فرق کے ساتھ، بعینہٖ وہ بات فرمائی ہے جو جناب علی نقی صاحب قبلہ مجتہد اپنی کتاب "شہید انسانیت" میں "اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم" کے زیر عنوان مدتوں پہلے تحریر فرما چکے ہیں۔ اس بیان میں وہ فتح مکہ پر آتے ہیں اور حضرت ابوسفیان اور اُن کی بیوی ہند اور دیگر کفار مکہ کے قبول اسلام کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:-

"مگر مذکورہ واقعات سے ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ بے بس ہو جانے کے بعد آدمی سر جھکا سکتا ہے۔ ہاتھ روک سکتا ہے۔ ہتھیار ڈال سکتا ہے۔ زبان بند کر سکتا ہے لیکن اپنے دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ اپنے قلب میں یقین کی صفت پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اپنی نفرت کو محبت میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ نفرت اور دشمنی جو اُن حدود تک پہنچ چکی تھی جن کا مظاہرہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہے۔ کیا اس سب کے بعد (وہ) محبت و عقیدت سے تبدیل ہو سکتی ہے؟ عام اصولِ فطرت اور واقعات کی رفتار کے مطابق یہ بات غیر ممکن معلوم ہوتی ہے۔ عام فطرت کے مطابق صرف اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ دشمن جو اب تک پھنکارے مارتے ہوئے اژدھے کی طرح سامنے موجود تھا اب مار آستین بن کر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لئے آزاد ہو گیا۔" صفحہ ۵۹-۶۰ (شہید انسانیت)

اسکے بعد کیا ہم غلط ہوں گے اگر علی نقی صاحب قبلہ میں اور مولانا عبداللہ عباس میں کوئی بڑا فرق نہ سمجھیں؟

طٰہٰ حسین اور احمد امین کا ایسے معاملے میں حوالہ تو جیسا کچھ ہے اُسے کیا کہیں، اس اشاعت میں کچھ دوسرے لوگوں کی تحریروں، بالخصوص ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے گرانقدر ... مقالے میں اس پر کچھ کہا بھی گیا ہے، ہمیں تو سید قطب کا نام بطور سند

پیش کئے جانے پر بھی حیرت ہے۔ مرحوم کی قابلِ قدر باتیں اپنی جگہ مگر دینی سند تو وہ جہاں تک ہم جانتے ہیں اخوان المسلمین کے ذی علم لوگوں کی نظر میں بھی نہ تھے۔ اسکے علاوہ معتمد صاحب کو اس بات سے بھی بے خبر نہ ہونا چاہیئے تھا کہ کم از کم برصغیر میں تو اس نام کو کوئی دینی وزن حاصل نہیں ہے، دینیات میں اعتبار رکھنے والے حلقوں میں تو اس نام سے آشنائی بھی شاذ و نادر ہی ہے۔ ہاں اخوان المسلمین سے تعارف یا روابط رکھنے والے کچھ حلقے یہاں ہیں اُنکے یہاں اس نام کی ضرور مان دان ہے۔

بے شک بعض تاریخی روایتیں حضرت ابوسفیان کے اسلام میں داخلے کو "استسلام" (مجبورانہ اسلام) ہی کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔ مگر جب صحاح کی بخاری جیسی درجہ اول کی کتاب میں "استسلام" کے بجائے اُن کے اسلام کی صاف روایت پائی جاتی ہے تو دینی اعتبار سے اور اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں تقاضائے واختیار کے اعتبار سے بخاری کی اس روایت کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم الرأیۃ یوم الفتح کی پہلی ہی روایت میں فتح مکہ اور اسلام ابوسفیان کا تفصیلی ذکر ہے۔ اور وہاں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے سچے اسلام کے بجائے بادلِ ناخواستہ کلمہ پڑھنے کی بات نکلتی ہو۔ اور مانا کہ واقعہ کی اصل صورت وہی تھی جس سے استسلام اور بادلِ ناخواستہ اسلام ظاہر ہوتا ہے تب بھی کیا ایک مومن کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس روایت کے مطابق اسی شخص کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس درجے کی تالیف قلب (بلکہ سچ یہ ہے کہ ناز برداری) کا معاملہ فرماتے نظر آ رہے ہیں؟ بایں حالتِ استسلام — جیسا کہ روایت ظاہر کرتی ہے — یہ تو گزر ہی چکا کہ اُن کے گھر کو حرم کی طرح جائے امن قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ علمبردار انصار حضرت سعد بن عبادہ ابوسفیان کو سامنے دیکھ کر نعرہ لگاتے ہیں کہ آج "رن پڑے گا۔ آج کعبے میں بھی خون بہے گا۔" ابوسفیان کو آنحضرت سے شکایت کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ

سعد نے غلط کہا۔ اور پھر سعد سے جھنڈا لیکر دوسرے کو دیدیا جاتا ہے۔ کیا اس شخص کو عمر بھر استسلام ہی کی حالت میں بتا کر ہم معاذ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضور اس شخص کے ساتھ یہ معاملہ فرما کر غلطی کر رہے تھے؟

معاملے کے اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو ایک سید قطب کیا دس "قطب الاقطاب" بھی یہ کہتے ہوئے اچھے نہیں لگ سکتے کہ "وہ اسلام کہاں لائے تھے۔ استسلام کیا تھا"۔
ام ابن تیمیہ کے فتاویٰ کے ایک مضمون کا ترجمہ ماہ گزشتہ ہی کے الفرقان میں چھپا تھا۔
سکی یہ سطریں اس موقع پر پڑھ لیجئے:۔

"..... وہ صحابہ جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے (اور جن کو اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں طُلقاء کہا جاتا ہے) جیسے عکرمہ بن ابی جہل، حرث بن ہشام، سُہیل بن عمر، صفوان بن اُمیّہ اور ابو سفیان بن حرث ان تمام لوگوں کے بارے میں پوری اُمّتِ مسلمہ کو اتفاق ہے کہ ان کو اچھی اسلامی زندگی نصیب ہوئی اور ان میں سے کسی پر بعد کے دور میں بھی کسی نفاق کی تہمت نہیں لگائی گئی ....."

الفرقان۔ مارچ ۹۲ء صلا

اور یہاں یہ بھی یاد کیجئے کہ ابو سفیان بن حرب (اموی) کے ساتھ تو یہ کشادہ قلبی اور ناز برداری کا معاملہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ابو جہل کے بیٹے عکرمہ جو خود بھی اشتہاری مجرم ہیں اور فرار ہو کر یمن جا چکے ہیں اُن کی مسلمان اہلیہ کی درخواست پر معافی عطا کی جاتی یقین دہانی کرائی جاتی ہے .... اور وہ یقین کر کے آجاتے ہیں تو اس گرمجوشی سے استقبال فرمایا جاتا ہے کہ عجلت میں ردائے مبارک جسم اطہر سے ہٹ جاتی ہے۔ اور ایسا ہی مہر و کرم کا معاملہ صفوان ابن امیّہ کے ساتھ فرمایا جاتا ہے جو اسی صف اول کے نامی گرامی دشمنوں میں رہے ہیں، معافی کی نشانی کیلئے عمامۂ مبارک دیا جاتا ہے مگر اسکے برعکس ۔ ہاں اسکے برعکس ابو سفیان بن حرث بن عبد المطلب (ہاشمی) جو اپنے عم زاد ہیں اور انھیں اُم ہانی (بنت ابی طالب)

جیسی پیاری بہن[1] اپنے ساتھ لیکر معافی دلانے کیلئے حاضر ہوتی ہیں تو سر کا رُخ انور پھیر لیتے ہیں۔ وہ بھائی ہونے کا واسطہ دیتی ہیں تو فرماتے ہیں مجھے ایسے بھائی کی ضرورت نہیں۔ غرض بڑی مشکلوں سے معافی ملتی ہے! کیا اسکے بعد بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ جن کا اعزاز و اکرام خود حضور اکرمؐ نے فرمایا ہمیں اُنکی توہین تو کم از کم نہ کرنی چاہیے۔ اور کچھ تو غور کرنا چاہیئے کہ اعزاز و اکرام اور مہر و کرم کا آخر راز کیا تھا۔ کیا اللہ کا رسولؐ ۔ معاذ اللہ ۔ مارہائے آستین پال رہا تھا؟ قبلہ نقوی صاحب مجتہد کو بالکل رہا ہے کہ یہی تصور دیں کیونکہ اُنکے نزدیک تو سب سے بڑے "مارہائے آستین" خلیفۂ اول و دوم تھے مگر ندوے کے منبر سے بھی ہم ایسی ہی صدائیں! الامان، الحفیظ!

شیعیت اور تشیع سے بچھیتی

جناب تبصرہ نگار نے ندوے کے منبر سے صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے گروہ کے بارے میں بھی شیعیت کی ہم زبانی ہی نہیں کی ہے جسے اسلام میں لانے کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلی ناز برداریاں فرمائیں بلکہ معاملہ شیعیت اور تشیع سے ایک طرح کی یکجہتی ( ) تک پہنچا دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض لوگوں کی طرف سے ائمہ اربعہ میں سے کم از کم تین (امام ابو حنیفہ، امام احمد، اور امام شافعی) کے حُبِّ اہل بیت کیلئے "شیعیت" کی تعبیر کو اس طور پر نقل کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تعبیر میں کوئی اعتراض کی بات نہیں، بالفاظ دیگر ہم وہ تمام لوگ جو الحمد للہ حُبِّ اہل بیت سے محروم نہیں ہیں اُنھیں اس لفظ سے کوئی وحشت نہیں ہونی چاہیئے۔

ائمہ اربعہ کا زمانہ جب کہ یہ لفظ محض لغوی معنی میں یا بقول تبصرہ نگار بطور ایک سیاسی اصطلاح کے، حضرت علیؓ اور اُن کی اولاد کی سیاسی ہمنوائی کیلئے بولا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت اس کے استعمال میں احتیاط، پرہیز یا وحشت کی کوئی بات نہ تھی مگر اب جبکہ یہ لفظ اہل سنت والجماعت کے مقابلے میں دین اسلام کی ایک متوازی تعبیر ہے، جو ہر ہر نکتے پر اپنے آپ کو ایک جدا دین ثابت کرتی ہے ایسے وقت میں اہل سنت کی کسی درسگا

---

[1] ایک اور روایت کے مطابق اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ۔

سے یہ آواز اُٹھنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ "عقیدۂ بدا، تحریفِ قرآن اور اِفک اُمّ المؤمنین" جیسی باتوں کو نہ مانتے ہوئے اگر خود کو شیعہ کہو کہلاؤ یا کہلائے جانے پر راضی ہو تو حرج کی بات نہیں اور کم از کم اس لفظ سے وحشت تو ہونی ہی نہ چاہئے، کیونکہ ہمارے تو ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ جیسے ائمہ "شیعہ" اور "رافضی" کہلائے ہیں!

یقین فرمایئے کہ حضرت حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کا نام زبان و قلم پر لاتے ہوئے بے اختیار جی چاہتا ہے کہ "امام" اور "علیہ السلام" کے الفاظ اُن کیلئے استعمال کئے جائیں۔ مگر صرف اس لئے ان کے استعمال سے پرہیز کرنا پڑتا ہے کہ ان الفاظ کو اب شیعہ اُس خاص مفہوم میں استعمال کرتے اور اُن عقیدوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جو اہلِ سنت کے یہاں قطعی ضلالت اور تحریفِ دین ہے۔ اور ایسی صورت میں عوام کے دین کی حفاظت کے لئے ہمارا فرض ہے کہ جذباتی تقاضہ قربان کریں۔ سوا سی نقطۂ نظر سے ہمارے لئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ "واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر" کے مقدمے میں سُنّی گھرانوں اور سُنّی دماغوں سے بھی کسی نہ کسی حد تک بالعموم بسی ہوئی شیعیت کو نکالنے کی ضرورت اور اہمیت پر جو کلام کیا گیا تھا اُسے ندوے کے ذمہ داروں اور ترجمانوں کے یہاں بجائے خود ایک "تحریفِ دین" سمجھا جائے اور اسکے برخلاف عامۂ مسلمین کو یہ باور کرایا جائے کہ شیعیت سے اُنس و عقیدت تو ہمارے ائمہ و اکابر کی "سنّت" ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے!

اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خاص گروہ کے بارے جس سے شیعیت کا کلیجہ خاص طور پر پھنکتا ہے ٹھیک وہی تبرائی زبان جو کُتُبِ شیعہ میں مذکور ہے، اور تصوّرِ شیعیت سے وہ فتنہ انگیز تضامن و یکجہتی جو اس تبصرے میں ڈنکے کی چوٹ پر برتی گئی ہے۔ ندوۃ العلماء کی انتظامیہ سے قطعی طور پر اس بات کی طالب تھی کہ صاف اور صریح الفاظ میں اس سے براءت کی جائے،

ترجمان ندوۃ العلماء میں اس کی اشاعت پر معذرت کی جائے اور متعلقہ ذمہ داروں کی اُنکی ذمہ داریوں کے بقدر تادیب کی جائے ـــــ اور اس باب میں اُن کیلئے قریب ترین اُسوۂ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل تھا۔

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جلد اول جو سید صاحب کے استاد مولانا شبلیؒ کی تالیف تھی، مگر استاذ کی وفات نے اس پر نظرِ ثانی اور اشاعت وغیرہ کے مراحل شاگردِ سعید کے حصے میں ڈال دیئے۔ اس نظرِ ثانی میں اُن کے قلم سے غزوۂ بدر کی حدیثی روایتوں کے سلسلے میں صحابئ رسول حضرت کعب بن مالکؓ کی روایت پر کچھ ایسی تنقید نکل گئی جس سے، خود سید صاحب کے الفاظ میں "صحابئ رسول کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا"۔ سید صاحب کو غالباً کسی نے توجہ دلائی یا خود اُنکی سعید روح نے احساس کیا تو چوتھے ایڈیشن کے دیباچہ میں یہ عبارت تحریر فرمائی جو سچ یہ ہے کہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور انشاء اللہ مرحوم کی راحتِ ابدی کے سامانوں میں سے ایک بڑا سامان بنے گا۔ فرماتے ہیں:-

"غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمداں کے خطاکار قلم سے حضرت کعب بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا جس پر مجھے شرمندگی ہے۔ اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کرکے صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی براءت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیرِ خویش
عُذر بہ درگاہِ خدا آورد

(جلد اول طبع چہارم (دار المصنفین۔ ص[1])

[1] سید صاحب نے یہاں اپنے قارئین سے مزید یہ درخواست بھی کی ہے کہ جن لوگوں کے پاس پہلے کے نسخے ہیں وہ اپنے نسخے سے صفحہ فلاں اور سطر فلاں پر متعلقہ عبارت قلم زد فرما دیں۔

ایسا پاکیزہ اور قابلِ فخر و اتباع اُسوۂ عمل ندوے کے قریب ترین بزرگوں کی زندگی میں پایا جائے لیکن اُسکے موجودہ بزرگ اس کے برخلاف اس تبرّائی تبصرے کے سلسلے میں وہ رویہ پسند فرمائیں جس کا پوری تفصیل سے بیان راقم ہی کے قلم سے نکلے گزشتہ مضمون (مجھے ہے حکم اذاں ......) میں ہو چکا ہے، یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے اس لئے کہ معاملہ دار العلوم ندوۃ العلماء جیسی اہلِ سنت کی ایک مرکزی درسگاہ کا ہے۔ سیّد صاحب نے بڑی حد تک محض ایک شخصی ذمہ داری کا احساس فرماتے ہوئے اپنی غلطی کے اثرات کو محو کرنے کی بجان و دل اور بکمالِ صراحت کوشش فرمائی اور آج کے ندوے کے وہ بزرگ جو محض ضابطے ہی میں اسکے بزرگ نہیں، عملاً اور اخلاقاً بھی بزرگ اور بزرگ تر ہیں اور ندوے کے محدود دائرے سے بھی آگے بڑھ کر وہ آج کی ملّت اسلام کے بزرگ ترین افراد میں شمار ہوتے ہیں، وہ ایک شخصی نہیں، محض ایک اداری بھی نہیں بلکہ مزید برآں ایک ملّی ذمہ داری کے ادا کرنے میں اسقدر تکلّف، وقت اور اسقدر پریشانی محسوس فرما رہے ہیں کہ بصد الحاح و التجا جو آخری چیز اس ضمن میں اُنکے قلم سے نکلی ہے اور بظاہر حرفِ آخر بن گئی ہے، وہ ۲۵ اپریل ۹۲ء کے تعمیرِ حیات کے صفحہ ۵ کا مضمون ہے۔ جو قارئین الفرقان کے مطالعے کیلئے اس اشاعت میں بتمام شامل بھی کر دیا گیا ہے۔

ہم کیا بتائیں، کسقدر حیرت اور رنج و الم کے ساتھ مولانا کا یہ مضمون دیکھا ہے، جس کے متعلق آپ نے اسکی اشاعت سے پہلے اپنے رفیق و محبِّ قدیم یعنی راقم کے والد ماجد کو، ان کے دوسرے خط کے جواب میں (جس میں مولانا کے مضمون مجریہ ۲۵ مارچ ۹۲ء پر گہری مایوسی کا اظہار کیا گیا تھا) یہ تحریر فرمایا تھا کہ اُن کے تأثر اور تبصرے کو اپنے ۲۵ مارچ کے مضمون کے بارے میں بالکل صحیح سمجھتے ہوئے اب وہ ایک زیادہ واضح اظہارِ حقیقت پر مشتمل مضمون شائع کرا رہے ہیں۔ وہ زیادہ واضح اظہارِ حقیقت اس مضمون میں فقط یہ نکلا کہ:

۱۔ سابق مضمون میں مولانا عبد اللہ عباس کے تبصرہ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس مضمون کی تقریباً

شانِ نزول میں اس کا اس طور پر ذکر کیا گیا کہ اس میں "حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض ایسے خیالات اور تاریخی تجزیہ و تبصرہ آیا ہے جس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے"۔

۲۔ اس اندیشے کے ماتحت ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی گئی کہ وہ "اہلِ سنت و الجماعت کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں" اور صحابہ کرام کے بارے میں اہلِ سنت کے متفقہ مسلک کے قائل ہیں۔

۳ حضرت ابو سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کے بارے میں صراحت کی گئی کہ وہ شرفِ صحابیت رکھتے ہیں اور کچھ مزید فضائلِ اسلام کے بھی حامل ہیں۔

یہ تمام قصہ چار کالم (ایک صفحہ) کے مضمون میں کُل ایک کالم کے اندر طے ہو جاتا تھا۔ باقی تین میں سے اڑھائی کالم کے اندر ندوے کے فضلاء اور نمائندگان کا حصہ صحابہ کرام کے سوانح اور خدمات کی نشر و اشاعت میں بتایا گیا تھا۔ اور پونے دو کالم حضرت ابو سفیان کے تذکرے کے بعد، ان امور کے بیان میں صرف کئے گئے تھے کہ:۔

۱۔ ......" ائمہ اہلِ سنت اور اس گروہ کے تمام محقق اور معتبر علماء اور نمائندوں کا اس پر اتفاق ہے کہ خلافت راشدہ امیر المؤمنین سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ پر ختم ہو گئی حضرت معاویہؓ اور اُن کے جانشینوں کی حکومت احادیث صحیحہ کے مطابق ...... خلافتِ راشدہ نہیں تھی......"

۲۔ " اس طرح گروہ اہلِ سنت یزید بن معاویہؓ کو اس دورِ خیر و برکت میں جماعت صحابہ اور صالحین امت پر حکومت کرنے کا مستحق نہیں سمجھتا........."

۳۔ " اسکے نتیجے میں اور اس پس منظر میں محققین اہلِ سنت سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو درست سمجھتے ہیں جو انھوں نے یزید کے معاملے اور مقابلے میں

اختیار کیا ......"

اسکے بعد ایک ۲۴ بھی تھا جو حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے بعض کے اپنے اپنے زمانے میں ایسے ہی اقدامات کی تصویب میں لکھا گیا تھا۔ اس کی عبارت دینے میں طوالت درپیش تھی اس لئے اقتباس نہیں دیا جارہا ہے۔

چار کالم کے اس مضمون میں ایک لفظ مولانا عبداللہ عباس کے اس تبصرے پر رنج اور افسوس کا نہیں، معذرت کا نہیں، شرمندگی اور ندامت کا نہیں جس میں حضرت ابوسفیان اور اُن جیسے دوسرے اُن صحابہ اور صحابیات پر جو فتح مکہ میں اسلام لائے بدترین شیعی انداز کا تبرّا کیا گیا تھا جبکہ تبصرہ ندوے کے ترجمان تعمیر حیات کی طرف سے تھا اور تبصرہ نگار ندوہ کے "معتمد تعلیم" تھے۔

سچے دل سے مسلمان نہ ہونے، اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض وعداوت کی بھڑکتی ہوئی آگ دل میں بھرے رکھنے اور دورِ خلافتِ عثمانی سے قبل تک بس مجبوراً مسلمان بنے رہنے کی فردِ جرم اس تبصرے میں حضرت ابوسفیان کے علاوہ اُن کی اہلیہ ہندؓ پر اور ان دونوں کے خاندان (بنی اُمیّہ) کے اُن تمام افراد پر جو فتح مکہ میں اسلام لائے لگائی گئی تھی، مولانا نے "مجرمین" کی اس فہرست میں سے صرف ایک فرد، حضرت ابوسفیان کو ــــ بلا کسی اظہارِ افسوس وندامت کے ــــ نکالا اور اُن کے لئے شرفِ صحابیت اور بعض فضائل کی گواہی دی لیکن اُن کی اہلیہ حضرت ہند اور اُن کے مبیّنہ "گروہ" کے دوسرے تمام افراد کو صحابیت ہی نہیں صدقِ اسلام کے دائرے سے بھی باہر اسی جگہ پر کھڑا چھوڑ دیا جہاں مولانا کے معتمد تعلیم مولانا عبداللہ عباس ندوی نے اُن کو اپنی "نَزْعَۂ شِیْعِیَّۃ"[ا] کے ماتحت نکال کر کھڑا کر دیا تھا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہوا اور مولانا نے اپنے لئے کیسے اس کا جواز سمجھا؟ ــــ کیا اس کی کوئی اور توجیہہ سوائے اسکے کی جاسکتی ہے کہ مولانا بھی اِن بقیہ افراد کے معاملے میں

ا اردو میں "شیعی رگ" اس کا ترجمہ سمجھئے۔

مولانا عبداللہ عباس کا ہم خیال ہیں؟ اور بالخصوص ہندؓ کے معاملے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی اس گواہی کو بھی (خاکم بدہن) خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں ہیں؟ جس کو راقم الحروف نے بھی بخاری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اور عربی و اُردو کے مصنفین اسے برابر ہی نقل کرتے آرہے ہیں خود ندوے کے حلقے میں علامہ سید سلیمانؒ کی مختصر کتاب "رحمتِ عالم" کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل نصاب ہے مزید برآں دار المصنفین کی مشہور "سیر الصحابیات" (از مولانا سعید انصاری) کا حوالہ فوری طور پر ہمارے سامنے ہے۔ مولانا انصاری نے تو حضرت عائشہؓ کی روایت ہی نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید لکھا کہ:۔

"حضرت ہندؓ مسلمان ہو کر گھر گئیں تو وہ ہند نہ تھیں، ابن سعد نے لکھا ہے کہ انھوں نے گھر جا کر بت توڑ ڈالا اور کہا کہ ہم تیری طرف سے دھوکہ میں تھے۔" ص ۱۸۴

کیسے غرض کریں حضرت ہندؓ اور دوسرے طُلَقاء بنی اُمیّہ کا معاملہ تو اس درجے کا سنگین ہے کہ یہ کم علم نہیں جانتا کہ کیسے اس معاملے میں مولانا عبداللہ عباس کی قول یا سکوت سے ہمنوائی اور ہمت افزائی کر کے کوئی شخص چاہے وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ تحقیقی مسلک کے مطابق اہلِ سنت کے گروہ میں شامل رہ سکتا ہے؟ ہمیں تو اس سے بہت کمتر یہ معاملہ بھی مولانا کی شان کے شایاں نہیں لگ رہا کہ انھوں نے اس مضمون کے اندر حضرت ابوسفیان کیلئے جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت کی طرف اشارے میں "استقامت دکھائی اور زخمی ہوئے" کے الفاظ استعمال کرنے پر اکتفاء کی ہے جبکہ اُن کا جہاد فی سبیل اللہ میں "زخمی ہونا" خاصی معتبر روایات کے مطابق اس شکل میں تھا کہ:۔

وَشَهِدَ قِتَالَ الطَّائِفِ فَقُلِعَتْ	وہ (آنحضرت کے ساتھ) غزوۂ طائف میں شریک
عَيْنُهُ حِينَئِذٍ، ثُمَّ قُلِعَتْ	ہوئے جس میں اُنکی ایک آنکھ گئی۔ دوسری یرموک کی
الْأُخْرَىٰ يَوْمَ الْيَرْمُوكِ[ا] ...	جنگ (بہ عہد فاروقی) میں نذر ہوئی ...

ا سیر اعلام النبلاء۔ ج ۲۔ اور سیرۃ حلبیہ میں تو مزید یہ بھی ہے کہ طائف میں آنکھ نکل پڑی تو (باقی حاشیہ ص ۴۳۰ پر)

اور معاملے کے اس پہلو کے ساتھ یہ منظر تو حیرت کو ہوش رُبا بنائے دیتا ہے کہ مولانا عبد اللہ عباس کے تبصرے سے صحابۂ کرام اور بالخصوص حضرت ابوسفیان کے بارے میں بانیان و ذمہ داران ندوۃ العلماء کے مسلک و عقیدے کی بابت ہو سکنے والی غلط فہمی کے سدّباب کیلئے لکھے جانے والے اس مضمون میں حضرت ابوسفیان کی بابت مولانا کا مختصر سا بیان ختم ہوتے ہی (جو صرف دسؔ سطروں میں ہے) حضرت معاویہ ابن ابی سفیان پر حضرت علی کی فضیلت کا بیان شروع ہو جاتا ہے، پھر یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کی برائیوں کا بیان اور اسکے مقابلے میں حضرت حسین بن علیؓ کے اقدام کی ضرورت اور صحت کا اظہار آتا ہے۔ اور پھر حضرت حسن اور حضرت حسین (رضی اللہ عنہما) کی اولاد میں سے جن لوگوں نے بھی خلفائے بنو امیّہ یا عباسیہ کے خلاف تلوار اٹھائی اُن کی فضیلت اور اُنکے اقدام کی صحت اور اسکے دلائل و شواہد کا بیان ہوا ہے (جیسا کہ اوپر ان بیانات کا خلاصہ دیا جا چکا ہے) — ہمیں حیرت اس بنا پر ہے کہ آخر اس مضمون میں ان بیانات کا محل کیا تھا؟ ان میں سے تو کوئی ایک بات بھی ایسی نہ تھی جس کے بارے میں مولانا عبد اللہ عباس کا تبصرہ کوئی مخالف تأثر دیتا ہو، بلکہ اُس میں تو یہ باتیں اور بہت ہی زور شور سے کہی گئی تھیں! — لیکن کوئی تو وجہ اس حصّۂ مضمون کی ہونی ہی چاہیئے جو تقریبِ مضمون اور عنوانِ مضمون کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں کھا رہا!

راقم کو اس سوالیہ موقع پر آکسفورڈ کا وہ واقعہ یاد آرہا ہے جو مضمون کے شروع میں درج کیا جا چکا ہے، وہاں لکھا گیا ہے کہ (گذشتہ ستمبر کی کسی تاریخ کو) آکسفورڈ میں جب مولانا، راقم کی موجودگی میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی سے مخاطب تھے تو بظاہر کوئی موقع وہاں حضرت حسین اور یزید کے قصے کا نہیں تھا، مگر بات یکایک اپنے طبعی حدود سے نکلی اور حضرت حسینؓ کے اقدام بمقابلۂ یزید پر آگئی اور مولانا ایک گونہ برہمی کے لہجے میں جس کا اثر چہرے پر

(باقی حاشیہ ص۴۲۹ کا) حضرت ابوسفیان ہاتھ پر لئے آنحضرت کی خدمت میں آئے آپؐ نے فرمایا چاہو تو دعا کردوں ٹھیک ہو جائے چاہو تو ذخیرۂ آخرت بنالو ابوسفیانؓ نے دوسری بات کو پسند کیا۔

بھی نمایاں تھا، یوں فرماتے سنائی دینے لگے کہ حضرت حسین کے اقدام کو کسی نے غلط قرار نہیں دیا، امام ابن تیمیہ نے بھی یہ لکھا ہے اور حضرت مجدد الف ثانی نے بھی یہ لکھا ہے الخ۔ اس واقعے کی توجیہ میں عرض کیا گیا تھا کہ اسکی کوئی وجہ بجز اسکے سمجھ میں نہ آئی کہ جیسے مولانا کے عزیز مولوی سید سلیمان حسینی صاحب (استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے کتاب کا مقدمہ کتاب کی اشاعت سے کافی پہلے الفرقان میں پڑھ کر ایک سخت سُست مضمون اسکے خلاف لکھ ڈالا تھا، اسی طرح معلوم ہوتا ہے وہ مقدمہ مولانا کی نظر سے بھی گزر گیا یا (جیسا کہ زیادہ امکان ہے) اسکے بارے میں کچھ سن لیا اور اُس سے ایسی ہی ناگواری محسوس فرمائی جیسی عزیز موصوف کو ہوئی تھی۔ اور موقع کی فی الجملہ مناسبت سے (کہ تذکرہ بہرحال اہل بیت کا تھا) راقم کو سامنے پاکر مولانا کی وہ تہ نشیں ناگواری بے قابو ہوکر ابھر آئی۔ بس مولانا کے مضمون کے زیر غور حصے پر جو سوال پیدا ہوا ہے اُسکی توجیہ بھی اپنی سمجھ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں آتی کہ حضرت ابوسفیانؓ والی سطریں لکھ کر مولانا نے اپنے آپ کو جو مولانا عبد اللہ عباس کے تبصرے سے ذرا فاصلے پر کیا تھا، یہ فاصلہ پیدا کرنا مولانا کے اُن احساسات پر بہت گراں ہو گیا جن احساسات پر راقم کی کتاب کا مقدمہ گراں ہوا تھا۔ اور پھر اس گرانی نے اپنی تشفی کیلئے مضمون کو اسی طرح اسکے طبعی حدود سے باہر نکال دیا جس طرح آکسفورڈ کی گفتگو باہر نکل آئی تھی۔

ہائے افسوس یہ عمر بھر کے احترام، لحاظ اور عقیدت کو زائل کر کے اس موڑ تک پہنچنا تھا! کسی طرح دل ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا کہ مولانا کے علم سے یا انکی رضامندی کا اطمینان کر کے ایسا تبصرہ شائع ہوا ہوگا جس میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ پر تبرّا تو بڑی چیز ہے [illegible] کاتب الحروف اور اسکی کتاب پر یہ [illegible] کرم برتا گیا ہو، مگر یہ بھی قابلِ تصور چیز نہ تھی کہ اس طرح کا تبصرہ کم از کم اس اطمینان کے بغیر شائع کر دینے کی جرات کوئی کرے کہ مولانا اسے ناپسند تو ہرگز نہیں فرمائیں گے۔ مولانا نے جو رویّہ اس تبصرے کے خلاف ایک حرف نہ کہنے کا، مختلف جہات کی کوششوں کے باوجود اپنایا جن میں سے کچھ کی تفصیل آپ پڑھ چکے اور کچھ کی تفصیل "الفرقان کی ڈاک" کے صفحات میں شاید آئے گی، اور پھر بہت مجبور ہو کر

لے یہاں اس تبصرہ کا ذکر مناسب [illegible] کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کی بابت امام ابن تیمیہ کا کلام بھی کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔

کچھ کہا تو وہ کہا جس کی بات ابھی ہم کر رہے تھے. تب کوئی گنجائش اپنے دل کو سمجھانے کی باقی نہیں رہ گئی، اور بالکل یقین کرنا پڑا کہ یہ تبصرہ اُسی برہمی و برافروختگی کے تسلسل کی ایک کڑی تھی جو برہمی کبھی "شہداء اسلام" کے جلسۂ لکھنؤ میں ظاہر ہوئی، کبھی مولوی سید سلمان صاحب حسینی کے مضمون میں نظر آئی اور کبھی آکسفورڈ کی ٹیبل ٹاک (TABLE TALK) میں دکھائی دی —— اور اس برہمی کا سراغ لگانے کی (جو کہ مولانا کے ساتھ اپنے چالیس برس کے خوردانہ تعلق کا ایک غیر معمولی تجربہ تھا) جو کوشش کی تو پتہ چلا کہ اِس حقیر کی کتاب اور اُس کا مقدمہ مولانا کے کچھ ایسے مخصوص خیالات سے ٹکرا گیا ہے جن کو کبھی اُنکی تحریروں سے اخذ کرنے کی طرف ذہن نہ گیا تھا. (اس لئے کہ اُن خیالات کی توقع ان سے نہیں تھی) مگر اب اس تجربے کی روشنی میں وہ بالکل آئینہ ہیں[1]۔

حسرتِ "دمِ واپسیں"

بہر حال یہ حسرت رہ گئی، اور شاید اب اسکے مقدر کو تبدیل نہیں ہونا ہے کہ کاش حضرت مولانا نے اس خورد سے تفہیم کے انداز میں اس مسئلے پر اپنے خیالات کا کچھ اظہار فرما دیا ہوتا اور اُسے موقع دیا ہوتا کہ کچھ عرض کرنا چاہے تو عرض کر سکے، اسلئے کہ اُس سے اس معاملے میں کسی نالائقی کا اندیشہ کرنیکی کوئی گنجائش نہ تھی، زیادہ باتیں اس بارے میں کہنے کی ضرورت نہیں صرف ابھی گزشتہ ہی سال کی یہ بات یاد دلانی کافی ہوگی کہ عراق اور کویت کے قضیے میں امریکہ کی مداخلت کے بعد محترم مولانا کے خیالات جو برابر تعمیر حیات وغیرہ میں شائع ہو رہے تھے اس حقیر کیلئے اس حد تک ناقابلِ فہم ہوئے کہ صریح زبان میں "ناقابلِ برداشت" کہنا چاہیئے. مگر ہرگز اس بات کی جرأت نہیں کی جاسکی کہ سامنے آکر اعتراض کیا جائے اسکے بجائے ایک عریضہ لکھا جس میں اپنے دل کا درد کھول کر بیان کیا. اور چاہا کہ مولانا کوئی تشفی بخش توجیہہ اپنے موقف کی کر دیں. وہ عریضہ بعینہٖ ذیل کی سطروں میں پڑھ لیا جائے اور دیکھ لیا جائے کہ یہ شخص جس نے ایک ملّی معاملے میں ایسے شدید احساسات کے باوجود نہ صرف یہ کہ علانیہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا بلکہ نجی خط میں بھی سراپا ادب بنکر بات عرض کی اُس سے کیا یہ توقع نہیں کی جانی چاہیئے تھی کہ وہ مولانا کے ارشادات بسر و چشم اور پورے ادب و لحاظ کے ساتھ سنے گا؟

[1] آئندہ کبھی فرصت ملی تو مولانا کے ان خیالات پر کچھ عرض کرنے کی صورت بھی انشاء اللہ نکالی جائے گی۔

جمعہ ۲۱ ذوالقعدہ، ۳۱ مئی سنہ ۹۱ء

مخدومی و معظمی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

میرے ایک عریضے کی یہ بات شاید یاد ہو کہ "مجھ سے بزرگوں کو خط نہیں لکھا جاتا". بنا بریں دل میں ایک گزارش کا تقاضہ کم از کم چھ ماہ سے تھامے ہوئے چل رہا ہوں کہ گزارش کی جرأت کہاں سے لاؤں —— مگر اب ایک دوسرا احساس اس تقاضائے ادب پر غالب ہو رہا ہے کہ شاید اب زیادہ وقت نہ گزرے کہ مشافہہ کی نوبت آجائے جو اس بوجھل دل کے ساتھ کسی طرح مناسب نہ ہوگی۔

دل کا یہ بوجھ خلیج کے المیہ میں آنمخدوم کے اور ندوۃ العلماء کے اس موقف سے متعلق ہے جو تعمیر حیات، الرائد اور البعث الاسلامی وغیرہ کے ذریعہ سامنے آتا رہا۔

اس قضیے میں صدام حسین کے متعلق آپ جو کچھ فرماتے رہے. اس میں کوئی اشکال کی بات نہ تھی۔ اشکال (اور بے پناہ اشکال) وہاں ہوتا رہا جہاں ان امور میں بھی تنہا صدام حسین ہی کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا جن امور میں سعودی اور کویتی حکمران صدام سے کہیں زیادہ قابلِ گرفت اور مستحقِ ملامت تھے۔ مثلاً عراق کی تباہی. امریکہ کا قلبِ اسلام میں مکمل گرفت کی حد تک پہنچا ہوا ہونا اور اسرائیل کے لیے علاقے کے اندر حالات کا زیادہ [illegible] ہو جانا۔

صدام حسین نے کویت پر حملے اور قبضے کے ذریعہ ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ امریکہ اسے مذکورہ بالا مقاصد کی طرف پیش قدمی کے لیے ایک بہانہ اور ذریعہ بنائے ـــــ چاہے یہ اُس نے دانستہ کیا ہو یا نادانستہ۔ لیکن اس پیش قدمی کے لیے امریکہ کو نہ صرف راہ دینے بلکہ دعوت دینے اور اپنے تمام وسائل اس راہ میں امریکہ کے لیے بچھا دینے کی ذمہ داری تو سعودی اور کویتی حکمرانوں نے پوری دنیا کے سامنے اپنے کاندھوں پر اٹھائی ہے۔ پھر آپ کے خدام کے لیے یہ کیوں کر روا ہو سکتا ہے کہ ان المناک اور پریشان کن نتائج کے لیے وہ عراقی حکمراں کی تو مذمت کریں اور سعودی اور کویتی حکمرانوں کے لیے صرف تعریف و توصیف اور حمایت و مدافعت روا رکھیں؟ حالانکہ صدام سے تو کبھی بھلائی کی توقع تھی ہی نہیں، جب کہ ان دوسرے لوگوں کو ہم تھوڑا یا بہت حامیٔ اسلام سمجھتے تھے۔ اس لئے شکوہ تو ہمیں درحقیقت یا زیادہ انہی سے ہونا چاہئے تھا، کہ ایک بعثی نے اعدائے اسلام کو ایک ذرا سا بہانہ (ممکن ہے کہ بالکل ہی نادانستہ) فراہم کیا اور ان حامیانِ اسلام نے بجائے اس کی کوشش کے کہ ایک ناخدا ترس اور ناعاقبت اندیش کا پیدا کیا ہوا یہ بہانہ اعداء کے کام نہ آئے۔ اعداء کو دعوت دی کہ وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور ان کا نام "اصدقاء" رکھا اور پھر یہاں تک اُن سے دوستی اور یگانگت دکھائی کہ بُلایا ان کو مملکت سعودیہ کی حفاظت کے نام پر تھا مگر جب انھوں نے سعودیہ کی حفاظت سے آگے بڑھ کر کویت کی آزادی کے لیے اقدام، اور کویت کی آزادی کے لیے اقدام سے آگے بڑھ کر عراق کی حسبِ ضرورت اور حسبِ منشاء تباہی کو اپنا نشانہ قرار دیا، تب بھی ان دوستوں کو نہ صرف یہ کہ کوئی پریشانی نہ لاحق ہوئی بلکہ خود بھی

ان کے شانہ بشانہ ہوئے اور امریکہ کی کمان میں اس دادِ شجاعت کا نام جہاد رکھا۔

یہ اپنے دل کا حسرت بوجھ ہے اور اس کا اظہار بھی اگرچہ کچھ کم شاق نہیں مگر اسے دل میں رکھ کر ملنا شاید اس سے زیادہ مشکل ہو جاتا۔ اس لیے کسی طرح جرأت کی ہے کہ جو کچھ دل میں ہے وہ سامنا ہونے سے پہلے ہی آپ کے سامنے رکھ دوں۔ کوشش پوری کی ہے کہ دامنِ ادب پر ہاتھ کی گرفت بھرپور رہے۔ لیکن اگر کچھ چوک ہوئی ہو تو آپ کا دامن عفو یقیناً بہت وسیع ہے۔

عفو خواہ

عتیق الرحمن سنبھلی

لندن

یہ عریضہ آپ نے پڑھ لیا، اب اس کے چار ماہ بعد کا ایک خط مولانا کے بھانجے اور دست راست مولانا محمد رابع صاحب حسنی کے نام کا پڑھ لیجئے جو آکسفورڈ کے ناشتے کی میز کے "اس تجربے کے بعد لکھا گیا تھا جس کے بارے میں راقم نے کہا ہے کہ وہ مولانا کی مجلس میں اپنی زندگی کا ایک منفرد تجربہ تھا۔ یعنی جسے کہا جا سکتا تھا کہ:

جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

اس خط کو پڑھ کر بھی اور غور کیجئے کہ کیا اس خط کا لکھنے والا اسی رویے کا مستحق تھا جو حضرت مولانا اور ان کے نائبین کی طرف سے اختیار فرمایا گیا۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مولانا محمد رابع صاحب) صدیق عزیز،

امید ہے آپ اپنے پروگرام کے مطابق لکھنؤ پہنچ گئے ہوں گے دعا ہے کہ سفر خیریت سے تمام ہوا ہو — میری اہلیہ۔ اگر ان کا حال معلوم کرنے سے آپ کو دلچسپی ہو تو ۔ اللہ کے فضل و کرم سے اُس وقت کے مقابلے میں کافی بہتر ہیں۔

ہماری آپ کی مجبوری کہ ملے تو وقت کی وہ نہایت اہم بات آپ میں نہ چھیڑ سکے جس کے تئیں اضطراب نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی خدمت میں ایک کرب نامہ تحریر کرادیا، جو یقیناً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔[1] تعمیر حیات (۱۰ ستمبر) کے ایک مضمون کا تراشہ لکھنؤ سے ملا ہے جس میں نشان زد کی گئی چند سطروں میں بظاہر میرے اس عریضے ہی کی طرف اشارہ ہے ۔ مجھے تعجب ہے کہ اس اشارے کو میرے گھر والوں نے کیسے سمجھا جبکہ میں نے تو اس عریضے کی ہوا بھی کسی کو نہ دی تھی، بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ اشارہ جس انداز میں کیا گیا ہے اس سے حضرت مولانا کی اور آپ حضرات کی گرانی کا اظہار ہوتا ہے۔ کاش اس کا علم کچھ پہلے ہو جاتا تو یہاں ملاقات میں آپ سے بھی معذرت خواہی کرتا اور حضرت مولانا سے تو دست بستہ معافی مانگتا۔ اگرچہ اس مسئلہ میں میرے کرب کا عالم آج بھی وہی ہے جو اُس دم تھا اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آپ جیسے احباب اور حضرت مولانا جیسے بزرگوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے اپنے دل کی بات کھل کر نہیں کہی

---

[1] یہ وہی عریضہ ہے جو اوپر گزرا۔

جائے ۔۔ "قہر درویش بجان درویش" کا معاملہ ہے۔

یہاں ایک مولوی صہیب حسن صاحب ہوتے ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی کے فارغ اور دعوت و ارشاد کے چیف مبعوث۔ ان سے ایک اور رشتہ بھی ہے۔ مولانا عبدالغفار حسن کے بیٹے ہیں، جو گویا حضرت مولانا کے اور والد ماجد کے دوستوں میں ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر یہاں خلیجی المیہ کے موقع پر سعودی عرب کی یا کہئے ادارۂ دعوت و ارشاد کی مہم کے سربراہ وہی تھے۔ اس پورے عرصہ میں میری ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور انھیں ضرور اندازہ رہا ہوگا کہ اس میں میرے قصد کو بھی دخل ہے۔ میری پوزیشن ان کو معلوم تھی۔ کل ایک جلسے میں ساتھ ہو گیا وہاں ان کی تقریر کے بعد سامعین میں سے ایک نے اس مسئلہ پر ان سے کچھ سوال کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ یہی چیز اس کا باعث ہوئی کہ صہیب صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آپ کی اب بھی وہی رائے ہے جو شروع میں تھی؟ میں نے کہا۔ بالکل وہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اعتماد اور وثوق کے ساتھ۔ کہنے لگے مولانا علی میاں تشریف لائے تھے آپ کی ملاقات ہوئی؟ میں نے کہا جی ہاں ہوئی۔ کہنے لگے ان سے اس مسئلہ میں کوئی بات نہیں ہوئی؟ میں نے کہا نہیں بھائی۔ ایک خط البتہ میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا تھا جس کا کوئی جواب حضرت مولانا نے نہیں دیا۔ اپنے دو رسالے اس سلسلہ کے مضامین کے بھجوائے تھے۔ مگر ان میں میرے سوال اور میرے نقطۂ نظر سے متعلق کوئی بحث ہی نہ تھی۔ بولے کہ آپ نے یہاں بھی اس کے بارے میں بات نہیں کی؟ میں نے کہا: مولانا کو میں نے اپنی ابتدائی عمر سے اپنے والد ماجد کے ساتھ دیکھا ہے اور ہمیشہ برابر دیکھا جاتا ہے ...

جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ مولانا جواب نہ دینا چاہیں اور میں کہوں کہ کچھ جواب دیجئے۔ وہ بزرگ ہیں میں ان سے نہایت چھوٹا ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میری سمجھ میں اُن کی بات نہیں آرہی اور ادب کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کے تقاضوں کو بھی ان کا حق دینے کی تعلیم جن بزرگوں سے پائی ہے اُن میں سے ایک خود مولانا مدظلہٗ کی ذات ہے۔"

اچھا جناب یہ تو ہو گیا۔ اب ایک دوسری بات سنیے۔ بلکہ ایک شکریہ قبول کیجئے۔ آکسفورڈ میں آپ حضرات کے ساتھ گزرنے والی ایک رات زندگی کی ایک یادگار رات بن گئی ہے۔ کافی دن سے راتیں بڑی بے توفیقی کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ اس رات آپ کی معیت کے طفیل مجھ پر بھی بقدرِ نصیب توفیق خیر کا در کھلا۔ یعنی ھم قوم لا یشقی جلیسھم آپ کو اگر اس طفیل کی نسبت اپنی طرف کرنے میں تکلف ہو تو حضرت مولانا کا طفیل ماننے میں تو بہرحال کوئی دقت نہ ہوگی۔ اللہ آپ کو اور حضرت مولانا کو عافیت سے رکھے۔

والسلام

عتیق الرحمٰن سنبھلی

لندن۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۱ء

مجھے نہیں معلوم کہ اگر آکسفورڈ میں مولانا کی گفتگو کا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تب بھی میں اپنے یہ احساسات اس مکتوب کی صورت میں قلم بند کرنے کی ضرورت سمجھتا یا نہیں لیکن اس واقعہ پر مولانا کی گرانیٔ خاطر دیکھ کر یہ مفید سمجھا کہ ان سے متعلق اپنے دل کا حال مولانا رابع صاحب کے توسط سے اُن تک پہنچے اور امید کی کہ انشاءاللہ مولانا کی کیفیت میں فرق پڑے گا۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ امید تعمیر حیات کے اس تبصرے کی شکل میں پوری ہوئی جس کے خاتمہ پر یہ وعید آمیز آگاہی بھی (حضرات حسنینؓ کی مفروضہ مخالفت پر) دی گئی تھی۔

"حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی مخالفت ناشی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت سے، وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا دل صاف نہیں رکھتے اور نہ ہی آپ سے اپنی بیزاری و کراہت کو ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں وہ اس راستے سے اپنے دل کا بخار نکالتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○

ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں تم کو رنج پہنچاتی ہیں مگر یہ تمھاری تکذیب نہیں کرتے، بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔"

حرفِ آخر

بہرحال ذاتی احساسات کی جراحت کا تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں لیکن صحابہ کرام کے ایک گروہ کی بابت جو بدزبانی تبصرے میں کی گئی ہے اس کے لئے ضرور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے ہم زبان ہو کر دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی ذمہ داری کے ہر شریک کو خلوص دل سے سرِعام توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اگر راقم الحروف سے کوئی ایسی غلطی الفرقان کے ان صفحات میں یا کتاب کے صفحات میں ہوئی ہو تو یہی دعا اپنے لئے بھی ہے اور قارئین کتاب سے خاص طور پر استدعا بھی ہے کہ ان کی نظر میں اگر کوئی عبارت توہین اہلِ بیت کرام کا مفہوم رکھتی ہو تو وہ ضرور اس خاکسار مصنف کو اس سے آگاہ فرما کر احسان کریں۔

افسوس ہے کہ راقم الحروف بہت زیادہ دیر تک پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے نہایت قیمتی مقالے اور قارئین کے درمیان حائل رہنے پر مجبور رہا۔ اب اپنی گزارشات کا ورق تمام ہوتا ہے۔ آئیے اور صدیقی صاحب کے مقالے سے مستفید ہوجیے۔ سبحانک اللھم و بحمدک نشھد ان لا الٰہ الا أنت نستغفرک و نتوب الیک

ے تیجہ ۱ے ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) ۱۹۹۲ء از صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۰۳

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر"
ایک تبصرہ کا تجزیہ

"تعمیر حیات" لکھنؤ کے ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء کے شمارے (ص ۱۵-۱۳) میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کی تازہ کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کے زیر تبصرہ آئی ہے، فاضل مبصر نے تبصرہ کے آخر میں ایک خاص نوٹ میں فرمایا ہے کہ "اس تبصرہ میں صرف اصول بحث اور طریق فکر سے بحث کی گئی ہے، پوری کتاب کے تمام مندرجات پر بحث کرنا اوران کا رد لکھنا نہ پیش نظر ہے اور نہ اس کا وقت ہے۔" اس کے بعد تبصرہ نگار نے حضرت امام مالکؒ کے ایک قول پر یہ نوٹ ختم کیا جس کے مطابق وہ اس قسم کے مباحث میں خاموشی اختیار فرماتے اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۱ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (یہ جماعت گزر چکی اُن کو اُن کے اعمال کا بدلہ ملے گا تم کو تمھارے اعمال کا اور جو عمل وہ کرتے تھے اُن کی پرسش تم سے نہ ہوگی) پڑھ دیا کرتے تھے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر خاص کر اس نوٹ کی روشنی میں سخت حیرت ہوئی کہ تبصرہ نگاری کا یہ کون سا علمی، اخلاقی، اسلامی اور دینی معیار ہے؟ سچ یہ ہے کہ تبصرہ نگاری کے پردے میں دشنام طرازی دیکھ کر بہت صدمہ ہوا، اور وہ بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک نمائندہ مجلّہ وپرچہ میں جس کی شرافتِ قلم اور معتدل وشریفانہ اظہارِ اختلاف کے

گن گائے جاتے ہیں، راقم سطور عام طور سے اِن مناظرانہ اور اختلافی مباحث سے گریز کرتا ہے کیونکہ وہ افہام وتفہیم کے جذبے سے عاری ہوتے ہیں اور صرف الزام تراشی اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کار ہوتے ہیں لیکن اس تبصرہ کو پڑھ کر اتنا ہیجان اور اضطراب ہوا کہ اس پر یہ استدراک قلم سے نکل پڑا۔ چونکہ فاضل تبصرہ نگار نے بعض علمی اسلامی اور تحقیقی اصولوں کی آڑ میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کو اپنے پسندیدہ مزعومات کے دفاع میں مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے خاکسار ضروری سمجھتا ہے کہ بعض معروضات اس تبصرہ کے قارئین کے سامنے پیش کرے [illegible] تبصرہ کے مزعومات کو اصل تعلیمات اور اصول نہ سمجھ لیں۔ مولانا سنبھلی [illegible] تبصرہ میں بھی نہیں کروں گا کہ وہ مفصل مطالعہ کا متقاضی ہے جس کا یہاں موقع نہیں، میں تبصرہ نگار کے اٹھائے ہوئے نکات سے ہی بحث کروں گا۔

محترم تبصرہ نگار نے بعض اردو اور انگریزی اصطلاحات کا سہارا لے کر کتاب زیر تبصرہ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اول تو مفروضہ تحقیقی نتیجۂ بحث (HYPOTHESIS) اور (THESIS) دونوں کو ایک ہی معنی... استعمال کیا ہے۔ حالانکہ دونوں اصطلاحیں الگ الگ ہیں۔ وہ ایک نہیں ہوسکتیں۔ ان میں سے صرف ایک ہی اس موقع پر صحیح ہوسکتی ہے، مولوی عبدالحق نے اپنی اردو انگلش ڈکشنری میں (HYPOTHESIS) کے دو معانی "مفروضہ"، "قضیہ" اور "بے دلیل دعویٰ" دیئے ہیں جبکہ (THESIS) کے معنی بتائے ہیں، دعویٰ، نظریہ، مقالہ مع تشریحات، ظاہر ہے کہ ایک دعویٰ بلا دلیل ہے اور دوسرا دلائل سے مدلل نظریہ اور ثبوت سے آراستہ دعویٰ و علمی مقالہ۔ تبصرہ نگار یا تو ان الفاظ کا فرق نہیں سمجھتے یا جان بوجھ کر انھوں نے الجھن پیدا کی ہے۔

پھر فاضل تبصرہ نگار نے مولانا سنبھلی کی کتاب کا جو نتیجۂ بحث اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے اسے انگریزی محاورہ کے مطابق اپنی بات دوسرے کے منہ میں رکھنے کا مصداق اور علمی بددیانتی کہا جاسکتا ہے۔ مؤلف کتاب نے کہیں یہ نہیں کہا کہ "حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب بلاوجہ اپنی جان گنوانے والے شخص تھے"۔ اس جملہ کے تینوں صفاتی فقرے

محترم تبصرہ نگار کے پُرغضب قلم کے تراشیدہ اور اُن کے پُرغیظ دماغ کے زائیدہ ہیں۔ مؤلف کتاب کا نظریہ کیا ہے فی الحال اس سے بحث نہیں مگر یہ تینوں صفات الزام تراشی کے ضمن میں آتے ہیں۔ فاضل تبصرہ نگار نے غالباً یہ نہیں سوچا کہ شہنشاہیت کے طالب کا مطلب کیا ہے؟ مؤلف کتاب نے دلائل و شواہد کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا موقف ان کے بڑے بھائی حضرت حسنؓ سے ہمیشہ الگ رہا اور انھوں نے اپنے برادر بزرگ کے احترام اور حالات کے دباؤ کے تحت حضرت معاویہؓ کی خلافت تسلیم کی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے بعد کے حالات میں وہ اپنے آپ کو دوسرے موقف کے لئے آزاد سمجھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ وہ یزید سے اپنے آپ کو خلافت کے لئے بہتر سمجھتے تھے اور اگر طالب تھے تو خلافت کے نہ کہ شہنشاہیت کے۔ جہاں تک حضرت حسینؓ کے "بلا وجہ اپنی جان گنوانے" والے فقرہ کا تعلق ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فاضل تبصرہ نگار نے شہادت حسین پر کتاب کا آخری باب اور ابن تیمیہؒ کی بحث پڑھی نہیں، یا پڑھی تو اپنے مزعومات کے تحت اس کو نظر انداز کر دیا۔

تحقیق کی تکنیک پر مبصّر گرامی قدر نے جو دو پیراگراف سپرد قلم فرمائے ہیں، اُن کا ماحصل یہ ہے کہ اپنے نظریہ' بقول اُن کے "مفروضہ عقیدہ" کے موافق واقعات کو مؤلف کتاب نے "ایک تسلیم شدہ حقیقت کی طرح قبول کیا ہے اور جہاں ان کے رجحان کے خلاف بات ملی" اس کو کسی نہ کسی بہانے سے مسترد کر دیا ہے۔ مؤلفِ کتاب کی تحقیقی تکنیک کیا ہے؟ اس سے یہاں بحث نہیں یہاں اصل بحث یہ ہے کہ کیا فاضل تبصرہ نگار نے یہی تکنیک اپنے تبصرہ میں نہیں اپنائی ہے پورا تبصرہ پڑھ جایئے۔ انھوں نے اپنے مفید مطلب اور ہمنوا مؤلفین و مؤرخین کے اقتباسات یا حوالوں کے ذریعہ گفتگو کی ہے۔ انھوں نے بھی اپنے رجحان کے مخالف یا مفروضہ تبصرہ کے ناموافق کسی بڑے سے بڑے اہلِ قلم کا ذکر و حوالہ تک نہیں دیا۔ پھر انھوں نے بعض ایسے اہلِ قلم کے حوالہ سے مؤلف کتاب نو در کنار صحابہ کرام جیسی بزرگ شخصیات پر کیچڑ اچھالی ہے جن کو وہ خود اسلام کا نمائندہ نہیں سمجھتے مگر اس پر گفتگو ذرا بعد میں ہوگی۔

ہاتھ میں ہاتھ دینے والی روایت کا مفہوم جو فاضل تبصرہ نگار نے مؤلف کتاب کے منہ میں اپنی جانب سے رکھا ہے وہ بھی ان کی علمی دیانت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ مؤلف کتاب نے اپنی فہرست کے صفحہ (ز) پر اس کا مفہوم "یزید کے پاس جانے کی پیشکش" بیان کیا ہے پھر ص۲۲۳ پر اسی ذیلی سرخی کے تحت اس پر بحث کی ہے۔ اس سے قبل اور بعد جہاں مؤلف نے اس روایت کا مفہوم بیان کیا ہے اس میں صرف ہاتھ میں ہاتھ دینے اور صلح کرنے کی بات کہی ہے، بیعت کرنے کا مفہوم کہیں نہیں بتایا گیا جس کی مبصر محترم نے بڑے دعووں اور چیلنج کے ساتھ تردید کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف مؤلف کتاب بلکہ ان کے ہمنواؤں کو بھی چیلنج کر دیا ہے کہ "وضع الید فی الید" کا مبایعت کے معنی میں استعمال کلامِ عرب سے ایک مثال کے ذریعہ پیش کر دیں۔ پھر اس روایت کے آخری جملہ "فیری فیما بینی و بینہ رأیہ" کی دلیل سے بیعت کے مفہوم کی تردید دکھائی ہے۔ مؤلف کتاب نے جہاں بھی اس جملہ کو نقل کیا ہے وہاں ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی ترجمہ کیا ہے۔ ص۲۲۵ کے حاشیہ ۱ میں مؤلف کی عبارت ملاحظہ ہو:

"ان روایتوں کے الفاظ ہیں "حتی اضع یدی فی یدہ" جس کا لفظی ترجمہ ہے (تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدوں) کوئی اس عبارت کا ترجمہ "بیعت" سے نہ بھی کرنا چاہے تو "سپردگی" سے پھر بھی کرنا ہی ہوگا اور پھر فرق کیا رہا؟" جملہ زیر بحث کے ترجمہ کے لئے ملاحظہ کیجئے کتاب کے صفحات (۱) ص۱۷ (جس پر روایت کے الفاظ کا یہی ترجمہ متن و حاشیہ میں دیا ہے) (۲) ص۱۹ جس پر ہے کہ "یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں، پھر وہ میرے اور اپنے معاملہ میں جو سمجھے فیصلہ کرے" (۳) ص۲۰ پر بھی یہی ترجمہ ہے اور ترجمہ کے بعد والی بحث میں "ہاتھ میں ہاتھ دینے کی بات کہی ہے"۔ بقیہ صفحات میں بھی ترجمہ یہی ہے۔ فاضل مبصر کی سخت زیادتی ہے کہ انھوں نے اپنا مفہوم مؤلف کے سر تھوپ دیا۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ خود مبصر محترم نے بیعت کے معنی میں اس محاورہ کے وجود سے انکار کیا ہے پھر لکھتے ہیں کہ "جہاں مبایعت کا ذکر ہے وہاں بایع، بایعنا، لیبایعہ ہی آیا ہے' اور ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا تذکرہ بھی کہیں نہیں اس کے بعد آتا ہے'

وہ بھی ہر جگہ نہیں۔ کنایہ بھی نہیں ہے۔ اگر کنایہ ہے تو دوستی کرنے، مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے کا مفہوم رکھتا ہے" (ص۱۳) اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ عربوں میں بیعت کا طریقہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ہی تو تھا۔ تاریخ اسلام اور ادب اسلامی سے اسکی صدہا مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ سب سے اہم شہادت لسان العرب کی ہے جہاں بیعت کا مفہوم یوں بیان کیا ہے۔ البیعۃ الصفقۃ علی ایجاب البیع وعلی المبایعۃ والطاعۃ الخ (مادّہ بیع)...........

.... اور صفق صفقۃ اصفیق کی تعریف میں لکھا ہے۔.... صفق یدیہ بالبیعۃ والبیع وعلی یدہ صفقا ضرب بیدہ علی یدہ الخ (بذیل مادہ صفق) اور احادیث اور اسلامی تاریخ سے ہاتھ پر ہاتھ مارنے سے مراد بیعت ہونے کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ جہاں تک وضع الید کے محاورہ کا تعلق ہے اسکے بارے میں کہا ہے: "وضع الید کنایۃ عن الاخذ" (اور ایک حدیث نبویؐ کی رعایت سے اسکی موقع کی تشریح کی ہے (بذیل وضع)۔

قرآن مجید نے اگرچہ اس محاورہ کا استعمال نہیں کیا لیکن بیعت کے ساتھ "ید" کا استعمال کرکے وہی مفہوم پیش کیا ہے۔ ارشاد ربّانی ہے:۔

ان الذین یبایعونک انما	جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے وہ ہاتھ
یبایعون اللہ ید اللہ فوق	ملاتے ہیں اللہ سے، اللہ کا ہاتھ ہے اوپر
ایدیہم۔ (الفتح ۱۰)	انکے ہاتھ کے۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر القرآن العظیم (مطبوعہ عیسیٰ البابی وشرکاؤہ غیر مورخہ جلد چہارم ص۱۸۵) پر اس آیت کی تفسیر میں خاص اس جملہ "ید اللہ فوق ایدیہم" کے تحت لکھا ہے

ای ھو حاضر معھم یسمع	یعنی وہ انکے ساتھ موجود انکے اقوال سنتا،
اقوالھم ویری مکانھم ویعلم	انکے موقف کو جانتا۔ اور انکے دلوں کے بھید او
ضمائرھم وظواھرھم فھو تعالی	ظاہر احوال کو جانتا ہے۔ وہ (اللہ) تعالیٰ

ھو المبایع بواسطۃ رسول اللہ	ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ
صلی اللہ علیہ وسلم۔	سے بیعت کرنے والا (مبایع) ہے۔

محترم مبصر کی خدمت میں عرض ہے کہ حافظ ابن کثیر نے "ید اللہ فوق ایدیہم" کا مفہوم بیعت سے لیا ہے اور اس بنا پر اللہ تعالیٰ کو مبایع کہا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس فقرہ میں بیعت کا لفظ یا اس کے مشتقات میں سے کوئی بھی استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ پھر حافظ ابن کثیر پر ہی موقوف نہیں۔ تقریباً تمام مفسرین کرام نے اس فقرہ کا یہی مفہوم لیا۔ ان کی تفصیلات پیش کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ آخر میں یہ عرض ہے کہ حافظ موصوف نے اس آیت کریمہ کے فقرہ بالا کے بارے میں جو احادیث و روایات نقل کی ہیں ان میں ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم بیعت کرنے ہی کا ہے (ص ۱۸۵-۹) مثلاً حضرت انس کی روایت کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعۃ الرضوان کا حکم دیا تو آپ نے فرمایا "اے اللہ! عثمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا کام کر رہے ہیں پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سے ایک کو دوسرے پر مارا اور آپ کا دست مبارک حضرت عثمانؓ کے لئے تھا جو لوگوں کے ہاتھوں سے بہتر تھا (ص۱۸۱)

خود محترم تبصرہ نگار نے تسلیم کیا ہے کہ کنایہ ہونے کی صورت میں وہ "دوستی کرنے اور مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے کا مفہوم رکھتا ہے"۔ یہی تو مطالبۂ حکومت تھا کہ دوستی کر لیں، اختلاف نہ کریں۔ وہ دوستی پر راضی تھے؛ اور آپ بھی اس پر راضی ہیں تو فرمائیے کہ پھر اس محاورہ کا مطلب "بیعت" کے سوا کیا ہے؟ کیا دوستی کرنے کا اور کوئی راستہ تھا؟

جہاں تک مؤلف کے اس جملہ و محاورہ کے شدومد سے مکرر سہ کرر دہرانے کا تعلق ہے وہ تسامح کا قطعی انکار کرتا ہے اور ہاتھ میں ہاتھ دینے کا وہی مفہوم رکھتا ہے جو انھوں نے بیان کیا ہے۔ رہا آخری جملہ کا مفہوم تو واضح ہے کہ خود سپردگی، بیعت، ہاتھ میں ہاتھ دینے یا بقول مبصر "دوستی کرنے اور مساویانہ انداز میں گفتگو کرنے" کا صرف ایک ہی مفہوم تھا کہ تمبیعۂ وقت کیا سلوک و فیصلہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی دستبرداری پر تو راضی نہ ہوتا اور نہ خلافت

حضرت حسین رضؓ کے لئے چھوڑتا۔ دوسری صورت کیا ہوسکتی تھی۔ وہ ظاہر ہے کہ قبول بیعت یا قبول دوستی کی ہی ہوسکتی تھی۔ تیسری صورت ممکنہ عدم قبول اور سزا دہی کی ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ توامکانات ہیں جو غلط بھی ہوسکتے ہیں۔

"روایات کا تضاد اور اس کا سبب" کے تحت فاضل مبصر نے جو بحث کی ہے وہ بڑے معرکہ کی ہے۔ باین معنی کہ اول تو ان کو مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور سلمان رشدی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ایک مسلم و عالم دین مؤلف سے ایک ایسے مصنّف کا موازنہ کرنا جو اس عہد میں اسلام دشمنی کا نمونہ ہو اُس دریدہ قلمی کی مثال ہے جو شرافت و اخلاق اور اسلام و ایمان کی تمام حدود کو پھلانگ جاتی ہے۔ دوم یہ کہ مؤلف نے جن روایات کو نا قابلِ قبول اور منکرا ور من گھڑت کہا ہے ان کے لئے انھوں نے روایات کا تجزیہ کرکے اُن کا تضاد روایت و درایت کی بنیادوں پر واضح کیا ہے اور ان کے موضوع و جعلی ہونے کے دلائل دیئے ہیں۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ ان کے دلائل و تجزیہ کو نہ تسلیم کرے اور اپنی پسندیدہ روایات کو خواہ وہ موضوع کیوں نہ ہوں مانتا اور قبول کرتا رہے۔ مگر مبصر گرامی قدر نے یہ جو الزام مؤلف پر عائد کیا ہے کہ وہ روایات کے ردّ و قبول میں اپنے مزعومہ نظریے کے اسیر رہے ہیں یہ تو دراصل خود ان پر صادق آتا ہے کیونکہ وہ اپنے مفروضات و مزعومات کا اسیر ہونے کے سبب اُن کے دلائل و تجزیہ سے ہی انکاری ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مؤلف کی وہ پوری بحث پڑھی ہی نہیں کیونکہ وہ مبصر کے مزعومات کے خلاف ہے۔

اس کے بعد تبصرہ نگار نے جو تاریخ نگاری کا اصول و طریقہ پیش کیا ہے وہ اس سارے تبصرہ کا شاہکار ہے اور ہر لحاظ سے خطرناک، غیر علمی اور غیر اسلامی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کرکے ایک اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جاسکتا، کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUCN) تھا" مبصر محترم نے اسلام و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کی ساری ذمہ داری بنو امیہ اور ان کے سربراہ

جواب واقعہ کربلا دیرینہ عداوتوں کا منطقی نتیجہ تھا

حضرت ابوسفیان کے سر ڈال دی ہے اور اس ضمن میں حضرت ہند زوجۂ ابی سفیان کی جگر خواریٔ حمزہؓ کا ذکر بھی درمیان میں لائے ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ نفرت و عداوت اس طبقہ بنی امیہ کے دلوں میں جاگزیں رہی حتیٰ کہ وہ فتح مکہ میں بظاہر مسلم ہو گئے اور بباطن دشمنِ اسلام رہے۔ کچھ مدت تک خاموش رہے پھر واقعۂ کربلا کی شکل میں ان کی عداوت رونما ہوئی۔

محترم مبصر کا یہ مفروضۂ عداوتِ بنی امیہ، دعوائے باطل اور غیر تاریخی ہونے کے علاوہ غیر اسلامی بھی ہے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی دشمنی کا مفروضہ بھی باد رہوا کا مصداق ہے جس کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اگر ایسی ہی دونوں خاندانوں میں دشمنی ہوتی تو عبدالمطلب کے عہد سے واقعۂ کربلا کے مدتوں بعد تک ان دونوں خاندانوں کے درمیان بہت سے ازدواجی رشتے نہ ہوتے، ان کے بہت سے سربرآوردہ افراد کے درمیان دوستی اور منادمت کے روابط نہ ہوتے، حضرت حسن، حضرت علی زین العابدین اور حضرت محمد بن الحنفیہ اور نہ جانے کتنے علوی وہاشمی بزرگوں کے اموی خلفاء بالخصوص حضرت معاویہ و یزید سے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات نہ ہوتے۔ محترم مبصر نے اگر اس موضوع پر قدیم مآخذ اور جدید تحقیقات اس باب میں دیکھ کر آنکھیں موند نہ لی ہوتیں تو ایسی بات نہ کہتے۔ پھر اموی خلفاء اور فوج کے ساتھ اکثریت غیر امویوں کی تھی وہ کس چیز کے انتقام لینے کے درپے تھے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان عداوت و دشمنی ثابت کرنے والے بالعموم بعد کے چند ناخوشگوار واقعات جیسے اختلاف علی و معاویہ اور واقعۂ کربلا وغیرہ اور چند بلا سند روایات کا سہارا لے کر تاریخ کا وہ مطالعہ کرتے ہیں جسے جدید اصطلاح میں (محترم مبصر کی پسندیدہ اصطلاحات کی خاطر) (PROJECTION BACK) کہتے ہیں جس میں الٹی گنگا بہائی جاتی ہے۔

جنگ بدر سے واقعۂ کربلا اور واقعۂ حرہ کا تعلق اس وقت تک جوڑا ہی نہیں جاسکتا جب تک عقل و خرد کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور اصولوں سے بھی ہاتھ نہ دھولیا جائے۔ اسی طرح صلیبی جنگوں میں شکست پر انگریزوں کے غم و غصہ کا اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے

اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارنے کی بات بھی وہی شخص کہہ سکتا ہے جو کفر و اسلام کا فرق نہیں جانتا۔ جو مسلمانوں کے باہمی اختلافات و مشاجرات کو اور کافروں و مشرکوں کی عداوتوں ..... کا امتیاز نہیں سمجھتا۔ فاضل تبصرہ نگار نے طلقاءِ مکہ یعنی فتح مکہ کے مسلمانوں بالخصوص بنو امیہ کے مسلمانوں کے اسلام پر شک و شبہ ہی نہیں کیا بلکہ سید قطب وغیرہ کی آڑ لے کر ان کے منافق ہونے یعنی بظاہر مسلم اور بباطن دشمنِ اسلام ہونے اور ان کے اسلام کو "استسلام" کہنے کی جسارت لے جا تک کر کے صحابہ کرام کی سخت توہین کی ہے۔ وہ شاید بھول گئے کہ ان کے اسلام کو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا تھا اور قرآن مجید نے فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کو مومن ہی قرار دیا ہے اگرچہ ان کو سابقون یا فتح سے قبل کے مسلمانوں سے فروتر درجہ میں رکھا ہے۔ فاضل مبصر نے اس باب میں وہ صحیح حدیث بھی بھلا دی جس میں زبان رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو اس بنا پر سید قرار دیا تھا کہ اُن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں (مسلمین) کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔ اس کی جگہ انھوں نے اپنی تائید میں سید قطب کے علاوہ احمد امین اور طٰہٰ حسین کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ غالباً وہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان حضرات بالخصوص موخر الذکر دو کا اسلامی تاریخ نگاری میں کیا درجہ ہے؟ پھر انھوں نے اپنے مزعومات و رجحانات والے مؤلفین کے حوالے دیئے ہیں وہ بھی اُن مؤلفین کے جو تاریخ نگاری میں کسی درجہ کے مستحق نہیں۔ انھوں نے قدیم مآخذ میں طبری، ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن کثیر، واقدی وغیرہ، کسی کا حوالہ نہیں دیا حتیٰ کہ انھوں نے اپنے محترم استاذ الطائفہ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ کا حوالہ بھی نہیں دیا جو طُلقاءِ مکہ بشمول حضرت ابوسفیان اور بنو امیہ کے اسلام خالص کے قائل ہیں۔ (سیرت النبی اول ص۵۳۷ حاشیہ ۱ و ۲) حضرت ابوسفیان کے خلوصِ اسلام و راسخ الایمان ہونے کا واقعاتی ثبوت یہ ہے کہ حضرت سعید بن المسیب جیسے ثقہ تابعی کی روایت کے مطابق ان کی ایک آنکھ غزوۂ طائف میں اللہ کی راہ میں پھوڑی گئی اور دوسری جنگ یرموک میں اور جیسا کہ آوازیں اس جنگ میں خاموش ہوگئیں تو تنہا ان کی آواز اللہ کی قدرت کی گواہی دے رہی تھی۔

پھر حضرت معاویہ اور ان کے برادر اکبر حضرت یزید کے بارے میں ایک بھی تاریخی روایت نہیں ملتی کہ انھوں نے اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی جنگ یا سازش میں کبھی حصہ لیا ہو۔ مبصّر محترم نے بعض روایات کی بنا پر جن کی صحت مشکوک ہے ان کے پورے ایمان و اسلام اور اخلاص پر ہی پانی پھیر دیا۔ اور تمام دوسرے علماء و مؤرخین کے نتائج و فیصلوں سے آنکھ موند لی۔ کیا وہ ایک بھی ثبوت احادیث و اعمال نبوی اور صحابہ کرام و تابعین کے اقوال و آثار سے پیش کر سکتے ہیں جو ان امویوں کے مومن ہونے کی تردید کرتے ہوں؟

محترم مبصّر نے مزید ظلم یہ کیا کہ بنو امیہ کو صرف حضرت ابوسفیان اور ان کے خاندان تک محدود کر دیا۔ اور تمام دوسرے اموی صحابہ کرام کے جن میں سابقین اولین اور شہداء اسلام بھی ہیں۔ اسلام و ایمان سے انکار کر دیا۔ کیا ان کو وہ حدیث نبوی یاد نہیں جس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہیتے صحابی حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو سرزنش کی تھی۔ هلا شققت قلبه (کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟) ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے ایک دشمن کو عین تلوار کے نیچے کلمہ پڑھنے کے باوجود قتل کر دیا تھا۔ ہر مسلمان پوچھ سکتا ہے اور حضرت ابوسفیان اور دوسرے اموی صحابہ جن کے ایمان و اسلام پر تبصرہ نگار نے شک و شبہ کر کے اُن کو غیر مسلم یا منافق قرار دیا ہے اللہ کے ہاں پوچھیں گے "هلّا شققت قلوبنا" پھر محترم تبصرہ نگار نے حضرت ہند کی جگر خوارئ حمزہ کا ذکر بڑے طعن و تشنیع کے ساتھ کیا ہے۔ کیا وہ دوسری اسلامی تعلیم "الاسلام یهدم ما كان قبله والهجرة تهدم ما كان قبلها" (اسلام اور ہجرت اپنے سے پہلے گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں) بھی بھول گئے؟ اسلام سے قبل کے جرائم و عداوتوں کا اسلام لانے کے بعد طعنہ دینے کے کیا معنی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور اللہ تعالیٰ نے تو ان کے جرائم کو معاف کر دیا اور تبصرہ نگار محترم ان کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پھر اس گروہ ہی کے جرائم کا ذکر کیوں؟ سب مخالفِ اسلام صحابہ کا ذکر کریں کہ اسلام سے پہلے وہ ان کے مرتکب تھے؟ کیا وہ حضرت عمر فاروق اور دوسرے بزرگوں کے بارے میں بھی ایسی دریدہ دہنی اور دریدہ قلمی کی

جسارت کرسکتے ہیں، صحابہ کرام کے بارے میں یہ طرزِ فکر تو رافضیت کی دین ہے جو چند حضرات کو چھوڑ کر باقی تمام صحابہ کرام کو منافق و مرتد قرار دیتے ہیں۔

تبصرہ نگار نے صحابہ کرام کی عدالت و کردار کا مضحکہ اپنے اس جملہ میں بھی اڑایا ہے جو یوں ہے: "ایک وہ جس کو حکومتِ وقت سے وابستگی تھی خواہ جان بچانے کی خاطر یا طمع کی وجہ سے یا مسلمانوں کی آپس کی خانہ جنگی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر وہ سمجھتا تھا کہ مناسب یہی ہے کہ جس کا غلبہ ہے اس کی تائید کی جائے دوسرا طبقہ وہ تھا جو اصل دین کی پامالی پر رنجیدہ تھا۔" اس دوسرے طبقہ میں کتنے آدمی تھے؟ پہلے طبقہ میں تو وہ تمام لوگ آتے ہیں جنھوں نے حضرت معاویہ اور ان کے فرزند کی خلافت کی بیعت کرلی تھی۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمر جیسے بہت سے صحابی تھے، ان میں حضرت عبداللہ بن عباس بھی تھے، اور حضرت حسین کے بڑے بھائی حضرت حسن، محمد بن الحنفیہ اور دوسرے کئی بھائی تھے اور خود واقعۂ کربلا کے بعد ان کے لختِ جگر حضرت زین العابدین بھی تھے۔ بعد کے اموی خلفاء کے کردار و سیرت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا صرف اتنا کہ اخلاف کے کارناموں، کرتوتوں کے ذمہ دار اسلاف نہ تھے۔ پھر قرآن محکم کا فیصلہ ہے "لاتزر وازرۃ وزر اخری" (کوئی دوسرے کے بوجھ کا ذمہ دار نہیں)۔ پھر ان اموی خلفاء و اخلاف کی لغزشوں کے لئے محترم تبصرہ نگار گواہی لائے بھی تھے تو کہاں سے شیعی اور من گھڑت راوی ابوالفرج اصفہانی کی اغانی اور ابونواس اور بشار بن برد جیسے فحش گو شعراء کی خرافات سے یہ تو قائل سے گواہی لانے کے مترادف ہے۔

"تاریخِ اسلامی کی کتب کی روایات کے سلسلہ میں جو بات یا دعویٰ محترم تبصرہ نگار نے کیا ہے کہ سرکاری روایات اور چھپے ہوئے مومنین کی روایات میں واضح فرق تھا اور اس فرق کو آلِ فرعون کے مردِ مومن کے حوالہ سے اور قرآن کی آیت سے مدلل کیا ہے وہ خالصتہً تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش ہے، اس کا بہترین عنوان "تاریخی روایات یا تاریخ نگاری میں تقیہ کا کردار" ہوسکتا ہے۔ اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کہ وہ مؤلف کتاب پر تبصرہ سے زیادہ محترم تبصرہ نگار کا نظریۂ

تاریخ ہے جس سے سر دست ہمیں بحث نہیں۔ البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ مردِ مومن جیسے لوگوں کی روایات کے بارے میں جو دعویٰ محترم مبصر نے کیا ہے کہ "وہ اپنی نسل کو صحیح حالات سے باخبر کرنے کے لئے اپنی معلومات ان تک منتقل کراتے تھے"۔ وہ تقیہ سازی، باطل روایات یا قصہ کہانیوں کے سوا کیا ہے؟

واقعۂ کربلا کے زمانے کی جس شخصی حکومت اور حاکم کے [illegible] کے درمیان قانون ہوتے اور ظلم و جبر کرنے کی داستانوں کا محترم مبصر نے حوالہ دیا ہے اس کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ ہمارے مآخذ میں متعدد روایات موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ حضرت معاویہ اور ان کے بیٹے کے خلاف ان کے رُو در رُو بہت سی ناروا اور سخت باتیں کہی گئیں اور کسی کو سزا دینے یا قتل کرنے کا حکم نہیں ملا معلوم نہیں تبصرہ نگار محترم کا ان روایات کے بارے میں کیا خیال ہے جن میں یزید کو خاص اس کے قصر و دربار میں خانوادہ علی رضی اللہ عنہ کے بچے کھچے افراد نے سخت سست کہا تھا؟ رہا حضرت امام نسائی کا واقعہ تو تبصرہ نگار نے یہاں دو مغالطے دیئے ہیں اول یہ کہ حضرت موصوف نے حضرت معاویہ کے مناقب سنانے کی فرمائش کے جواب میں کہا تھا کہ ان کی مغفرت ہی ہوجائے تو کافی ہے، ابن خلکان، وفیات الاعیان، قاہرہ سنہ ۱۹۴۸ء اول صـ ۵۹ نے ان کا جملہ نقل کیا ہے "اما یرضی معاویۃ أن یخرج رأسا برأسی حتی یفضل" ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ، مطبع السعادۃ مصر جلد ۱۱ صـ ۱۲۳۴ (دو تین روایات الفاظ کے فرق کے ساتھ) حافظ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، حیدر آباد سنہ ۱۹۵۶ء دوم صـ ۷ ، انھوں نے صرف حدیث سنانے پر اکتفا نہیں کی تھی، دوم یہ کہ مسجدِ اموی کے حاضرین نے ان کے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا اس کے لئے اموی اور عباسی خلفاء کیونکر ذمہ دار تھے، اور اس سے ان کے ناصبی عقائد کا ثبوت کیونکر ملتا ہے؟ پھر کسی ایک گروہ کے خیال میں امام نسائی کا تبصرہ کلمۂ حق تھا اور ہے مگر دوسرے گروہ کے خیال میں وہ کلمۂ حق نہ تھا بلکہ صحابی جلیل کی توہین تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مؤلف کتاب کے بیانات سے اس پوری بحث خاص کر اس واقعہ کا کیا تعلق؟ اور ناصبیت کی بھی خوب رہی، جو آپ کی مانند عقائد نہ رکھے

وہ ناصبی ہے۔ لہٰذا وہ تمام صحابہ کرام، تابعین اور علماء جنھوں نے خلافت یزید تسلیم کرلی تھی۔ کیسے بھی کی تھی، وہ سب کیا ناصبی تھے؟ کیا حضرت حسن کو بھی آپ ناصبی کہیں گے؟

مورخ طبری اور دوسرے ائمہ خاص کر ائمہ اربعہ اور ان میں بھی بالاخص امام ابوحنیفہ کے بارے میں شیعیت کی بحث سے محترم تبصرہ نگار کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس کا مؤلف یا کتاب سے کیا تعلق ہے؟ جہاں تک شیعیت کا تعلق ہے خواہ وہ کسی کی ہو اصولاً ایسے طرفدار شخص کی گواہی یا روایت مخالف کے خلاف یا طرفدار کے حق میں نہیں قبول کی جاتی کہ وہ انصاف واعتدال پر قائم نہیں رہا۔ بہرحال یہ بحث ہم سے زیادہ تعلق نہیں رکھتی۔ اس پر مزید تبصرہ کسی اور موقعہ پر کیا جا سکتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کے حوالہ سے تبصرہ نگار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر میں خروج کو حضرت زید بن علی کے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج کے مماثل قرار دیا ہے یا کہیے کہ حضرت زید کے خروج کو اقدام نبوی کے مماثل قرار دیا ہے۔ پھر دلالۃ النص کی گہری اصطلاح کے حوالہ سے حضرت حسین کے خروج کو اقدام نبوی کے مماثل بتایا گیا اور حضرت زید کے خروج کو حضرت حسین کے خروج کا اتباع قرار دیا گیا ہے۔ تبصرہ نگار گرامی نے اس روایت کا حوالہ موجودہ دور کے ایک مؤلف شیخ ابوزہرہ کی کتاب سے دیا ہے جو ثانوی حوالہ ہے۔ اگر اصل کا حوالہ دے دیتے تو اس روایت کے رُواۃ کی حیثیت ومقام پر بحث کی جا سکتی۔ اس سے قطع نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدام اور بدر کے لئے خروج سے کسی بھی شخص کے خروج کی مماثلت تلاش کرنا جرات بے جا کے علاوہ توہین رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مترادف ہے۔ پھر غزوۂ بدر کفر و اسلام کا معرکہ تھا کیا خروجِ حسین یا خروجِ زید کفر و اسلام کا معرکہ تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے کافروں اور مشرکوں اور اسلام کے علانیہ دشمنوں کے خلاف نکلے تھے کیا حضرت حسین اور حضرت زید کے مخالف ومقابل ایسے ہی کافر و مشرک اور دین کے ... دشمن تھے؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری برگزیدہ رسول اور ختم الانبیاء کا

اقدام تھا۔ کسی غیر نبی کے اقدام کو نبی کے اقدام کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر ایسے غیر نبی کے اقدام کو جس کو ان کے معاصر صحابہ کرام اور ان کے عزیز واقارب اور امتِ مرحومہ کے غالب طبقات میں سے کسی ایک کی بھی تائید حاصل نہ تھی بلکہ جن کے اقدام و خروج کے سلسلے میں علماء امت اور صحابہ کرام کے ایک غالب اکثریت والے طبقہ کے ہاں عدم صحت کی تصریح پائی جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ پر یہ خالص الزام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خروج زید کے حامی ہوں مگر وہ اسے اقدام نبوی کے برابر سمجھتے تھے یہ روایت کا اور اس کے ناقل تبصرہ نگار کا کمال ہے؟ پھر روایت کا ظرفہ ستم یہ کہ مال کے ساتھ معاونت کی مگر تلوار اٹھانے سے گریز کیا محض اس لئے کہ ان کے انصار کمزور تھے۔ کیا حق کا ساتھ دینا اسی کو کہتے ہیں؟ بدر کے غزوہ میں مسلمان بھی تو کمزور تھے کیا کسی صحابی یا مسلم نے مال دے کر جان بچائی تھی؟ تلوار اٹھانے سے معذرت کرنے کا واضح مطلب ہے کہ امام صاحب بفرضِ محال موقفِ زید صحیح بھی سمجھتے تھے تو وقتِ خروج صحیح نہیں سمجھتے تھے کہ اقدام کا کوئی ... نتیجہ مرتب ہونے والا نہیں تھا۔ ایسے خروج کی اجازت شاید کس اصولِ فقہ اور اصولِ دین سے ملتی ہے؟

حضرات ائمہ مالک، احمد بن حنبل اور شافعی کی شیعیت علی سے یہاں کیا بحث؟ یہ مسئلہ تو مؤلف کتاب نے چھیڑا ہی نہیں پھر اگر اس نکتہ کو شیعیت کے ضمن میں اٹھانا ضروری تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے ہمنواؤں کا ذکر بھی آنا ضروری تھا[1] اور ان صحابہ کرام کا بھی جو حضرت معاویہ کے ساتھ تھے۔ فاضل مبصر نے حدیث نبوی کے الفاظ "تقتلہ الفئۃ الباغیۃ" نقل کئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں ... اس بحث کا بھی یہاں کوئی موقعہ نہیں۔ کسی نے اس حدیث کے راویوں میں شیعیت کا سراغ لگایا ہے تو عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب اس کے لئے کیونکر ذمہ دار ہیں۔ یہ دونوں بحثیں دراصل کسی اور کے خلاف نشانہ ہیں اور مؤلف کتاب

---

[1] "الفرقان" اپنی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب ازالۃ الخفاء میں خلافت راشدہ کو دو حصوں یا دو درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے درجے میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان کی خلافت جسے وہ خلافت خاصہ منتظمہ (یا کاملہ) کا نام دیتے ہیں۔ دوسرے درجے میں حضرت علی کی خلافت جو منتظمہ یا کاملہ نہ ہو سکی۔ فاضل تجزیہ نگار کا اشارہ غالباً اسی طرف ہے۔

کا کا ڈھا اس کے لئے تلاش کیا گیا ہے۔ دراصل وہ مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ کی مصداق ہیں۔
اگر فاضل تبصرہ نگار نے جذبات وعزومات سے دب کر کتاب نہ پڑھی ہوتی تو محسوس کرتے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ جیسے صحابی کے ساتھ ساتھ مؤلف کتاب نے حضرت حسین کا بھی دفاع کیا ہے۔ ان کو میدانِ کارزار میں لا کھڑا کرنے کی ذمہ داری اُن شیعوں پر ڈالی ہے جنھوں نے پہلے ان کے والدگرامی اور برادرِ محترم کے ساتھ اور پھر ان کے ساتھ غدّاری کی تھی۔ پہلے ان کو خروج پر آمادہ کیا، طرح طرح سے برانگیختہ کیا، دعوت دی، اصرار کیا، اور جب وہ ان کے اصرار پر ان کے "گھر" گئے تو ان سے غدّاری کر کے حکومتِ وقت سے جا ملے اور ان کے قتل کے لئے میدان میں آ گئے۔ مؤلف گرامی نے حضرت حسین کے انجام کو قتل یا باغی کی موت نہیں کہا بلکہ شہادت قرار دیا ہے۔ یہ ان کا دفاع نہیں تو اور کیا ہے۔؟

محترم تبصرہ نگار نے عباس محمود العقاد، عبدالقادر مازنی، سید قطب اور احمد امین جیسے مؤلفین کی تحقیقات و تصنیفات و خیالات سے اعراض کرنے کا شکوہ مؤلفِ کتاب سے کیا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ تبصرہ نگار کے ہم خیال و ہمنوا ہیں۔ وہ ان کے نزدیک فکری طور پر کسی گروہ کے پابند نہیں اور ان کا طرزِ بحث موضوعی ہے۔ یہ ان کا خیال ہے ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ مؤلفین کس طرزِ فکر کے قائل ہیں اور وہ کتنے اسلام پسند ہیں۔ اگر مصنف کتاب کا اندازِ تحقیق PRESUMPTIVE STUDY ہے تو تبصرہ نگار کا تبصرہ اسی کے مانند PRESUMPTIVE REVIEW ہے۔ یہ جملے جیسے کونسیا کے لحاظ سے ہے۔ محترم مبصر نے ایسے (PRESUMPTIVE) مطالعہ کی تشریح نہیں کی ورنہ عام قارئین کے ساتھ ہمیں بھی معلوم ہوتا کہ اس کا مفہوم و مطلب کیا ہے؟ جدید اصطلاحات اور الفاظ بالخصوص انگریزی الفاظ و مصطلحات کے استعمال کا رعب ہم جیسے عامیوں پر تو پڑ سکتا ہے مگر اہلِ علم و تحقیق پر ان کا رعب نہیں پڑتا۔ دوسرے یہ کہ تبصرہ نگار نے ان سب کا استعمال بیدردی کے ساتھ اور بے سمجھے بوجھے کیا ہے۔ ان کے اسلوب و زبان میں بھی تحقیر واستہزاء کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ پورا تبصرہ مؤلفِ کتاب اور ان کے ہمنواؤں کے خلاف ایک فردِ جرم ہے

جسے لاطائل دلائل، غلط بیانات اور ناقابلِ قبول توجیہات اور دور از کار مباحث سے سجایا دسنوارا گیا ہے۔ تبصرہ نگاری کی یہ ایک ایسی مثال ہے جسے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، افسوس کہ محترم مبصّر نے علمی تبصرہ نگاری کے بنیادی اصول وضوابط سے دانستہ روگردانی کی ہے۔

اس استدراک کا خاتمہ تبصرہ نگار محترم کے آخری نکتہ پر کیا جا رہا ہے جو انھوں نے علامہ سید زینی دحلان کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ان کے ترکش کا یہ آخری تیر بڑا قاتل، بڑا غیر اسلامی اور سخت غیر اخلاقی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی مخالفت ناشی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت سے...... یہ لوگ حضرت سیدنا حسین سے نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عناد کا اظہار کرتے ہیں...." اول تو اس پوری کتاب میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مخالفت کہیں کی نہیں گئی بلکہ انکی ہر طرح سے تحسین و تعریف کی گئی، دوم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اولین موقف سے اختلاف کیا گیا ہے[1] جو انکے تمام معاصرین کو تھا، باستثنائے چند نفوس۔ تو کیا وہ سب صحابۂ کرام، ازواجِ مطہرات اور علماء و تابعین اس جرمِ عظیم کے مرتکب تھے؟ کیا ابن تیمیہ، قاضی ابن العربی شاہ ولی اللہ جیسے بزرگ نفوس بھی اس عنادِ رسول کے مجرم ہیں؟ ایک علامہ زینی دحلان نہیں ہزار ہا ایسے بزرگ ہوں تب بھی وہ کسی مسلم و مومن کے بارے میں عنادِ رسول کا الزام نہیں لگا سکتے۔ اور اگر لگا دیں تو اسکی حیثیت پرِ کاہ کے برابر نہیں۔ فاضل تبصرہ نگار ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ وہ مسلمانوں کے کن طبقات پر کن کن بزرگوں اور کن کن نفوس قدسیہ پر ایک شخص کے حوالہ سے عناد و مخالفتِ رسول کا الزام لگا رہے ہیں۔ اگر اللہ توفیق دے تو اس سے توبہ کریں اور تمام مسلمانوں سے معذرت کریں۔ مگر جس شیعیت بلکہ جس رافضیت کے وہ گن گاتے رہے ہیں، وہ انکو شاید رجوع و استغفار کی مہلت نہ دے کہ اعتقادِ باطل کی کورانہ تقلید اسی طرح دلوں اور آنکھوں پر پردے ڈال دیتی ہے۔ لیکن وہ مقلب القلوب ہر چیز پر قادر ہے اور اسی کے ارشاد کے مطابق ہم اسکی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہو سکتے۔
اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

[1] فاضل تجزیہ نگار کا اشارہ غالبًا امام ابن تیمیہ کی عبارت مندرجہ باب ۱۲ کی طرف ہے ورنہ خود مؤلف کتاب نے اتفاقِ اختلاف کے اظہار کو اپنے حدود سے خارج ٹھہرایا ہے۔ (ماہنامہ الفرقان) لکھنؤ مئی جون ۱۹۹۲ء از ص ۱۰۲ تا ص ۱۱۰

خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی

گزارشِ احوالِ واقعی

۲۵ مئی ۱۹۹۲ء کو "ایک اہم وضاحت" کے زیرِ عنوان مولانا عبد اللہ عباس ندوی صاحب (معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کا ایک ۳۰ سطری بیان شائع ہوا ہے[1]، ان ۳۰ سطروں میں سے آخری ساڑھے تین سطروں کو چھوڑ کر پورا بیان برادرِ معظم مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور ادارۂ الفرقان پر چند سنگین الزامات پر مشتمل ہے۔

اس سلسلہ میں اوّلاً تو عرض ہے کہ اگر ہم مسلمانوں میں قرآن و حدیث کی اس ہدایت پر عمل کا عام رواج ہوتا کہ بلا تحقیق کیے ہوئے کسی کے بارے میں کسی کا الزام تسلیم نہ کریں۔ اور نہ کوئی بے تحقیق بات دوسروں کے سامنے نقل کریں۔ تو ان الزامات کا جواب الفرقان کے صفحات میں دینے کے بجائے ہم یہ بہتر سمجھتے کہ جو ہم سے حقیقتِ حال دریافت کرتا ہے گا ہم اسے خاموشی سے حقیقت بتاتے رہیں گے کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ ان بے بنیاد الزامات کا جواب خواہ جس قدر بھی احتیاط کے ساتھ دیا جائے گا بہرحال اس کے نتیجہ میں ایک ایسے شخص کی، جس کا شمار نہ صرف یہ کہ علماء دین میں ہوتا ہے، بلکہ وہ ایک انتہائی محترم و موقر ادارے کے "معتمد تعلیم" کے منصب پر فائز بھی ہے، جو تصویر بنے گی وہ اچھی اور خوش نما تصویر نہیں ہوگی۔ اور اس سے علماء کے وقار کو بہرحال ٹھیس لگے گی۔ لیکن بالآخر جس پہلو نے الفرقان ہی میں ان الزامات کا جواب دینے کا فیصلہ کرایا وہ یہ تھا کہ برسرِ عام ان الزامات کا جواب نہ دینے کی صورت میں بھی، جو ایک کثیر الاشاعت اخبار۔ تعمیرِ حیات ۔ کے صفحات میں لگائے گئے ہیں، اور پھر الگ سے بھی اس بیان کو وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یہی صورتحال باقی رہے گی

[1] اس شمارے کے بالکل آخری صفحہ پر ہم اس بیان کا فوٹو بھی شائع کر رہے ہیں۔

اس لیے کہ اس بیان میں انصاف و دیانتداری اور علم و اخلاق کے بنیادی تقاضوں سے ہٹ کر جاری ہونے کے الزامات جن لوگوں پر لگائے گئے ہیں، وہ بھی ایک طویل عرصہ سے، علم و دین کی خدمت میں مشغول اور اسی حیثیت سے معروف ہیں اور اگر ان پر لگائے گئے ان بے بنیاد الزامات کی حقیقت نہ کھولی گئی تو بھی وہی نتیجہ ہوگا یعنی علماء کی بے توقیری اور علم و دین اور اس کے نام لیواؤں کی رسوائی۔ اسکے علاوہ ایک اور پہلو تھا جس نے الفرقان کے صفحات میں ان الزامات کا جواب دینے کے حق میں ترازو کے پلڑے کو جھکایا اور وہ یہ تھا کہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام کی شان میں بے ادبی کے گناہ کی جو سزا صداقت و دیانت ہی نہیں عقل و خرد سے محرومی اور ہوش و حواس کی خرابی کی شکل میں فوری طور پر بحکمِ خداوندی مل سکتی ہے اس کی ایک تازہ ترین عبرتناک اور سبق آموز مثال بھی اس طرح سامنے آجائے، اور بہت سے لوگوں کے لیے عبرت و موعظت کا سامان بن جائے ـــــ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صحیح نیت کے ساتھ مناسب طریقہ پر اور بقدرِ ضرورت اپنی بات کہنا آسان فرمائے۔

مولانا عبد اللہ عباس صاحب کے عائد کردہ الزامات میں سے سب سے سنگین الزام یہ ہے کہ انھوں نے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے نام اپنے مفصل وضاحتی خط میں نہ صرف یہ کہ اپنی ان عبارتوں کو لغزش تسلیم کر لیا تھا جو مولانا سنبھلی کی کتاب واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر پر تبصرہ کرتے ہوئے صحابۂ کرام کے ایک پورے گروہ کے بارے میں ان کے (یعنی مولانا عبد اللہ عباس صاحب کے) قلم سے نکلی تھیں۔ بلکہ اُن سے اپنے رجوع و برأت کا مضمون بھی پوری وضاحت سے لکھ دیا تھا۔ اور حد یہ ہے کہ یہاں تک پیش کش کر دی تھی کہ ـ

"میری عبارت سے اطمینان نہ ہو تو آپ (یعنی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب)
عبارت بنا دیں میں اس پر دستخط کر دوں گا اور وہ شائع کر دی جائے۔"

اس سے پہلے کہ ہم مولانا کے ان دعووں پر کوئی تبصرہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا یہ پورا خط اپنے قارئین کی نذر کر دیں۔ اس شمارے کے آخر میں مولانا کے خط کی فوٹو کاپی بھی ہم نے

ضروری ہے، تاکہ سند رہے، اور وہ تاریخی خط مکتوب نگار ہی کی تحریر میں محفوظ ہو جائے۔[1]

آپ بھی خط ملاحظہ فرمائیے! (مولانا کے خط کی جن عبارتوں پر ہم قارئین کی خصوصی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں، اُن کو ہم نے خط کشیدہ کر دیا ہے۔ اور جہاں کہیں کچھ ضروری سمجھا ہے مکتوب الیہ (مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب) نے حاشئے میں کچھ لکھ بھی دیا ہے۔

۱ فوٹو کے علاوہ خط کی کتابت بھی اس لیے کرائی گئی ہے کہ مکتوب نگار کی تحریر کا پڑھنا ہر ایک کے لیے آسان نہ ہوتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۴ مئی سنہ ۱۹۹۲ء

مکرمی و محترمی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ ودعاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ[1]

آپ کا مکتوب مؤرخہ ۱۷؍ مارچ سنہ ۹۲ء مجھے ۴؍ مئی کی شام کو ملا۔ تاخیر سے ملنے کا سبب یہ ہے[2] کہ میں ۲۸؍ اپریل کو واپس آیا ہوں، اس وقت شاہد حسین صاحب یہاں موجود نہ تھے، اور خط انھیں کی تحویل میں تھا جب وہ آئے تو بھی انھوں نے تذکرہ نہیں کیا، بھول گئے تھے، آج قبل مغرب ایک خط کی بابت دریافت کیا جس کا مجھے انتظار تھا، اس وقت ان کو آپ کا مکتوب یاد آیا۔ میری فرمائش پر وہ بعد مغرب دفتر کھول کر خط لے کر آئے۔[3] اس سے پہلے میں نے آپ کا وہ مکتوب پڑھ لیا تھا جو اڈیٹر تعمیر حیات کے نام تھا خط اگرچہ اڈیٹر تعمیر حیات کے نام تھا مگر اس کا جواب دہ میں تھا[4] مگر معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مدظلہ کا بیان اس سلسلے میں نکل چکا

۱ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ!

۲ ہے بہت تعجب کہ قریب دو مہینے تک ڈاک دفتر ہی میں بند پڑی رہے۔ اور پھر مولانا کی واپسی پر بھی بھول کی نذر رہے۔ مگر مولانا فرما رہے ہیں تو مان لینے کے سوا چارہ کیا ہے؟

۳ ع "سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر!"۔

۴ آپ کیوں جواب دہ تھے؟ وہ تو اڈیٹر کے نام تھا۔ اور آپ، جیسا کہ آگے لکھ رہے ہیں، تعمیر حیات کے

اور آئندہ کے لیے اس موضوع پر جس میں مناظرانہ مضامین ہوں[5] وہ تعمیر حیات میں شائع نہیں ہونگے۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ اپنے وضاحتی نوٹ کو دہلی کے "دعوت و عزیمت" میں دوں، مگر وہاں سے اطلاع ملی کہ وہ اس موضوع پر پہلے سے لکھ رہے ہیں اور پرچہ نکلنے والا ہی ہے، اس لیے آئندہ اشاعت میں وہ میرا کوئی مضمون دے سکیں گے۔

اب آپ کے مندرجات مکتوب پر عرض کرتا ہوں۔[6]

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ تبصرہ میرے قلم سے نکلا تھا اور تعمیر حیات میں شائع ہوا۔ اس کی کوئی ذمہ داری ندوہ کے ناظم مجلس انتظامیہ اور موجودہ ذمہ داروں پر نہیں ہے، پھر بھی حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کے کہنے پر انھوں نے ندوہ کا موقف واضح کر دیا، جس سے ندوہ کی طرف سے اس کے مندرجات کے قابل اعتراض پہلو کی جس کی میں چند سطروں بعد عرض کروں گا۔ پوری تردید ہو گئی اور یہ واضح ہو گیا کہ یہ تبصرہ ندوہ کا نہیں بلکہ عبداللہ عباس کا ہے۔ تعمیر حیات کا میں نہ سرپرست ہوں اور نہ اس کے اڈیٹوریل بورڈ میں ہوں۔ میرے مقالہ یا تبصرہ کی نوعیت ایک مراسلہ سے زیادہ نہیں ہے[7] جو روزناموں میں اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوتا ہے کہ

نہ سرپرست نہ ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر بلکہ محض ایک "مراسلہ نگار"! اور وہ خط جواب دہی کے لئے تھا کب؟ وہ تو محض ایک وضاحتی مراسلہ تھا۔ یا شائع کر دیا جاتا یا معذرت کر دی جاتی۔

۵ گویا آپ نے ایڈیٹر تعمیر حیات کے نام والے خط کا سہارا لے کر مجھ سے مناظرہ کرنے کی اس کے باوجود کوشش کی تھی کہ آپ کے نام والے خط میں صاف لکھ دیا گیا تھا کہ تبصرہ میں آپ کا غیر عالمانہ اور معاندانہ رویہ دیکھ کر میں اس کے کسی نکتے پر آپ سے بات کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتا۔

۶ ارشاد!

۷ ندوے میں آپ جس حیثیت کے مالک ہیں، اسکے ساتھ اپنے تبصرے کو کسی بیرونی کے مراسلے کی حیثیت [illegible] آپ کے شایانِ شان نہیں ہے، نیز اس بات سے تجاہل بھی مناسب نہیں کہ کتاب پر تبصرہ آپ نے [illegible] میں برائے تبصرہ آئی ہوئی کتاب کی حیثیت سے کیا تھا، جس کا ظاہری مطلب تو یہی تھا کہ آپ اور تعمیر حیات

ایڈیٹر کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

لہٰذا ندوے کی تحریک وصل کے لیے تھی اور رہے گی (انشاء اللہ) اس تبصرہ کی اشاعت سے ایک شخص کی رائے ضرور معلوم ہوگی مگر ندوہ کا کوئی موقف نہیں سمجھا جائے گا۔[8]

۲۔ آپ کا اور حضرت نعمانی مدظلہٗ کا تعلق جو ندوہ سے ہے اس پر ایک فرد واحد کی کوئی تحریر (جس کا دائرہ فکر اور تاریخی رجحان سے ہے) اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔ آپ نے جن تعلقات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس درجہ عیاں ہیں کہ ان کے لیے کسی سوگندہ گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ آپ کی کتاب پڑھ کر میں نے یہ نہیں محسوس کیا کہ خدا ناکردہ آپ میں عداوت رسول ؐ کا روگ پایا جاتا ہے۔[9] آپ نے جو لکھا وہ آپ کی دانست میں رسول اللہ صلعم سے تعلق رکھنے والے کی برأت ثابت کرنے کے لیے لکھا[10] اور میرا تبصرہ بھی اسی بنا پر تھا کہ میں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرب اور آپ ؐ کے حب و حنان کا ثمرہ سمجھتا ہوں اس کو برحق بتاؤں۔ رہا سید زینی دحلان کا قول جو نقل کیا،

کچھ الگ نہیں ہیں اور ماشاء اللہ ایڈیٹوریل بھی اکثر و بیشتر آپ ہی کے قلم سے ہوتے ہیں۔

۸ سوال کسی مسئلے پر موقف کا نہیں تھا، محض رویّے اور انداز گفتگو میں "وصل" کی جگہ "فصل" کی روح پائے جانے کا تھا، اور موقف ہو یا رویّہ ندوے کا معتمد تعلیم اپنے منصب کی حیثیت کو بہت گراتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جب وہ کہتا ہے کہ میرا کوئی رویّہ اور کوئی م[illegible] ندوے کا ذرا بھی ترجمان نہیں سمجھا جانا چاہیئے۔

۹ آپ کے قلم سے میری اس براءت پر جزاک اللہ۔

۱۰ الحمدللہ آپ نے یہاں بظاہر تریدی و وکالت سے بھی بری کر کے میری کتاب کو صحابیٔ رسول حضرت معاویہؓ کی براءت (صفائی) کی کوشش پر مبنی قرار دیا ویسے میری نظر میں تو وہ کتاب صرف تلاش حقیقت پر مبنی ہے۔ نہ کسی کی حمایت نہ کسی کی مخالفت، لیکن اس تبصرے کے بعد آپ کے قلم سے میری اتنی براءت بھی بہت ہے مگر اسکی کیا قیمت رہ گئی جبکہ ۲۵ مئی کی وضاحت میں اسے یکسر فراموش کر کے پھر سے مجھے "قاتلانِ حسین" کی صفائی کرنے والا ہی نہیں کچھ اضافہ کر کے قاتلان عبداللہ بن زبیرؓ اور قاتلانِ اصحاب حرہ کی وکالت و صفائی کا مجرم بھی بنا دیا گیا؟ فالی اللہ المشتکی۔

اس کا منشاء یہ تھا کہ آپ کا زور قلم میرے خیال میں یزید کی تنزیہ میں تنقیص حسینؓ پر منتج ہو رہا ہے اور یہ بات ڈرنے کی ہے۔ والدین النصیحۃ[11] - میرے ذہن پر آپ کی کتاب سے زیادہ اس زہر برگ والوں اور انکی زبانی اپنے کانوں سنے اقوال پر (اقوال کا اثر؟) تھا[12] جس میں ایک صاحب جنہوں نے پاکستان میں "سیدنا یزید" لکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ حسین بن علیؓ کو کاندھے پر لے کر گلیوں میں نکلنا اور منبر سے اتر کر حسن بن علیؓ کو گود میں اٹھا لینا محمد بن عبداللہ کا فعل تھا نہ کہ محمد رسول اللہ کا اور ہمیں محمد رسول اللہؐ سے سروکار ہے۔[13]

خدا شاہد ہے کہ مجھ پر جو سلبی تاثر تھا اس کی بنا پر خواہ جو بھی لکھ گیا ہوں مگر آپ کو ذاتی ذہنیت کی بنا پر اپنے سے کم رسول اللہ کا فدائی نہیں سمجھتا۔ لیکن آپ کی تحقیق کا رخ، خواہ الفاظ میں نہ ہو لیکن نتیجہ کے اعتبار سے حضرت حسینؓ کو یزید کے مقابلہ میں خطا کار بتا رہا ہے۔ اور اگر آپ نے حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے مکتوبات کا مطالعہ فرمایا ہے تو مکتوب نمبر ۸۸ اور ۸۹ کو ذہن میں تازہ کر لیجیے اور اگر نہ پڑھا ہو تو اب دیکھ لیجیے الحمدللہ ان مکاتیب کے مقدمات اور تاریخ بحث کو اپنا عقیدہ پاتا ہوں، وعلیہ احیا واموت۔ مولانا عبدالرشید نعمانی کی کتاب "یزید کی سیرت - اہل سنت کی نظر میں" بھی آپ کی توجہ کی محتاج ہے۔

میں نے آپ کی کتاب پر تبصرہ صرف نہج اور انداز فکر پر کیا ہے اور مندرجات میں صرف وضع الید فی البلد کے مفہوم پر کلام کیا ہے۔[14] اس کے علاوہ جو باتیں ہیں وہ سب ایک عمومی بحث ہے کہ جو لوگ اس خط پہ تحقیق کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں ان کی تحقیق کی بیکلنگ کیا ہے۔

---

۱۱ کاش اس نصیحت (خیر خواہانہ بات) کا انداز بھی خیر خواہی کی اسپرٹ لئے ہوئے ہوتا۔

۱۲ الحمدللہ، ثم الحمدللہ بڑی بات کا اعتراف کیا۔ مگر بدقسمتی کہ "رفتے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد" ۲۵ مئی کی وضاحت میں تو میں پھر از سر نو آپ کے حد سے گزرے اشتعال کا بلا شرکت غیرے واحد مجرم ٹھہرا دیا گیا۔ وہاں تو اس اشتعال کی ذمہ داری میں کسی دوسرے کا ذکر نام کو بھی نظر نہ آیا!

۱۳ اللہ ایسے ناسمجھ لوگوں کو سمجھ دے اور آپ کو بھی سمجھ دے کہ کسی گروہ کا غصہ کسی پر نہ اتارا کریں۔

۱۴ یہ اظہار بھی میرے لئے اطمینان کی ایک گہری سانس کا باعث ہوا تھا کہ ان کم از کم [illegible] گناہ سے [illegible] پایا گیا ہوں۔ مگر وہی حسرت کہ یہ اطمینان بہت ہی کم عمر ثابت ہوا [illegible]

بہرحال میرے اس خط سے آپ کی تشفی ہو یا نہ ہو میں عنداللہ اپنے آپ کو بری کرنے کے لیے اور ندوہ کو بری کرنے کے لیے دوبارہ اپنی تحریر بالا کی خود تلخیص کر دیتا ہوں۔

۱۔ میرا تبصرہ سو فی صد صرف میرے رجحانات کا آئینہ دار ہے[۱۲]۔ ندوہ کی یہ رائے نہیں ہے۔ ندوہ کی وہی رائے ہے جس کو بیان کرنے کا حق حضرت ناظم ندوۃ العلماء کو ہے اور وہ واضح کر چکے۔ اگر اس پر بھی کسی کو تسکین نہ ہو تو فلیفعل ما یشاء ـــ والعاقبة للمتقین۔

۲۔ میں نے زینی دحلان کا قول بطور نصیحت اور انتباہ کے نقل کیا ہے۔ نہ تو خدانخواستہ مذموم رشدی کے مماثل ٹھہرایا ہے اور نہ عدو رسول بتایا ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اس انداز پر چلنے والوں کے لیے اس کا خطرہ ہے۔

---

۲۵ مئی سے آگے نہ جا سکی۔

[۱۵] آپ کے دکھانے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اور اسی وجہ سے آگے کا یہ ارشاد تسلیم کرنا آسان نہیں ہو رہا کہ آپ ان مکاتیب کے تمام مقدمات اور نتائج بحث کو (فی الواقع) اپنا عقیدہ پاتے ہیں اور اسی پر مرنے اور جینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان مکاتیب خصوصاً ۲؎ کو از سر نو دیکھئے

[۱۶] اس کلام پر مختصر سی جو ایک بات اپنے مکتوب (بنام ایڈیٹر تعمیر حیات) میں عرض کی گئی تھی اسکے بارے میں بھی اظہار خیال سے یہ مکمل سکوت! وہ تو بڑا مبارزانہ (CHALLENGING) کلام تھا! اور پھر مئی جون ۲۰۰۳ء کے الفرقان میں تو اُسکی مبارزانہ شان کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے جواب عرض کیا گیا تھا۔ کچھ تو پتہ چلنا ہی چاہیئے کہ چیلنج کی سوزش و شورش کو کچھ افاقہ ہوا یا نہیں؟

[۱۷] میرے رجحانات کا "آئینہ دار ہے" نہ کہ "آئینہ دار تھا"۔ الحمد للہ اس صریح اظہار کے باوجود کہ ۵ مئی کو بھی آپ کے وہی رجحانات (خیالات) ابد تک ہیں جو تبصرہ میں درج کئے گئے) ۲۵ مئی کی وضاحت میں یہ کہتے ہوئے آپ کو اللہ کا خوف نہ آیا کہ ۵ مئی کو عتیق کو رجوع اور برأت کا خط لکھ دیا گیا تھا۔ مگر اُس کے باوجود اُس نے خط دبا کر آپ پر تکفیر صحابہ کا الزام لگایا؟ ـــ اللہ آپ کو معاف کرے۔ ہاں آپ یہ فرمانا چاہیں تو فرما دیں کہ خط میں نہیں بلکہ ۲۵ مئی کے اعلان میں رجحانات سے نہیں عبارت سے رجوع کرنے کی بات کہی ہے!

اب ایک اہم موضوع جس کو آپ نے اپنے مکتوب میں نہیں چھیڑا ہے، وہ میں وضاحت کے ساتھ عرض کرتا ہوں اور اس کا سبب صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے ورنہ برے سے بدتر خیالات رکھنے والے بھی کسی سے نہیں ڈرتے، اور میں اگرچہ مناظرہ کا آدمی نہیں ہوں اور نہ کبھی اس طرح کے مضامین میں پڑا ہوں[۱۸] مگر بقول آپ کے شیطان سوار کرانے پر اللہ محفوظ ہی رکھے، ایک مہابھارت جنم پا سکتی ہے۔

میں نے واقعۂ کربلا کو غزوۂ بدر کے بعد کے واقعات سے مربوط کرنے کی جو بات کہی اس پر مجھے الزام دیا جا رہا ہے[۱۹] کہ معاذ اللہ میں نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں بے ادبی کر دی۔ فرض کیجیے اگر اس واقعہ کو اس طرح دیکھا جائے تو کون سے صحابۂ کرام ہیں جنکی اہانت کا شبہ ہے[۲۰]؟ - زیادہ سے زیادہ کوئی کہے گا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ ان کے علاوہ کوئی نام ہو سکتا ہے تو حضرت ہندہ اور وحشی[۲۱]۔ جہاں تک حضرت معاویہؓ کا تعلق ہے وہ تو اتر کے ساتھ ہمارے عقیدے کے مطابق صحابیٔ رسول اور کاتب وحی ہیں اور میں تو یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ کمتر درجہ کے صحابی ہیں کیونکہ کمتر اور برتر کا فیصلہ تو درجات دینے والا جانے۔ میزان درجات میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ (اب ابا رہے؟) حضرت ابوسفیانؓ ان کی ایک تو تاریخ ہے اور دوسری طرف ان کے متعلق کلا وعد اللہ الحسنی اور الاسلام یجب ما قبلہ کا عقیدہ ہے۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے وہ ہم آپ کیا کوئی بھی اس کو سیر و مغازی کی کتابوں سے جدا نہیں کر سکتا اور نہ ان کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ لہذا تاریخ

---

[۱۸] مگر "ایک اہم وضاحت" نے تو ثابت کیا ہے کہ آپ "مرد میدان" ہیں۔

[۱۹] یہ ایک بار پھر اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے جو خیالات تبصرے میں طٰہٰ حسین اور سید قطب کی تائید سے ظاہر کئے تھے اُن کے بارے میں توہین صحابہ کے اعتراض کو آپ صرف غیروں کا عائد کیا الزام ہی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے وضاحت میں رجوع اگر کیا ہے تو غالباً صرف الفاظ او رعبارت سے نہ کہ خیالات سے۔

[۲۰] یہ بہت اہم ارشاد ہے۔ اسکے بارے میں کچھ تفصیلی بحث مدیر الفرقان نے "ایک اہم وضاحت" کے جائزے میں کی ہے۔ اسکو وہاں دیکھا جانا چاہیئے۔

[۲۱] تبصرے میں تو آپ نے پورا ایک "گروہ" بلکہ "طبقہ" بتایا تھا، اور اب معلوم ہوا کہ بس ایک میاں بیوی

واحادیث سے ان کا ۲۱ سالہ کردار الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن شرف صحابیت کی بنا پر ہم اس عقیدہ کے پابند ہیں جو عموم صحابہ کے لیے آیا ہے۔ حضرت مدنیؒ نے اپنے مکتوب ۸۰ میں جو پانچ مقدمات نام کئے ہیں ان میں پہلا مقدمہ یہی ہے۔

"صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں جو آیات وارد ہیں وہ قطعی ہیں جو احادیث صحیحہ انکے متعلق وارد ہیں وہ اگرچہ ظنی ہیں مگر ان کے اسانید اس قدر قوی ہیں کہ تواریخ کی روایات ان کے سامنے ہیچ ہیں۔"[۲۲]

اس بنا پر جن حضرات کو علمائے امت نے صحابہ کے زمرہ میں شمار کیا ہے، ان کے بارے میں ہم تاریخ کو نہیں احادیث سے ثابت شدہ عقیدہ کو دیکھتے ہیں۔ تاریخی روایات ظنی اور صدق و کذب کا احتمال رکھتی ہیں بلکہ مشاہدات بھی اگر قرآن کریم اور سنت کے خلاف آکر کھڑے ہو جائیں تو ہمیں یہی اسوہ ملا ہے کہ مشاہدات کو جھوٹا اور اللہ و رسول کی بات کو سچا سمجھیں جیسا کہ ترمذی کی وہ حدیث ہے جس میں ایک صحابی نے آکر آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ میرے بھائی کو دست آ رہے ہیں، آپ نے فرمایا شہد پلاؤ۔ اس نے شہد پلایا مگر مرض بڑھ گیا۔ دوسری بار بھی یہی فرمایا اور تیسری بار جب اس نے کہا کہ اس کا مرض زیادہ ہو گیا تو آپؐ نے فرمایا صدق اللہ وکذب بطن اخیك بالآخر اس کو شفا اسی علاج سے ہو گئی۔[۲۳]

کا معاملہ تھا (کیونکہ غلام وحشی تو اس گروہ یا طبقے کا رکن نہیں کہلا سکتا) پس اب یہ معمہ مولانا کو خود ہی حل کرنا چاہئے کہ وہ گروہ اور طبقہ کے الفاظ مبالغہ تھے یا اب کسی مصلحت سے انھیں فراموش کیا جا رہا ہے؟

۲۲؎ تاریخی روایات کو قرآن و حدیث کے مقابلے میں "ہیچ" فرما کر بھی حضرت مدنیؒ نے اس "طٰہٰ حسینی" نقطۂ نظر کو قطعی مردود ٹھیرا دیا ہے کہ "تاریخ کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔" پھر نہ معلوم مولانا نے حضرتؒ کے اس مقدمہ اولیٰ کا آخری جملہ اپنے اقتباس میں کیوں چھوڑ دیا ہے جسے آپ آگے مدیر الفرقان کے جائزے میں پڑھیں گے۔ اور اللہ جانے کیا کہیں گے۔

۲۳؎ "مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا" اولاً کہا کہ وہ کون سے صحابہ ہیں جن کی اہانت کا سوال اٹھایا جا رہا ہے؟

میرے تبصرہ میں اس سلسلہ میں جو الفاظ جس ترتیب سے آگئے اس پر سلبی تاثر ہے غلط ہے کا اثر نمایاں ہے جس کا مجھے افسوس ہے۔ پھر بھی میرے یہ جملے قابل لحاظ ہیں! "ممکن ہے یہ تجزیہ غلط ہو، مگر یہ غلط نہیں ہے کہ ان حوادث کو ان خلفیات سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا!" مطلب مبہم نہیں ہے، یعنی ان خلفیات سے جدا کر کے تو دیکھا ہی جا تا ہے۔ اگر ان سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔[۲۴] واللہ اعلم بالنیات

آپ نے اپنے مکتوب کے آخر میں تحریر فرمایا ہے۔ "ندوہ اور اہل ندوہ اور بالخصوص حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء سے جو تعلق ۴۰ برس پہلے قائم ہو گیا تھا اس کو جو آزمائش میں آپ کے اس تبصرہ نے ڈال دیا ہے۔۔۔"

مجھے اس سے قطعاً اتفاق نہیں ہے کہ میرے ذاتی رجحان و خیال یا تاریخی تجزیہ کی صحت یا خطا کا اثر آپ کے اور ندوہ کے تعلقات پر پڑ سکتا ہے جب کہ آپ کے اور ناظم صاحب ندوۃ العلماء مدظلہ کے رجحانات میں اختلاف آپ کی اس کتاب سے موجود ہی ہے جس میں آپ کی روش جمہور علمائے سنت سے مختلف ہے جس کا آپ کو پورا حق ہے۔[۲۵] اس طرح کے مسائل میں بعض لوگوں کے اپنے والد یا بھائی سے بھی اختلاف رہا ہے۔

ابوسفیانؓ ہیں۔ بےشک وہ صحابہ میں شمار ہیں۔ مگر ان کے ۲۱ سالہ (کا فرانہ) کردار کو تاریخ واحادیث سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر فرمایا کہ ان کے بارے میں ہم تاریخ کو نہیں احادیث صحیحہ کو دیکھتے ہیں۔ اور تاریخ کیا حدیث کے مقابلے میں تو ہم مشاہدات تک کو جھٹلا دیں گے۔ آخر یہ پہیلیاں بوجھانے کی کیا ضرورت ہے؟ سیدھی اور صاف بات کیوں نہیں کہتے؟ یا طٰہٰ حسین اور حضرت مدنی دونوں کی روح کو بیک وقت خوش رکھنا چاہتے ہیں؟

۲۴؎ یہ ہاں اور نہیں، ٹھیک اور غلط کو یکجا کرنے اور یکساں بنانے کی وہ مثال ہے کہ جس کا ثانی ہمیں بس باطنی لٹریچر میں ملتا ہے۔ اور الفاظ کی ترتیب میں تبدیلی باطنیت کے وجود کا سراغ بھی دے رہی ہے۔ اللہ کرے غلط ہو۔

۲۵؎ زہے مژدہ گر جاں فشانم رواست۔ اگر مجھے آپ کے "جمہور اہل سنت" کی روش سے کبھی انحراف کا پورا حق تھا تب تو تبصرے ہی میں میرے اس حق کو جس بری طرح پامال فرمایا گیا وہی کیا کم تھا کہ پھر [illegible]

مجھ سے اگر یہ کوتاہی ہوئی کہ آپ سے مل کر اس موضوع پر گفتگو کیوں نہ کی تو آپ سے بھی دوستانہ شکوہ ہے کہ اس مسئلہ کو مبہم بنانے کے بجائے اسی طرح کا خط جو آپ نے لکھا ہے، مجھے لکھ دیتے۔ براہ راست مکہ مکرمہ بھیج دیتے یا میرا انتظار کر لیتے تو میں کہتا آپ ہی ایک ایسا بیان بنا دیجئے جس کو میں ہی شائع کرا دیتا ہوں اور اس سے آپ کی جو تجریح شعور ہوئی ہے اس کی، اور مجھ پر جو اتہام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں پیدا ہو رہا ہے دونوں کی تلافی ہو جاتی۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

(دستخط) عبداللہ عباس ندوی
۱۸ مئی ۱۹۹۲ء

کی "اہم وضاحت" کی بسم اللہ کے لئے بھی اسی مشق ستم کا انتخاب، مزید کچھ اضافے کے ساتھ، فرمایا گیا؟ اور حضراتِ شیعہ کی مجالس کے "ذکرِ مصائب" کا نقشہ کھینچ دیا گیا!

کیا آپ کا کچھ کم انتظار کیا گیا؟ مئی جون کا مشترکہ الفرقان اس انتظار کی مدت اور تفصیل بھی کچھ بتاتا ہے۔ ۱۰ر مارچ سے ۲۵ر اپریل تک "آہٹ پہ کان" اور "در پہ نگاہ" رہی مگر آپ تو واپس تشریف لا کر بھی سیدھا دوستانہ رابطہ پیدا کرنے کے بجائے، اولاً اِدھر کے عاجزانہ اور دوستانہ خطوط کا ایک "مناظرانہ" جواب تعمیر حیات میں چھپوانے کی کوشش کی اور وہاں نہ ہو سکا تو دہلی کے ایک پرچے سے رجوع کیا (جیسا کہ ابھی آپ اوپر ذکر کر آئے ہیں) اور پھر بالکل مجبوری کے درجے میں اس عاجز کو یاد فرمایا۔ اور اُس مجبوری کی بھی وجہ آپ ہی کے الفاظ کی روشنی میں، یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنے مسئلے پر الفرقان سے کوئی "مہم" چلنے کی خبر آپ نے سُن لی۔ بندہ پرور پھر بھی کچھ نہ کیا تھا، اگر آپ لیتَ ولعلّ والے صیغوں سے کام چلانے کے بجائے سیدھے سیدھے لکھ دیتے کہ "بھائی مجھ سے آپ کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی معافی چاہتا ہوں۔ اور شامت اعمال سے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی گستاخی کر گیا جس کیلئے اللہ اور عامۂ مومنین سے میری عفو خواہی آپ الفرقان میں شائع کر دیجئے"۔ ورنہ تو کہتا ہوں اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ معاملہ بقول خود مولانا کے بس "دو ہونٹوں (شفتین)" کے درمیان ہے!

خیر! آپ نے پڑھ لیا، گزارش ہے کہ ایک بار پھر پڑھ لیجئے، اور پھر بتائیے کہ اس خط میں مولانا عبداللہ عباس صاحب نے اپنے تبصرہ والے موقف، اور اس میں پیش کردہ خیالات اور تجزیہ سے رجوع کہاں کیا ہے، کن جملوں میں انھوں نے ان کو واضح طور پر غلط تسلیم کر کے ان سے برأت کا اظہار کیا ہے؟ اور "میری عبارت سے اطمینان نہ ہو تو آپ (یعنی مولانا عتیق الرحمن صاحب) عبارت بنا دیں میں اس پر دستخط کر دوں گا" والی سادہ دلانہ اور فیاضانہ پیش کش کہاں ہے جس کا انھوں نے اپنے وضاحتی بیان میں بڑے زور و شور سے تذکرہ فرمایا ہے؟؟؟

نہ صرف یہ کہ اس خط میں ہرگز ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس انھوں نے اُس خط میں انداز بیان کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اپنے سابقہ خیالات اور تجزیہ کو دوبارہ دہرایا ہے، جو اس سارے قضیہ کا اصل سبب ہیں اور انھیں اس انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ انکی وہ شناعت و قباحت جو تبصرہ میں بالکل برہنہ ہو کر سامنے آگئی تھی، اشاروں اور نفی اثبات کے پردوں میں کم از کم عام لوگوں کی نگاہ سے مستور ہو جائے۔ اور خط کا یہی وہ پہلو ہے جس نے ہمیں مجبور کیا کہ کم از کم خط کی ان عبارتوں کا تجزیہ کرنے کی زحمت گوارا کی جائے جن کی طرف مولانا عبداللہ صاحب کا اشارہ ہو سکتا ہے، اور جن سے اہل علم و نظر کو تو نہیں، عام لوگوں کو دھوکہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ شاید کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ صرف خط کا متن شائع کر دینا ہی کافی ہوتا۔

پورے خط میں صرف دو عبارتیں ایسی ہیں جن سے سطحی نظر سے پڑھنے والوں کو کچھ مغالطہ ہو سکتا ہے، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ:-

"میرے تبصرہ میں اس سلسلہ میں جو الفاظ جس ترتیب سے آگئے اس پر سلبی تأثر سے مغلوبیت کا اثر نمایاں ہے، جس کا مجھے افسوس ہے۔ پھر بھی میرے یہ جملے قابل لحاظ ہیں! "ممکن ہے یہ تجزیہ غلط ہو مگر یہ غلط نہیں ہے کہ ان حوادث کو ان خلفیات سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا" مطلب مبہم نہیں ہے یعنی ان خلفیات سے جدا کر کے تو دیکھا ہی جاتا ہے۔ اگر ان سے مربوط کر کے دیکھا

جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔"

مولانا نے اپنے تبصرہ کے جن جملوں کو قابل لحاظ بتایا ہے، ان کا مطلب سمجھنے کے لئے وہ پورا سیاق سباق سامنے آنا ضروری ہے جس میں وہ جملے آئے ہیں۔ تبصرہ کی وہ پوری عبارت یوں تھی۔

کربلا کا واقعہ بنوامیہ اور بنوہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (COSEQUENCE) تھا۔ وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصۂ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے ۲۱ سال تک شد و مد سے قائم رہیں۔ غزوہ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اس کے سربراہ ابوسفیان تھے۔ اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہیدؒ کے استسلام کیا)، مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے، اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب و غم اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔

حضرت ابوسفیان نے احتجاج کیا تھا کہ اب وہ دن آگیا ہے کہ پسماندہ ہم اشراف پر فوقیت دیئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف حضرت علی کو اکسانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے۔

اسلام کے پورے طور پر فاتح ہوجانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہوگئی تھیں۔ اس عرصہ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کن

واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے، مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے، اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا، مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔ احمد امین نے فجر الاسلام اور اس کے مقدمہ میں طٰہٰ حسین نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ ممکن ہے یہ تجزیہ غلط ہو مگر یہ غلط نہیں ہے کہ حرہ اور کربلا کے واقعات کو ان خلفیات سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔"

یہ ہے مولانا کی وہ فکر اور وہ تاریخی تجزیہ جو اصل مورد اعتراض تھا —

اب مولانا کے خط کا وہ واحد پیراگراف جس پر ان کے مبینہ رجوع و برأت، اور اعتراف قصور کی تلاش میں نگاہ ٹھہرتی ہے۔ پھر سے پڑھ لیجئے جو ابھی ہم نے گزشتہ صفحہ میں نقل کیا ہے اور جس میں اسی تجزیہ کو ایک بار پھر دہرانے کے بعد کہا گیا ہے۔

"یعنی ان خلفیات سے جدا کر کے تو دیکھا ہی جاتا ہے، اگر ان سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔"

یعنی یہ کہ کربلا اور حرہ کے واقعات کو غزوۂ بدر میں گروہ کفار کی شکست کے پس منظر سے جدا کر کے تو عام طور پر دیکھا ہی جاتا ہے لیکن اگر ان کو اس سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔

یہ ہے وہ نئی بات جس کا اضافہ مولانا نے اپنے خط میں اس تجزیہ کے سلسلہ میں اپنا تازہ ترین موقف بیان کرنے کیلئے کیا ہے۔ آپ نے دیکھا — اس "اضافہ" میں بھی مولانا اپنے اس تجزیہ پر بدستور قائم ہیں۔ اسے غلط تسلیم نہیں کر رہے ہیں، اس سے اپنے رجوع اور برأت کا اظہار نہیں فرما رہے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ فرما رہے ہیں کہ "یہ تجزیہ بھی درست ہے۔ اور یہ نظر انداز کر کے واقعہ کربلا وغیرہ پر غور کرنے کا عام انداز بھی درست ہے۔

اب ہمیں بتایا جائے کہ اس کے باوجود کہ مولانا نے اپنے خط میں سابقہ موقف کے بھی صحیح ہونے پر اصرار کیا تھا۔ ہم یہ کیونکر سمجھ لیتے یا کوئی کیسے باور کرلیتا کہ مولانا نے اپنے خط میں اپنے مخصوص خیالات اور تجزیہ سے رجوع کرلیا تھا، اور انھیں غلط تسلیم کرلیا تھا، اور ان سے واضح طور پر اعلان برأت بھی کردیا تھا؟۔ یاد رہے کہ اعتراض جس کو بھی تھا صرف الفاظ یا ان کی ترتیب پر نہیں تھا بلکہ مولانا کے ان خیالات اور اس تجزیہ پر تھا۔ اور کسی اور کا کیا ذکر خود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے مضمون (تعمیر حیات ۲۵ اپریل سنہ ۹۲ء) میں یہ بات صاف طور پر درج ہے کہ اصل مسئلہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے "خیالات اور تاریخی تجزیہ" کی وجہ سے پیدا ہوا حضرت مولانا مدظلہ کی وہ عبارت یہ ہے۔

"تعمیر حیات کی اشاعت مورخہ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس صاحب ندوی کا ایک مضمون "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض ایسے خیالات اور تاریخی تجزیہ و تبصرہ آیا ہے جس سے ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ خود حضرت مولانا مدظلہ کی صراحت کے مطابق قابل اعتراض یا "غلط فہمیوں" کا سبب مولانا عبداللہ عباس صاحب کے الفاظ نہیں تھے بلکہ مخصوص تاریخی تجزیہ و تبصرہ اور خیالات تھے یا دوسرے لفظوں میں کہہ لیجئے کہ غلطی صرف "تعبیر" کی نہیں تھی، فکر کی بھی تھی۔ اور اب بتائیے کہ اگر کوئی شخص اپنے سابقہ زیر بحث خیالات اور تجزیہ و تبصرہ پر بدستور قائم ہو، اسے غلط قرار نہ دے، اس سے رجوع نہ کرے، بلکہ اسے صحیح یا قابل قبول بنانے کی نئے سرے سے کوشش کرے، تو کیا صرف اس وجہ سے کہ اس نے اپنے کچھ الفاظ پر، اور الفاظ پر بھی نہیں "الفاظ کی ترتیب" پر افسوس ظاہر کردیا۔ دنیا کا کوئی سمجھ دار آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس شخص نے اپنے سابقہ موقف سے "رجوع اور برأت کا واضح اعلان" کردیا ہے۔ اور اب اس کے سابقہ موقف کو اس کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا؟؟؟

صحیح بات یہ ہے کہ اگر واقعی مولانا عبداللہ عباس صاحب کو یہ خیال تھا کہ صرف الفاظ

کی ترتیب پر بلکہ الفاظ کی ترتیب میں سلبی تاثر سے مغلوبیت کا جو اثر جھلکتا ہے، صرف اس پر ایک لفظ افسوس کے اظہار سے پڑھنے والوں کا دماغ سُن ہوجائے گا، اور پھر وہ اس کے متصلاً بعد جب اپنے سابقہ خیالات کا انجکشن دوبارہ لگائیں گے تو، دماغ سن ہوجانے کی وجہ سے، لوگوں کو پتہ ہی نہیں چل پائے گا اور وہ اپنی پرانی بات پھر دوہرا کر، اپنے خیالات اور تاریخی تجزیہ و تبصرہ لوگوں کے ذہنوں میں پھر سے اتار دیں گے، اگر واقعۃً مولانا کو یہی گمان تھا تو اطلاعاً عرض ہے کہ بالکل غلط اور عبرتناک خود فریبی پر مبنی گمان تھا!!!

اب مولانا کے خط کی ایک اور عبارت پیش ہے، جس نے ہمارے اس یقین کو مزید مستحکم کیا ہے کہ مولانا نے اپنا جو موقف تبصرہ میں پیش کیا تھا، خط میں اس سے رجوع تو درکنار اسے از سر نو ثابت کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ عبارت یہ ہے۔

"میں نے واقعۂ کربلا کو غزوۂ بدر کے واقعات سے مربوط کرنے کی جو بات کہی اس پر مجھے الزام دیا جارہا ہے کہ معاذ اللہ میں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں بے ادبی کردی۔ فرض کیجئے اگر اس واقعہ کو اس طرح دیکھا جائے تو کون سے صحابۂ کرام ہیں جن کی اہانت کا شبہ ہے؟ زیادہ سے زیادہ کوئی کہے گا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ان کے علاوہ کوئی نام ہوسکتا ہے تو حضرت ہند اور وحشی۔"

غور فرمائیے! کیا یہ بات بالکل صاف نہیں ہے کہ ابھی تک۔ یعنی خط لکھتے وقت تک مولانا کو یہ تسلیم نہیں ہے کہ فی الواقع ان سے صحابہ کرام کی شان میں بے ادبی ہوئی ہے، بلکہ اس کے بالکل برخلاف صاف لفظوں میں، وہ اسے ابھی بھی اپنے اوپر ایک "الزام" ہی قرار دے رہے ہیں! اس عبارت کو آگے تک پڑھ جائیے! اس کا حاصل بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ واقعہ کربلا کو غزوہ بدر [illegible] کے مخصوص زعمائے مشرکین کی شکست کا انتقام قرار دینے والا جو ظالمانہ اور جاہلانہ تجزیہ (اس تعبیر پر مجھے معاف کیا جائے) انھوں نے تبصرہ میں، کسی خاص کیفیت میں ڈوب کر پیش کردیا

تھا، اسے کسی طرح بے ضرر اور قابل قبول بنا کر اور اس کی شناعت وقباحت کو بزعم خود کچھ کم کر کے اپنے خط میں دوبارہ پیش کرنے۔ اور گویا اپنے مخاطب کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔

علاوہ ازیں اس پیراگراف پر غور کرتے وقت اس تیکھے اور تنک لہجہ میں پوچھے گئے سوال کو ضرور پیش نظر رکھے گا کہ:

"فرض کیجئے اگر اس واقعہ کو اس طرح دیکھا جائے (جس طرح موصوف نے دیکھا ہے) تو کون سے صحابہ کرام ہیں جن کی اہانت کا شبہ ہے؟....."

یہ تند اور تحقیر آمیز لہجہ یہ مطلب ظاہر کرتا ہے کہ آیا یہ صحابہ بھی ایسے ہیں کہ ان کی توہین کا مسئلہ اٹھایا جائے؟ ــــ ہمارے خیال میں مقام صحابیت کے سلسلہ میں تفریق کا یہی وہ طرز فکر ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہن پر غیر شعوری طور پر چھا گیا ہے اور یہ سارا ہنگامہ ہی اسی لیے برپا ہوا ہے کہ مصنف واقعۂ کربلا نے بھی اس طرز فکر کی اصلاح کی مہم میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔

علاوہ ازیں اس پیراگراف کا ایک اور حصہ بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ:

رہا (رہے؟) حضرت ابوسفیانؓ تو اُن کی ایک تو تاریخ ہے اور دوسری طرف كُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى اور الاسلام یجبُ ماقبلہ کا عقیدہ ہے۔

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے وہ ہم آپ کیا کوئی بھی اس کو سیر ومغازی کی کتابوں سے جدا نہیں کر سکتا۔ اور نہ انکو نظر انداز کر سکتا ہے۔ لہٰذا تاریخ وحدیث سے ان کا ۲۱ سالہ کردار الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن شرف صحابیت کی بنا پر ہم اسی عقیدے کے پابند ہیں جو عموم صحابہ کے لیے آیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں جس پہلو کی طرف توجہ دلانی ہے وہ صرف یہ ہے کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب نے اپنے اس موقف کی سند کے طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مکتوب کا ایک اقتباس پیش کیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک آخری اور فیصلہ کن جملہ حذف کر دیا ہے۔ جس میں اس موقف کے بالکل مخالف موقف کی صراحت ہے۔ ہم ذیل میں

حضرت مدنیؒ کی وہ عبارت دوبارہ نقل کر رہے ہیں۔ اس آخری جملہ کے اضافہ کے ساتھ جسے مولانا عبداللہ عباس صاحب نے حذف کر دیا ہے اور اس جملہ کو نمایاں کرنے کے لیے ہم نے اسے خط کشیدہ کر دیا ہے: وہ عبارت یہ ہے کہ:

"صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں جو آیات وارد ہوئی ہیں، وہ قطعی ہیں۔ جو احادیث صحیحہ ان کے متعلق وارد ہیں وہ اگرچہ ظنی ہیں مگر ان کے اسانید اس قدر قوی ہیں کہ تواریخ کی روایات ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس لیے اگر تاریخی روایت میں اور آیات واحادیث صحیحہ میں تعارض واقع ہوگا تو تواریخ کو غلط کہنا ضروری ہے۔"

اب آپ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے خط کا وہ حصہ ایک بار پھر ملاحظہ فرمالیں، آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے حضرت مدنیؒ کا آخری جملہ حذف کر دیا ہے ــــ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ ہمارے خیال میں وجہ ظاہر ہے، یعنی یہ کہ اس جملہ کے ہوتے ہوئے جس میں نہایت فیصلہ کن انداز سے یہ بات آئی ہے کہ "آیات واحادیث سے متعارض روایات کو غلط کہنا ضروری ہے۔" مولانا عبداللہ عباس صاحب اس سے اپنے عجیب وغریب اور تذبذب وبےیقینی کی کیفیت سے بھرپور اس موقف کو ثابت کرنے کا کام نہیں لے سکتے تھے کہ "تاریخی روایات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور یہ کہ "حضرت ابوسفیان کے بارے میں ہم اس عقیدہ کے پابند ہیں جو عموم صحابہ کے لیے آیا ہے" مگر "ان کا ۲۱ سالہ کردار تاریخ سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

ہم یہاں مولانا عبداللہ عباس صاحب کے اس موقف پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں، کہ اس بارے میں اُن کے اور حضرت مدنیؒ کے موقف میں مشرق ومغرب کا فاصلہ ہے ــــ مگر مولانا عبداللہ عباس صاحب کی مجبوری یہ تھی کہ طٰہٰ حسین اور احمد امین جیسے حوالوں کا الٹا اثر دیکھ کر انھیں حضرت مدنیؒ جیسے ناموں کی ضرورت تھی، اور اس ضرورت کے احساس نے انھیں اتنا مغلوب کر دیا کہ نہ انھیں یہ خیال ہوا کہ

کوئی اگر حضرت مدنیؒ کے مکتوب کی اصل عبارت دیکھ لے گا تو ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا، اور نہ اس طرف توجہ ہوئی کہ حذف شدہ جملے سے پہلے والا جو جملہ برقرار رہ گیا ہے وہ بجائے خود تاریخ کو۔ یعنی قرآن و حدیث سے متعارض تاریخی روایات کو نظر انداز کرانے کے لیے بالکل کافی ہے ــــ

اور اب آئیے مولانا موصوف کے خط میں اُن کی وہ عالی ظرفانہ پیشکش تلاش کریں جس کا انھوں نے بڑے زور و شور سے اپنے وضاحتی بیان میں تذکرہ فرمایا ہے۔ اور جس نے ہماری دانست میں خاصے وسیع پیمانے پر لوگوں کو دھوکے میں مبتلا کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ:

"میں نے اس (خط) میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میری عبارت سے اطمینان نہ ہو تو آپ عبارت بنا دیں میں اس پر دستخط کر دوں گا، اور وہ شائع کر دی جائے۔"

ہماری نظر اس پیش کش کی تلاش میں خط کے جس پیرے پر آکر رکتی ہے کہ مولانا موصوف کا اشارہ اسی کی طرف ہوگا وہ یہ ہے کہ:

"مجھ سے اگر یہ کوتاہی ہوئی کہ آپ سے مل کر اس موضوع پر گفتگو کیوں نہ کی تو آپ سے بھی دوستانہ شکوہ ہے کہ اس مسئلہ کو مہم بنانے کے بجائے اسی طرح کا خط جو آپ نے لکھا ہے مجھے لکھ دیتے۔ براہ راست مکہ مکرمہ بھیج دیتے یا میرا انتظار کر لیتے تو میں کہتا آپ ہی ایک ایسا بیان بنا دیجیے جس کو میں کہیں شائع کرا دیتا ہوں، اور اس سے آپ کی جو تجریح شعور ہوئی ہے اس کی اور مجھ پر جو اتہام صحابہ کرام کے بارے میں پیدا ہو رہا ہے دونوں کی تلافی ہو جاتی۔"

خط کی اس عبارت میں ساری بات "ماضی تمنائی" کے صیغوں میں کہی گئی ہے۔ "آپ نے ایسا کر دیا ہوتا"، "میں ایسا کرتا" "تلافی ہو جاتی" وغیرہ وغیرہ" کہیں مستقبل کے بارے میں

امر یا درخواست اور پیشکش کا وہ صیغہ نہیں ہے جس کا دعویٰ مولانا نے اپنے وضاحتی بیان میں کیا ہے ــــ اردو کی معمولی سی شُدبُد رکھنے والے کسی خالی الذہن آدمی کو یہ عبارت دے کر اور اس سے پوچھ کر دیکھ لیجیے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ ہمیں یقین ہے کہ وہ یہی بتائے گا کہ یہ ایک ایسی بات کا ذکر ہو رہا ہے جو رفت گزشت ہو چکی ہے، جس کا موقع نکل چکا ہے، یعنی یہ کہ اگر آپ ایسا کرتے تو میں ایسا کرتا، اس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اگر آپ کو میری عبارت سے اطمینان نہ ہو تو آپ عبارت بنا دیں، میں اس پر دستخط کر دوں گا، اور وہ شائع کر دی جائے۔

واللہ العظیم اگر مولانا کے خط میں یہ بات، اسی صیغہ میں ہوتی، تو ہمارے لیے حرام تھا کہ ہم اس کے بعد بھی الفرقان کا وہ شمارہ اسی طرح شائع کرتے، ہم پر لازم تھا کہ ہم اسے روک لیں اور چھپ چکا ہوتا تو اسے دریا برد کر دیں، اور اگر مولانا کے خط میں کوئی عبارت واقعی رجوع و اظہار برأت کے واضح مضمون پر مشتمل ہوتی اور وہ ہمارے نزدیک کافی بھی ہوتی تو ہم پر واجب تھا کہ "حسینؓ روشن دل ما شاد" کے عنوان سے اسے الفرقان میں شائع کرتے، اور مولانا کو اس توفیق خداوندی کی دل کھول کر داد دیتے، اور اگر وہ عبارت ہمارے خیال میں کافی نہ ہوتی تو ان کی پیشکش کے احترام میں بلا تکلف ایک عبارت مرتب کر کے ان کے دستخط سے اسے مرصّع کرا کے مکمل عزت و احترام کے ساتھ اسے سر آنکھوں پر سجاتے اور ساری دنیا میں اسوۂ سلیمانی کے طرز پر نقش ہونے والے اس اسوۂ عباسی کا بصد احترام و افتخار ڈھنڈورا پیٹتے۔ لیکن یہ سب تو اس صورت میں ہوتا، جب کہ واقعی مولانا کے خط میں وہ بات نام کو بھی ہوتی، جس کا دعویٰ مولانا نے ۲۵ مئی والے بیان میں فرمایا ہے ــــ اب تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ کاش ایسا ہوتا، اور اگر وہ ہوتا تو یقیناً یہ ہوتا۔

اہم ترین سوال

اور اگر ان سب باتوں سے بالکل صرف نظر کر کے، تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی

لیا جائے کہ ۵ مئی والا مولانا عبداللہ عباس صاحب کا یہ خط اعتراف قصور، اعلان رجوع، در اظہار برأت کے "واضح مضمون" پر مشتمل تھا، تو سوال یہ ہے کہ ۱۰ مئی کے تعمیر حیات میں اسے شائع کیوں نہیں کر دیا گیا؟ کیونکہ جن خیالات اور جس تجزیہ سے رجوع کرنا تھا وہ تعمیر حیات کے "منبر" سے نشر ہوئے تھے اور وہیں سے اُن سے رجوع کا اعلان بھی لازم تھا، اور اگر ۱۰ مئی کو وہاں اعلان رجوع اور عبارت بدلنے والی پیشکش شائع ہو جاتی تو ۲۰ مئی کو شائع ہونے والے الفرقان میں کیا اسے نظر انداز کیا جانا ممکن تھا؟ اور نہ صرف یہ کہ ۱۰ مئی کے تعمیر حیات میں اعلان رجوع شائع نہیں ہوا بلکہ ایک ایسا نوٹ شائع ہوا جو صاف لفظوں میں بتا رہا تھا کہ کم از کم اُس وقت تک ادارہ تعمیر حیات کی نگاہ میں مولانا عبداللہ عباس صاحب کے وہ خیالات قابل تائید و تحسین بھی تھے۔ لیجئے وہ پورا نوٹ ملاحظہ فرمائیے:-

"تعمیر حیات جو شعبہ تعمیر و ترقی ندوۃ العلماء کا آرگن ہے اس میں دعوتی انداز کے مختصر مضامین شائع ہوتے ہیں، تبصرہ کے لیے جو کتابیں آتی ہیں ان کا تبصرہ کبھی ادارہ کے کسی رکن کے قلم سے اور کبھی کسی دوسرے کے قلم سے شائع ہوتا ہے۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں "واقعہ کربلا اور اس کے تاریخی پس منظر" پر جو تبصرہ شائع ہوا وہ بھی ایک انفرادی رائے کا مظہر تھا، اس پر مصنف کتاب کا ایک نوٹ آیا، جس کو دیکھ کر تبصرہ نگار نے اپنا ایک نوٹ دیا اور خطرہ تھا کہ اگر ان کو شائع کیا جائے تو یہ سلسلہ طویل سے طویل ہو جاتا، جب کہ دفتر کو تبصرہ کی تائید و تحسین میں بعض خطوط ملے، اور بعض خطوط رد و اعتراض میں، ان سب کے شائع کرنے کے لیے تعمیر حیات کے صفحات متحمل نہیں ہو سکتے تھے، خاص بات یہ رہی کہ تبصرہ کے بعض جملوں پر جو خاص اعتراض ہو سکتا تھا اس سلسلہ میں خود حضرت ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے ایک مفصل مضمون مرحمت فرمایا جو شائع ہو چکا ہے[*] اور تبصرہ نگار نے بھی مطلع کیا کہ ان کا رجحان و عقیدہ وہی ہے جو جمہور اہل سنت

کا رجحان و عقیدہ ہے، اس لیے اب اس سلسلہ میں کوئی خط یا مضمون خواہ تائید کا ہو یا تردید کا شائع کرنے سے معذور سمجھا جائے۔ (ادارہ)

اس نوٹ کے جس جملہ پر ہم نے خط کھینچا ہے اسے سامنے رکھئے اور غور کیجئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ۵ مئی کو ندوے ہی کے اندر بیٹھ کر ندوے کے معتمد تعلیم مولانا عبداللہ عباس صاحب اپنے جس تبصرے سے رجوع کر چکے ہوں، ۱۰ مئی کو شائع ہونے والے ندوے کے ترجمان تعمیر حیات کے ادارے کی نگاہ میں وہ تبصرہ ہنوز قابل تحسین و تائید بھی ہو؟ آسانی سے تو یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔

اور اس نوٹ کا جب تذکرہ آ ہی گیا ہے تو اس کے حوالے سے اپنے محترم قارئین کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نوٹ سے مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کی تعمیر حیات میں اشاعت نہ ہو سکنے کی جس وجہ کا اشارہ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ -

"خطرہ تھا کہ اگر ان کو (یعنی مصنف کتاب کا مراسلہ اور مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کو) شائع کیا جائے تو یہ سلسلہ طویل سے طویل ہو جاتا۔"

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مولانا عبداللہ عباس صاحب نے اپنے اُس مضمون میں واقعۃً اپنی قابل اعتراض عبارتوں کو لغزش تسلیم کر کے ان سے رجوع و برأت کا اعلان کر دیا تھا جیسا کہ الفرقان نے ۵ مئی والے بیان میں دعوی کیا ہے، تو پھر خطرہ کہاں سے آ گیا کہ یہ "سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا جائے گا" بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اسی وقت اگر وہ مضمون شائع کر دیا گیا ہوتا تو مولانا عبداللہ عباس صاحب کے "صاف صاف اعلان رجوع" کی بدولت سارا معاملہ وہیں ختم ہو جانا یقینی تھا ـــ بہر حال یقین نہیں تو گمان تو ضرور ہوتا ہے کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کا وہ مضمون۔ کم از کم ادارۂ تعمیر حیات کی نگاہ میں معاملہ کو مزید الجھانے والا ہی تھا، اور اسی بنا پر انھوں نے اس کی اشاعت نہ کرنے ہی کا فیصلہ کیا[ل] واللہ اعلم

ل اور اس کی ایک واضح شہادت خود مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مکتوب بنام مولانا عتیق الرحمن سنبھلی میں موجود ہے، وہ لکھتے ہیں:

"معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مدظلہ کا بیان اس سلسلہ میں نکل چکا ہے، اور آئندہ کے لئے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور ہاں! یاد آیا، مولانا عبداللہ عباس صاحب اس مضمون کے شائع نہ ہونے کی ایک وجہ اور بتاتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ:

> مضمون شائع ہوا تو میں یہاں موجود نہ تھا، واپسی پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دیگر حضرات نے مجھے توجہ دلائی کہ میرے قلم سے نکلنے والی فلاں عبارت قابل اعتراض ہے، مجھے قلم کی اس غلطی پر افسوس ہوا، اور میں نے صراحت سے اس کی وضاحت کر دی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے متعلق میرا مسلک شدت سے وہی ہے جو شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور میری یہ عبارت ایک لغزش ہے، میں اس سے رجوع کرتا ہوں، اپنی برأت ظاہر کرتا ہوں، لیکن جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کا ایک تفصیلی مضمون تعمیر حیات میں آگیا جو توضیح مسلک کے سلسلہ میں کافی وشافی تھا، اس لیے اس کی اشاعت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

مولانا عبداللہ عباس صاحب کے اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ چونکہ ۲۵/اپریل والے شمارہ میں حضرت مولانا مدظلہ کا تفصیلی مضمون آگیا تھا اس لئے اُن کے یعنی مولانا عبداللہ عباس صاحب کے اس مضمون کی اشاعت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی،

یا للعجب! مولانا عبداللہ عباس صاحب اپنے خط میں بتا چکے ہیں کہ وہ ۲۸/اپریل کو لکھنؤ واپس آئے تھے اور معلوم ہے کہ حضرت مولانا مدظلہ کا تفصیلی مضمون ۲۵/اپریل والے شمارہ میں شائع ہو چکا تھا، لہٰذا حضرت مولانا نے یہ جو مولانا عبداللہ عباس صاحب کو توجہ دلائی تھی کہ ان کے قلم سے نکلنے والی فلاں عبارت قابل اعتراض ہے، تو یہ قصہ یقینی طور پر اُن کے یعنی حضرت مولانا مدظلہ کے مضمون کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)
اس موضوع پر جس میں مناظرانہ مضامین ہوں وہ تعمیر حیات میں شائع نہیں ہوں گے۔ اس لئے...

اشاعت کے کم از کم تین، چار دن بعد کا ہے۔ تو کیا تک ہوئی اس بات کی کہ چونکہ حضرت مولانا مدظلہ کا تفصیلی مضمون تعمیر حیات میں اشاعت کے لیے آگیا اس لئے مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کی اشاعت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، کیونکہ حضرت مولانا نے ان سے جو تقاضا کیا تھا وہ تو اپنے مضمون کی اشاعت کے بعد ہی کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت مولانا مدظلہ اپنے مضمون کی اشاعت کے بعد بھی مولانا عبداللہ عباس صاحب سے کسی "شئے مزید" کا مطالبہ فرمارہے تھے۔ تو کیا اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ جو ضرورت حضرت مولانا دامت برکاتہم کو محسوس ہو رہی تھی وہ ہمارے مولانا عبداللہ عباس صاحب کو نہیں ہوئی۔ اور بالآخر ان کا احساس حضرت مولانا مدظلہ کے احساس پر غالب رہا — استغفراللہ! ایک غلطی کو نباہنے اور اعلان رجوع میں اس قدر ناروا تاخیر کے لیے حیلے بہانے کرنے کی کوشش میں کیسی الٹی سیدھی اور مضحکہ خیز باتیں زبان سے نکل رہی ہیں۔ جائے عبرت ہے! اللّٰھمّ احفظنا!

ہاں! اس بہانے جو ایک بہت اہم بات اب ہمیں معلوم ہوئی ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کو اپنے اس تفصیلی مضمون کی اشاعت کے بعد بھی صاحب معاملہ کی حیثیت سے مولانا عبداللہ عباس صاحب کی طرف سے مزید اعلان رجوع اور اظہار برأت کے قسم کی کسی چیز کی ضرورت کا احساس تھا اور اس کے لیے انھوں نے ان سے تقاضا بھی فرمایا تھا.....

..... کاش کہ یہ بات ہمیں الفرقان کے گزشتہ شمارہ کی اشاعت سے پہلے ہی معلوم ہو گئی ہوتی یا کاش مولانا عبداللہ عباس صاحب ہی اپنے ۵ مئی والے خط میں اس کا تذکرہ فرما دیتے تو اس طفل مکتب کا نوآموز قلم حضرت مولانا مدظلہ کے طرز عمل کے بارے میں اپنی شدید حیرت اور پریشانی کے اظہار میں حد ادب سے تجاوز کا گنہگار نہ ہوا ہوتا جیسا کہ ہوا، اور اب جب کہ یہ خوش خبری سن کر دل کا بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ یہ راقم الحروف اپنے ان جملوں کو واپس لیتا ہے، اور صمیم قلب سے اُن پر شرمندہ و نادم ہے جو اس کے خطاکار قلم سے حضرت مولانا کی شان میں [illegible] گئے تھے۔ نیز حضرت مولانا مدظلہ سے معافی کا خواستگار بھی ہے —

بہر حال اب یہ بات بالکل بے غبار ہو چکی ہے کہ :

حضرت مولانا مدظلہ نے اپنے دوسرے مضمون کے بعد بھی مولانا عبداللہ عباس صاحب کو وہ ہدایت دی تھی جس کے بارے میں راقم الحروف نے گزشتہ شمارہ کے اداریہ میں بایں الفاظ اظہار خیال کیا تھا کہ :

"کتنی آسان سی بات تھی، چند سطروں پر مشتمل ایک بیان حضرت مولانا مدظلہ کا آجاتا کہ مولوی عبداللہ عباس صاحب کے مضمون میں صحابہ کرام کے ایک گروہ کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ غلط اور بے بنیاد ہیں۔ ہم ان سے اظہار برأت کرتے ہیں۔ یا حضرت مولانا مدظلہ اپنے شاگرد مولانا عبداللہ عباس صاحب سے فرمادیتے کہ فوری طور پر اپنے تبصرہ کے اس حصہ سے اپنی برأت اور معذرت خواہی پر مشتمل بیان دو"

مگر افسوس کہ ہمارے مولانا عبداللہ عباس صاحب کو اس کی توفیق نہ ہوئی، اور اسی ضرورت کے احساس نے جو حضرت مولانا مدظلہ کو بھی تھا، راقم الحروف کو گنہگار کر دیا۔

مولانا عبداللہ عباس صاحب نے اپنے وضاحتی بیان میں ایک شکوہ اور کیا ہے، اسے بھی انہی کی زبانی سنیے! وہ فرماتے ہیں۔

"اور ..... جس مسئلہ پر لکھنے کے لیے مجلہ "الفرقان" کافی تھا، اس کو عوامی جذبات بھڑکانے، ندوہ کی عظمت و شہرت پر بٹہ لگانے اور الفرقان کو فروغ دینے کی خاطر پوسٹروں کی سطحی سیاست کا استعمال کیا گیا۔ کیا اسی کا نام علم اخلاق اور دیانت ہے؟"

شکوہ آپ نے سن لیا، اب جواب شکوہ سننے سے پہلے اس پوسٹر کا فوٹو جو ادارۂ الفرقان نے شائع کیا تھا وہ بھی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرما لیجیے۔

پوسٹر آپ نے دیکھ لیا، اس کے مضمون پر پھر سے غور کر لیجئے، اور پھر فرمائیے کہ اس میں "ندوے کی عظمت و شہرت پر بٹے لگانے والی بات کا تو ذکر ہی کیا، ندوے کی طرف کوئی دور کا اشارہ بھی اس میں آیا ہے ---؟ بجائے اس کے کہ ایسے پوسٹر کی داد دی جاتی جس سے زیادہ محتاط اور مبہم زبان پوسٹروں میں کم ہی استعمال کی جاتی ہوگی، الٹا کہا جا رہا ہے کہ ادارہ الفرقان پوسٹروں کی سطحی سیاست کا استعمال کر کے عوامی جذبات بھڑکانے اور ندوے کی عظمت و شہرت پر بٹہ لگانے میں لگ گیا ہے --- اناللہ وانا الیہ راجعون

ہو سکتا ہے کہ یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ آخر اس پوسٹر کی ضرورت کیا تھی؟ سو عرض ہے کہ جن لوگوں کی نظر سے تعمیر حیات میں شائع ہونے والا تبصرہ جو انتہائی ایمان سوز خیالات پر مشتمل تھا، گزر چکا تھا، ہم ضروری سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ ان کی نظر سے الفرقان کا وہ شمارہ حتی الامکان ضرور گزر جائے جس میں ملک کے بعض معروف اہل علم وقلم نے ان خیالات کا تعاقب کیا تھا۔ اور ایسے ہی لوگوں کی توجہ الفرقان کے اس خاص شمارہ کی طرف مبذول کرنے کے لیے پوسٹر کی ضرورت پڑی تھی ـــــ اور کافی ذہنی توانائی صرف کرنی پڑی تھی پوسٹر کا ایسا مضمون بنانے میں جس سے یہ مقصد تو حاصل ہو جائے، مگر ندوے کی طرف، اکابر ندوہ کی طرف، بلکہ تعمیر حیات یا مولانا عبداللہ عباس صاحب کی طرف بھی اشارہ تک نہ ہونے پائے ـــــ مگر کیسا المناک تجربہ ہے یہ کہ ہماری ساری کاوشیں اور یہ ساری رعایتیں گم ہو گئیں اس پروپیگنڈے کے شور میں کہ الفرقان والوں نے ندوے کے خلاف عوامی جذبات بھڑکانے کی مہم چھیڑ دی ہے! خیر! وہ علیم و بصیر جس کی رضا کے لیے کیا گیا جو کچھ کہ کیا گیا وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، اور اعمال پر نتائج مرتب کرنے کا اختیار اس کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ہے!! اور اس کے فیصلے کسی پروپیگنڈے کی بنیاد پر نہیں ہوا کرتے، اصل حقیقت کی بنیاد پر ہوا کرتے ہیں جس کا جاننے والا اس سے زیادہ کوئی اور نہیں۔

اس ذیل میں یہ بات بھی توجہ کے لائق ہے کہ "ایک اہم وضاحت" کے زیر عنوان چھپنے والے اس اشتہار میں جو شہر میں بڑے پیمانے پر تقسیم بھی کیا گیا۔ ہم لوگوں پر لگائے گئے الزامات کا جواب ہم نے الفرقان ہی کے صفحات میں دینا بہتر سمجھا ـــ اور ان لوگوں کے اطمینان کے لئے جو اس اشتہار کے بعد حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے ہم سے رجوع کر رہے تھے، اور معلوم ہونے پر فوراً جوابی اشتہار شائع کرنے پر زور دے رہے تھے، ایک مختصر سا اعلان جاری کیا جو یہ تھا:

ایک ضروری اعلان

"ایک اہم وضاحت" کے زیر عنوان مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کا ایک بیان جو ادارہ الفرقان، اس کے مدیر مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی، اور اُن کے برادر معظم مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے خلاف بہت سے الزامات پر مشتمل ہے ۲۵ مئی کو شائع ہوا ہے اور شہر میں تقسیم کرایا گیا ہے۔

بے شمار لوگوں نے اس سلسلہ میں ادارہ الفرقان سے رجوع کیا ہے، لہٰذا اعلان کیا جاتا ہے کہ مولانا عبداللہ عباس ندوی کے اس وضاحتی بیان کے سلسلہ میں ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ الفرقان ہی کے صفحات تک محدود رہے گا، اس لئے جن حضرات کی نظر سے مولانا عبداللہ عباس صاحب کا وہ بیان گزرا ہو اور انھیں ہمارا نقطۂ نظر جاننے سے دلچسپی ہو، اُن سے گزارش ہے کہ تھوڑے انتظار کی زحمت گوارا فرمائیں اور الفرقان کا آئندہ شمارہ، جو انشاء اللہ جلد ہی شائع ہوگا، ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

ایک اور گزارش تمام اہل ایمان سے یہ ہے کہ قرآنی ہدایت کے بموجب ہم میں سے کسی کی کوئی بات، خاص کر وہ جو دوسروں سے متعلق ہو، بغیر تحقیق قبول نہ کریں۔

ناظم ادارہ الفرقان۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ فون نمبر ۲۳۵۵۴

خلاصۂ کلام

یہاں تک ہم نے جو کچھ عرض کیا، اس کا تعلق ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے مطبوعہ وضاحتی بیان کی ۲۶ سطروں سے تھا، آخری ساڑھے تین سطروں کے بارے میں کچھ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو جملوں میں اپنی معروضات کا خلاصہ پھر سے پیش کر دیا جائے۔

ہم نے اپنی گفتگو کے ابتدائی حصہ میں عرض کیا ہے کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کا یہ فرمانا کہ انھوں نے ۵ مئی والے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے نام اپنے خط میں ان سبھی قابل اعتراض خیالات اور تاریخی تجزیہ و تبصرہ سے رجوع کر لیا تھا۔ افسوس ہے کہ بالکل غلط

اور سراسر بے بنیاد ہے۔ انھوں نے اپنے خط میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی تھی۔ بلکہ اپنے انہی خیالات کو انداز بیان میں تھوڑی سی تبدیلی کرکے دوہرا دیا تھا اور انھیں اپنے خیال میں قابل قبول بنا کر پیش کرنے کی سعی نامشکور کی تھی۔ اور اپنے اُن غلط خیالات کے مکرر اظہار کے بعد اب مزید صریح غلط بیانی کرکے انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شہرت اور حیثیت عرفی کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اللہ ہی بہتر جانے کہ کب اور کیسے اس کی تلافی ہو سکے گی؟

ہماری معروضات کا دوسرا اہم جزیہ اہم ترین سوال ہے کہ۔

۵ مئی کو اپنے خط میں یا اس سے پہلے لکھے ہوئے اپنے کسی مضمون یا نوٹ میں اگر مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی نے اپنے قابل اعتراض خیالات سے رجوع کر لیا تھا...، تو وہ اعلان رجوع تعمیر حیات کے ۱۰ مئی کے شمارے میں کیوں شائع نہیں ہوا؟ کیونکہ اس اعلان رجوع کی اشاعت کا صحیح محل تعمیر حیات تھا اور اس کی اشاعت کی اولین ذمہ داری اُسی پر تھی، نہ کہ الفرقان یا کسی اور رسالے پر ——؟؟؟ اس سوال کے جواب کی ذمہ داری مولانا عبداللہ عباس صاحب (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) کے علاوہ ادارۂ تعمیر حیات پر بھی ہے۔

اس خلاصۂ کلام کے آخر میں ہم ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کے اِن دعووں کے جواب میں کہ "انھوں نے اپنے خط میں اپنے قابل اعتراض تجزیہ و خیالات کو غلط تسلیم کر لیا تھا، ان سے رجوع کر لیا تھا، اور صاف لفظوں میں ان سے اظہار برأت کر دیا تھا" بلکہ یہاں تک پیشکش کر دی تھی کہ۔

"اگر میری عبارت سے اطمینان نہ ہو تو آپ عبارت بنا دیں، میں اس پر دستخط کر دوں گا اور وہ شائع کر دی جائے۔"

اپنے قارئین کی خدمت میں غالب کا یہ شعر عرض کرنا مناسب سمجھیں گے کہ ؎

ہاں! کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

وضاحتی بیان کی آخری ساڑھے تین سطریں

ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب نے اپنے بیان کی آخری سطروں میں لکھا ہے۔

"میں پھر پوری صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ میرے قلم سے جو غلط عبارت نکل گئی تھی اس سے میں رجوع کر چکا ہوں۔ مزید اپنی برأت ظاہر کرتا ہوں میرا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقام بلند کتاب و سنت میں بیان فرمایا ہے۔ میں اسی عقیدہ پر جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔ وما علینا الا البلاغ۔ وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی، ان ربی

ہم وضاحتی بیان کی ان آخری سطروں کی اس خبر پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور خوشی سے تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب نے بالآخر اپنی قابل اعتراض "عبارت" سے رجوع کر لیا ہے۔ اور اگر آخری سطروں والی خوشخبری میں الفرقان کی کاوش اور اس دعا کا بھی کچھ دخل ہے جو بایں الفاظ مانگی گئی تھی کہ "اللہ تبارک و تعالیٰ اس تبصرہ کی ذمہ داری کے ہر شریک کو خلوص دل سے سرِ عام توبہ کی توفیق عطا فرمائے" تو یہ خبر ہمارے لیے ذاتی طور پر لائق صد شکر بھی ہے۔ کہ یہ محض اللہ کا کرم اور اسی کی توفیق و عنایت ہے۔ فلک الحمد والشکر یا اللہ العالمین ٥ —— مگر اسی خوشی کے ساتھ ہم اس تمنا کا اظہار بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ کاش وہ اپنے اس اعلان رجوع کے حُسن کو بے بنیاد الزامات سے داغدار نہ کرتے۔ اور امید کرتے ہیں کہ زیادہ صاف لفظوں میں، اور کسی "ملاوٹ" کے بغیر صرف عبارت نہیں بلکہ اپنے ان خیالات اور تاریخی تجزیہ سے بھی اعلان رجوع فرمائیں گے جو اس سارے ہنگامہ کا سبب بنے ہیں اور جو غلط بیانیاں اور بے بنیاد الزامات ان کے قلم سے ادارہ الفرقان کے ذمہ داروں کے متعلق پھر نکل گئے ہیں۔ ان کے بھی غلط ہونے کا واضح اعلان کر کے متعلقہ لوگوں،

سے معافی مانگنے کا حوصلہ بھی انہیں میسر آئے گا۔ کہ اللہ کے خزانے بہت وسیع ہیں۔ ۱ے

ایک اہم وضاحت

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی نے "واقعہ کربلا اور اُس کا پس منظر" نامی کتاب لکھی جس میں نہ صرف اہل بیت نبوت کی حق تلفی کی۔ بلکہ صحابہ
حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور واقعہ حرہ میں یزید کے لشکر کے ہاتھوں شہید ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی ظلم کیا۔ اور قاتلوں
کی طرف سے صفائی پیش کی۔ اس کتاب کو پڑھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والا ہر شخص دکھی ہوتا ہے۔
اور اس کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ مجھ پر بھی یہ تاثر شدت کے ساتھ ہوا۔ نتیجتاً میں نے کتاب پر تبصرہ کیا۔ جو تعمیر حیات میں شائع ہوا۔ یزید کے
خلاف شدت جذبات میں میرے قلم سے ایک ایسی عبارت نکل گئی جس سے حضرت ابوسفیانؓ، حضرت ہندہؓ اور بنی اُمیہ کے بعض دیگر صحابیوں
کی تنقیص کا مطلب نکالا جا سکتا تھا۔ مضمون شائع ہوا تو میں یہاں موجود نہ تھا۔ واپسی پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دیگر حضرات نے مجھے
توجہ دلائی کہ میرے قلم سے نکلنے والی فلاں عبارت قابل اعتراض ہے۔ مجھے قلم کی اس غلطی پر افسوس ہوا۔ اور میں نے صراحت سے اس کی وضاحت
کردی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے متعلق میرا مسلک شدت سے وہی ہے جو شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ
علیہ کا ہے۔ اور میری یہ عبارت ایک لغزش ہے۔ میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔ اپنی براءت ظاہر کرتا ہوں۔ لیکن جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
دامت برکاتہم کا ایک تفصیلی مضمون تعمیر حیات میں آگیا۔ جو توضیح مسلک کے سلسلہ میں کافی و شافی تھا۔ اس لیے اس کی اشاعت کی ضرورت نہیں سمجھی
گئی۔ اس کے چند روز بعد مجھے مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب کا خط ذاتی میرے نام ملا۔ اس کے جواب میں میں نے مفصل وضاحتی خط مولانا عتیق الرحمن
صاحب سنبھلی کو لکھا جس میں یہ مضمون پوری وضاحت سے آگیا تھا۔ یہ خط ان کو ۵ مئی کو مل گیا تھا اور الفرقان ۲۱ مئی کو شائع ہوا۔ ان کی اخلاقی
ذمہ داری تھی کہ اس کو "الفرقان" میں شائع کرتے۔ میں نے اس میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میری عبارت سے اطمینان نہ ہو تو آپ عبارت بنا دیں
میں اس پر دستخط کردوں گا، اور وہ شائع کردی جائے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بجائے اس کے کہ وہ میری براءت شائع کرتے اور دیانت داری
کے ساتھ حق کا اظہار کرتے انہوں نے مجھ پر تحقیر صحابہ رضی اللہ عنہم کا الزام لگایا، نعوذ باللہ من ذلک۔ کیا ایک انسان اگر اپنی کسی قلمی غلطی سے
رجوع کرے اور وضاحت کردے کہ یہ میرے سلبی تاثر سے مغلوبیت کا نتیجہ تھا۔ تب بھی وہ غلطی اس کے سر منڈھ دی جائے گی؟
کیا انصاف اور دیانت داری اسی کا نام ہے؟ اور پھر مجھے جس بات کا سب سے زیادہ قلق ہے کہ میری غلطی کو آڑ بنا کر انہوں نے اُمت اسلامیہ
کی امید اور مرکز توجہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم پر کیچڑ اچھالا۔ اور گویا ان کو بھی تنقیص صحابہ رضی اللہ عنہم کا مجرم گردانا۔ وہ عالم
اتفاق جس کو مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ امام اہلسنت
مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ اور اخیر دور میں عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کی محبت، اخلاص،
اعتماد حاصل ہو، اور جس کو عرب و عجم کے تمام علماء بالاتفاق اپنا پیشوا اور رہبر تسلیم کرتے ہوں اس کے ساتھ "الفرقان" کے نو آموز ایڈیٹر اور مولانا
عتیق الرحمن سنبھلی نے جس تذلیل کا معاملہ کیا، اور جس طرح ان کی ذات کو اس مسئلہ میں گھسیٹا، وہ محسن کشی کی تاریخ کا بڑا شرمناک اور قابل مذمت
باب ہے۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

اور اس سے بھی زیادہ حیرت اور بے انتہا افسوس کی بات ہے کہ جس مسئلہ پر لکھنے کے لیے مجلہ "الفرقان" کافی تھا، اس کو ہوا دے کر جذبات
بھڑکانے، ندوہ کی عظمت و شہرت پر بٹہ لگانے اور الفرقان کو فروغ دینے کی خاطر پوسٹروں کی سطحی سیاست کا استعمال کیا گیا۔ کیا اس کا نام علم
اخلاق اور دیانت ہے؟

میں پھر پوری صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ میرے قلم سے جو غلط عبارت نکل گئی تھی، اس سے میں رجوع کر چکا ہوں۔ مزید اپنی براءت ظاہر
کرتا ہوں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقام بلند کتاب و سنت میں بیان
فرمایا ہے۔ میں اسی عقیدہ پر جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ — وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ

[illegible] عبداللہ عباس ندوی

مدیر: نوٹ فرمائیں کہ یہاں مولانا نے اپنے خط کے حوالے سے جس بات کو ہماری دیانت کا تقاضا اور اخلاقی فریضہ ٹھہرایا ہے، تعمیر حیات
(مورخہ ۱۰ جون ۹۲ء) میں اپنا یہ خط شائع کرتے ہوئے اسے صرف ایک گنجائش بتایا گیا ہے۔ ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا؟ [illegible]

ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) جولائی ۱۹۹۲ء ص۱۳ تا ص۴۳

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی

یہ ملامت۔ زہے نصیب!

مدیر الفرقان عزیزی میاں سجاد صاحب کے نام اُن کے ایک ندوی ساتھی[1] کا خط دو ماہ پیشتر آیا تھا۔ اُس کا ایک حصہ ذیل میں پڑھیے:۔

"تعمیر حیات" میں آپ کے بھائی صاحب محترم کی کتاب پر مولانا عبداللہ عباس صاحب کا تبصرہ پڑھ کر یہاں سب لوگوں[1] کو سخت اذیت پہنچی...... صاحب...... صاحب...... صاحب اور خاکسار، سب کا ردِ عمل یکساں ناگواری کا تھا۔ ندوہ کے پلیٹ فارم سے شیعیت کا پروپیگنڈہ اللہ کی پناہ۔ یہی مضمون مولانا عبداللہ عباس صاحب اپنے پرچے میں شائع کرتے تو اسکو ان کی ذاتی رائے شمار کر لیا جاتا، لیکن ندوہ کے ترجمان میں اس طرح کا مضمون شائع ہو جائے اس کا بہت دکھ تھا۔ وہ بھی اس اہتمام سے کہ پورے شمارے کے سارے مضامین کے برعکس اس کو سرخ ہیڈلنگ سے شائع کیا گیا...... صاحب نے چھبیس فل سکیپ صفحوں پر ایک جائزہ لکھ کر تعمیر حیات کو بھیجدیا تھا جو اپنی جگہ اچھا تھا۔ مگر اسکی توقع نہیں کہ وہ شائع کرینگے۔ اولاً تو افسوس اس کا تھا کہ عبداللہ عباس صاحب کا یہ مضمون تعمیر حیات میں شائع کیسے ہو گیا پھر یہ کہ اسکے بعد دو ایک شماروں میں کوئی معذرت نہیں آئی۔ پھر حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کا مضمون آیا جو اپنی جگہ درست تھا لیکن ضرورت تو اسکی تھی کہ اضافہ کی سرزنش کی جاتی۔ ابھی چند روز قبل...... صاحب کو کسی نے عبداللہ عباس صاحب کے وضاحت کی ایک کاپی

---

[1] مراد ندوی برادری ہے اور آگے انہی لوگوں کا نام تھے جو حذف کر دیئے گئے ہیں۔

ارسال کی ہے۔ یہ وضاحت نہیں "غرّاہٹ" ہے۔ عذرِ گناہ بدتراز گناہ۔ موصوف کو پشیمانی کیا ہوگی وہ تو غیظ و غضب کا اظہار کرتے نظر آرہے ہیں۔ موقع اس کا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے سچی توبہ کرتے اور ایک واضح اور مختصر اعتذار شائع کرا دیتے۔ بات ختم تھی۔ وہ کتنی عظیم نسل تھی جو اپنے بارے میں یہ رائے رکھا کرتی تھی کہ رحم اللّٰہ امرءً اھدیٰ الیٰ ذنوبی۔

یہ ۔ال اب ہم لوگ خلافت و ملوکیت کی تغلیط کا منہ نہیں رکھتے۔ آپ کو شاید معلوم ہوا ہو کہ خلافت و ملوکیت گروپ نے عبداللہ عباس صاحب کے مضمون کی کاپیاں تقسیم کیں ۔۔۔۔!

عبداللہ عباس صاحب کو چاہئے کہ ذی الحجہ کے ماہ رواں کے بعد محرم منانے کا اعلان کرکے مؤمنین میں شامل ہو جائیں موصوف کو یقیناً اس حلقے میں آقائی مجتہد العصر آیۃ اللہ عبداللہ عباس کا درجہ حاصل ہو جائے گا!"

جو شخص یہ خط لکھ چکا ہو جس میں عبداللہ عباس صاحب کے تبصرے کو اُن کا ذاتی فعل ماننے سے انکار کرکے اُسے "ندوے کے پلیٹ فارم سے تشیعیت کا پروپیگنڈہ" کہا گیا ہو جس میں اس بات پر نکتہ چینی کی گئی ہو کہ تعمیرِ حیات نے دوسرے سارے مضامین کے برخلاف اس تبصرے کو سرخ ہیڈنگ سے شائع کرکے اہم بنایا، جس میں افسوس ظاہر کیا گیا ہے کہ بعد میں تعمیرِ حیات کی طرف سے اس تبصرہ کی اشاعت پر کوئی معذرت بھی نہیں آئی۔ اور پھر مولانا علی میاں کی طرف سے اس تبصرے کے سلسلے میں شائع کئے جانے والے مضمون (۲۵ر اپریل ۱۹۹۲ء) کو بھی اس لحاظ سے ناقص قرار دیا گیا ہے کہ اس موقع کی جو اصل ضرورت تھی کہ اصاغر (عبداللہ عباس صاحب اور ارکان ادارہ تعمیرِ حیات) کی سرزنش کی جاتی وہ تو اس سے پوری نہیں ہوئی۔ کیا اُسی شخص سے یہ توقع کوئی کرسکتا ہے کہ جب اس تبصرے سے متعلق الفرقان کی اشاعت خاص (بابت مئی۔جون ۱۹۹۲ء) وہ دیکھے جس میں یہی سب باتیں جو اس نے اپنے خط میں کہی تھیں ذرا تفصیلی اور استدلالی انداز سے کہی گئی ہیں تو وہ ... ...مرا خط بایں الفاظ لکھے گا کہ:۔

"آپ حضرات نے اس قضیے میں حضرت مولانا علی میاں صاحب اور ندوۃ العلماء کو

سمیٹنے اور مطعون کرنے کی بجید مذموم کوشش کی ہے۔۔۔۔!

"اگر الفرقان نے صرف مولانا عبداللہ عباس صاحب کی تحریر کا رد اور موضوع کی اہمیت سے بحث کی ہوتی تو بڑی خوشگوار بات ہوتی"

لیکن کتنی بھی حیرت ہمیں یا کسی اور کو ہو، واقعہ یونہی ہوا ہے۔ اور اس انداز کا خط بھی انہی عزیز کے قلم سے مئی جون کا الفرقان پڑھنے کے بعد مدیر الفرقان کے نام موصول ہوا ہے۔ اور اسے پڑھنے کے بعد اس کا بھی کوئی امکان سمجھ سے باہر نظر آتا ہے کہ انھیں اگر معلوم ہو گیا ہو۔ یا اب معلوم ہو جائے کہ عبداللہ عباس صاحب کی وہ وضاحت جسے وہ "غرّاہٹ" اور "عذرِ گناہ بدتراز گناہ" سے تعبیر کرتے ہیں وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے نزدیک بالکل کافی و شافی ہے اور اُسکے بعد کوئی مسئلہ باقی نہیں رہنا چاہیئے[1] تب بھی وہ مولانا علی میاں کی اس پوزیشن پرکسی کی پبلک لب کشائی کو جائز رکھیں گے۔

مولانا عبداللہ عباس صاحب کو جو چاہیئے کہیے۔ انکی پوری "برادری" بخوشی تیار ہے اس خط میں تو آپ نے سب کچھ پڑھ ہی لیا۔ یقین فرمائیے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ایک بڑا حصہ اس بات کیلئے بخوشی تیار تھا کہ الفرقان اگر عبداللہ عباس صاحب کی خبر لے (جیسا کہ وہ اندازہ کررہے تھے) تو ندوے کے کفارے کے طور پر ان کی قربانی کو کارِ ثواب سمجھ لیا جائے۔ اور ہمیں یہ سب معلوم تھا لیکن "مولانا علی میاں کو بھی اس میں سمیٹ لیا گیا" جن سے ندوہ اور ندوی برادری کی آبرو کو چار چاند لگے ہوئے ہیں۔ بس یہ چیز سارا توازنِ فکر بگاڑ گئی ــــ بیشک چار چاند لگے ہوئے ہیں بلکہ ندوے ہی کی نہیں ہندستانی مسلمانوں کی آبرو اُن کی وجہ سے دنیائے اسلام کے قلب ممالک عربیہ میں بڑھی ہے ــــ نادان قسم کے ندوی خواہ کچھ گمان کریں اور کہتے پھریں ہمیں الحمدللہ نہ ندوے سے آج بھی کوئی کد ہے جبکہ وہاں ہمارے حق میں نادانیوں کی انتہا ہو رہی ہے[2] نہ مولانا علی میاں صاحب کیلئے بدخواہی کا کوئی گزر ہمارے سینے میں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم دین کے معاملے میں مولانا عبداللہ صاحب اور مولانا علی میاں صاحب میں کوئی فرق کرنے کی

[1] حضرت مولانا کی یہ رائے ریکارڈ پر موجود ہے۔ [2] اسکی صرف ایک مثال اگلے صفحے پر ایک اشتہار کے عکس کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سمیٹنے اور مطعون کرنے کی بیحد مذموم کوشش کی ہے ......"

"اگر الفرقان نے صرف مولانا عبداللہ عباس صاحب کی تحریر کا رد اور موضوع کی اہمیت سے بحث کی ہوتی تو بڑی خوشگوار بات ہوتی۔"

لیکن کتنی بھی حیرت ہمیں یا کسی اور کو ہو، واقعہ یونہی ہوا ہے۔ اور اس انداز کا خط بھی انہی عزیز کے قلم سے مئی جون کا الفرقان پڑھنے کے بعد مدیر الفرقان کے نام موصول ہوا ہے۔ اور اسے پڑھنے کے بعد اس کا بھی کوئی امکان سمجھ سے باہر نظر آتا ہے کہ انھیں اگر معلوم ہوگیا ہو، یا اب معلوم ہوجائے کہ عبداللہ عباس صاحب کی وہ وضاحت جسے وہ "غُرّاہٹ" اور "عذر گناہ بدتر از گناہ" سے تعبیر کرتے ہیں وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے نزدیک بالکل کافی وشافی ہے۔ اور اُسکے بعد کوئی مسئلہ باقی نہیں رہنا چاہیئے[1] تب بھی وہ مولانا علی میاں کی اس پوزیشن پر کسی کی پبلک لب کشائی کو جائز رکھیں گے۔

مولانا عبداللہ عباس صاحب کو جو چاہیئے کہیئے۔ انکی پوری "برادری" بخوشی تیار ہے۔ اس خط میں تو آپ نے سب کچھ پڑھ ہی لیا۔ یقین فرمایئے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا ایک بڑا حصہ اس بات کیلئے بخوشی تیار تھا کہ الفرقان اگر عبداللہ عباس صاحب کی خبر لے (جیساکہ وہ اندازہ کر رہے تھے) تو ندوے کے کفارے کے طور پر ان کی قربانی کو کارِ ثواب سمجھ لیا جائے۔ اور ہمیں یہ سب معلوم تھا لیکن "مولانا علی میاں کو بھی اس میں سمیٹ لیا گیا" جن سے ندوہ اور ندوی برادری کی آبرو کو چار چاند لگے ہوئے ہیں ــــ پس یہ چیز سرا نوازنِ فکر بگاڑ گئی ــــ بیشک چار چاند لگے ہوئے ہیں بلکہ ندوے ہی کی نہیں ہندوستانی مسلمانوں کی آبرو اُن کی وجہ سے دنیائے اسلام کے قلب ممالک عربیہ میں بڑھی ہے ــــ نادان قسم کے ندوی خواہ کچھ بھی گمان کریں اور کہتے پھریں۔ ہمیں الحمدللہ نہ ندوے سے آج بھی کوئی کد ہے جبکہ وہاں ہمارے حق میں نادانیوں کی انتہا ہو رہی ہے[2]۔ نہ مولانا علی میاں صاحب کیلئے بدخواہی کا کوئی گزر ہمارے سینے میں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم دین کے معاملے میں مولانا عبداللہ صاحب اور مولانا علی میاں صاحب میں کوئی فرق نہیں کی

[1] حضرت مولانا کی یہ رائے ریکارڈ پر موجود ہے۔ [2] اسکی صرف ایک مثال اگلے صفحے پر ایک اشتہار کے عکس کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔

دینی و ملی غداروں اور احسان فراموش لوگوں کے چہرے بے نقاب

واقعہ کربلا کے پردے میں ناصبیت کا پرچار

ایک المناک سانحہ

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو مجروح کرکے یزید کی حیثیت کو بڑھاوا دینے کی اسلام بیزار سازش کا پردہ چاک

گمراہ کن کتاب "واقعہ کربلا اور اُس کا پس منظر" عالم اسلام کے لئے کھلا چیلنج

مذکورہ کتاب ایک فریب اور دھوکا ہے۔ درحقیقت اس کتاب میں جمہور علماء اسلام اور اکابر سلف کیخلاف زہر افشانی کی گئی ہے۔ جیسے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور اسی طرح کے دوسرے اکابر کی رائے اور تحقیق سے کھلا انحراف کیا گیا ہے۔ حسب ذیل مضمون اسی آئینہ میں غور طلب ہے ملاحظہ فرمائیں۔

مذہب کے نام پر تفرقہ اندازی کرنیوالے گروہ سے ہوشیار

ہندوستان کے تمام مسلمان واقف ہیں کہ پوری اسلامی دنیا میں حضرت علی میاں اور ندوۃ العلماء کی ہر قوم میں عزت و شہرت ہے اور آج ساری دنیا حضرت مولانا علی میاں کو اچھی طرح جانتی ہے۔ مولانا محترم کی کتابیں ملک کے اندر اور تمام عرب ممالک میں پڑھی جاتی ہیں۔ اور جوٹی کے دانشور اور علماء ان کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ندوۃ العلماء کا علمی دینی وقار سارے عالم میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس چند احسان فراموش جنہوں نے ندوہ ہی کے نام سے اپنے کو روشناس کرایا۔ اور حضرت علی میاں صاحب ہی کی بدولت باہر کی دنیا میں جانے پہچانے گئے اور ان ہی اشارے پر رابطہ عالم اسلامی کے ممبر بنائے گئے۔ آج ان کے اور ندوہ کے مختار بن کر دشمن کے روپ میں سامنے آرہے ہیں زبان سے صحابہ صحابہ کی رٹ لگاتے ہیں اور صحابہ کا نام ان کی عظمت کو اجاگر کرنے والوں پر بہتان تراشی کرتے ہیں جو حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کے مرتکب ہیں۔ بظاہر شیعوں کی مخالفت کا نقاب چہرے پر ڈالے ہیں اور باطن یزید کی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں۔ اور کتنے صحابہ کرام یزید کے ہاتھوں شہید ہوئے اور جس کی حکومت نے حضرت امام حسین اور خاندان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت ترین توہین کی اس شخص کو تمام صحابہ کی موجودگی میں افضل و برتر بتاتے ہوئے نہیں شرماتے کہ وہ نامنظور نعمانی اور ان کے فرزندوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم لکھنؤ اور یوپی کے بسنے والے اتنے بے غیرت نہیں ہیں کہ اپنے اس عظیم قائد اور عظیم اسلامی درسگاہ پر کیچڑ اچھالنے والے کو صبر کریں۔ ہم قانونی چارہ جوئی کے ساتھ منظور نعمانی اور ان کے حواریوں کا اصل چہرہ بے نقاب کریں گے۔ اور عوام کو بتادیں گے کہ صحابہ کا اصل دشمن کون ہے۔

ہم اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والے مسلمان وہ ہیں جنہوں نے رافضیت اور شیعیت کا کھل کر اور بہادری کیساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اور کرتے رہیں گے۔ اسی طرح خارجیت اور ناصبیت کو بھی ہم گناہ اور گمراہی سمجھتے ہیں اور اس کا بھی ہم ہر طرح سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔

حاجی نسیم الدین خاں۔ حافظ محمد اسحٰق۔ محمد اشتیاق ادیب۔ مولانا مصلح الحسن۔ ڈاکٹر عشرت علی صدیقی
ممتاز احمد صدیقی۔ لطیف عباس منیجر اسلامک اسکول۔ محمد اسلم خاں۔ مولانا معید عالم ندوی۔ ظہیر احمد
رفیق احسن نوری

۱؎ اشتہار نہ صرف یہ کہ مولانا علی میاں اور ندوے کی حمایت کے نام پر چھاپا گیا ہے بلکہ ۱۹ جون ۹۰ء کو نماز جمعہ کے بعد ندوۃ العلماء کی مسجد کے دروازہ پر تقسیم بھی ہوا۔

ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔ ہم کہیں دور کے لوگ نہیں کہ مولانا کے قدر سے ناواقف ہوں جس وقت مولانا علی میاں صاحب کا وہ مضمون (۲۵ر اپریل ۱۹۹۲ء) اس تبصرے کے سلسلے میں نکلا جس کے انتظار میں ہم نے تبصرے کی بابت کچھ لکھنا موقوف کر رکھا تھا۔ اور اس سے ہمارے نزدیک یہ بات طے ہو گئی (چاہے وہ غلط طے ہوئی ہو) کہ یہ تبصرہ خود مولانا کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ تب اس مرحلے پر ایک واضح سوالیہ نشان ہمارے سامنے تھا کہ ہم صرف تبصرے سے بحث کریں یا اسکے ساتھ مولانا کی رضامندی کو بھی زیر بحث لائیں۔ پہلی صورت صاف طور سے وہ تھی جسے "بے گٹھلی کا میوہ" کہا کرتے ہیں۔ اور دوسری میں اپنا سر پھوٹنے کا بھی خطرہ تھا۔ اسے دیوانگی کہئے یا اور جو کچھ آپ کا جی چاہے کہئے ہمیں دین کے نام پر ایک مسئلہ اٹھاتے ہوئے اسکی ہمت نہ ہو سکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد گرامی ہم نے پڑھ رکھا ہے کہ :-

انما أهلك الذين من قبلكم	تم سے پہلی امتیں ایسی ہی باتوں میں (دینی
انهم اذا سرق فيهم الشريف	اعتبار سے) برباد ہوئیں کہ ان میں اگر کوئی
تركوه واذا سرق فيهم الضعيف	بڑے درجے کا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ
اقاموا عليه الحد۔[1]	دیتے تھے اور کوئی کمزور یہ کام کر لیتا تو
	اس پر حد قائم کرتے تھے۔

اُسے اس آزمائش کے موقع پر نظر انداز کر جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی پوری اہمیت سمجھنے کیلئے مفید معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پورا موقع و محل اور سیاق و سباق عام ناظرین کیلئے بیان کر دیا جائے۔ حدیث کی پوری روایت کے مطابق موقع یہ تھا کہ (فتح مکہ کے بعد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں فاطمہ نامی ایک قریشی عورت پر ایک چوری کا مقدمہ قائم ہوا۔ قریش کو اپنی شان و عظمت کی وجہ سے فکر ہوئی (کہ اس کا ہاتھ کٹے گا تو ان کی آبرو خاک میں مل جائے گی) پس تلاش ہوئی کہ وہ کون شخص ہو سکتا ہے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح (کتاب الحدود) بحوالہ بخاری و مسلم۔

جو بارگاہِ نبوی میں کچھ زور رعایت کی سفارش ایسے موقع پر کر سکے، رائے قائم ہوئی کہ اسامہ بن زیدؓ جو حب رسول اللہ (محبوب رسول اللہ) کہلاتے ہیں وہ یہ کام کر سکیں گے حضرت اسامہؓ کو تیار کر لیا گیا۔ وہ سفارشی بن کر آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے تب آپؐ نے فرمایا :-

أتشفع في حد من حدود	کیا حدود الٰہی میں (زور رعایت کی)
الله -؟	سفارش کرنے آئے ہو؟

اور یہ کہہ کر آپ کھڑے ہو گئے اور ایک خطبہ دیا جس میں وہ بات ارشاد فرمائی جو اوپر نقل کی گئی کہ تم سے پہلی امتیں ایسی ہی باتوں میں (دینی اعتبار سے) برباد ہوئیں۔ کہ قانون الٰہی کے اطلاق میں کم حیثیت اور ذی حیثیت کا امتیاز برتا جاتا تھا۔ اور اس خطبہ کا خاتمہ آپؐ نے ان الفاظ پر فرمایا جن کی یاد ہمیشہ آپؐ کی اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کی عزت بڑھاتی رہے گی کہ "لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها" (اگر چوری کرنے والی فاطمہ، فاطمہ بنت محمدؐ بھی ہوتی تب بھی مجھے اس کا ہاتھ کاٹنا ہی تھا) صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

اس ارشاد نبوی کی رعایت و نگہداشت کے علاوہ جو کہ یہ چاہتی تھی کہ اگر ہم مولانا علی میاں صاحب کے موقف کے بارے میں لب کشائی نہیں کر سکتے تو پھر عبداللہ عباس صاحب پر گرفت بھی ہمیں زیب نہیں دیتی، معاملہ کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی تھا کہ یہ دین کی اعتقادی اور فکری حفاظت کے سلسلے کی ایک بحث تھی۔ اور اس سلسلے کے مباحث میں بڑوں کی لغزش کا احتساب کسی چھوٹے کی لغزش یا کج فکری کے احتساب سے کہیں زیادہ ضروری اور مقدم ہے۔ اور کسی کی نہیں خود مولانا کی اس بارے میں ایک تحریر ہمارے سامنے ہے جسے قول فیصل کہنا چاہئے۔ فرماتے ہیں :—

"امت کی دینی، علمی، فکری و اصلاحی طویل تاریخ میں دینی و علمی احتساب، بے لاگ بے رو رعایت اور تعمیری و صحت مند تنقید کی مثالوں کی کمی نہیں۔ بلکہ اس بارے میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اس معاملہ میں کوئی قوم و ملت ملت اسلامیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور یہ ہر طرح سے اس امت کے شایان شان ہے جس کو

"شہداء علی الناس" کا امتیاز عطا کیا گیا ہے اور جس کو "یا أیہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ" کے امر کا مخاطب بنایا گیا ہے، علمائے امت کو اپنے اس فریضہ کے ادا کرنے سے نہ کسی کا زہد، روحانیت، عند اللہ و عند الناس مقبولیت روک سکی نہ وہ عظیم دینی خدمات اور علمی منافع بلکہ فیوض و برکات مانع بن سکے جو ان کی ذات سے مسلمانوں اور اسلام کو پہونچ رہے تھے اس کی تابناک مثالیں جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کی کتابوں اور کتب طبقات و تراجم میں دیکھی جا سکتی ہیں، بلکہ مشہور اصول "زلۃ العالِم زلۃ العالَم" (عالِم کی لغزش عالَم کی لغزش ہے) کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن لوگوں کو متبوعیت و مقتدائیت کا مقام حاصل تھا یا جنکے قول و عمل کو حجت و سند سمجھا جاتا تھا، ان پر تنقید و احتساب اور انکی غلطیوں کی نشاندہی میں ان ناقدین و مصلحین نے (اُن کی خدمات کے پورے اعتراف اور ان کی ذات کے کامل احترام کے ساتھ) اپنی ذمہ داری کا اور زیادہ احساس کیا اور دوسروں کے مقابلہ میں (جن کو امت اور اسلامی معاشرہ میں یہ مقام حاصل نہیں تھا) اس کام کو اور زیادہ ضروری سمجھا۔

ہمارے علم اور محدود مطالعہ میں قرن اول سے لے کر اس موجودہ عہد تک کبھی یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا، اور اگر اس امت کیلئے اسلام کی صراط مستقیم پر قائم رہنے، کتاب الٰہی کا تحریف سے اور امت کا ضلالت عامہ سے محفوظ رہنے کا خدائی فیصلہ ہے (اور یہ اس امت کے لئے جو آخر الامم ہے ضروری ہے) تو یہ سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا، اور اس کو قائم رہنا بھی چاہیئے کہ اس میں اس امت کی حفاظت اور انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ کے قیامت تک اس امت میں جاری رہنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع بھی دی ہے۔ کتب حدیث میں آپ کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے "یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال

المبطلین وتاویل الجاھلین[1] (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم) اور امم سابقہ اپنے علماء اور دین کے علمبرداروں کی اسی اخلاقی جرأت اور فرض شناسی کی کمی، دین میں مداہنت اور پاسداری (محاباۃ) اور دینی مصالح پر دنیوی مصالح کی ترجیح، مسئلہ کو مادی، سیاسی اور تنظیمی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت کی بنا پر عمومی ضلالت و انحراف کا شکار ہوئیں، اور آخر میں وہ آخری اور کمزور دھاگا بھی ٹوٹ گیا جو انکو خدا سے اور اپنی کتاب و شریعت سے مربوط کئے ہوئے تھا"

مولانا کا یہ طویل اقتباس اُنکی اُس تحریر کا جزو ہے جو راقم کے والد ماجد (مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ) کی کتاب "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف" کے "پیش لفظ" کے طور پر شائع ہوئی ہے۔ مولانا اُن حضرات میں ہیں جو مودودی صاحب کو اس عہد کی نہایت اہم اسلامی شخصیت مانتے اور پورے احترام سے اُن کا نام لیتے ہیں، مگر انکے بعض افکار و خیالات کو دین کے سلسلے میں خطرناک بھی مانتے ہیں۔ والد ماجد کی کتاب میں موصوف کے اسی قسم کے بعض افکار کی خطرناکی کو نمایاں کیا گیا تھا۔ محترم مولانا علی میاں صاحب نے اپنے "پیش لفظ" کے ذریعے کتاب کو خاص طور سے ان لوگوں کے لئے قابل توجہ بنانے کی کوشش فرمائی ہے جو مودودی صاحب کو اس دور کی عظیم اسلامی شخصیت سمجھتے ہیں، اور اس لئے ان پر تنقید ہضم کرنا انھیں مشکل ہو سکتا ہے ___ کاش مولانا کی تحریر کے یہ دو صفحے جو اوپر نقل کئے گئے خود مولانا کے اُن محبین کیلئے بھی قابل توجہ ہو جائیں جو مولانا کو اس دور کی اہم اسلامی شخصیت ماننے کا مطلب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مولانا سے کوئی علمی و فکری غلطی نہیں ہو سکتی۔ یا اگر ہو سکتی ہے تو اس پر نقد و احتساب کی اجازت کسی کو نہیں دی جا سکتی۔

اس پیش لفظ میں مولانا نے آگے چل کر مودودی صاحب کے معتقدین کے اُس ردّ عمل پر اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے جو وہ مودودی صاحب کے سلسلے میں کسی صحیح سے صحیح اور ضروری سے ضروری تنقید پر بھی روا رکھتے ہیں۔ اور وہی ردّ عمل انھوں نے خود مولانا کی ایک تنقیدی کتاب پر روا رکھا۔ فرماتے ہیں:۔

[1] اس ارشاد نبوی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو علم (کتاب و سنت کی شکل میں) آیا ہے ہر زمانہ کے قابل اعتماد بندے اس امانت کی حفاظت کریں گے۔ غالیوں کی تحریفات، اہل باطل کے غلط دعووں اور جاہلانہ تاویلوں کی تردید اور ان کا غلط باطل ہونا ثابت کریں گے۔

"اس سلسلے میں حیرت کی بات صرف اتنی ہے کہ اس فکر (آگے ایک خاص فکر کا اشارہ بریکٹ میں دیا گیا ہے جس پر خود مولانا کی تنقید مبنی تھی) کی تنقید واحتساب کا استقبال بڑی ناگواری، استعجاب اور کسی قدر آزردگی کے ساتھ کیا گیا، جو ایک ایسی جماعت سے قطعاً غیر متوقع تھا جس کو اس کا دستور اساسی ہدایت کرتا ہے کہ "رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنایا جائے کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا جائے، اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہوا جائے'، اسکے جواب میں وہی کہا جا سکتا ہے جو راقم السطور نے کتاب کے (یعنی اپنی کتاب کے) عربی ترجمے میں لکھا کہ عمل تنقید واحتساب پر سواریوں کے بلدیاتی بے لچک قانون نافذ نہیں کئے جا سکتے: تنقید واحتساب کا عمل یک طرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ اور اس کا حق ہر صاحبِ فکر ونظر کو حاصل ہے۔" (ص ۵-۴)

الفرقان میں حضرت مولانا پر تنقید صرف اتنی کی گئی تھی کہ انکے معتمد تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب نے ندوہ کے ترجمان تعمیر حیات میں ذاتی طور ہی پر نہیں بلکہ تعمیر حیات ہی کی طرف سے راقم کی کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے واقعۂ کربلا کے بارے میں ایسے خیالات پیش کئے کہ جو صرف کسی شیعہ ہی کو زیب دے سکتے تھے۔ اسکی بابت حضرت مولانا کو توجہ دلائی گئی تو آپ نے اس تبصرہ کے اثرات کے ازالے کے نام پر اپنا ایک پرانا مضمون صحابہ کی عظمت ومنزلت پر تعمیر حیات میں شائع کرایا۔ مگر اسکو تبصرے کے کسی اثر کے ازالے سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں تھا۔ یہ اس سے بالکل بے تعلق ایک مثبت مضمون شان صحابہؓ پر تھا۔ مضمون کی اس خامی پر مزید توجہ دلائی گئی تب آپ نے ایک دوسرا مستقل مضمون اسی تبصرے کے حوالے سے تحریر فرمایا۔ مگر اُس کا مقصد مضمون کی تمہید میں از خود ہی یہ بیان کیا گیا تھا کہ عبداللہ عباس صاحب کے تبصرے سے "ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں

غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں، ذمہ داروں اور کارکنوں کے بارے میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی ہے جو پیش نظر ہے" ظاہر ہے کہ اس تمہید اور بیان غرض وغایت کے بعد اس مضمون کے اندر عبداللہ صاحب کے خیالات کی تردید کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا چنانچہ وہ ناپید تھی۔ البتہ بالکل بے جوڑ اور بے ربط طور پر ایک ایسی چیز اسکے اندر آ گئی تھی جس سے عبداللہ عباس صاحب کے تبصرے کی فی الجملہ تائید

اور اُن پر یکجہتی کا اظہار ہو۔ مولانا جیسی معتبر اور معتمد دینی شخصیت کی طرف سے اس حیرت انگیز رویّے کا اظہار ظاہر ہے کہ کوئی نظر انداز کی جانے والی چیز نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ اس پر اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا گیا اور اسکی بھی ضرورت سمجھی گئی کہ اس رویّے کی تہ میں کام کرنے والے اسباب کی کھوج لگائی جائے۔ اس کھوج میں مذکورہ مضمون کے تجزیے، مضمون سے باہر کے کچھ واقعات کی شہادت اور مولانا کی بعض تحریروں پر نظر نے ہمیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ عبداللہ عباس صاحب کے جن خیالات کی تردید سے مولانائے محترم گریزاں ہیں وہ بظاہر خود اُن کے بھی خیالات ہیں۔ فرق اگر ہوگا ___ اور غالباً ضرور ہوگا ___ تو وہ تعبیر و تفصیل کا ہوگا۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ امت مسلمہ کے اندر تنقید واحتساب کے عمل کی جو ضرورت واہمیت بلکہ عزت وعظمت خود مولانا مدظلہ کی مذکورۂ بالا تحریر سے ثابت ہوتی ہے، اسکے بعد ہماری مذکورہ تنقید پر صرف تنقید ہونے کی حیثیت سے چیں بجبیں ہونے کا کس کو حق ہے، ہاں جس چیز کا حق ہے اور جو چیز مولانا کی اس تحریر کی روشنی میں معقول ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یا تو ثابت کیا جائے کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے اُن خیالات کی تردید فرمائی ہے جن کی تردید کی ضرورت کی طرف مولانا کو توجہ دلائی گئی تھی. اور مولانا نے اس ضرورت سے انکار بھی نہیں فرمایا. یا پھر یہ ثابت کیا جائے کہ مولانا کے تردید نہ فرمانے (بلکہ ایک خاص انداز سے تائید وحمایت فرمانے) سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ یہ تبصرہ مولانا کے خود اپنے جذبات وخیالات سے ہم آہنگ بلکہ انہی کی ترجمانی تھا. اور یہ کہ اس نتیجے کے سلسلے میں جن دلائل اور شواہد وقرائن سے مدد لی گئی ہے وہ ناکافی یا بے بنیاد ہیں۔ الفرقان بابت مئی وجون ۹۲ء کی اشاعت تھی، کے بعد ندوہ اور بیرون ندوہ ہر میدان میں۔ مولانا کے دست راست، اُنکے بھانجے اور میرے قدیم دوست مولانا سید محمد رابع ندوی سے اس معاملے میں تقریباً تیس صفحات پر مشتمل خط وکتابت ہوئی مولانا رابع صاحب کی سب سے بڑی شکایت یہی تھی کہ عبداللہ عباس صاحب کو جو کچھ کہنا تھا کہتے خالِ معظم کو اس معاملے میں کیوں گھسیٹا گیا؟ شکایت کے جواب میں ایک مختصر بات یہی لکھی گئی تھی ......

"اُس باب میں شکایت اور خفگی کی واحد معقول صورت یہ ہے کہ جو اسباب اس جرأت وجسارت (یعنی تنقید) کے بنائے گئے ہیں اُن کا بے بنیاد یا ناکافی ہونا ظاہر کیا جائے یا (کم از کم) طرزِ کلام کا قابلِ اعتراض ہونا..."

ایک اور اہم بات

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے کہ جہاں تک عبداللہ عباس صاحب کے اُن خیالات کا تعلق ہے جنکی اہلسنت کے نقطۂ نظر سے سنگینی کی طرف مولانا علی میاں صاحب کو توجہ دلائی گئی، اور جن کے سلسلے میں یہ ساری بحث ہے، اُن خیالات کے سلسلے میں خود ندوے کے حلقے میں بھی سوائے حضرت مولانا علی میاں صاحب کے کوئی ایک آدمی ہمیں نہیں معلوم جو ان خیالات سے براءت اور بیزاری میں تأمل کرتا ہو۔ حد یہ ہے کہ خود عبداللہ عباس صاحب نے ایک چیختی چلاتی وضاحت کے ذریعے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان خیالات سے رجوع کر چکے ہیں اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مولانا علی میاں صاحب کو ان خیالات سے براءت اور بیزاری کے ہلکے سے ہلکے اظہار میں بھی جو تأمل رہا۔ اسکی وجہ اگر یہ نہ سمجھی جائے کہ مولانا ان خیالات کو غلط ہی نہیں سمجھتے تو پھر اُنکے رویّے اور انکے موقف کی توجیہہ کیلئے کیا اسکے سوا کوئی دوسری صورت رہ جاتی ہے کہ وہ غلط سمجھتے ہوئے بھی اور یہ مانتے ہوئے بھی کہ اہلِ سنت کے نقطۂ نظر سے ایسے خیالات قطعاً ناقابلِ قبول ہیں اُنکی تردید تو کیا، ان سے براءت بھی اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے؟ اگر کوئی تیسری صورت بھی اس معاملے کی توجیہہ میں نکالنا ممکن ہے تو لوگ ہمیں بتائیں۔ ورنہ غور کریں کہ ہماری اختیار کردہ توجیہہ بہتر ہے جس میں مولانا بہر حال ایک صاحبِ ضمیر انسان رہتے ہیں؟ یا وہ دوسری توجیہہ جو اسے ترک کرنے کی شکل میں اختیار کرنا پڑے گی؟ یعنی یہ کہ مولانا پورے عقیدۂ اہلِ سنت کے ساتھ علمائے اہلِ سنت میں ہوتے ہوئے بھی، کسی وجہ سے اسکے لئے تیار نہیں ہیں کہ اُنکے زیرِ انتظام ادارے کے اندر ایک ذی منصب شخص کے قلم سے ادارے کے پرچے میں عقیدۂ اہلِ سنت کے سو فی صد خلاف جو اظہارِ خیال ہوا اُسکی تردید یا کم از کم اُس سے براءت و بیزاری کا اظہار فرمائیں! ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ دوسری صورت پہلی سے بدتر ہے۔ یہ بات کہ مولانا کا ایک خاص مزاج ہے کہ وہ ردّ و تردید کا پیرایہ پسند نہیں کرتے۔ تو اولاً تو راقم کی کتاب کے سلسلے میں مولانا نے اس سے پوری طرح مختلف مزاج کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ ثانیاً یہ عذر اور کسی دائرے میں معقول بلکہ محمود بھی ہوسکتا ہے لیکن دین و شریعت اور خاص کر اعتقادی معاملات میں مولانا جیسی پوزیشن کے حضرات کیلئے یہ عذر ذرا بھی قابلِ قبول نہیں۔ کوئی اس کا جواز نہیں بتا سکتا۔ اور مسائل کسی بڑے کیلئے بدلتے نہیں بلکہ اور زیادہ سخت ہوجایا

جو لوگ مولانا (علی میاں) کے مضمون (تعمیرِ حیات ۲۵ راپریل ۹۲ء) پر ہمارے معروضات سے رنجیدہ ہوئے ہیں، اُن سے مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے اس مضمون پر جو کچھ لکھا وہ واقعے میں بہت کم لکھا، ورنہ صورت بقول علامہ اقبال[1] یہ بھی کہ ؎

سنائی کے ادب سے میں نے غوّاصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی (تھے) لاکھوں لولوئے لالا

مولانا کا مضمون اس شکایت پر لکھا گیا تھا کہ راقم کی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر تعمیرِ حیات کے تبصرے میں کربلا کے سانحے کو بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا نتیجہ اور بالخصوص غزوۂ بدر میں شکست کا انتقام بایں طور بتایا گیا ہے کہ:-

"غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقے کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا، اسکے سربراہ ابوسفیان تھے اسی طرح غزوۂ اُحد میں اُن کا اور انکی اہلیہ جگر خوارِ حمزہ ہند کا کردار یہ سب باتیں وہ ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے[2] اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔ حضرت ابوسفیان نے احتجاج کیا تھا کہ اب وہ دن آگیا ہے کہ پسماندہ ہم اشرف پر فوقیت دیئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف حضرت علی کو اکسانے کی کوشش بھی اُن سے ثابت ہے"۔

"اسلام کے پورے طور پر فاتح ہوجانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہوگئی

[1] بادنیٰ تصرّف۔

[2] اس دعوے کی حقیقت الفرقان اشاعتِ خاص مئی و جون ۹۲ء میں بتائی جاچکی ہے۔

تھیں، اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ
میں نہیں ملتا، مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کی شکست کا غم و غصہ آج تک
موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر
بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی
خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی ذات سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا؛

یعنی بدر کے انتقام کے جذبے کی جو آگ ابوسفیان و ہند اور اُن کی آل اولاد کے دلوں میں
بھڑکتی رہی تھی وہ خاندانِ بنوامیہ سے تعلق رکھنے والے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلافت مل جانے پر
اسلام کے حق میں تو ٹھنڈی پڑ گئی مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے حق میں یہ (معاذ اللہ)
جوں کی توں بھڑکتی رہی حتیٰ کہ ابوسفیان اور ہند کے پوتے یزید کو موقع ملا کہ وہ نسلاً بعد نسل منتقل ہونے والی
اپنے سینے کی اس آگ کو سبطِ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خون سے بجھائے۔

اس شکایت پر مولانا نے جیسا کہ بعض عقیدتمند حضرات کو جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ: "ہمیں
افسوس ہے کہ مولوی عبید اللہ صاحب کے مضمون میں بعض ٹکڑے ایسے آگئے ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا
اندیشہ ہے، حالانکہ ان کی نیت ایسی نہ ہوگی۔ اب ان شاء اللہ کوئی ایسا مضمون شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے گا
جس سے صحابہ کرام کے بارے میں اہل سنت کے مسلک اور عقیدہ کا اظہار ہو"[1] لیکن اسکے مطابق اپنے مضمون
(مجریہ ۲۵ اپریل) میں تبصرہ نگار کے کھلے رافضانہ خیالات سے کسی براءت و بے تعلقی یا اُن کی تردید و مذمت
کے بجائے صحابۂ کرام کے بارے میں بانیان و کارکنان و ذمہ دارانِ ندوہ (جن میں تبصرہ نگار مولوی
عبید اللہ عباس صاحب بھی لازماً شامل تھے) کا عقیدہ (مطابق عقیدۂ اہلسنت) بیان کرکے اور مزید برآں

---

[1] مکتوب بنام چودھری علی مبارک صاحب مؤرخہ ۱۲ رمضان ۱۴۱۲ھ

---

[2] خدا معلوم وہ کون سا اسلام ہو سکتا ہے کہ آدمی اس سے راضی ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن!

صحابۂ کرام کے سیر و سوانح کی تحریری نشر و اشاعت میں اکابر ندوہ اور فضلاء ندوہ کا قابلِ فخر حصہ
یاد دلا کر بالفاظ دیگر یہ اعلان کیا کہ مولوی عبد اللہ صاحب نے "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے تبصرے
میں جو کچھ بھی لکھا ہو اس سے نہ اُن کے عقیدے کے بارے میں کسی وسوسے کی ضرورت ہے اور نہ ندوے سے
اُن کے ذمہ دارانہ تعلق کی بنا پر ندوے کے لئے کسی پریشانی کی، لیکن اسکے برعکس تبصرہ نگار نے زیر تبصرہ کتاب
اور اسکے مصنف کے خیالات میں جو عیب محسوس کر کے اپنے قارئین کو بتائے تھے اُن سے بیزاری اور اُن کی
تردید و تنقید مولانا نے اپنے اسی مضمون میں ضروری خیال فرمائی اور ایسا انداز اس ضرورت کی ادائیگی
کیلئے اختیار فرمایا جیسے کسی بدعقیدگی کی تردید اور اسکے مقابلے میں صحیح عقیدے کا بیان کیا جا رہا ہو۔ اور
اس میں بھی کہا جا سکتا تھا کہ کوئی مضائقہ نہیں، ایک اندازِ بیان ہی تو ہے۔ مگر بے ادبی کی معافی چاہتے
ہوئے یہ عرض کرنا ناگزیر ہے کہ مضمون کے اس حصے میں حضرت مولانا نے بھی کتاب اور اسکے مصنف کے
فکر سے اختلاف فرمانے میں اس حد تک غلو کو راہ دیدی ہے کہ اُن کے ارشادات اسلامی آداب سے بھی
ٹکرائے ہیں اور اسلامی عقیدے سے بھی (اسے آپ اہلِ سنت کا ادب اور اہلِ سنت کا عقیدہ بھی کہہ سکتے ہیں)

مولانا کے ارشادات پر ایک نظر

اہل سنت کا بے شک اب تک اتفاق ہی رہا ہے کہ خلافت راشدہ کا دور حضرت علی رضی اللہ عنہ
پر ختم ہو گیا لیکن کیا اس موقف کو بیان کرنے میں اہل سنت نے یہ کہنا بھی ضروری یا صحیح سمجھا ہے کہ
"حضرت معاویہؓ کی حکومت خلافتِ راشدہ نہیں تھی"۔ اس راقم کے اور حضرت مولانا کے علم کا کیا مقابلہ
وہ اُن کے خوشہ چینیوں کی صف میں ہے لیکن جب یہ کہنے سے کہ خلافت راشدہ کا دور حضرت علیؓ پر ختم ہو گیا
حضرت معاویہ کا دورِ خلافت آپ سے آپ خلافتِ راشدہ کے زمرے سے نکل جاتا ہے تو پھر صراحۃً یہ بھی
کہنا کہ "اُن کی حکومت خلافتِ راشدہ نہیں تھی"، کیونکر ایک صحابی کی محض تنقیص نہ سمجھی جائے گی؟
اور کیونکر اس پیرایۂ بیان کو مذاقِ اہلِ سنت کے مطابق سمجھا جا سکے گا؟ مزید برآں جب اس سلسلے

ضرت شاہ ولی اللہ کی تحقیق کا حوالہ دیا جائے گا جیسا کہ دیا گیا ہے تو پھر اس حقیقت کو کیسے
ندازکیا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے تو خلافت راشدہ کے معیاری دور کو (جسے وہ
لافت خاصہ منتظمہ" کہتے ہیں) حضرت عثمانؓ پر ختم کر دیا ہے۔ اور اس کے بعد حضرت علی اور حضرت
اویہ کا تقابلاً ذکر کر کے جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اس معیاری خلافت کے بعض اوصاف
ن میں سے ایک میں تھے۔ اور بعض دوسرے میں، تمام ضروری اوصاف کا جامع ان دونوں میں سے
ئی نہیں تھا۔ ایک میں سابقیت اسلام کے فضائل اور سابقین اوّلین والا مزاج اور مذاق تھا۔
خلافت خاصہ کیلئے شرط ہے۔ دوسرے میں قیادت اور نظم مملکت کیلئے مطلوب اوصاف تھے، جو
خلافت منتظمہ" کی شرط ہیں۔ — ازالۃ الخفاء حصہ اول کی فصل پنجم میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

باید دانست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
در احادیث متواتر بالمعنیٰ افادہ فرمودند
کہ حضرت عثمان مقتول خواہد شد و نزدیک
بقتل او فتنۂ عظیمہ خواہد برخاست کہ
تغیر اوضاع در رسوم مردم کند و بلائے
آں مستطیر باشد زمانے کہ پیش از اں
فتنہ است آنرا باوصاف مدح ستودند
و مابعد آنرا باصناف ذم نکوہیدند،

جاننا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
چند در چند ایسی حدیثوں میں جو کہ معناً متواتر
ہیں ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت عثمان شہید
ہونگے اور انکی شہادت کے دنوں میں ایسا
عظیم فتنہ برپا ہوگا کہ لوگوں کے احوال و عادات
بدل ڈالے گا۔ اور اسکی مصیبت ہمہ گیر ہوگی۔
نیز آپ نے اس فتنے سے پہلے کے زمانے کو
اچھے الفاظ سے یاد فرمایا اور اس سے

واستقصاء نمودند در بیانِ آں فتنہ
تا آنکہ مطابقتِ موصوف بر آنچہ واقع
شد بر ہیچ خردے مخفی نماند و بابلغ بیان
واضح ساختند کہ انتظام خلافتِ خاصہ
بآں فتنہ منقطع خواہد شد و برکاتِ ایام
نبوت روئے باختفا خواہد آورد و ایں
معنیٰ را تا بحدّے ایضاح کردند کہ پردہ
از روئے کار برخاست و حجۃ اللہ بثبوت
آں خبر در خارج متحقق گشت بآں وجہ
کہ حضرت مرتضیٰ با وجود رسوخِ قدم
در سوابق اسلامیہ و در خورِ اوصافِ
خلافتِ خاصہ و انعقاد بیعت برائے
او و وجوبِ انقیاد رعیت فی حکم اللہ
بنسبت او متمکن نہ شد در خلافت و در
اقطار ارض حکم او نافذ نہ گشت و تمام
مسلمین تحتِ حکم او سر فرود نیاوردند و جہاد
در زمان وے رضی اللہ عنہ بالکلیہ منقطع
شد و افتراقِ کلمۂ مسلمین بظہور پیوست
و ایتلافِ ایشاں رخت بعدم کشید و
مردم بحروب عظیمہ باہم پیش آمدند و دستِ
او را از تصرف ملک کوتاہ ساختند

بعد سے زمانے کو مذموم بتایا۔ اور اس فتنے کے
بیان میں اسقدر وضاحت فرمائی اور اس کا
کوئی پہلو بیان سے نہ چھوڑا تا کہ کسی شخص کو بھی
اسکے بارے میں اشتباہ کا موقع نہ رہے۔ نیز
نہایت صریح الفاظ میں فرمایا کہ اس فتنے
کی آمد سے خلافت خاصہ (راشدہ) کا
نظام درہم برہم ہوگا اور زمانۂ نبوّت
کی برکتیں (جن کا اس دور میں بھی سلسلہ
قائم تھا) اُٹھ جائیں گی — یہ بات
آپ نے اسقدر وضاحت سے فرمائی کہ
معاملے کا کوئی پہلو مخفی نہ رہا اور پھر آپ کی
اس خبر کے خارج میں مطابق واقعہ ثابت
ہونے سے اللہ کی حجّت (آپ کی صداقت
پر) قائم ہوگئی بایں طور کہ حضرت علی مرتضیٰ
میں باوجودیکہ خلافت خاصہ کے
بھرپور اوصاف پائے جاتے تھے اور سابقیت
اسلام والے فضائل میں آپ کا پایہ بہت
اونچا تھا، اور آپ کیلئے بیعت کا انعقاد
اور رعیت پر آپ کی اطاعت کا وجوب
بھی ہوا مگر آپ کی خلافت مضبوطی سے
قائم نہ ہو سکی۔ آپ کا حکم پوری مملکت

وہر روز دائرہ سلطنت لاسیما بعد تحکیم تنگ ترشدن گرفت تا آنکہ در آخر بجز کوفہ و ماحول آں برائے ایشاں صافی نماند وہر چند ایں خللہا در صفات کاملہ نفسانیۂ ایشاں خللے نینداخت لیکن مقاصدِ خلافت علیٰ وجہہا متحقق نگشت وبعد حضرت مرتضیٰ چوں معاویہ بن ابی سفیان متمکن شد و اتفاق ناس بروے بحصول پیوست وفرقتِ جماعہ مسلمین از میان برخاست وے سوابق اسلامیہ نداشت ولوازمِ خلافت خاصہ در وے متحقق نبود وبعد ازاں بادشاہان دیگر از مرکز حق دور تر اُفتا بخفی الیس خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بانقطاع خلافتِ خاصہ منتظمہ نافذہ ازیں جہت متحقق گشت۔[۲]

میں نافذ نہ ہو پایا سب کے سب مسلمانوں نے آپ کے حکم کے آگے سر نہیں جھکایا، آپ کے زمانے میں جہاد بالکل منقطع ہو گیا۔ مسلمانوں میں افتراق رونما ہوا اور اتحاد راہئ عدم، لوگوں نے بڑی بڑی جنگوں کی شکل میں آپ کا مقابلہ کیا۔ اور آپ کا دائرۂ سلطنت ہر روز، خاص کر تحکیم کے بعد[۱] تنگ سے تنگ تر ہوتا گیا حتیٰ کہ سوائے کوفہ اور اسکے اِرد گِرد کے اور کوئی حصۂ سلطنت آپ کے لئے صافی نہ رہ گیا۔

ہر چند کہ ان باتوں سے آپ کے ذاتی صفات اور کمالات پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن خلافت کے مقاصد بہر حال اچھی طرح پورے نہ ہو پائے اور پھر حضرت مرتضیٰ کے بعد جب معاویہ بن ابی سفیان تختِ خلافت پر متمکن ہوئے اور اُن پر لوگوں کا اتفاق ہو، اور اُمّت مسلمہ کا تفرقہ مٹ گیا تو کمی یہ رہی کہ وہ سوابقِ اسلامیہ کے

[۱] "تحکیم" سے اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جس میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان صفین جنگ اس قرارداد پر رُک گئی کہ دو پنچ (حَکَم) فیصلہ کریں گے۔

حامل نہ تھے اور خلافت خاصہ کے خصوصی ثمرات انکے ان میں نہ پائے جاتے تھے۔ انکے بعد جو دوسرے بادشاہ آئے وہ جیسا کہ معلوم ہے مرکزِ حق سے دور تر ہوتے گئے لہٰذا اس طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خبر جو آپ نے خلافت خاصہ منتظمہ و نافذہ کے (حضرت عثمان کے ساتھ) منقطع ہو جانے کی دی تھی وہ حقیقت واقعی بن گئی۔

اور مان لیا جائے کہ بے ضرورت یہ کہنا بھی مذاقِ اہلِ سنت کے اعتبار سے روا ہے کہ حضرت معاویہؓ خلیفۂ راشد نہیں تھے[۱] تب بھی یہ کوئی عقیدے سے تعلق رکھنے والی چیز تو بہر حال نہیں ہو سکتی۔ پھر حضرت مولانا نے جو اسکو اس طرح اپنے مضمون میں درج فرمایا ہے کہ ایک عام آدمی اسے عدالتِ صحابہ جیسا واجب الاعتقاد معاملہ سمجھ لے اور اپنے عقیدے کا جزو بنانے پر مجبور ہو یہ تو اُن کیلئے نظرِ ثانی فرمانے والی بات ہے۔

اسی طرح یزید بن معاویہؓ کے بارے میں "گروہِ اہلِ سنت" کا جو موقف مولانا نے بیان فرمایا ہے اس میں بھی سب سے پہلے نمبر پر محسوس ہونے والی بات یہی ہے کہ اسے جس طرح اور جس سیاق و سباق میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اُسے ایک عامی آدمی کی نظر میں ایک عقیدے کی چیز بناتا ہے یعنی یہ کہ جیسے ایک سُنّی مسلمان کو یزید کی بُرائی پر عقیدہ رکھنا لازم ہے۔ حالانکہ مولانا جب "گروہِ اہلِ سنت" کے اس موقف کو "معتبر تاریخ و سیر کی روشنی" پر مبنی قرار دیتے ہیں تو کوئی سوال ہی نہیں رہتا کہ یہ عقیدے کی چیز ہے۔ اور ہر آدمی کا حق ہی نہیں بلکہ یہ اُس کا دینی اور اخلاقی فرض نہ ٹھہرے کہ وہ یزید بن معاویہؓ کو ویسا سمجھے جیسے کہ وہ اسکے اپنے

[۱] جتنے کچھ الفاظ کا حوالہ شاہ ولی اللہ صاحب کے یہاں بھی دیا جا سکتا ہے مگر ان کے یہاں موقع و محل میں صاف طور بے ضرورت پائی جاتی ہے، اسے بے ضرورت نہیں کہا جا سکتا۔

(یا علم تاریخ کے اعتبار سے اُسکے کسی معتمد کے) مطالعۂ تاریخ وسیر کی روشنی میں نظر آتے ہوں. ورنہ اس معاملے میں اندھی تقلید مزاجًا اُسی طرح کی تقلید ہوگی جیسی تقلید کو قرآن مجید میں اِن الفاظ ذکر کیا گیا ہے کہ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳) (ہم نے بپ باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا تھا اور ہم انھیں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں)

مزید برآں اِس ذیل میں حضرت مولانا نے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا جو حوالہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہی رائے اُن کی ہے. اور یہ کہ انھوں نے سخت الفاظ میں یزید کی مذمّت کی ہے. سو یہ نہایت حیران کن ہے. فتاویٰ ابن تیمیہؒ جلد ۴ صفحہ ۴۸۷ جس کا حوالہ اس سلسلے میں دیا گیا ہے ہمیں کہیں اس میں سخت مذمّت کے الفاظ نہیں مل سکے. اور یہ تلاش ہم نے اس بنا پر کی کہ یزید بن معاویہؓ سے متعلق امام ابن تیمیہؒ کا سب سے زیادہ مفصل اور مبسوط اظہار خیال اُن کی معرکۃ الآرا کتاب منہاج السنّۃ میں پایا جاتا ہے جسے راقم نے اپنی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کی تصنیف کے زمانے میں اچھی طرح پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی. اور اُس مطالعے کی رو سے مولانا کا یہ بیان بہت چونکانے والا تھا کہ ابن تیمیہؒ نے کہیں یزید کی سخت الفاظ میں مذمّت بھی کی ہے. اور یہ کہ وہ بھی اُنھیں علمائے اہلِ سنت کے ہم خیال ہیں جو یزید بن معاویہؓ کو صرف برائی سے یاد کئے جانے کا مستحق جانتے ہیں. فتاویٰ کی جلد ۴ کا صفحہ ۴۸۷ اس جلد کے ۶ صفحوں کی اُس پوری بحث (فصل) کا ایک صفحہ ہے جس میں یزید ہی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے نہ اس صفحے میں اور نہ ہی کسی اور صفحے میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کو سخت مذمّت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاسکے. اسکے برعکس بالکل منہاج السنّہ کے اس بیان کے مطابق جس کو راقم نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے اس میں بھی دونوں انتہا پسندیوں سے اختلاف کرکے (جس میں سے ایک کے مطابق یزید ولی کامل تھے اور دوسرے کے مطابق مجسّم شیطان) اعتدال پسندی کی حمایت کی ہے. بلکہ اس ذیل میں انکے یہ الفاظ یاد رکھنے کے ہیں کہ :-

وبلغنی ایضًا انّ جدّنا ابا عبد اللہ	اور مجھے یہ بات بھی پہنچی ہے کہ ہمارے اجداد
بن تیمیہ سئل عن یزید فقال:	میں سے ابوعبداللہ بن تیمیہؒ سے یزید کے بارے میں

لا تنقص ولا تزید. وھٰذا اعدل	پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ اُنکے
الاقوال فیہ وفی امثالہ واحسنھا.	نہ گھٹاؤ نہ بڑھاؤ. اور یہ (میرے نزدیک)
(فتاویٰ ج ۴ صفحہ ۴۸۳)	یزید بن معاویہؓ اور اُن جیسے دوسرے لوگوں
	کے سلسلے میں سب سے بہتر اور سب سے متوازن بات ہے

واقعہ میں اور حضرت مولانا کے بیان میں اتنا بڑا اختلاف دیکھ کر ہمارے نزدیک یہ بات یقینی سی ہوئی جاتی ہے کہ مولانا اپنے مضامین اور تصانیف کی تسوید میں مواد تلاش کرنے اور حوالے نکالنے کا کام جن حضرات سے لیتے ہیں (اور یہ ہمیں معلوم ہے کہ ایک عرصے سے مولانا کا معمول ہے) یہ چوک اُن میں سے کسی کی نظر کی ہے. اور اس طرح کی چوک کی کئی ایک مثالیں مولانا کی کتاب "المرتضیٰ" میں ہماری نظر سے گزری ہیں. ورنہ مولانا سے ایسے خلاف واقعہ بیان کا تو تصور ہی کیا، ایسی چوک کا بھی تصور آسان نہیں. مولانا نے فتاویٰ کی یہ فصل اگر خود ملاحظہ فرمائی ہوتی تو مزید یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس چیز کو کیسے نظر انداز فرما سکتے تھے. شیخ الاسلام نے اس فصل کا آغاز یزید کے بارے میں جس انتہا پسندی کے بیان سے کیا ہے وہ بعینہٖ وہی نقطۂ نظر ہے جسے تعمیر حیات کے تبصرہ نگار نے واقعہ کربلا کا حقیقی پس منظر بتایا تھا یعنی غزوۂ بدر کے وقت سے چلا آرہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بنو امیہ کا انتقامی جذبہ جس کی آگ یزید کے سینے میں بھی بھڑک رہی تھی. شیخ الاسلام نے اس انتہا پسندی کا بیان کرکے فرمایا کہ :-

وھٰذا القول سھل علی الرافضۃ	اور یہ قول رافضیوں کیلئے بلاشبہ آسان
الذین یکفرون ابابکر وعمر وعثمان	ہے جو کہ ابوبکر و عمر اور عثمان کی تکفیر کیا کرتے
فتکفیر یزید اسھل بکثیر.	ہیں پھر یزید کی تکفیر تو اس سے کہیں زیادہ
(صفحہ ۴۸۲)	آسان ہے.

اسکے بعد مولانا نے جو تیسری بات فرمائی وہ اس سے بھی زیادہ حیران کن اور پریشان کن ہے فرمایا کہ:

"اسکے نتیجے میں اور اس پس منظر میں (یعنی یزید کے بارے میں جو گروہ اہلِ سنّت" کی رائے ہے اسکے نتیجے اور پس منظر میں. ع) محققین اہلِ سنّت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو

درست سمجھتے ہیں جو انھوں نے یزید کے معاملے اور مقابلے میں اختیار کیا اور اُن کو برسرِصواب، شہیدِ راہِ حق اور اُمّت کیلئے ایک نمونہ پیش کرنے والا باور کرتے ہیں۔

اگر ایک بھی جمائی حکومت کے نمایات جس کا حاکم و فرماں روا مسلمان ہو، لیکن اُسکی سیرت غیر اسلامی، اسکے اخلاق وعادات قابلِ تنقید ہوں اور اس سے مسلمانوں کے اخلاق اور اسلامی معاشرے پر برے اثرات پڑنے کا اندیشہ ہو کسی قسم کا اقدام خروج وبغاوت اور انتشار انگیزی کے مرادف قرار دیدیا جائے تو پھر خاندانِ سادات ہی کے ان تین صاحبِ عزیمت افراد، زید شہید، محمد ذوالنفس الزکیہ اور اُنکے بھائی ابراہیم بن عبداللہ المحض کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی جن میں سے اوّل الذکر نے اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک بن مروان اور دو آخر الذکر حضرات نے خلیفہ منصور عباسی کے مقابلے میں علمِ جہاد بلند کیا جو بہر حال یزید سے غنیمت اور کہیں بہتر تھے"!

یزید سے متعلق حضرت مولانا کے ارشادات، جن کا تذکرہ ابھی گزرا، اور حضرت حسینؓ کے اقدام بمقابلہ یزید سے متعلق یہ اقتباس سامنے آجانے کے بعد راقم کے ظاہر کردہ اس خیال کے حقیقت ہوتے ہیں غالباً کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت مولانا نے اپنے مضمون میں تعبیرِ حیات کے تبصرہ نگار کے عقائد کی طرف سے صفائی دینے کے بعد ان چیزوں کی تردید کی طرف توجہ فرمائی ہے جو تبصرہ نگار نے زیرِ تبصرہ کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کی طرف بطور عیب منسوب کی تھیں۔

ہر چند کہ حضرت مولانا کی یہ توجہ تردید کے انداز میں ہے اور اس لئے کوئی مسرّت کی بات نہیں۔ تاہم اہمیت کی بات ضرور ہے کہ ایک کتاب کسی بھی انداز میں سہی اس قدر توجہ کی مستحق مولانا کی نظر میں قرار پائے لیکن افسوس (اور سخت پریشانی) ہے کہ حضرت مولانا کی اس توجہ نے ہمیں بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ تبصرہ نگار نے اولاً اپنے تبصرے کے ذریعہ اور ثانیاً اپنی "وضاحت" کے ذریعے اپنے آپ کو جس سطح کا ثابت کیا اسکی بنا پر ہمیں اُن سے کوئی شکایت نہیں تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ [illegible] کہ مصنف [illegible] تھے نہ ہو بلکہ اس وقت کے بعض صحابۂ کرام

[illegible] فرمایا بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے انداز سے کہی (مصنف اسے صرف نقل کرنے کا گنہگار ہے) اسکے بارے میں تزلہ عزیب مصنف پر کیوں گرایا گیا؟ اگر نقل کرنا بھی گناہ تھا تو اصل کہنے والے کے "گناہ" سے تو بہر حال کم ہی ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم حیران ہیں کہ مولانا نے بھی اپنے لئے وہی بات جائز سمجھی! بلکہ اُس سے بھی کچھ آگے کی بات کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نام وہ اس سے پہلے یزید کی بابت گفتگو میں اس طور سے لے آئے ہیں جس سے لازمی طور پر تأثر ہوتا ہے کہ از کم ابن تیمیہ اُن لوگوں میں نہیں ہو سکتے جنھوں نے حضرت حسینؓ کے اقدام کے بارے میں حضرت مولانا کے بیان کردہ مسلک اہلِ سنت سے کچھ مختلف رائے ظاہر کی ہو۔ اور یہ بات اصل حقیقت اور واقعے سے کتنی دور ہے، اسے ہر وہ شخص خود معلوم کر سکتا ہے جو شیخ کی کتاب منہاج السنہ جلد دوم کے صفحات ۲۴۲ تا ۲۴۵ کا مطالعہ کر سکے۔ یا اس کے اقتباسات کے سلسلے میں راقم کی کتاب پر اعتماد کر سکے۔

دوسری بات اس سلسلے میں ہماری پریشانی کی یہ ہے کہ کیسے یہ کہنے سے باز رہیں کہ حضرت مولانا کے مذکورہ بالا اقتباس سے جو اُن کا یہ موقف ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ وقت اور حکومتِ وقت (یعنی مسلم حکومت وقت) کے خلاف اقدامِ خروج کرنے والے حضرات اگر "خاندانِ سادات" سے ہوں تو اُن کے خروج کو "خروج" نہیں کہا جا سکتا، سو یہ موقف تو جبھی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جبکہ ہم خاندانِ سادات سے متعلق رکھنے والے حضرات کو نہ صرف معزز و محترم ہی مانیں بلکہ شیعہ حضرات کے بارہ معصومین کے مقابلے میں ان سب ہی کو بلا تحدید معصوم مان لیں یا کم از کم قانون سے بالاتر۔ ورنہ یہ تو حضرت مولانا پر بھی مخفی نہیں ہو سکتا کہ اس مقابلے کا قانون، جسے اہلِ سنت نے غیر معمولی اہمیت کا حامل قرار دے کر قانونِ عقائد کے زمرے میں شامل کر دیا ہے وہ تو بلا کسی استثناء کے ہم سے یہ اقرار کراتا ہے کہ:-

ولا نری الخروج علیٰ ائمتنا وولاۃ امورنا، وان جاروا، ولا ندعوا علیھم ولا ننزع یداً من طاعتھم ونری طاعتھم من طاعۃ اللہ عزّوجلّ	اور (یہ کہ) ہم اپنے ائمہ اور حکّام کے خلاف خروج (مسلح اقدام) کو جائز نہیں جانتے، گرچہ وہ ظلم یا انحراف کریں۔ اور ہم ان کیلئے بددعا بھی نہیں کرتے۔ نہ انکی اطاعت سے دستکشی جائز

فریضۃً، مالم یأمروا بمعصیۃٍ، وندعوا لھم بالصلاح والمعافاۃ۔[1]

رکھتے ہیں، بلکہ انکی طاعت کو اللہ عزوجل کی طاعت کے قبیل سے فریضہ جانتے ہیں جب تک وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں اور ان کیلئے صلاح و فلاح کی دعا کرتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ مولانا کا موقف فی الواقع وہ نہیں ہو سکتا جو اُن کے الفاظ "تو پھر خاندانِ …دات ہی کے اِن تین صاحبِ عزیمت افراد الخ ...." سے ظاہر ہو رہا ہے اور جو ایک نہیں کئی ایک ستی …دوں سے ٹکرا رہا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اس بارے میں وضاحت فرمادی جائے۔ اور اسی ضمن … ذرا اس پر بھی غور کر لیا جائے کہ ایک مسلم حکومتِ وقت کے خلاف اقدام ہر حالت میں "خروج" ہوتا ہو[2] …ہوتا ہو، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو صحیح اور دعوے سے بھی آگے بڑھا کر جب "اُمت کیلئے ایک …نہ عمل" باور کئے جانے کو بھی کہا جائے گا تو لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ آپ کے عمل کے کون سے حصے کو اُمت اپنے لئے …نہ سمجھے۔ ابتدائی حصہ جس میں اقدام نظر آتا ہے۔ یا انتہائی حصہ جس میں اقدام سے دستکشی ہے اور ٹکراؤ سے بچنے کی ہر ممکن سعی؟

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ (اور حضرت نانوتویؒ) کا مسلک

حضرت معاویہؓ، یزید بن معاویہ اور حضرت حسینؓ کے سلسلے میں محقق و معتبر علماءِ اہلِ سنت کی بات چلی ہے تو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے مسلک اور اُن کے اُن مکتوبات پر بھی کچھ ضروری گفتگو نہیں ہو جاتی چاہئے جنکے پیچھے تعمیرِ حیات کے تبصرہ نگار نے چھپنے کی اور ہمارے لئے اُن کے حوالے سے مشکل پیدا کرنے کی کچھ ایسی ہی کوشش کی جیسے ایک ڈوبنے والے کے ذکر میں قرآن پاک کے اندر آتا ہے کہ حَتّٰی اِذَا اَدْرَکَہُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِہٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے ہی لگا تو بولا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ وہی اللہ معبودِ برحق ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان

[1] عقیدۂ طحاویہ کی دفعہ ۷۲، شرح العقیدۃ الطحاویہ، مطبوعہ المکتب الاسلامی دمشق و بیروت ص۳۷۳

[2] جیسا کہ عقیدۂ طحاویہ کے اقتباس بالا میں نظر آتا ہے۔ امام ابن تیمیہ وغیرہ کہتے ہیں۔ اس ضمن میں **ازالۃ الخفاء کی فصل اول کا آخری پیراگراف (مسلک ششم)** بھی دیکھ لیا جانا مناسب ہے۔

لے ص ۳۱ جلد نمبر ۱

رکھتے ہیں۔ (سورہ نساء آیت نمبر ۹۰)

اللہ کی شان تو دیکھئے کہ جہاں ہمیشہ سے امام ابن تیمیہؒ کی "شیخ الاسلامی" چلتی آرہی تھی۔ اور انھیں کی بات بالا و برتر رہا کرتی تھی وہاں ایک دم سے حالات نے تحویلِ قبلہ کی ضرورت پیدا کی تو یہ شیخ الاسلامی ہمارے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سر کی زینت بن گئی جن کی ہم نے وہاں کبھی کم از کم اس درجے کی پوچھ تاچھ تو نہ دیکھی تھی کہ شیخ الاسلام کے لقب سے نام لیا جائے۔ حضرت مدنیؒ کے مکتوبات جو "مکتوبات شیخ الاسلام" کے نام سے چار جلدوں میں چھپے ہیں، اُن کی پہلی جلد میں مکتوب ۸۸ اور ۸۹ حضرت کے ایک مسترشد مولانا ابوالحسن حیدری غازی پوری کے ایک سوال کے جواب میں ہیں۔ مکتوبات کے مرتب نے مکتوب ۸۸ کے حاشیے پر اس سوال کا خلاصہ جس کے جواب میں مکتوب لکھا گیا ہے ان الفاظ میں درج کیا ہے کہ "حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل کیا غیر مستحسن نہیں ہے کہ انھوں نے یزید جیسے فاسق و فاجر کو خلافت کیلئے نامزد کیا؟" اسکے جواب میں حضرت مدنیؒ کے دس صفحے کے اس مکتوب میں تبصرہ نگار کے مسلک کے برعکس ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ حضرتؒ نے کیسی کیسی کوشش حضرت معاویہؓ کے دامن کو اس الزام سے پاک دکھانے کی نہیں کی ہے۔ انگریزی محاورے کے مطابق "کوئی پتھر اس کوشش میں اُلٹے بغیر نہیں چھوڑا ہے" جتنی بھی ممکن صورتیں حضرت معاویہ کو یزید کی نامزدگی کے سلسلے میں کسی الزام سے بچانے کی سوچی جا سکتی تھیں خواہ وہ عقل و عادت کے اعتبار سے بعید تر ہی کیوں نہ ہوں وہ سب حضرت کے قلم سے یکے بعد دیگرے اس کوشش میں نکلتی چلی آئی ہیں تاکہ کسی بھی طرح معترض کے ذہن کو اس معاملے میں مطمئن کر دیں جناب سائل مطمئن نہیں ہوئے اور دوسرا خط لکھتے ہیں، جسکے مضمون کی بابت مرتبؒ نے کوئی نوٹ نہیں دیا ہے مگر جواب سے پتہ چلتا ہے کہ اس دفعہ انھوں نے مزید یہ اشکال بھی سامنے رکھدیا کہ اگر یزید بن معاویہؓ کی نامزدگی کو غلط نہیں مانا جاتا اور وہ اس طرح خلافت پاکر شرعاً قابلِ قبول خلیفہ بن گئے تو پھر اُن کے خلاف حضرت حسینؓ کے اقدام کو کیا کہا جائے گا؟ وہ تو اُس خروج اور بغاوت کے حکم میں آجائے گا جس کی شریعت میں اجازت نہیں۔ اس دوسرے خط کے جواب میں حضرت مدنیؒ نے ۲۲ صفحے کا والا نامہ تحریر فرمایا۔ وہ مکتوب ۸۹ ہے جس کے ابتدائی ۱۲ صفحوں میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ

کے ایک طویل مکتوب کا اقتباس ہے[۱]، جو اتفاق سے ایک ایسے ہی سوال کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

ان دونوں مکاتیب میں دو باتیں قدر مشترک ہیں۔ (۱) حضرت معاویہؓ کو ہر طرح کی قابلِ اعتراض باتوں سے، دلائل کی بنیاد پر، بری الذّمہ بتانا۔ (۲) یزید کو ویسے ہی فاسق و فاجر ماننا جیسے سائل نے اپنے خط میں فاسق و فاجر ٹھہرایا ہے۔ دوسرے خط میں ایک تیسری چیز بھی آگئی ہے۔ اور وہ ہے حضرت حسینؓ کے اقدام کو دلائل کی بنیاد پر اعتراضات سے بری قرار دینا۔

تعمیرِ حیات کے تبصرہ نگار نے جو ان دو خطوں کے مضمون کو اپنا عقیدہ بنایا اور ان بزرگانِ دیوبند کو ایسی غیر معمولی اہمیت دی تو اس میں جہاں تک صحابۂ کرام کے بارے میں اُس بلا امتیاز حسنِ عقیدت اور تقدسیت کا تعلق ہے جو ان دونوں کی اصل روح ہے۔ اسکے بارے میں اپنے دل کی ہم آہنگی کا اظہار کرکے تو تبصرہ نگار صاحب نے سوائے اپنی کمزوری کے اور کسی بات کا ثبوت نہیں دیا۔ اور ایسا لگتا ہے کہ "استسلام" کا جو نکتہ وہ لفظ انھوں نے بعض اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں بولا تھا وہ اُن پر اُلٹ آیا۔ ورنہ وہ اس معاملے میں بزرگانِ دیوبند کی ہم عقیدگی سے بمراحل دور تھے جیسا کہ الفرقان بابت ماہ جولائی ۹۲ء میں یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے۔ البتہ یزید کے فسق و فجور اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کے بارے میں جو کچھ ان مکاتیب میں نظر آتا ہے اسکی بنا پر اگر انھوں نے سوچا کہ اس سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہے تو ایک سرسری نظر کے تأثر کے طور پر ٹھیک ہی سوچا لیکن ایک گہری نظر میں معاملے کی صورت بالکل مختلف ہوجاتی ہے۔ اور کم از کم حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب جس کا طویل اقتباس حضرت مدنی کے مکتوب ۸۹ میں دیا گیا ہے وہ تو اُن کی اکثر تحریروں کی طرح معمولی گہری نظر نہیں بلکہ بہت گہری نظر چاہتا ہے بلکہ ہم جیسوں کی تو بار بار کی گہری نظر اور کوشش چاہتا ہے جس کے بعد وہ سمجھ میں آسکے (اہلِ دیوبند جانتے ہیں کہ وہاں صرف بڑے بڑے اساتذہ کا مقام تھا کہ کما حقہ حضرت نانوتوی کے مدّعائے کلام کو سمجھتے تھے اور چھوٹوں کو ضرورت پڑتی تھی کہ اس کلام کو سمجھنے میں اُن سے مدد لیں) اور حضرت حسینؓ اور یزید کے نزاع اور سانحہ کربلا کے سلسلے میں جو کچھ بحث ہے وہ بھی اسی میں ہے۔ مکتوب ۸۸ میں یہ بحث بالکل نہیں ہے وہاں صرف یزید کو خلافت کیلئے نامزد

---

[۱] [illegible] گویا اصل [illegible] کو ۶ صفحے کا اقتباس۔

کئے جانے کی بحث ہے۔

راقم السطور نے جب حضرت نانوتوی کے اُس اقتباس کو سمجھنے کی کوشش کی جو مکتوباتِ شیخ الاسلام کے مکتوب ۸۹ میں دیا گیا ہے اور جو فارسی زبان میں ہے تو باوجود اسکے کہ ساتھ میں اس کا اردو ترجمہ بھی دیا ہوا تھا حضرت نانوتوی کا اصل مقصد و مدّعا پوری طرح سمجھ میں نہ آسکا۔ اور ضرورت محسوس ہوئی کہ آپ کے جس مکتوب سے یہ اقتباس ہے وہ پورا مکتوب دیکھنے میں آئے۔ اتفاق سے انہی دنوں میں ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند نے حضرت نانوتوی کے اس پورے مکتوب کا ترجمہ اپنے دو شماروں میں شائع کیا، تو بہت کچھ بات واضح ہوئی۔ پھر بھی نہ صرف یہ کہ احتیاط کا تقاضہ تھا کہ اصل مکتوب (فارسی) سامنے ہو۔ بلکہ ترجمہ جگہ جگہ اس بات کی چغلی بھی کھا رہا تھا کہ مکتوب نگار کی بات پوری طرح مترجم کے قابو میں نہیں آئی ہے۔ اس لئے اصل کے حصول کی کوشش میں مدیر دارالعلوم مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کو لکھا۔ اور اُن کی عنایت سے اصل کی فوٹو کاپی میسّر آئی۔ اور اسکو پڑھ کر مترجم سے کچھ بہت زیادہ شکایت نہیں رہی کیونکہ واقعی اس مکتوب کو لفظ بلفظ پوری طرح حل کرنا "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں ہے۔ اور اسکی زحمت اُٹھانے کی ضرورت بھلا لائق تبصرہ نگار کو کیوں محسوس ہونے لگی تھی۔ ورنہ وہ اگر مکتوباتِ شیخ الاسلام کے اور دیئے گئے اس کے اقتباس میں صرف یہ دیکھ لینا کافی نہ سمجھ لیتے کہ یزید کو پلید لکھا گیا ہے۔ اور پورے اقتباس ہی کو نہیں بلکہ پورا مکتوب حاصل کرکے اسکو سمجھنے کی کوشش کرتے تو یقین ہے کہ صرف مکتوب ۸۸ کا حوالہ دینے پر اکتفا کرتے مکتوب ۸۹ کا ذکر مناسب نہ سمجھتے۔

حضرت نانوتوی کا مکتوب

معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت نانوتوی کا یہ خط آپ کے لائق و فاضل شاگرد حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کے ایک خط کے جواب میں ہے۔ راقم السطور نے اپنی بساط بھر ہر ممکن کوشش کی مولانا فخر الحسن صاحب کے خط کا متن بھی کہیں دستیاب ہوجاتا۔ جہاں جہاں امکان سمجھا اس بارے میں خطوط لکھے مگر کہیں سے کامیابی نہیں ہوئی۔ اسکی ضرورت اس لئے تھی کہ جواب میں انکے سوال کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ وہ کیا تھا اور

ظاہر ہے کہ سوال معلوم ہو تو جواب کو سمجھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ تاہم مکتوب کے عنوان سے اور پھر آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فخر الحسن صاحب نے کچھ اس طرح کا سوال بھیجا تھا کہ شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ سنّیوں کے عقائد و اصول پر تو سبط رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو شہادت بھی نہیں کہا جا سکتا بلکہ (معاذ اللہ) ایک واجب القتل باغی کی موت کہا جائے گا۔ اور پھر اُن اصول و عقائد کا حوالہ بھی بظاہر مولانا فخر الحسن صاحب نے دیا جن کی طرف شیعہ معترضین کا اشارہ تھا۔ چنانچہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے پندرہ صفحے کا یہ پورا مکتوب صرف اسی بات کو ثابت کرنے کیلئے لکھا ہے کہ نہیں ہمارے اصول و عقائد کی رو سے بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہی قرار پائیں گے۔ بلکہ ہاں یہ تمہارے (یعنی شیعہ کے) اصولِ دین ہیں جن کی رو سے ان کو شہید نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ہے حضرت نانوتوی کے پندرہ صفحے کے پورے مکتوب کا مکمل خلاصہ۔

ہمیں رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیسی محبتِ سبطِ رسول علیہ السلام ہے جو آپ کے حق میں اپنے غالیانہ خیالات ہی پر راضی نہ رہ کر دوسروں کو بھی مجبور کرنا چاہتی ہے کہ وہ اسی کی زبان اس معاملے میں بولیں جس کے نتیجے میں ایسی باتیں بھی کھول کر کہنے کی مجبوری لاحق ہوئی جاتی ہے جنھیں نہ کہنا ہی مناسب تھا۔ پندرہ صفحے کے اس مکتوب گرامی میں اوّلاً پورے دس صفحوں کے طول و عرض میں پندرہ مقدّمے حضرت والا نے یہ کہہ کر قائم فرمائے ہیں کہ:۔

بعد حمد و صلوٰۃ اوّل مقدّمات چندمی نویسم کہ ثبوتِ مدّعا و وضوحِ آں بے آں مقدّمات دشوار است۔

بعد از حمد و صلوٰۃ اوّلاً چند مقدّمات لکھتا ہوں کیوں کہ ان مقدّمات کے بغیر مدّعا کا ثابت ہونا اور واضح ہونا مشکل ہے۔

"عقلمنداں را اشارہ کافیست" کے مطابق ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسا فاضل بے بدل اور قادر الکلام انسان اہلِ سنّت کے اصول کے مطابق حضرت حسینؓ کی شہادت ثابت کرنے کیلئے بھی اتنے طولِ عمل کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ ایک دو نہیں پندرہ مقدمے

اسکے بعد اور کچھ سننے کی ضرورت تو نہیں رہنی چاہیئے لیکن خدا ہی جانے کہ یہ اشارہ کافی ہوا یا نہیں۔ اس لئے مزید یہ بھی سن لیجیے کہ مقدّمات کی بسم اللہ یہاں سے ہوتی ہے:۔

اول آنکہ حضرت امام حسین و دیگر ائمہ اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین نزد اہلِ سنت مثلِ دیگر ائمۂ مجتہدین امام و مجتہد اند کہ خطاء اجتہادی از ویشاں ممکن۔ عقیدۂ ما مثلِ شیعہ نیست کہ امام را خطا محال و غلطی ازاں ممتنع باشد۔

اوّلاً یہ کہ حضرت امام حسین اور دوسرے ائمۂ اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین اہلِ سنت کے نزدیک دوسرے ائمۂ مجتہدین ہی کی طرح کے امام ہیں کہ اُن سے اجتہادی خطاء ممکن ہے۔ ہمارا عقیدہ شیعہ عقیدہ کی طرح نہیں ہے کہ امام سے خطاء محال اور غلطی ناممکن ہے۔

اور اسکے بعد مزید مقدمات یکے بعد دیگرے قائم کرکے اُن اعتراضات کے سائے سے حضرت حسینؓ کے اقدام کو نکالنے کی کوشش کرتے کرتے جو شیعوں کے کہنے کے مطابق اصول اہلِ سنّت کی رو سے آپ کے اس اقدام (بمقابلۂ یزید) پر عائد ہوتے اور آپ کی شہادت کو شہادت کہے جانے سے بھی روکتے تھے، آخر میں اسی اولین مقدمے کا سہارا لے کر بے تکلّف یہ بھی ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ:۔

زیادہ از زیادہ اگر کسے گوید ایں بگوید کہ حضرت امام دریں مسئلہ خطا کردند لیکن چہ حرج، المجتہد یخطئ و یصیب بنائے ثواب بر نیت خطاء اجتہادی دریں بارہ مزاحم حال نمی شود۔

زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کہے گا تو یہ کہہ سکے گا کہ حضرت امام نے اس مسئلے میں غلطی کی لیکن اس سے کیا حرج؟ مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور صحیح بھی کرتا ہے۔ ثواب کا مدار نیت پر ہے۔ اجتہادی خطا سے اس میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔

اور اسی طرح یہ بھی کہنے میں آپ کو کوئی تأمل نہ ہوا کہ:۔

اگر موجبات جہاد نبودند او شاں

اگر اس اقدام کے ...

نیز از تصدیٔ جہاد باز آمدہ می خواستند
کہ براہِ خود روند لشکریانِ یزید پلید
نگذاشتند و محاصرہ کردہ ظلماً شہید
ساختند، مَنْ قُتِلَ دُونَ مالِہٖ
وَعِرْضِہٖ فَہُوَ شَہِید۔

تو (بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ) آپ
ارادۂ جہاد سے باز آکر اپنی راہ چلے جانے
کے خواہاں ہوگئے تھے۔ مگر یزید پلید کے
لشکریوں نے راستہ نہ دیا اور گھیر کر ظالمانہ
شہید کر دیا۔ اور (بموجب حدیث) اپنے
مال اور آبرو کی حفاظت میں مارا جانے
والا بھی شہید ہے۔

اب اسکے بعد اس مکتوب گرامی کی روشنی میں اگر کوئی سوال راقم السطور سے کرنا کسی بھی درجہ میں مناسب ہوسکتا ہے تو وہ صرف یہ سوال ہے کہ تم اپنے اِن بزرگوں کے بارے میں کیا کہتے ہو جنھوں نے یزید بن معاویہ کو پلید اور فاسق و فاجر یا جبکہ تم نے اُس پر فسق و فجور کے الزامات میں کلام کیا ہے؟ اس سوال کو بھی صرف اپنے یہاں کے عام مزاج اور مذاق کی بنا پر "مناسب" کہنا پڑا ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ یہ کوئی معقول سوال نہیں ہے۔ خود ہمارے ہی بزرگوں میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے یزید ہی کے معاملے میں سوال کیا گیا کہ کچھ علماء لعنت جائز رکھتے ہیں اور کچھ منع کرتے ہیں۔ آپ کا کیا ارشاد ہے؟ آپ نے اس اختلاف کے پیچھے تاریخی روایات کے ردّ و قبول میں علماء کے اختلاف کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ "بس جوازِ لعن و عدمِ جواز کا مدار تاریخ پر ہے"[1] یعنی جس کے نزدیک یزید سے ایسے افعال ثابت ہیں کہ انکی وجہ سے لعنت جائز ہو وہ جواز کا فیصلہ کرتے ہیں، جنکے نزدیک ثبوت نہیں ہے وہ منع کرتے ہیں۔ الغرض یہ لعنت و عدمِ لعنت کا معاملہ ہو یا فسق و فجور کا اس میں کسی کو کسی کی رائے کا پابند نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ متضاد روایتوں کی وجہ سے تاریخی ثبوت میں رایوں کا اختلاف ہوسکتا ہے۔ ایک آدمی اگر ایمانداری سے اس بات پر مطمئن ہے کہ فلاں شخص کے بارے میں فاسقانہ اعمال کی روایتیں صحیح نہیں ہیں یا قوی نہیں ہیں تو اسکے لئے تو بظاہر شرعاً بھی گنجائش نہیں کہ وہ محض اپنے بزرگوں یا دوسرے اکابر علماء کی پیروی میں اس شخص کے

فسق و فجور کا قائل ہو جائے[1]۔ لیکن یہاں تو راقم کے معاملے میں مسئلے کی صورت بھی یہ نہیں ہے کہ ہمارے بزرگوں نے کچھ فرمایا تھا اور ہمیں کچھ اور عرض کرنا پڑ رہا ہے۔ راقم کی کتاب میں یزید کے فاسق و فاجر ہوتے یا نہ ہونے کے بارے میں ضمناً کوئی بات نہیں کہی گئی۔ جو بات ضمناً کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی سے حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ وغیرہ کے اختلاف کے سلسلے میں جو یہ شہرت ہے کہ یہ اختلاف یزید کے فاسق و فاجر اور بداعمال ہونے کی وجہ سے تھا، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اور اپنی تلاش و تحقیق کے اس نتیجے کو بہت زور دے کر کیوں کہا گیا تھا۔ کیا یزید کی محبت اور حضرت حسین بن علیؓ کی (معاذ اللہ) عداوت میں؟ جو لوگ اس طرح کی باتیں کر رہے اور پھیلانے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، انھیں کاش کوئی یاد دلا دے کہ ایک دن مر کر خدا کے یہاں جانا ہے۔ اور اِن بے باک الزام تراشیوں کا وہاں جواب دینا ہوگا۔ ورنہ ہر معقول پسند آدمی دیکھے گا کہ اس معاملے میں تلاش و تحقیق کی ساری جد و جہد اگر محض حقیقت واقعہ کی یافت کے علاوہ کسی اور غرض سے بھی کی گئی تھی تو وہ صحابیٔ رسول حضرت معاویہؓ کے اسی دامن کو ہر ممکن جائز حد تک بے داغ دکھانے کی غرض تھی جس کو ولی عہدی کے سلسلے میں ہر الزام سے پاک بتانے کیلئے حضرت نانوتوی اور حضرت مدنی (رحمۃ اللہ علیہما) اپنے اِن مکتوبات میں بے چین نظر آتے ہیں۔ خاص کر حضرت مدنیؒ جن کا مکتوب اول ہے ہی اسی سوال پر۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اگر میری حقیر تلاش و تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جس یزید کو ولی عہد بنایا تھا وہ فسق و فجور کے اعمال میں مبتلا نہیں پایا جاتا تھا حتیٰ کہ آپ کی وفات تک بھی ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی تو یہ چیز میرے اِن بزرگوں کی روحوں کو خوش کرنے کے بجائے الٹی ناخوشی کا باعث کیوں کر ہوگی اور یہ انکے کس عقیدے کے خلاف ہو جائے گا؟ ہاں اُن لوگوں کیلئے یقیناً کچھ خوشی کا باعث ہونے والی نہیں ہے جو یزید کے فسق و فجور پر تو زور دیتے ہیں مگر واقعۂ ولی عہدی کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کرتے ہوئے ادنیٰ دلچسپی اس بات میں نہیں دکھاتے کہ اربابِ تاریخ کے بیان سے چھینٹیں اُڑ کر حضرت معاویہؓ کے دامن پر لگتی ہیں انھیں صاف کیا جائے۔ یا وہ لوگ جو حضرت معاویہؓ

---

[1] یہاں اس ضمن میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حضرت مدنیؒ نے اپنے بزرگوں کی پیروی کے غیر معمولی ذوق کے باوجود ان کی بیجا نمایاں خصوصیت تھی یزید کے ذکر میں کہیں بھی پلید کا لفظ نہیں استعمال فرمایا ہے

کے لئے خطاء اجتہادی کا لفظ دس بار بولنے کو تیار ہیں۔ مگر حضرت حسینؓ کیلئے اس کا تصور بھی گناہ سمجھتے ہیں اور اس لئے انھیں ضرورت ہے کہ یزید کا فسق و فجور ہر شک و شبہے سے بالاتر رہے۔

حرفِ آخر

جی چاہتا ہے کہ اب اس قضیے میں مزید کچھ نہ لکھنا پڑے۔ اور یہی سمجھ کر کہ یہ تحریر انشاء اللہ اس سلسلے کا آخری باب ہے۔ بلکہ اسی کوشش میں کہ یہ آخری باب ہی ثابت ہو جائے چند باتیں مختصراً لکھنی ہیں۔

۱۔ جو شخص کتاب (واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر) کا مقدمہ توجہ سے پڑھے گا۔ اسے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ کتاب نہ کسی کی تائید میں لکھی گئی ہے نہ تردید میں نہ کسی کی حمایت میں نہ مخالفت میں۔ بلکہ صرف حقیقت اور سچائی کی تلاش میں لکھی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ واقعۂ کربلا کی اور اسکے پس منظر کی وہ واقعی صورت کیا ہے جو اس سلسلے کی تاریخ کے بے لاگ مطالعے میں نظر آتی ہے۔ خود کتاب کا انداز بیان اور انداز بحث بھی اسی بات کا شاہد ہے کہ مصنف کو فریقین میں سے کسی کی بھی تائید و تردید سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی صرف اس بات سے ہے کہ قاری پر سچائی اور حق ظاہر ہو۔ اور یہ اندازِ مطالعہ، اندازِ بیان اور اندازِ بحث اس نظریے کے ماتحت اختیار کیا گیا ہے کہ لوگ حقیقتوں اور سچائیوں کو بغیر جذباتی مداخلت کے انکی اصل شکل میں دیکھنے کے خوگر ہوں جسکے بغیر ہم موجودہ پسماندگی سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔

۲۔ جن لوگوں نے اس کتاب کے خلاف شور مچایا ہے کہ یہ حضرت حسینؓ کی مخالفت و عداوت اور قاتلِ حسینؓ یزید کی نصرت و حمایت میں لکھی گئی ہے۔ وہ اگر اللہ سے ڈرتے ہیں تو انھیں سوچنا چاہئے کہ کسی مسلمان کے بارے میں ایسی ایمان سوز نیت کے الزام کا کوئی ثبوت وہ اللہ کی عدالت میں پیش کر سکیں گے؟ اور خاص کر ایسی صورت میں کہ یزید کے بارے میں تو کئی حضرات نے متعین طور سے کتاب کے الفاظ بتا کر یا انکی طرف واضح اشارہ کر کے (جیسا کہ الفرقان کی ڈاک میں ناظرین الفرقان دیکھ چکے ہونگے) اہانت یا ناانصافی کی شکایت کی ہے مگر حضرت حسینؓ کے بارے میں کوئی ایک شخص ہمیں پوچھنے کے باوجود ایک لفظ یا ایک جملہ کتاب میں حضرت حسینؓ کی اہانت و عداوت کا مظہر نہ بتا سکا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو کتاب لکھی ہی کسی کی مخالفت میں گئی ہو اس کے

کسی ایک لفظ میں بھی اس جذبے کا اظہار نہ ہو؟

۳۔ ابتک کوئی معترض یہ نہیں بتا سکا کہ کتاب میں کونسی بات کہاں پر غلط لکھی ہوئی ہے کہاں تاریخی دیانت اور امانت کی خلاف ورزی کی گئی ہے؟ تمام معترضانہ باتوں کا حاصل صرف یہ نکلتا ہے کہ کربلا کے قصے میں فریقین کی جو تصویر ذہنوں میں بنی ہوئی تھی، اس کتاب نے اُس تصویر میں فرق ڈالا ہے۔ یا یہ کہ بزرگوں کی جو رائے یزید کے بارے میں عام طور سے چلی آرہی تھی اُسکی صحت مشکوک ہو گئی۔ مگر کم از کم اہل علم کے لحاظ سے تو ان میں کی کوئی بات پریشان ہونے کی نہیں ہے۔ تاریخ کا فن تو جغرافیہ اور علم ہیئت کی طرح کا ہے جن میں روز نئی نئی دریافتیں سامنے آتی ہیں۔ اور آتی رہیں گی۔ اس سے ہمارے اُن بزرگوں کی کوئی توہین نہیں ہوتی جو ان باتوں کو مانتے ہوئے قبروں میں چلے گئے جن کا قول آج مضحکہ خیز ہے۔ مثلاً زمین کے بجائے سورج کا متحرک ہونا۔ یا بقول حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس (فنِ تاریخ) کی مثال ایک منہدم قصر کی ہے جو کھنڈر کی شکل میں ہو۔[1] اسکے آگے مولانا نے فرمایا کہ "اسکے ملبہ کے نیچے سے وہ سب کچھ نکل سکتا ہے جس کی کسی طالب صادق یا جویائے حق کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔"[2] راقم اسکی جگہ یہ کہنا پسند کرے گا کہ ڈھونڈنے والے سلامت اس ملبے کے نیچے سے تو روز نئی چیزیں نکل کے آویں گی۔ ان سے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ چیز ڈرنے ہی کی ہے کہ اس سے عقیدے خراب ہوں گے۔ جیسے کلیسا کا عقیدہ زمین کے گھومنے کی خبر سے پریشانی میں پڑ گیا تھا۔ تو پھر شرعی حکم جاری کرا دینا چاہئے کہ تاریخی ریکارڈوں کی مزید چھان بین ممنوع ہے۔ جیسا کہ یورپ میں کلیسا نے سائنسدانوں کے خلاف کیا تھا۔ مگر پھر اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو کلیسا نے یورپ میں بھگتا۔ ع

الحذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

بزرگوں اور دوستوں سے گزارش ہے کہ اپنے جذباتی خیالات یا بزرگوں کی معلومات و خیالات اور عقیدے میں فرق کریں۔ دونوں چیزوں کو گڈمڈ نہ کریں۔ اور دوسرے یہ کہ حق اور صواب کی اجارہ داری کا ذہن یہ حق اور صواب کیلئے سب سے زیادہ خطرناک ذہن ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱-۲ المرتضیٰ (دوسرا ایڈیشن) ص ۱۴۰

اموی دورِ حکومت کا تاریخی تجزیہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ ۔ السابقون الاولون ۔ کا دورِ اقتدار ختم ہوتا ہے اور اب عربوں کی قومی حکومت شروع ہوتی ہے، جب اسلام کی تحریک کی حفاظت عربوں نے اپنا قومی مسئلہ بنا لیا تو ظاہر ہے کہ اسلام سے پہلے قریش کے جس خاندان کے ہاتھ میں اقتدار تھا وہ برسرِ عروج ہوتا، یہی وجہ ہے کہ عربوں کی قومی حکومت کی قیادت بنو امیہ کو ملی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مسلمان عربوں کی قومی حکومت کا بہترین نمونہ تھی اور اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمان عربوں کے بہت بڑے آدمی تھے، عام عربوں کا رجحان بنو ہاشم کے مقابلہ میں امویوں کی طرف زیادہ تھا اور اسکے اپنے اسباب ہیں، خلافت راشدہ کے بعد امویوں کا اقتدار میں آنا، اموی دور اسلام کی بین الاقوامی تحریک کے ارتقاء کی ایک لازمی کڑی کا حکم رکھتا ہے، ہمارے تاریخ نگاروں نے بنو امیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بنو امیہ کے سیاسی مخالفوں نے بھی جو بعد میں ان کے تخت و تاج کے وارث بنے انھیں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا پہلے ہم بھی بنو امیہ کے خلاف اپنے مؤرخوں کی باتیں پڑھ کر متأثر ہو جاتے تھے لیکن اب جو ہم نے دنیا کی انقلابی تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا اور ایک انقلابی تحریک کو جن جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے ان کو جانا تو ہم پر اموی دور کی اصل حقیقت واضح ہو گئی ۔

ہم نے بنو امیہ کی غلطیوں کو تو خوب اچھالا لیکن ان کی حکومت کی جو اچھائیاں تھیں ان کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا بیشک امویوں نے اسلامی حکومت کو قومی اور عربی رنگ دیا لیکن انھوں نے اسلام کے بین الاقوامی فکر کو اپنی حکومت کے تابع نہ بنایا، چنانچہ عہدِ اموی میں اسلام کا سیاسی مرکز دمشق تھا لیکن ذہنی اور علمی مرکز مدینہ ہی رہا، دوسرے لفظوں میں اسلامی فکر کی بین الاقوامیت بحال رہی ۔

بشکریہ ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند (ستمبر ۶۹ء) — مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

بات پہنچی ہے کہاں تک یہ تجھے کیا معلوم؟

ترجمان دارالعلوم دیوبند" ماہنامہ "دارالعلوم" کا ایک اہم اداریہ

["ملک میں پھیلے ہوئے مدارس، علماء اور حساس مسلمانوں کے پیہم اصرار کے باوجود ہم اس انتظار میں تاخیر پر تاخیر کرتے رہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ یا تعمیرِ حیات کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر کی تردید و براءت پر کوئی بیان آجائے لیکن ادھر سے جب بالکل مایوسی ہو گئی تو محض اظہارِ حق اور تردیدِ باطل کی نیت سے یہ مضمون لکھنا پڑا ۔"

اِن الفاظ پر ختم کئے جانے والے ۲۵ صفحے کے اس فاضلانہ اداریے میں مدیر "دارالعلوم" نے ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کے اس تبصرے پر دینی اور علمی نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کیا ہے جس سے قارئین الفرقان بخوبی واقف ہو چکے ہیں ۔ الفرقان میں اس تبصرہ کی جانب جو کچھ لکھا گیا ۔ افسوس اور انتہائی افسوس ہے کہ ندوے کے اربابِ حل و عقد نے اُسے ناقابلِ تصور شکوک و شبہات کے ماتحت ندوہ اور مولانا علی میاں (۱) کے خلاف ایک رقیبانہ مہم کی نظر سے دیکھا ۔ اور اُسکے کسی ایک بھی جزو کو اسکی

واقعی اسپرٹ میں دیکھنے سے انکار کر دیا۔ دعا ہے کہ "دارالعلوم" کے اس ادارے کے ساتھ اس طرح کی بدگمانی کا معاملہ نہ ہو اور دارالعلوم دیوبند کی طرف سے "اظہارِ حق اور تردید باطل" کی یہ کوشش بدگمانیوں میں کھوئے ہمارے بھائیوں کیلئے حق کو حق اور باطل کو باطل مان لینے کا ذریعہ بن جائے۔ اللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ

[_______________ الفرقان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی معصوم نہیں ہے اگر کوئی فرد یا جماعت کسی غیر رسول کی عصمت کا مدعی ہے تو وہ اپنے دعوی میں کاذب اور جھوٹا ہے۔ اس لئے جماعتِ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے علاوہ ہر انسان سے صواب وخطا اور خیر وشر کا صدور ہو سکتا ہے، البتہ بعض خدا کے ایسے سعید بندے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی پر خیر و صلاح کا غلبہ ہوتا ہے، اسی غلبۂ خیر کی بنا پر انھیں نیک صالح، ولی وغیرہ محترم ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ یہ زلات وسیئات سے بالکلیہ پاک ہیں۔

اس کے بالمقابل کچھ نابکار ایسے بھی ہیں جو مجموعۂ شرور و معاصی اور خزینۂ فسق وفساد ہوتے ہیں، ان کے فسق وفساد کی یہ کثرت انھیں ظالمین ومفسدین کے زمرے میں پہنچا دیتی ہے، بایں ہمہ ان کا بھی دامن حیات خیر وصلاح سے یکسر خالی نہیں ہوتا۔

صلحائے امت کی حیات وسوانح پر بحث وتحقیق کے وقت ان کی بعض لغزشوں اور بشری کمزوریوں کے پیش نظر ان کے جملہ محاسن ومزایا پر خط نسخ کھینچ دینا، اور ان کے سارے حسنات وخیرات کا انکار کر کے انھیں ظالمین ومفسدین کی صف میں کھڑا کر دینا علم و دیانت کے سراسر منافی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ظالمین ومفسدین کے چند گنے چنے اچھے

کاموں کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے سارے سیاہ کارناموں سے آنکھیں بند کر کے انھیں صلحاء واولیاء کی جماعت میں شامل کر دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہوگا، بلکہ ہر ایک کے ساتھ اسکے اعمال خیر وشر کی قلت وکثرت کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ننزل الناس منازلھم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیں حکم تھا کہ ہم لوگوں کو ان کے درجات ومراتب میں رکھیں۔

گر فرق مراتب نہ کنی ....

بحث ونظر اور تحقیق وتبصرہ کا یہ ایسا لازمی اصول ہے جس سے غفلت اور بے اعتنائی ایک محقق ومبصر کو دائرہ بحث وتحقیق سے نکال کر افراط وتفریط اور تنقیص وتضلیل کی سرحد میں پہنچا دیتی ہے، جس سے خود اسکی ذات مجروح اور علمی کاوشیں بے سود ہو کر رہ جاتی ہیں،

پھر ایک محقق کی علمی دیانت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ کسی شخصیت پر بحث کرنے کے لئے اس سے متعلق جو درست، صالح، معتبر اور مستند مواد ہیں انھی کو کام میں لائے، خود تراشیدہ، بے سند غیر مقبول، اور گری پڑی باتوں کو بنیاد بنا کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا نہ صرف اس شخصیت پر ظلم ہے بلکہ خود علم وتحقیق کے ساتھ مذاق کرنا ہے، محقق کا یہ رویہ بھی اسے پایۂ اعتبار سے ساقط اور علمی خیانت سے متہم کر دیتا ہے، باری تعالیٰ عز اسمہ کا ارشاد ہے یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا جب غلط کار دروغ گو کوئی خبر دے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایک دوسری آیت میں ہے اذا ضربتم فی الارض فتبینوا، اس لئے صحیح سقیم، قوی، ضعیف کی اچھی طرح چھان بین کے بعد ہی کوئی فیصلہ درست سمجھا جائے گا۔

عام اسلامی شخصیات سے ہٹ کر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور ان کے مقام مرتبہ پر بحث وکلام کے لئے محض تاریخی روایات پر انحصار واعتماد بھی ایک محقق کو جادہ اعتدال اور راہ صواب سے دور کر دیتا ہے، کیونکہ تاریخ کو ہرگز یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ اس کی شہادت سے کتاب وسنت کے مسلمات کے خلاف استدلال فراہم کیا جائے، رسول خدا اور عام امت کے درمیان دین خالص کے صحیح تصور کے لئے اگر کوئی قابل اعتماد واسطہ ہے تو وہ صحابۂ کرام کی برگزیدہ اور مقدس جماعت ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے یہ

ساتھی ہی آپ کے پیغام اور آپ کی تعلیمات کو پورے عالم میں پہنچانے والے ہیں، صحابہ کرام کی اس امتیازی حیثیت کا اعلان خود خدائے علیم و خبیر نے اپنے رسول ؐ کی زبانی یوں فرمایا ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ الآیۃ آپؐ اعلان کردیں کہ یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور میرے ساتھی۔ مطلب یہ ہے کہ کسی اندھی تقلید کی بنیاد پر نہیں بلکہ حجت و برہان اور بصیرت و وجدان کی روشنی میں، میں اور میرے اصحاب دین توحید کی دعوت دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نور بصیرت عطا فرمایا تھا آپ کے فیض صحبت سے ہر صحابی کا دل و دماغ اس نور سے روشن ہو گیا تھا اور دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرۃ میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو اور رفیق کار بن گئے تھے، حدیث پاک "ما انا علیہ واصحابی" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ کرام کے اسی رتبۂ بلند کو بیان فرمایا ہے۔ اس لئے صحابہ کی سیرت درحقیقت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا جز ہے، عام شخصیات، و رجال کی طرح انھیں صرف کتب تاریخ کی روشنی میں نہیں بلکہ قرآن و حدیث اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ میں دیکھا جائے گا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں

ومن توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم توقیر اصحابہ وبرھم ومعرفۃ حقھم والاقتداء بھم وحسن الثناء علیھم والاستغفار لھم والامساک عما شجر بینھم ومعاداۃ من عاداھم والاضراب عن اخبار المورخین وجھلۃ الرواۃ

(الاسالیب البدیعۃ ص ۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر میں سے ہے صحابہ کی تعظیم کرنا، ان سے حسن سلوک کرنا ان کے حق کو پہچاننا، ان کی پیروی کرنا، ان کی مدح و ستائش کرنا، ان کے واسطے استغفار کرنا، ان کے باہمی اختلاف کے ذکر سے (زبان و قلم کو) روکے رکھنا، ان کے دشمنوں سے دشمنی رکھنا مورخین اور جاہل راویوں کی (ان کی خلاف شان) روایتوں کے نقل و بیان سے باز رہنا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں جو آیات وارد ہیں وہ قطعی ہیں، جو احادیث صحیحہ ان کے

متعلق وارد ہیں وہ اگرچہ ظنی ہیں مگر ان کی اسانید اس قدر قوی ہیں کہ تواریخ کی روایات ان کے سامنے ہیچ ہیں، اس لئے اگر کسی تاریخی روایت میں اور آیات و احادیث صحیحہ میں تعارض واقع ہوگا تو تواریخ کو غلط کہنا ضروری ہوگا (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۲۴۲ مکتوب ۸۸)

حضرات صحابہ کا یہ تقدس و امتیاز کسی انسانی شخصیت و جماعت کا عطا کردہ نہیں ہے، بلکہ انھیں یہ رتبہ بلند خود مالک کائنات و خالق دوجہاں کے دربار سے مرحمت ہوا ہے، ذیل میں مذکور چند آیات ملاحظہ فرمائیں آپ پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جائے گی۔

(۱) کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تؤمنون باللہ (آل عمران آیت ۱۱۰)

تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کی نفع رسانی کیلئے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم کرتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہو، اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو انتم فرماتے اس وقت خطاب کی وسعت میں پوری امت مرحومہ براہ راست داخل ہو جاتی مگر اللہ تعالیٰ نے کنتم فرمایا اور صحابہ کی تخصیص فرمادی، اب رہے امت کے باقی لوگ تو جو صحابہ جیسے اعمال کریں گے وہ بھی ان کے تابع ہو کر اس خیریت و افضلیت کے مصداق ہو جائیں گے (اخرجہ ابن جریر و ابو حاتم عن السدی)

حضرت فاروق اعظم رضؓ نے آیت پاک کا مصداق اولین صحابۂ کرام کو قرار دیا ہے اور امت کے دیگر وہ افراد جو آیت پاک میں مذکور صفات کے حامل ہوں گے انھیں ثانوی درجہ میں شامل کیا ہے اور عربی زبان کے قواعد کی رو سے یہ بات اس طرح سمجھائی ہے کہ انتم خیر امۃ جملہ اسمیہ ہے جو ثبوت نسبت کو بتاتا ہے، تو انتم سے خطاب عام ہوگا جس کے عموم و وسعت میں موجود و غیر موجود سب داخل ہو جائیں گے، لیکن جب ضمیر "انتم" پر "کان" فعل ماضی داخل کر دیا جائے تو وقوع و حدوث کا معنی پیدا ہو جائے گا، اس صورت میں کنتم کے مخاطب صرف موجودین ہوں گے یعنی نزول آیت کے وقت جو امت موجود ہے وہی اس کی مصداق اولین ہوگی یہ آیت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بلا تخصیص جماعت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام

کے بعد سب سے افضل ہیں۔ علامہ سفارینی نے شرح عقیدۃ الدرۃ المضیۃ میں اسے جمہور امت کا مسلک قرار دیا ہے کہ انبیاء کے بعد صحابۂ کرام افضل الخلائق ہیں، ابراہیم بن سعید جوہری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو امامہ سے دریافت کیا کہ حضرت معاویہ اور عمر بن عبدالعزیز میں کون افضل ہے تو انھوں نے فرمایا لا نعدل باصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم احدا (الروضۃ الندیۃ شرح العقیدۃ الواسطیۃ ابن تیمیہ ص ۴۰۵) ہم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔

امام ابن حزم اپنی مشہور کتاب الفصل میں لکھتے ہیں ولا سبیل الی ان یلحق اقلہ درجۃ احد من اھل الارض کوئی شکل نہیں ہے کہ صحابۂ کرام میں سے کم رتبہ کے درجہ کو بھی کوئی (غیر صحابی) فرد بشر پہونچ سکے۔

اب اگر کسی تاریخی روایت سے صحابۂ کرام کی تنقیص لازم آتی ہو تو وہ اس نص قطعی کے معارض ہونے کی بنا پر لازمی طور پر مردود ہوگی۔

(۱) لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنیٰ۔ (الحدید آیت ۱۰)

برابر نہیں تم میں جس نے خرچ کیا فتح مکہ یا صلح حدیبیہ) سے پہلے اور جنگ کی ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان لوگوں سے جنھوں نے خرچ کیا اس کے بعد اور جنگ کی اور سب سے وعدہ کیا اللہ نے خوبی کا

سورۂ انبیاء میں الحسنی کے متعلق ارشاد ہے ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ اولئک عنہا معبدون جن لوگوں کے واسطے ہماری طرف سے حسنی کا وعدہ ہو چکا ہے وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ فرق مراتب کے باوجود سارے صحابہ جنتی ہیں یہی بات سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے۔

(۲) السابقون الاولون من المہاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ واعد لھم جنٰت تجری تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدا ذلک الفوز العظیم (آیت ۱۰۰)

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو لوگ ان کے پیرو ہیں نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے تیار کر رکھے ہیں واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انھی میں ہمیشہ یہی ہے بڑی کامیابی

اس آیت میں صحابۂ کرام کو دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک اولین سابقین کا اور دوسرا ان کے بعد والوں کا، اور دونوں طبقوں کے متعلق یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور ان کے لئے جنت کا مقام دوام ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ لکھتے ہیں جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے جب اس کے علم میں یہ بات آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کو دوامی طور پر جنتی فرمایا ہے تو اب ان کے حق میں جتنے بھی اعتراضات ہیں سب ساقط ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں بندے سے فلاں وقت میں نیکی اور فلاں وقت میں گناہ صادر ہوگا اس کے باوجود جب وہ اطلاع دے رہے ہیں کہ میں نے اسے جنتی بنا دیا تو اسی کے ضمن میں اس بات کا اشارہ ہو گیا کہ اس کی تمام لغزشیں معاف کر دی گئی ہیں، لہٰذا اب کسی کا ان مغفور بندوں کے حق میں لعن وطعن اور برا بھلا کہنا حق تعالیٰ پر اعتراض کے مرادف ہوگا، اس لئے کہ ان پر اعتراض اور زبان طعن دراز کرنے والا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ پھر اللہ نے اسے جنتی کیسے بنا دیا ا ھ (فضائل صحابہ واہلبیت مجموعہ رسائل ص ۲۰۶، مطبوعہ انجمن حمایت اسلام لاہور ۱۹۶۷ء)

اور علامہ ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں قاضی ابو یعلیٰ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انھیں کے لئے فرماتا ہے جن کے متعلق وہ جانتا ہے کہ ان کی وفات موجبات رضا پر ہوگی (معارف القرآن ص ۵۰۱ ج ۸) لہٰذا اگر کوئی تاریخی روایت اس نص قطعی کے خلاف ہوگی تو وہ لائق اعتبار نہ ہوگی۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (الانفال آیت ۶۳)

اللہ ہی نے تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا اور الفت ڈال دی ان کے دلوں کے درمیان اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ الفت ڈال سکتا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت پیدا کر دی ان کے درمیان بیشک وہ زور آور حکمت والا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب میں جدال و قتال کا جو بازار گرم تھا اس سے کون ناواقف ہے، ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قبائل عرب باہم ٹکراتے رہتے تھے، اور بسا اوقات ان کی قبائلی جنگوں کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہتا، باہمی عداوت اور شقاق و عناد کے اس دور میں رحمۃ للعٰلمین توحید و معرفت اور اتحاد و اخوت کا عالمگیر پیغام لے کر مبعوث ہوئے کیا دنیا کی کوئی طاقت تھی جو ان درندہ صفت، جہالت پسند لوگوں میں معرفت الٰہی اور حب نبوی کی روح پھونک کر سب کو ایک دم باہمی اخوت و الفت کی زنجیر میں جکڑ دیتی، بلا شبہ روئے زمین کے سارے خزانے خرچ کر کے بھی یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا، یہ خدائی طاقت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ کل تک جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور عزت و آبرو کے بھوکے تھے ان کے درمیان اس طرح سے برادرانہ اتحاد و اتفاق پیدا کر دیا کہ حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک دوسرے سے محبت و الفت کرنے لگے صحابۂ کرام کی اس باہمی الفت و محبت کا ذکر سورہ آل عمران میں اس طرح کیا گیا ہے

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا

یاد کرو اللہ کا احسان اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر اللہ نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں۔

آیت پاک محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (الفتح) (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحیم و مہربان ہیں) بھی حضرات صحابہ کی باہمی رحمت و الفت کی خبر دے رہی ہے

امام قرطبی اور عامۂ مفسرین لکھتے ہیں " والذین معہ" میں بلا تخصیص تمام صحابۂ کرام داخل ہیں، اس آیت پاک میں تمام صحابہ کو آپس میں رحیم اور مہربان اور فضل خداوندی کا طالب بتلایا گیا ہے

ان نصوص قطعیہ کے خلاف اگر تاریخی روایتیں یہ شہادت دیں کہ صحابہ آپس میں ذاتی پرخاش اور بغض و عناد رکھتے تھے تو یہ شہادت زور ہوگی جو کسی عدالت میں بھی قابل قبول نہیں ہے، رہا معاملہ صحابہ کے باہمی مشاجرات اور آپسی لڑائیوں کا تو اس کا منشاء بغض و عداوت اور شقاق و عناد قطعی نہیں تھا بلکہ اس میں ہر فریق اپنے نقطۂ نظر اور اجتہاد کے مطابق مسلمانوں کی مصالح اور راہ حق و رضائے الٰہی کے حصول میں کوشاں تھا، یہ الگ بات ہے کہ ایک فریق

اپنے اجتہاد میں چوک گیا جس پر وہ قابل گرفت نہیں بلکہ مستحق اجر ہے، چنانچہ علامہ سفارینی لکھتے ہیں۔

التخاصم والنزاع والتقاتل والدفاع الذی جری بینھم کان عن اجتھاد قد صدر من کل واحد من رؤس الفریقین ومقصد سائغ لکل فرقۃ من الطائفتین وان کان المصیب فی ذلک للصواب واحدھما .... غیر ان للمخطی فی الاجتھاد اجراً وثواباً۔ (مقام صحابہ ص ۱۰۴)

جو نزاع و جدال اور دفاع و قتال صحابہ کے درمیان پیش آیا وہ اس اجتہاد کی بنا پر تھا جو فریقین کے سرداروں نے کیا تھا اور فریقین میں سے ہر ایک کا مقصد اچھا تھا اگرچہ اس اجتہاد میں ایک ہی فریق صواب پر ہے .... بلکہ اپنے اجتہاد میں خطا کر جانے والے کیلئے بھی اجر و ثواب ہے

(۴) لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ (المجادلہ، آیت ۲۲)

تو نہیں پائے گا کسی قوم کو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ دوستی رکھیں ایسے لوگوں سے جو اللہ اور رسول اللہ کے مخالف ہیں خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا اپنے گھرانے ہی کے کیوں نہ ہوں ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض غیبی سے مدد کی ہے۔

حضرت شاہ عبد القادر مفسر دہلوی، اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں، یعنی جو دوستی نہیں رکھتے اللہ کے مخالف سے اگرچہ باپ بیٹے (وغیرہ) ہوں وہ ہی سچے ایمان والے ہیں، ان کے درجے (جنت و رضوان الٰہی) ملتے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان یہی تھی کہ اللہ و رسول کے معاملہ میں کسی چیز اور کسی شخص کی پروا نہیں کی۔ الحاصل حضرات صحابہ اس آیت پاک کے مصداق اولین ہیں، چنانچہ امام قرطبی، زمخشری، حافظ ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس آیت کے تحت حضرت ابو عبیدہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عمر فاروق وغیرہ رضوان اللہ علیہم کے بے لوث مخلصانہ واقعات بیان کئے ہیں۔

اب اس قرآنی اطلاع کے برعکس تاریخ کی روایتیں یہ خبر دیں کہ صحابہ خدا اور رسول خدا کے

مقابلے میں اپنے بیٹے عزیز واقارب اور قبیلے و گھرانے کو اولیت دیتے تھے تو یہ روایتیں ساقط الاعتبار ہوں گی انھیں کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (الحجرات، آیت ۷-۸)	لیکن اللہ نے محبوب بنادیا تمھارے لئے ایمان کو اور اس کو مزین کر دیا تمھارے دلوں میں اور نفرت ڈالدی تمھارے دلوں میں کفر، گناہ اور نافرمانی کی ایسے ہی لوگ نیک راہ پر ہیں اللہ کے فضل واحسان سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

یعنی اللہ سب کی استعداد وصلاحیت کو جانتا ہے اور اپنی حکمت سے ہر ایک کو وہ مقام و مرتبہ مرحمت فرماتا ہے جو اس کی استعداد کے مناسب ہو۔

یہ آیت ناطق ہے کہ بلا استثناء تمام صحابہ کے دلوں میں ایمان کی محبت اور کفر، گناہ، اور نافرمانی سے نفرت وکراہیت منجانب اللہ راسخ کر دی گئی تھی، اور "الیکم" میں حرف "الیٰ" سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ ایمان کی محبت اور کفر وفسق سے نفرت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی تھی کیونکہ "الیٰ" عربی میں انتہاد غایت کے معنی بیان کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ نیز آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام سے جو لغزشیں صادر ہوتی ہیں اس کی بنیاد ضعفِ ایمان اور فسق وعصیان کا (نعوذ باللہ) استحسان نہیں ہے بلکہ بتقاضائے بشریت ان کا صدور ہو گیا ہے، جس سے ان کے رشد پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اس لئے ان کی معدودے چند لغزشوں کی بنا پر انھیں تنقید وتنقیص کا نشانہ بنانا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

ما ذكر عن الصحابة من السيئات كثير منه كذب وكثير منه كانوا مجتهدين فيه لكن لا يعرف كثير من الناس وجه اجتهادهم وما قدر انه كان فيه ذنب من الذنوب لهم فهو مغفور لهم اما بتوبة واما بحسنات ماحية، و اما بمصائب مكفرة واما بغير ذلك، فانه قد قام الدليل الذي يجب القول بموجبه انهم من اهل الجنة، فامتنع ان يفعلوا ما يوجب النار لا محالة

واذا لم يمت احد هم على موجب النار لم يقدح ذالك في استحقاقهم للجنة (المنتقى ص ۲۱۹ — ۲۲۰)

بعض صحابہ کی طرف جو برائیاں منسوب کی گئی ہیں ان میں بیشتر خود ساختہ ہیں، اور ان میں بہت سی ایسی ہیں جن کو انھوں نے اپنے اجتہاد (سے حکم شرعی سمجھ کر) کیا مگر لوگوں کو ان کے اجتہاد کی وجہ معلوم نہ ہو سکی، اور جن کو گناہ ہی مان لیا جائے تو ان کا وہ گناہ معاف ہو گیا، یہ عفو ومغفرت یا تو توبہ کی بنا پر ہے یا ان کی (کثرت) حسنات نے ان گناہوں کو مٹا دیا، یا دنیاوی مصائب ان کے لئے کفارہ بن گئیں، علاوہ ازیں دیگر اسباب مغفرت بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ قرآن وسنت سے ان کا جنتی ہونا ثابت ہو چکا ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا عمل ان کے نامۂ اعمال میں باقی رہے جو جہنم کی سزا کا سبب بنے، تو جب حضرات صحابہ میں سے کوئی ایسی حالت میں وفات نہیں پائیگا جو دخول جہنم کا ذریعہ ہے تو اب کوئی چیز ان کے استحقاق جنت میں مانع نہیں ہو سکتی۔

صحابہ کے ایمان واخلاص، دیانت وعدالت پر اس قرآنی شہادت کے بعد کسی تاریخی مطروہ کی بنیاد پر صحابۂ کرام کے اسلام کو استسلام سے تعبیر کرنا ایمان بالقرآن سے میل کھاتا ہے؟ پرستار تاریخ و دلدادگان سید قطب وطٰہٰ حسین کو سوچنا چاہئے کہ وہ کس سے رشتہ توڑ رہے ہیں اور کس سے ناطہ جوڑ رہے ہیں بقول

دشمن بیمانِ دوست بشکستی
ببیں از کہ بریدی و باکہ پیوستی

قرآن مقدس کی مندرجہ بالا آیات بصراحت ناطق ہیں کہ۔

(۱) بغیر کسی استثناء کے تمام صحابہ جنتی ہیں۔
(۲) سارے صحابہ کو اللہ تعالیٰ کی دائمی رضا وخوشنودی حاصل ہے۔
(۳) جملہ اصحاب رسول آپس میں برادرانہ الفت واخوت رکھتے تھے
(۴) سبھی حضرات صحابہ اللہ ورسول کے معاملے میں نسبی وقبائلی عصبیت سے بالکل پاک تھے۔
(۵) ہر ایک صحابی کا دل ایمان واخلاص کی محبت سے مزین اور کفر، فسق اور نافرمانیوں سے متنفر تھا

صحابہ کا مقام حدیث کی نظر میں

کتاب الٰہی کی ان واضح تصریحات کے ساتھ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی پیشِ نظ

رکھیں تاکہ بات بالکل منقح ہو جائے اور کسی تاویل باطل سے آپ شکوک و شبہات میں گرفتار نہ ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے۔

(۱) خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم، فلا ادری ذکر قرنین او ثلاثۃ الخ

(السنۃ الامالکا جمع الفوائد ص ۲۰۱ ج ۲ طبع الہند)

سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو اس سے متصل ہیں، پھر انکا جو اس سے متصل ہیں، راوی حدیث کہتے ہیں مجھے یاد نہیں رہا کہ "ثم الذین یلونھم" آنحضرت ؐ نے دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ

اس حدیث پاک سے متعین طور پر معلوم ہوگیا کہ عہد نبوی کے بعد سب سے بہتر زمانہ صحابہ کرام کا ہے "اصابہ" کے مقدمہ میں مشہور شارح حدیث حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔ وتواتر عنہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم الخ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث محدثین کے نزدیک متواتر ہے جس سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔

(۲) عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ اختار اصحابی علی الثقلین سوی النبیین والمرسلین، رواہ البزار بسند رجالہ موثقون۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے اصحاب کو انبیاء و مرسلین کے علاوہ تمام انسانوں پر فضیلت دی ہے

یہ حدیث پاک اس بات پر نص ہے کہ تمام حضرات صحابہ اللہ تعالیٰ کے منتخب و برگزیدہ ہیں، جماعت انبیاء کے بعد گروہ جن و انس میں سے کوئی بھی ان کے مقام و مرتبہ کو نہیں پا سکتا شرف صحابیت ایک ایسا شرف ہے جس کے مقابلے میں ساری فضیلتیں ہیچ در ہیچ ہیں، اسی لئے حضرت سعید بن زید (یکے از عشرۂ مبشرہ) قسم کھا کر فرماتے ہیں

واللہ لمشھد رجل منھم مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یغبر فیہ وجھہ خیر من عمل احدکم ولو عمر عمر نوح (جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۶)

خدا کی قسم صحابہ میں سے کسی کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کسی جہاد میں شرکت جس سے اس کا صرف، چہرہ غبار آلود ہو جائے غیر صحابی میں سے ہر فرد کی عمر بھر کی عبادت و عمل صالح سے بہتر ہے اگرچہ اس کو عمر نوح ؑ مل جائے۔

(۳) صحابی رسول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم ومن اذاھم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ فیوشک ان یاخذہ

(للترمذی جمع الفوائد ص ۲۶۱)

اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملہ میں میرے بعد ان کو (طعن و تشنیع) کا نشانہ نہ بناؤ کیونکہ جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا، اور جس نے ان کو ایذاء پہنچائی اس نے مجھے ایذاء پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا پہونچائی اور جو اللہ کو ایذاء پہونچانا چاہے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں پکڑ لے۔

آیت کریمہ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ الخ کی تفسیر میں امام قرطبی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث ذکر کی ہے جس سے حدیث بالا کی تائید ہوتی ہے

(۴) من احب اللہ عزوجل فلیحبنی ومن احبنی فلیحب اصحابی ومن احب اصحابی فلیحب القرآن ومن احب القرآن فلیحب المساجد الخ

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱۲ ص ۲۶۶)

جو اللہ سے محبت رکھتا ہے اسے چاہیے کہ مجھ سے محبت رکھے اور جو مجھ سے محبت رکھے اسے چاہیے کہ میرے اصحاب سے محبت رکھے اور جو صحابہ سے محبت رکھے اسے چاہیے کہ قرآن سے محبت رکھے اور جو قرآن سے محبت رکھے اسے چاہیے کہ مساجد سے محبت رکھے

کوئی انتہا ہے حضرات صحابہ کی رفعت مقام کا کہ سید المرسلین، محبوب رب العالمین، خلاصۂ کائنات، فخر موجودات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کی محبت کو اپنی محبت بتا رہے ہیں اور ان سے بغض و عناد کو اپنے ساتھ بغض و عناد قرار دیتے ہیں، جس کے دل میں نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ درجہ کی محبت بھی ہوگی وہ اصحابِ رسول کی شان میں لب کشائی کی جرأت کرسکتا ہے؟ اور جب کہ آپؐ نے صاف فرمادیا ہو کہ دیکھو میرے بعد میرے صحابہ کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا اور انھیں اپنے اعتراضات کا ہدف نہ بنانا،

ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے لا تسبوا اصحابی فمن سبهم فعلیه لعنة الله والملائکة والناس اجمعین لا یقبل الله منه صرفا ولا عدلا (شرح الشفاء للملا علی قاری ص۵۵۵ ج۲)

ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں ؛- اذا رأیتم الذین یسبون اصحابی فقولوا لعنة الله علی شرکم (الترمذی جمع الفوائد ص۲۰۱ ج۲)

ان احادیث پاک پر بطور خاص ان لوگوں کو غور کرنا چاہیے جو مؤرخین کی گری پڑی روایتوں اور مستورین کے طبع زاد مفروضوں کو بنیاد بناکر صحابۂ کرام کے اخلاق و اعمال کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جسے وہ خود اپنے یا اپنے بڑے بوڑھوں کے بارے میں قطعاً گوارہ نہیں کرسکتے تو کیا (نعوذ باللہ) صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان مستورین و متجددین سے بھی انسانی و اسلامی اخلاق و شرافت میں فروتر اور پست تھے؟ (العیاذ باللہ)

(۵) عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم مثل اصحابی فی امتی کالملح فی الطعام لا یصلح الطعام الا بالملح (مشکوۃ شریف بحوالہ شرح السنۃ ص۵۵۳)	حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت میں میرے اصحاب کی وہی حیثیت ہے جو نمک کی کھانے میں ہے کہ بغیر نمک کا کھانا پسندیدہ نہیں ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح عمدہ سے عمدہ تر کھانا بے نمک کے پھیکا اور بے مزہ ہوتا ہے بعینہٖ یہی حال امت کا ہے کہ اس کی ساری صلاح و فلاح اور اس کا تمام تر شرف و مجد صحابہ کی مقدس جماعت کا مرہون احسان ہے اگر اس جماعت کو درمیان سے الگ کردیا جائے تو امت کے سارے محاسن و فضائل بے حیثیت اور غیر معتبر ہوجائیں گے،

الحاصل اس حدیث میں واضح اشارہ ہے کہ امت مسلمہ کے دین کی صحت و درستگی کیلئے حضرات صحابہؓ کے اقوال و اعمال حجت و سند اور معیار کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ

(۱) عہد نبوی کے بعد صحابہ کا دور سارے زمانہ سے بہتر ہے۔
(۲) حضرات صحابہؓ اللہ کے منتخب و برگزیدہ ہیں، جماعت انبیاء کے علاوہ جن و بشر کا کوئی بھی فرد ان کے مقام و مرتبہ تک نہیں پہونچ سکتا۔
(۳) صحابہؓ کی محبت محبت رسول کی علامت اور ان سے بغض و عناد رسول اللہؐ سے بغض و عناد کی نشانی ہے، صحابہؓ کو ایذا پہونچانا خود نبی پاکؐ کو اذیت پہنچانے کے مرادف ہے۔
(۴) حضرات صحابہؓ کو تنقید و تنقیص کا ہدف بنانا ناجائز و حرام ہے۔
(۵) امت کا سارا شرف و مجد صحابہؓ کے ساتھ وابستگی پر موقوف ہے، اور ان کا قول و فعل امت کے لئے حجت ہے۔

آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے نصوص سے ثابت شدہ صحابہؓ کے اسی امتیازی مقام و مرتبہ کو ایک دو گمراہ فرقوں کے علاوہ ساری امت ہمیشہ سے مانتی چلی آرہی ہے، ان کے حق میں طعن و تشنیع، سب و شتم اور ان کی عیب جوئی اور اہانت کو اکبر کبائر میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔

چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں۔

(۱) واعلموا ان سب الصحابة حرام من فواحش المحرمات سواء لابس الفتنة منهم او غیره۔ (شرح مسلم ص۳۱۰ ج۲)	اچھی طرح سمجھ لو کہ صحابہ کا نازیبا الفاظ سے ذکر کرنا حرام ہے اور بڑے حراموں میں ہے خواہ وہ صحابی باہمی جنگ کے فتنہ میں مبتلا ہوئے ہوں یا اس سے بری ہوں۔

حضرت امام مالکؒ کا قول مشہور شارح حدیث ملا علی قاریؒ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

(۲) من شتم احدا من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم ابابکر او عمر او عثمان او علیا او معاویة او عمرو بن العاص فان قال شاتمهم کانوا علی ضلال او کفر قتل وان شتم بغیر هذا نکل نکالا	جس نے اصحاب رسول میں سے کسی کو (مثلاً ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاویہؓ، عمرو بن عاصؓ، کو گالی دی اگر انھیں گالی دینے والا یہ کہتا ہے کہ وہ کفر و ضلالت پر تھے تو اسے قتل کیا جائے گا اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور کہتا

شدیدا (شرح الشفاء ص۵۵۵ ج ۲) ہے تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔

عظیم المرتبت محدث امام ابوزرعۃ الرازیؒ فرماتے ہیں۔

(۳) اذا رأیت الرجل ینتقص احدا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاعلم انہ زندیق وذلک ان الرسول حق، والقرآن حق وما جاء بہ حق وانما روی الینا ذلک کلہ الصحابۃ وھؤلاء یریدون ان یجرحوا شھودنا لیبطلوا الکتاب والسنۃ والجرح بھم اولی وھم زنادقۃ۔ (الاصابۃ ص۱۱ ج۱)

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ یہ زندیق ہے اور یہ اس لئے ہے کہ رسول حق ہیں، قرآن حق ہے، قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے حق ہے اور ان سب کو ہم تک پہنچانے والے صحابہؓ ہیں تو یہ عیب جو یان صحابہ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں اور واسطہ کو مجروح کر دیں۔ تاکہ وہ کتاب و سنت کو باطل اور بے اصل ٹھہرادیں لہذا یہی بدگو مجروح ہونے کے زیادہ مستحق ہیں یہ لوگ تو زندیق ہیں

(۴) امام ذہبیؒ اپنی مشہور کتاب "الکبائر" میں لکھتے ہیں۔

من ذم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشئ وتتبع عثراتھم و ذکر عیبا واضافہ الیھم کان منافقا الخ (ص ۲۳۹)

جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی کسی نوع کی مذمت کی اور ان کی عیب جوئی اور لغزشوں کی تلاش کے پیچھے لگا رہا یا کسی عیب کا ذکر کر کے اسکی نسبت صحابہ کی جانب کردی تو وہ منافق ہے۔

امام احمد بن حنبل رہ کا قول ان کے تلمیذ المیمونی ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

(۵) سمعت احمد یقول مالھم ولمعاویۃ نسأل اللہ العافیۃ وقال لی یا ابا الحسن اذا رأیت احدا یذکر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسوء فاتھمہ علی الاسلام (مقام صحابہ ص۸۸)

میں نے امام احمد سے فرماتے ہوئے سنا لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کی برائی کرتے ہیں ہم اللہ سے عافیت کے طلبگار ہیں پھر مجھ سے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہؓ کا ذکر برائی سے کر رہا ہے تو اسکے اسلام کو مشکوک سمجھو۔

حضرات ائمہ و محدثین کے ان اقوال کا حاصل یہی ہے کہ حضرات صحابہؓ کی اہانت، برائی اور ان کے اوپر طعن و تشنیع عظیم تر گناہ کبیرہ ہے کسی مخلص سچے مومن کی یہ شان نہیں ہے کہ رسول خدا کے مخلص و جاں نثار ساتھیوں کو ہدف ملامت اور نشانہ مذمت بنائے ایسی شنیع جسارت کوئی زندیق بنافق اور مشکوک الاسلام ہی کرسکتا ہے (نعوذ باللہ منہ)

محقق ابن ہمامؒ اسلامی عقائد پر اپنی جامع کتاب مسایرہ میں لکھتے ہیں۔

واعتقاد اھل السنۃ والجماعۃ تزکیۃ جمیع الصحابۃ وجوبا باثبات العدالۃ لکل منھم والکف عن الطعن منھم والثناء علیھم (ص ۱۳۲)

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ تمام صحابہ کی لازمی طور پر پاکی بیان کرنا ہے، ان میں سے ہر ایک کی عدالت ثابت کرنے ان پر کسی قسم کا طعن نہ کرنے اور ان کی مدح و تعریف کے ساتھ۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے شرح عقیدۂ واسطیہ میں اس عقیدہ کی تصریح ان الفاظ میں کی ہے۔

ومن اصول اھل السنۃ سلامۃ قلوبھم والسنتھم لاصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۴۰۳)

اہل سنت کے اصول عقائد میں سے ہے کہ وہ اپنے دلوں اور زبانوں کو صحابہؓ کے معاملے میں صاف رکھتے ہیں

عقائد کی معروف کتاب شرح مواقف میں سید شریف جرجانی رقم طراز ہیں۔

المقصد السابع انہ یجب تعظیم الصحابۃ کلھم والکف عن القدح فیھم لان اللہ عظیم واثنی علیھم فی غیر موضع فی کتابہ (عقیدہ سے متعلق یہ تینوں حوالے "مقام صحابہؓ از مفتی محمد شفیعؒ" سے ماخوذ ہیں)

ساتواں مقصد اس بیان میں ہے کہ تمام صحابہ کی تعظیم اور ان پر طعنہ زنی سے رکنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ عظیم ہے اور اس نے اپنی کتاب میں ان حضرات کی بہت سے مقامات میں تعریف بیان کی ہے۔

کس قدر حیرت انگیز ہے یہ واقعہ کہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی جو صرف مشہور صاحب قلم عالم ہی نہیں بلکہ ہماری معروف دینی درسگاہ ندوہ کے معتمد تعلیمات بھی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر اصحاب رسولؐ سے متعلق کتاب و سنت کے نصوص اور علمائے امت کی تصریحات ضرور ہوں گی، بایں ہمہ موصوف ایک جدید کتاب "واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر" پر تبصرہ کرتے ہوئے صحابہؓ کے ایک طبقہ کو اپنے قلم کے تیر و نشتر کا اس بیباکی سے ہدف بنایا ہے کہ اسے پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں یہ خیالات جماعت اہل سنت سے وابستہ کسی صاحب علم و دانش کے ہیں

آں موصوف کی تحریر کا وہ حصہ جس میں انھوں نے حضرت سفیان اور دیگر اموی صحابہ رضوان اللہ علیہم کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ ٹھہرایا خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے لکھتے ہیں۔

۔ کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ (CONSEQUENCE) تھا۔ وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصہ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے اکیس سال تک شدومد سے قائم رہیں، غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اسکے سربراہ ابوسفیان تھے۔ اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مورخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا) مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے۔ اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے اور صحاح ستہ کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہند نے بیعت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ وغضب کا اظہار کیا تھا، حضرت سفیان نے احتجاج کیا تھا کہ اب وہ دن آگیا ہے کہ یہ پسماندہ ہم اشراف پر فوقیت دیئے جاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کے خلاف حضرت علی کو اٹھانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے۔

اسلام کے پورے طور پر غالب ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں تھیں اس عرصۂ مختصر میں اس گروہ کی طرف سے کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں میں شکست کا غم وغصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔ احمد امین نے فجر الاسلام اور اس کے مقدمہ میں طہ حسین نے اس کی نشاندہی کی ہے۔"

(تعمیر حیات، اشاعت ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر صاحب کی اس طویل عبارت کا حاصل یہ ہے کہ

(۱) حضرت ابوسفیانؓ اور خاندان بنی امیہ کے دیگر صحابہ کرام حقیقتاً مسلمان نہیں تھے بلکہ ظاہری طور پر اطاعت قبول کرلی تھی بالفاظ دگر یہ حضرات آیت پاک۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا کے مصداق تھے۔

(۲) اس استسلام (ظاہری تسلیم واطاعت) کے بعد اچانک زمانۂ کفر وشرک کی عداوتوں کو وہ بھول گئے یہ عقلاً محال ہے۔

(۳) ہند زوجہ حضرت ابوسفیانؓ (جنھیں موصوف نے جگر خوار حمزہ کا طعنہ دیا ہے) نے بیعت اسلام کے وقت اپنے کرب وغم کا اظہار کیا تھا (غالباً ڈاکٹر صاحب امت کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ عین اسلام قبول کرتے وقت بھی اللہ کے دین اور اللہ کے رسول سے ان کا دل صاف نہیں تھا بدرجۂ مجبوری استسلام کر رہی تھیں۔

(۴) حضرت ابوسفیانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے خلاف (خلافت کے لئے) حضرت علی رضؓ کو اکسایا تھا۔

(۵) غلبۂ اسلام کے بعد یہ گروہ مقابلہ کی طاقت نہ پاکر ایک محدود عرصہ کیلئے خاموش ہوگیا تھا، مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کا غم آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ کے سینہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مار رہا تھا۔

(۶) حضرت عثمان غنی رضؓ کی خلافت نے اسلام سے ان کے عناد کو ختم کر دیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔

یہ ہے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی صحابہؓ کی اس جماعت کے بارہ میں رائے جن میں حضرت ابوسفیانؓ (عامل نجران) اور ان کی زوجہ ہندؓ کے علاوہ خال المومنین کاتب وحی حضرت معاویہؓ، عتابؓ ابن اسیدؓ (گورنر مکہ معظمہ) یزید بن سفیانؓ (عامل تیما) عبداللہ بن سعید (عامل فدک وکاتب وحی) عمرو بن سعیدؓ (عامل خیبر وکاتب وحی) عثمان بن سعیدؓ (عامل عرینہ) خالد بن سعیدؓ (کاتب وحی وعامل یمن) ابان بن سعیدؓ (عامل بحرین) سعید بن سعیدؓ (بازار مکہ کے نگران اعلیٰ) رضی اللہ عنہم اجمعین جیسی اسلام کی پاکباز شخصیتیں شامل ہیں۔

جن پر خود صاحب وحی، رسالت مآب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتماد کر کے اپنے عہد رسالت میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت پر مامور فرمایا تھا اور اپنے اس انتخاب کے ذریعہ اس جماعت کے ایمان واخلاق پر ہمیشہ کیلئے مہر تصدیق ثبت فرمادی ہے، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسلامی لشکر کی قیادت اور صوبوں کی سربراہی جیسے اہم ونازک ترین عہدوں سے انھیں سرفراز کر کے ہمیشہ کے واسطے اسلامی تاریخ میں ان کے ناموں اور کارناموں کو روشن و تابناک بنادیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مستسلمین جن کے سینوں میں غزوۂ بدر کے انتقام کا جذبہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مار رہا تھا اور قلوب اسلام اور داعئی اسلام سے صاف نہیں تھے (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق ہے) کیا اس اعتماد واعزاز کے مستحق تھے کہ کتابت وحی جیسی نازک ترین خدمت اور اسلامی ریاست کے اہم مناصب ان کے سپرد کر دیئے جائیں؟ کیا ندوی صاحب کی اس تحقیق کو تسلیم کر لینے کے بعد سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے عصمت کو (نعوذ باللہ) جرح وقدح کے دھبوں سے پاک وصاف رکھا جاسکتا ہے؟

بات پہونچی ہے کہاں تک یہ تجھے کیا معلوم

اس لئے یہ ہمارے ایمان بالرسول کا تقاضا ہے کہ بغیر کسی بحث وتحقیق اور ریب وشک کے کہدیں کہ واللہ ھذا بھتان عظیم۔

ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ ندوہ جیسی مشہور علمی درسگاہ کے ہونہار فاضل ہیں ان کی نظر قدیم وجدید دونوں ماخذوں پر ہے، وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ حضرات صحابہ کے متعلق فیصلہ محض تاریخی روایتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ امام ابن جریر طبری، حافظ ابن کثیر، ابن اثیر اور ابن عساکر جیسے مستند علماء جو فن تاریخ کے علاوہ حدیث، تفسیر وغیرہ اسلامی علوم میں بھی عبقریت کی شان رکھتے ہیں کی بیان کردہ وہ روایتیں جو کتاب وسنت کی تصریحات سے میل نہ کھائیں قابل قبول نہیں ہیں۔

اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے سید قطب، احمد امین اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین جیسے مستشرقین کے کارندوں اور اسلامی روایات واقدار سے بیزار عصر جدید کے متجددوں کے خود ساختہ مفروضوں

کو سامنے رکھ کر صحابہ کی ایک بڑی جماعت پر ایسی سخت ترین جرح کر ڈالی جس کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی وفاداری ہی نہیں بلکہ اسلام بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔ کیا صحابہ کے اخلاق وکردار کی یہ صحیح منظر کشی ہے؟ کیا صحابہ کی یہ تصویر دیکھ کر امت کا وہ اجماعی اعتقاد جو ان کے بارے میں ہے باقی رہ سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کو خالی الذہن ہو کر غور کرنا چاہئے۔

اس اجمالی نظر کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے اجزاء پر تفصیلی گفتگو ملاحظہ فرمائیں

(الف)۔ کیا یہ مستسلمین جو حقیقی اسلام کی دولت سے محروم تھے جن کے سینوں میں اسلام سے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، جن کے قلوب نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صاف نہیں تھے کسی درجہ میں مستحق جنت ہیں؟ حالانکہ خدائے علیم وخبیر کا اعلان ہے لایستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئك اعظم درجة من الله وكلا وعد الله الحسنى (آیت پاک کا ترجمہ وتفسیر آگے گذر چکی ہے) فرق مراتب کے باوجود تمام صحابہ کو بارگاہ الٰہی سے جنتی ہونے کی سند مل چکی ہے، اس لئے ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق کسی اور حلقہ میں قابل قبول ہو تو ہو گروہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک قطعاً مردود ونامقبول ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال ہے"۔

(ب) ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ جس بات کو یہ محال عقلی ٹھہرا رہے ہیں اسی کے بارے میں کتاب الٰہی کی شہادت یہ ہے کہ چشم گیتی اس حیات بخش منظر کو عہد رسالت میں دیکھ چکی ہے اذكروا نعمت الله عليكم اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا، یعنی اللہ کے فضل وعنایت سے قدیم دشمنی بغیر کسی تاخیر کے دوستی میں بدل گئی اور کل کے دشمن آج کے بھائی بن گئے، اس آیت پاک میں اذ كنتم اعداء پر الف بين قلوبكم کا عطف کیا گیا ہے اور اس کے لئے حروف عاطفہ میں سے "فاء" کا انتخاب ہوا ہے جو تعقیب بلا تراخی کے معنی کے واسطے استعمال ہوتا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ دشمنی وعداوت کے بعد اچانک ایک پل میں الفت پیدا ہوگئی اور پرانی ساری رنجشیں یک بیک کافور ہوگئیں۔

(ج) ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ "ہندا (زوجۂ ابوسفیان) نے بیعت کے الفاظ دہراتے

ہوئے بھی اپنے اندرونی کرب وغم اور غیظ وغضب کا اظہار کیا تھا:۔

اس بیان میں ڈاکٹر صاحب صحیح علم وتحقیق کے حق کو فراموش کر گئے ہیں کیونکہ اس واقعہ میں جو بات انھیں اپنے مقصد کے مطابق نظر آئی اسے اٹھا لیا اور جو خلافِ مقصد تھی اسے قلم انداز کر دیا آج کل کے تاریخی تجزیے اور ریسرچ وتحقیق کی یہی ٹیکنک ہے۔ بیعت اسلام کے اس واقعہ میں ہند رضی اللہ عنہا کی آخری گفتگو جو انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی یہ ہے

• یا رسول اللہ! اسلام سے پہلے آپ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چہرہ مجھ کو مبغوض نہ تھا اور آپ سے زیادہ کسی کو دشمن نہ رکھتی تھی، اور اب آپ سے زیادہ کوئی چہرہ مجھے محبوب نہیں، آپ نے فرمایا ابھی محبت میں اور زیادتی ہوگی:۔ (سیرۃ المصطفےٰ ج ۳ ص ۳۶)

کیا اسکے بعد بھی کہا جائے گا کہ وہ نبی کریم سے بغض وعداوت رکھتی تھیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ان کے دل کی صفائی اور انتہائی اخلاص کی بات ہے کہ اسلام لانے سے پہلے کی اپنی قلبی کیفیات کو بلا تکلف بیان کر دیا۔ چونکہ ہمارے محقق ومبصر طٰہٰ حسین اور احمد امین جیسے استشراق پسند مصنفین کی عینک لگا کر اس واقعہ کو دیکھ رہے ہیں اس لئے جو چیز قابل تعریف تھی وہی انھیں لائق مذمت نظر آ رہی ہے۔

اس موقع پر موصوف نے حضرت ہند رضؓ کو "جگر خوارئ حمزہؓ" کا طعنہ بھی دیا ہے جو کسی طرح بھی ان کی علمی شان کے مناسب نہیں ہے کیونکہ حدیث پاک الاسلام یہدم ما کان قبلہ (اسلام نے اپنے سے پہلے سارے گناہوں کو ختم کر دیا) اور التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (گناہ سے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے کے مثل ہو جاتا ہے) اس لئے اسلام لانے کے بعد زمانۂ شرک کے معاصی پر طعن و تشنیع کسی طرح بھی روا نہیں، اور اگر بالفرض اس دروازے کو کھول دیا جائے تو مہاجرین وانصار میں سے کون بچے گا جو اس قسم کے طعنہ کا مورد نہ ہو سکے۔ جانتے بوجھتے ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ رویہ خواہ مخواہ اس شبہ کو دعوت دیتا ہے کہ ان کا قلب خاندان بنی امیہ سے متعلق صحابۂ کرام سے صاف نہیں ہے، اللّٰھم احفظنا منہ۔

(د) موصوف حضرت ابو سفیان کے جرموں کو شمار کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق کے خلاف حضرت علی کو اکسانے کی کوشش بھی ان سے ثابت ہے:

ڈاکٹر صاحب جس بات کو ایک ثابت شدہ حقیقت کے انداز میں پیش کر رہے ہیں اس کی حیثیت بس اتنی ہے کہ ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ ابو سفیان حضرت علی اور حضرت عباس کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اے علیؓ وعباسؓ! کیا بات ہے کہ خلافت قریش کے اس قبیلہ میں گئی (مراد حضرت ابو بکر صدیقؓ کا قبیلہ ہے) جو مرتبہ کے اعتبار سے پست اور تعداد کے لحاظ سے قلیل ہے، بخدا اگر تم دونوں آمادہ ہو جاؤ تو ہم مدینہ کو اپنے حامیوں اور طرفداروں کے لشکر سے بھر دیں، حضرت علیؓ نے جواب دیا، بخدا میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا الخ

اس روایت کو مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہٗ نے اپنی مشہور کتاب "المرتضیٰ" صفحہ ۱۵۱ پر بحوالہ کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۱ نقل کیا ہے، اسی روایت کی بنیاد پر کہا جا رہا ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی ابو سفیانؓ کے دل سے جاہلی عصبیت کا جرثومہ ختم نہیں ہوا تھا اسی لئے تو وہ خلافت صدیقی کے خلاف حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو اکسا رہے تھے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اولاً تو خود اس روایت کی صحت ہی مشکوک ہے اس لئے ایسی روایت کی بنیاد پر کسی صحابئ رسول کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دینا کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ ——— جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

علاوہ ازیں اگر کسی درجہ میں اس روایت کو مان لیا جائے تو حضرت ابو سفیان کی اس رائے کو حضرت ابو بکرؓ کے خلاف اکسانے کا معنی پہنانا کسی طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر حضرت ابو سفیانؓ کی اس رائے کا یہی معنی درست مانا جائے تو پھر اس اعتراض سے عم رسول عباس رضی اللہ عنہ بھی بری نہ ہو سکیں گے کیونکہ حضرت ابو سفیانؓ سے پہلے خود حضرت عباسؓ کی رائے بھی یہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت آل ہاشم کو ملنی چاہیے۔ چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں ایک دن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رض کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ انی اری الموت فی وجوہ بنی عبد المطلب فتعال حتی نسأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فان کان ھذا الامر فینا علمناہ" جس کے جواب میں حضرت علی رض نے فرمایا تھا انا واللہ لئن سألناھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمنعناھا لا یعطیناھا الناس بعدہ وانی واللہ لا اسألھا رسول اللہ، (رواہ البخاری فی کتاب المغازی،

پھر یہی اعتراض حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے حامی حضرات انصار پر بھی عائد ہوگا جو سقیفۂ بنی ساعدہ میں انتخاب خلیفہ کے لئے اکٹھا ہوئے تھے۔

درحقیقت اس موقع پر نہ کسی کے اندر خاندانی عصبیت کارفرما ہے اور نہ کوئی کسی کو کسی کے خلاف اکسا رہا ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ حضرات صحابہ کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک ایسا مسئلہ کھڑا ہوگیا جس پر انھوں نے پہلے سے پورے طور پر غور و فکر نہیں کیا تھا اس لئے اول وہلہ میں استحقاق خلافت کے سلسلہ میں ان کی رائیں مختلف ہوگئیں، قریش کی وہ شاخ جو عبد مناف سے تعلق رکھتی تھی اس کے دونوں بزرگ یعنی حضرت عباسؓ اور حضرت ابوسفیانؓ کی رائے یہ تھی کہ چونکہ آنحضرت کا نسبی تعلق بنو ہاشم سے ہے اور اس وقت بنو ہاشم میں اپنے فضائل و محاسن کے لحاظ سے حضرت علیؓ سب پر فوقیت رکھتے ہیں اس لئے وہی خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں جس کا اظہار ان دونوں حضرات نے حسب موقع حضرت علی رضی اللہ سے کر دیا، اس کے برخلاف حضرات انصار کا ایک طبقہ اپنی نصرت و تائید کے پیش نظر یہ سمجھ رہا تھا کہ مہاجرین کے مقابلہ میں خلافت کے زیادہ حقدار یہی ہیں اپنی اسی رائے کے تحت وہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہوئے تھے لیکن بعد میں حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے بیانات سے دلائل منقح ہوکر سب کے سامنے آگئے تو بغیر کسی تردد کے سب نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ رسول تسلیم کر لیا اور مکمل بشاشت قلبی کے ساتھ خلیفۂ وقت کی سمع و طاعت قبول کر لی۔

(۵) موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں پہ شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے اور اپنے کمال ادب و بلاغت کے اظہار کے لئے حضرات صحابہ کی مقدس جماعت کے ساتھ جس بے ادبی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف اس پر غماز ہے کہ فی قلبہ شیئ۔ حضرت ابوسفیان، حضرت معاویہ، حضرت یزید بن ابی سفیان، حضرت عتاب بن اسید، حضرت خالد بن سعید وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد صحابہ کرام کو انگریزوں کی صف میں کھڑا کر دینا جس درجہ کی جسارت ہے جو اہل سنت والجماعت کے صحابہ سے متعلق اجماعی

عقیدہ کے یکسر منافی ہے۔

الحاصل ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کا ایک ایک جز کتاب و سنت سے معارض عقیدۂ اہل سنت کے خلاف ہے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیان کے مطابق (شائع تعمیر حیات، ۲۵ اپریل ۱۹۹۲ء) خود ندوہ کے مسلک کے بھی خلاف ہے جس کے معتمد تعلیمات کی مسند پر بیٹھ کر اسے لکھا گیا ہے اور ندوہ کے ترجمان "تعمیر حیات" کے ذریعہ جس کی اشاعت ہوئی ہے، مگر حیرت ہے کہ ترجمان ندوہ "تعمیر حیات" نے آج تک اس کی واضح طور پر تردید اور اس سے براءت کے سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا، بعض علماء کی جانب سے حضرت مولانا علی میاں صاحب کو اس نامناسب تحریر کی طرف توجہ دلائی گئی بلکہ احتجاج کیا گیا تو موصوف نے "ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں کا صحابہ کرام کے بارے میں مسلک و عقیدہ" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون شائع فرما دیا جس میں ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی تردید میں ایک لفظ بھی نہیں ہے، البتہ ان کے بے بنیاد مفروضوں اور صحابہ بیزار خیالات کو "تاریخی تجزیہ و تبصرہ" کا نام دیکر یک گونہ علمی حیثیت دیدی گئی ہے، حضرت مولانا نے اپنے اس مضمون میں صحابۂ کرام بالخصوص حضرت علی، حضرت معاویہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کی جو تشریح و ترجمانی فرمائی ہے وہ قابل تحسین ہے، پھر حضرات صحابہ کے کارناموں اور عظمت کے اظہار میں ندوہ کی جس بے مثال خدمات کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے ثبوت میں مولانا شبلی نعمانی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تصنیفات اور دارالمصنفین اعظم گڈھ کی صحابہ سے متعلق مطبوعات کا تذکرہ کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں مگر سوال یہ ہے کہ حضرت مولانا سے تو درخواست کی گئی تھی ڈاکٹر عبداللہ کے غلط مضمون کی تردید کی تاکہ ایک طاقتور تردید سے ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی تحریر کے وہ مسموم اثرات جو تعمیر حیات کے ذریعہ پورے ملک میں پھیل گئے ہیں ختم ہو جائیں۔ اس کے جواب میں ندوہ کے بانیوں اور کارکنوں کے مسلک اور صحابہ سے متعلق ندوہ کی خدمات کی وضاحت فرمائی جا رہی ہے، آخر اس درخواست اور اس کے اس جواب میں ربط کیا ہے؟ حضرت مولانا سے نیازمندانہ گذارش ہے کہ وہ اس پر غور فرمائیں۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

ندوہ کے ایک پرجوش صاحب قلم استاذ کو یہ بات انتہائی گراں لگی کہ ڈاکٹر صاحب کی اس قابل اعتراض تحریر پر لوگ اعتراض کیوں کرتے ہیں، چنانچہ موصوف اپنی لسانی ہوشمندی اور

تمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"مولانا کے مضمون میں اس عبارت کا آنا تھا کہ کچھ مدعیوں نے چیخ و پکار شروع کر دی
وہ اخرس و گونگے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف بیجا باتوں کی نسبت اور یزید
کی وکالت پر نہیں بولتے .... وہ یہاں گویا ہو گئے"

ادبی اعتبار سے اس تحریر کے عیب و سقم کو تو اہل ادب جانیں میری تو آں محترم سے بس اتنی گذارش ہے کہ جذبات کی رو میں اتنے آگے نکل جانا کسی طرح مناسب نہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھیں تو صرف آپ اکیلے رہ جائیں، پورے ملک کے علماء کو اخرس اور گونگا کہنے سے آپ کی گویائی میں کچھ اضافہ ہونے سے رہا البتہ اس کا انجام یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ آپ کی بات سننے سے لوگ اپنے کان بالقصد بند کر لیں۔ ـــــ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ایک ایسے صاحب کا مضمون داد تحسین کے خانہ میں شائع کیا گیا جو نہ قرآن پاک سے واقف نہ حدیث نبوی سے نہ اقوال صحابہ سے نہ علماء و مصلحین کی آراء سے، گستاخ و بے ادب محمود عباسی کی دو چار کتابیں جن کا سرمایہ حیات ہیں"

یہ ایک فاضل ندوہ کے بارے میں موصوف کی شہادت ہے "صاحب البیت ادری بما فیہ" ہم اس سلسلے میں کیا کہہ سکتے ہیں، البتہ آگے چل کر موصوف نے بلاوجہ اور بغیر کسی معقول ربط کے دار العلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ اس بارہ میں موصوف سے صرف یہ گذارش ہے کہ جب طبیعت جوش میں آئے اور قلم خردہ گیریوں کیلئے بے چین ہو جائے تو اپنے گرد و پیش نظر اٹھا کر دیکھ لیا کریں تسکین کے سامان خود ندوہ اور لکھنؤ میں بہت مل جائیں گے اور آپ دہلی و دیوبند کے طویل سفر کی زحمت سے بھی بچ جائیں گے کیونکہ "این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کی تحریر کے درجۂ حرارت کو کم کرنے کے غرض سے موصوف رقم طراز ہیں

"مولانا عبداللہ عباس ندوی جن کا قلم ردعمل کے جوش میں بغیر قصد و نیت کے غلط رخ پر چل گیا"

یہ اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام کوشش ہے ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا سیاق و سباق زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ پورے غور و فکر اور قصد و ارادہ سے اور

اپنے خیال میں استدلال کی قوت سے طاقتور اور مدلل کر کے لکھا جا رہا ہے کیا بے قصد و نیت کی تحریریں اسی طرح کی ہوا کرتی ہیں؟ بلکہ اسکے پیچھے کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے۔

ملک میں پھیلے ہوئے مدارس، علماء اور حساس مسلمانوں کے پیہم اصرار کے باوجود ہم اس انتظار میں تاخیر پر تاخیر کرتے رہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ یا تعمیر حیات کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر کی تردید و برأت پر کوئی بیان آ جاتے، لیکن ادھر سے جب بالکل مایوسی ہو گئی تو محض اظہار حق و تردید باطل کی نیت سے یہ مضمون لکھنا پڑا۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه وصلى الله على النبي الكريم

تبصرے

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر

دو ممتاز اہل علم کی نظر میں -

[مولانا مجیب اللہ ندوی، اور مولانا عبد العلی فاروقی کے نام ملک و بیرون ملک کے دینی و علمی حلقوں میں معروف و معتبر نام ہیں۔ مولانا مجیب اللہ ندوی نہ صرف کہ اعظم گڑھ کے مشہور ادارے جامعۃ الرشاد کے بانی و ناظم اور ماہنامہ الرشاد کے مدیر ہیں، بلکہ علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کے ممتاز تلامذہ میں ہیں عرصہ تک دار العلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی رہے ہیں۔ چند سال پہلے قائم ہونے والی فقہ اکیڈمی کے ارکان تاسیسی میں ہیں۔ اور اپنی علمی و فقہی حیثیت کے علاوہ ملکی و بیرونی حالات پر گہری نظر اور مسلمانوں کی ہمہ جہتی تنظیم و ترقی کیلئے فکر مندی و کوشش میں بھی امتیازی مقام کے حامل ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڑھی علیہ الرحمہ کے منظور نظر ہیں — اور — مولانا عبد العلی فاروقی، امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبد الشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے، ان کے علوم و مسلک کے وارث و ترجمان، دار العلوم فاروقیہ کاکوری کے ناظم اور اس ادارے کے ترجمان "البدر" کے مدیر ہیں۔

ذیل میں مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی معرکۃ الآرا کتاب "واقعۂ کربلا....." پر بالترتیب مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب اور مولانا عبد العلی فاروقی صاحب کے تبصرے ہم اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں — ادارہ]

(۱)

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں واقعۂ کربلا کی اس کے پس منظر میں وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک مقدمہ اور نو ابواب پر مشتمل ہے۔

واقعۂ کربلا اسلامی تاریخ کا ہمیشہ ایک نازک مسئلہ بنا رہا اس لئے اس پر قلم اٹھانا بڑا نازک بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے اس لئے کہ یہ مسئلہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک راہِ اعتدال قائم کرنے کے ہم معنی ہے اور جب کسی مسئلہ کے سلسلہ میں دو انتہاؤں کے ماننے والوں نے اپنی بات کو حقیقت سمجھ لیا ہو تو پھر درمیانی راہ اختیار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

مولانا عتیق الرحمن صاحب نے اس کتاب میں تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے بھی اپنے قلم کو بڑی حد تک انتہا پسندی سے بچائے رکھا ہے۔

راقم الحروف نے اس موضوع کو نازک اس لئے کہا ہے کہ اہل بیت اور ریحانۂ جنت کا

سر رشتہ ایک طرف داستانِ عشق و محبت سے جڑا ہوا ہے تو دوسری طرف واقعات کھتونی سے بھی اس کا بڑا گہرا تعلق ہے یعنی ایک طرف اہلِ بیت کی محبت جزو ایمان ہے تو دوسری طرف ان کی اس محبت کو ہمیشہ سیاسی استحصال کا ذریعہ بھی بنایا گیا ہے اس لئے واقعات کی اصل صورت سیاسی مفاد میں دب کر رہ گئی ہے خود مصنف کو اس کا احساس ہے۔

مصنف نے مسئلہ کی نزاکت کے باوجود اپنے قلم کو جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹنے دیا ہے کہیں کہیں واقعات کربلا کے تجزیہ اور رائے قائم کرنے میں اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کہیں کہیں روایتوں کے درمیان ترجیح دینے میں جانبداری بھی محسوس ہوتی ہے لیکن انھوں نے نہ تو حضرت حسینؓ کی شہادت جس کے بارے میں دو رائے دی جاتی ہے یا دی جاتی رہی ہے اور جسے پوری اسلامی تاریخ میں بارہا سیاسی استحصال کا ذریعہ بنایا گیا، اس کے مقابلہ میں اسلامی تاریخ کی متفق علیہ شہادتوں کی اہمیت کو کم ہونے دیا ہے۔ اور نہ اُسے بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کی کشمکش کا نتیجہ قرار دیا ہے مگر افسوس ہے کہ سبائی فتنے نے اس واقعہ کو ایسی شکل دے دی کہ نبی کریمؐ کی ۲۳ سالہ تعلیمات بھی بے اثر دکھائی دینے لگی اور پوری اسلامی تاریخ کو جاہلیت کی تاریخ بنانے کی کوشش کی گئی اور اس کا شکار نہ صرف عوام ہوئے بلکہ اہلِ علم بھی اس فتنہ سامانی سے اپنا دامن نہ بچا سکے، حضرت حسنؓ کے مصلحانہ طرز عمل کو جس نے بیس برس تک پورے عالم اسلام کو متحد رکھا پوری اہمیت نہ دینا اور حضرت حسینؓ کے اقدام اور یزید کی امارت کو جاہلیت کی کشمکش بنا دیا گیا قرآن و سنت کی واضح تعلیمات سے انحراف ہیں۔ کیا اس سے بڑا کوئی ظلم اسلامی تاریخ میں ہو سکتا ہے کہ کسی بھی شخصیت کے اقدام کی تائید میں اُسے جاہلیت کی تاریخ بنا دیا جائے پوری اُمت اس پر متفق ہے کہ اسرائیلی روایات اور سبائی فتنہ جس نے باطنیت اور رافضیت کی صورت اختیار کی اس نے اپنی خود ساختہ روایات کو پورے اسلامی علوم میں داخل کرنے کی کوشش کی اور محققین کی جانکاہ کوششوں کے باوجود ان بے سر و پا روایات کو اسلامی تاریخ سے پورے طور پر نکالا نہ جا سکا ایسی صورت میں درایت کا

تقاضہ ہے کہ ان روایتوں کو ترجیح دی جائے جو کتاب وسنت کے عمومی مزاج سے قریب تر ہیں، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے منہاج السنہ میں اور شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحفہ اثنا عشریہ میں اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ازالۃ الخفاء میں اس کی کوشش کی ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ندوہ کے ترجمان "تعمیر حیات" میں اس کتاب پر تاریخ دانی اور ادب شناسی کے ایک مدعی صاحب نے جو تبصرہ کیا ہے وہ نہ صرف سبائی ذہنیت کا عکاس ہے بلکہ جاہلی عصبیت کے جوش میں حضور نبی کریمؐ کی تعلیمات کو بھی ملیا میٹ کر دینے کی کوشش کی گئی ہے غور کیجئے کہ تبصرہ نگار کی یہ عبارت متعصب سے متعصب مستشرق کا قلم بھی لکھتے ہوئے شاید رکتا، وہ لکھتے ہیں:

"درحقیقت مصنف کو بھی جو الجھن پیش آئی اس کے دو اسباب ہیں ایک یہ کہ انھوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کر کے اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا، کربلا کا واقعہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ تھا، وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں اُبھر کر آئیں۔"

پھر کہتے ہیں:—

مگر جس طرح صلیبی جنگوں میں شکست کا غم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ (بنو امیہ) میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔

ذرا غور کیجیے کہ قرآن پاک تو اُن کو "رحماء بینھم اور رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ" کے پُرسعادت الفاظ سے خطاب کر رہا ہے اور ہم انھیں بغضاء بینھم قرار دے رہے ہیں اسلام کے معاندین بھی اتنی جرأت سے یہ بات نہیں کر سکتے تھے جو کہ تبصرہ نگار صاحب نے لکھ دی ہے، یعنی ایک حضرت حسینؓ کے اقدام کو صحیح ثابت کرنے کے لئے پوری اسلامی تاریخ کو دریا بُرد کر دینے کی کوشش کی ہے گویا اسلام لانے کے بعد صحابہ کے درمیان جاہلی عصبیت اور زیادہ اُبھر کر

سامنے آئی اللہ تعالیٰ سے سو بار پناہ۔ حبك الشئ يعمى ويصم۔ اسی کو کہتے ہیں۔

ایک طرف تو آپ یہ لکھتے ہیں اور دوسری جگہ خود ہی فرماتے ہیں:—

"حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلاف حضرت علیؓ کو اکسانے کی کوشش بھی اُن سے (ابوسفیان) سے ثابت ہے۔"

یعنی ابوسفیان نے بنو امیہ اور بنو ہاشم کی دشمنی کو بھلا کر حضرت علیؓ کو خلافت کے لئے اکسایا دوسرے الفاظ میں حضرت علیؓ کو اپنا آلۂ کار بنایا گویا آپ نے حضرت علیؓ کی شخصیت کو بھی داغدار بنانے کی کوشش کی، آپ حوالہ طٰہٰ حسین جیسے ملحد اور احمد امین جیسے سیکولر مزاج مصنف کا دیتے ہیں، جنھوں نے مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ بات کہی کہ اسلام جاہلی عصبیت کو نہ مٹا سکا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگ پوری اسلامی تاریخ کے واقعات نظر انداز کر کے عصبیت کے پیش آنے والے دو چار واقعات کی بناء پر پوری اسلامی تاریخ کو داغدار بنا دیتے ہیں جو تاریخی بددیانتی ہے۔

اگر یہ کتاب بقول تبصرہ نگار بنو امیہ اور یزید کی صفائی کیلئے لکھی گئی ہے تو تبصرہ نگار حضرت حسینؓ کے اقدام کی صفائی میں خدا بہتر جانتا ہے کہ کس جاہلیت کا شکار ہوئے ہیں یا سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کیا نام دیا جائے۔

ایک بار ایک غلام سے ایک صحابی نے پوچھا کہ تم کس قبیلہ سے ہو وہ بولا من فلاں انھوں نے سوال کیا من انفسھم او من موالیھم وہ بولا من موالیھم۔ انھوں نے تنبیہ کی کہ پھر پہلے ہی یہ کیوں نہ کہا، اسی طرح تبصرہ نگار نے بھی اپنے کو من انفسھم ثابت کرنے کیلئے اس عصبیت کا مظاہرہ کیا ہے کیا یہ بات بالکل ہی نظر انداز کر دینے کے قابل ہے کہ یزید کی بہت سی خرابیوں کے باوجود اس کے انتخاب میں بہت سے ممتاز صحابہ کی رائیں شامل تھیں مگر حضرت حسینؓ کے اقدام میں اُن کے قریب سے قریب تر حضرات بھی اُن کے ہمنوا نہیں تھے۔

بہرحال جذباتِ محبت اپنی جگہ پر لیکن افسوس ہے کہ حضرت سمیہؓ، حضرت خباب بن ارت، حضرت حمزہ، حضرت مصعب بن عمیر، اُحد اور بیر معونہ اور عہد نبوی اور عہد صحابہ کی

بے شمار خالصتاً فی سبیل اللہ شہادتوں کی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں اتنی نہ بٹھائی جاسکی جو تشنیع کے ذریعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو دے دی گئی کیا یہ انصاف کی بات ہے؟ اس کتاب میں مصنف نے واقعات کے کنہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے مگر پھر بھی یزید کی صفائی میں قلم بعض جگہ[1] اعتدال سے ہٹ گیا ہے، بہرحال ان کی یہ علمی کوشش قابلِ قدر ہے۔

بشکریہ "الرشاد" (اپریل سنہ ۹۲ء)

۲

واقعۂ کربلا، حضرت حسین اور یزید ـــــ تاریخ اسلام کے یہ وہ عنوانات ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے اعتدال و سلامتی کے ساتھ گذر جانا ایک ناممکن نہیں تو مشکل ترین کام ضرور ہے، قرونِ اولیٰ کے حوادث ووقائع میں راقم الحروف کے خیال میں حادثۂ کربلا سے زیادہ تقریراً و تحریراً کسی کا ذکر نہ ہوا ہوگا۔ اور اسکی جزئی تفصیلات نیز اسکے اثرات کو جس اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، وہ اہتمام کسی بھی دوسرے حادثہ یا واقعہ کے بیان میں نہیں کیا گیا سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں؟ اس سوال کا جواب تلخ ضرور ہے مگر سچائی بہرحال یہی ہے کہ معرکۂ کربلا کی "بکائی تفصیلات" کی بنیاد ہی دروغ خالص اور افترائے محض پر رکھی گئی میدانِ کربلا کے مناظر کی روایت کرنے والے نہ علیؓ (زین العابدینؒ) اور زینب علیاؓ ہیں، نہ ہی عمر بن سعد اور ابن زیاد ـــــ بلکہ ان مناظر کو (چشم دید راوی کے انداز میں) بیان کرنیوالا تو ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے جو حادثۂ کربلا کے وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر تیسری صدی ہجری کی "تاریخ طبری" سے لیکر پندرھویں صدی ہجری تک ان "بکائی تفصیلات" کو مالہ وما علیہ کے اضافوں کے ساتھ اتنی مرتبہ بیان کیا گیا کہ ابو مخنف کو خود بخود "اعتبار و تقدس" کا مقام حاصل ہوگیا اور یہ بات ایک مسلمہ سچائی کے طور پر ہنوں نے قبول کر لی کہ

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے ... اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کربلا کی اس "علامتی حیثیت" اور قتل حسینؓ سے مرگ یزید کے تعلق پر اگر کوئی بحث اٹھائی گئی تو اس میں "ردِ عمل" کا پہلو اسقدر نمایاں ہوگیا کہ بات "دوسرے رخ" سے بگڑ گئی اور "خلافت معاویہؓ و یزید" جیسی کتابوں میں ابو مخنف کے دجل و فریب کو نمایاں کرنے سے زیادہ حضرت حسینؓ کی "حیثیت عرفی" کو مجروح کرنیکی کوشش کی گئی۔

یہ وہ دو متضاد فکریں ہیں جنکی موجودگی نے نہ صرف واقعۂ کربلا بلکہ حضرت حسینؓ اور یزید بن معاویہؓ کے کردار پر قلم اٹھانے کو ایک مشکل ترین کام بنا دیا ہے ـــــ اور خدا کا شکر ہے کہ زیر تبصرہ کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" کے مصنف مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب نے اس مشکل کو بڑی سلامت روی کے ساتھ عبور کر لیا ہے۔

[1] اس تبصرہ کی الرشاد میں اشاعت کے بعد جلد ہی مصنف کربلا نے مولانا محب اللہ صاحب سے ایک ملاقات کے دوران یہ گذارش کی ہے کہ اگر وہ ان مقامات کو نشان زد فرما دیں تو غور اور اصلاح میں آسانی ہوگی۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصحاب رسول کے سلسلہ میں امت کے اجماعی ”عقیدۂ احترام
و اعتبار کو قارئین کے ذہنوں میں راسخ کرانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور یہی وہ ایک خدمت ہے
جو انشاء اللہ اجر اُخروی سے خالی نہ ہوگی، کیونکہ واقعۂ کربلا جیسے اہم نزاعی اور ہنگامہ خیز و ہنگامہ
پرور عنوان پر قلم اُٹھانے کے بعد ”سبائی و خارجی“ دونوں فکروں سے دامن بچا کر اہلسنت کی معتدل فکر کو
اپنا کر نباہ دینا، اور مقامِ صحابیت کے سلسلہ میں بنو امیہ و بنو ہاشم کے درمیان تفریق نہ برتنا، اور
یک چشمی و کور باطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنو ہاشم سے اظہارِ عقیدت کیلئے بنو امیہ کو، یا بنو امیہ سے
اظہار عقیدت کیلئے بنو ہاشم کو مطعون کرنے کی غیر معتدل بلکہ غیر اسلامی فکر سے عافیت کے ساتھ
دامن بچالے جانا ہی ایک بہت اہم اور لائق مبارک باد کارنامہ ہے۔
جہاں تک کتاب کے سرنامہ یعنی ”واقعۂ کربلا“ کی تفصیلات اور اس سے ماخذ کردہ نتائج
کا معاملہ ہے تو چند جزئی اختلافات کے سوا تمام مندرجات سے اتفاق کے باوجود تبصرہ نگار اپنی
اس رائے کا اظہار کرنے پر مجبور ہے کہ غالباً منجانب اللہ واقعۂ کربلا کا قیامت تک نزاعی رہنا ہی
مقدر ہو چکا ہے کیونکہ نہ حسینؓ کو ”بناء لا الٰہ“ قرار دے کر یزید کو فاسق و فاجر بلکہ دائرۂ اسلام
تک سے خارج گرداننے والے ختم ہوں گے، نہ یزید کو خلیفہ موعود زاہد مرتاض، بلکہ صحابی رسول
تک قرار دے کر حسینؓ کو (معاذ اللہ) جاہ پرست، باغی و سرکش اور مزاج اسلامی سے
ناآشنا گرداننے والے ختم ہوں گے، اور جب ایسا ہے تو انیس و دبیر کے مرثیوں اور محمود احمد عباسی
کی ”خلافت معاویہؓ و یزید“ کی متضاد فضا کے درمیان ”راہ اعتدال“ کی پذیرائی جس مخصوص
جرأت و حمیت کی طالب ہے وہ عنقا نہیں تو کم یاب ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ
راہِ اعتدال کی تلاش کا کام ہی بند کر دیا جائے، مصنف نے یقیناً ایک مبارک مہم میں شمولیت

اختیار کی ہے، خدا کرے کہ وہ بہتے دھاروں کے رُخ پر جانے والے کچھ تنکوں ہی کو روکنے میں کامیاب
ہو سکیں، خلاصہ یہ ہے کہ زیر تبصرہ کتاب واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچنے
اور قبول کرنے کیلئے ایک معتدل ذریعہ ہے اور اس کا مطالعہ تو بہرحال ”سب ہی“ کو کرنا چاہیئے۔

تبصرہ ماہنامہ ”البدر“ کاکوری (اپریل مئی ۹۲ء)
از قلم مولانا عبد العلی فاروقی

چھپتے چھپتے ملیں

ادارہ الفرقان بے پناہ مسرت کے ساتھ اپنے قارئین کو یہ مسرت انگیز خبر سناتا ہے کہ آج بروز دوشنبہ مطابق ۶ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ سرپرست الفرقان حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کی خواہش پر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے اور نہایت خوشگوار ماحول میں تقریباً نصف گھنٹہ یہ ملاقات رہی۔ امید ہے کہ ہر دو بزرگوں کی اس ملاقات کی برکت سے ماحول کی وہ نامناسب کشیدگی یکسر ختم ہو جائے گی جو علمی اختلاف رائے میں ناروا اور امت کے لیے ایک فتنہ و ابتلاء ہے۔ —— مدیر

ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) جولائی ۱۹۹۲ء از ص۴۴ تا ص۵۰

بے خبری میں بڑی راحت ہے

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر

کراچی کے مؤقر انگریزی ماہنامہ "یونیورسل میسیج" کا تبصرہ (اشاعت جولائی ۱۹۹۲ء)

اردو تصنیفات میں تحقیق کی ہمیشہ شدید کمی محسوس کی گئی ہے۔ اور اگر اس تحقیق کا تعلق اسلامی تاریخ کے ایک ایسے المناک واقعے سے ہو جسکے اندوہ ناک اثرات تنازعہ، اختلاف اور تشدد آمیز رد عمل کی صورت میں رونما ہوئے ہوں تو اسکی ضرورت اور اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن نے اپنی اس تصنیف میں جسے انکے وسیع مطالعے کا شاہکار کہنا چاہیے، اسی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

اعتراضات کی پیش بندی کی خاطر مولانا عتیق الرحمٰن نے یہ وضاحت کردی ہے کہ "یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے (ص ۲۰) اپنی اس

Waqai Karbala Aur Uska Pas Manzar

Author Maulana Atiqur Rahman Sambhali

Publisher Al-Furqan Book Depot 114/31, Nazirabad, Lucknow, India.

Pages 264

Price Rs.60.00

Research has always been in dire demand in Urdu works. If this research pertains to a tragic episode of Muslim history casting its ominous shadows of dispute, dissension and violent reactions, it becomes an acute need. What Maulana Atiqur Rahman has done through this book is to academically contribute towards this need, this is the magnum opus of his extensive study.

To forestall objections Maulana Atiqur Rahman writes: "We have no relationship with Yazid, if there is, it is firstly with Hazrat Hussain. We have no relationship with Hazrat Muawiyya; if there is, it is firstly with Hazrat Ali" (Page 20). And, throughout his research work, besides being guided by this memorable quote, he has indefatigably tried to be impartial and unprejudiced, a truth-seek: and a strict trasher of fact from fiction.

پوری تحقیقی تصنیف میں انھوں نے اپنے اس یادگار قول کو ملحوظ رکھا ہے اور ایک غیر جانبدار اور بے تعصب طالب حق کی حیثیت سے حقائق کو افسانوں سے الگ کرنے کے لئے بے پناہ چھان پھٹک کی ہے۔

اس کتاب سے زیادہ متنازعہ مولانا عبداللہ عباس ندوی کا اس پر وہ تبصرہ رہا ہے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان "تعمیر حیات" میں شائع ہوا ہے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی میں چلنے والے اس باوقار دینی و علمی ادارے میں مولانا عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیمات ہیں۔ انھوں نے اپنے تبصرے میں جو نکات اٹھائے ہیں ان پر الفرقان لکھنؤ کے مئی۔جون ۱۹۹۲ء کے شمارے میں بحث کی گئی ہے۔

مجھے جو بات دلچسپ بھی لگی اور حیرت انگیز بھی وہ یہ ہے کہ ندوی تبصرہ نگار نے مولانا عتیق الرحمٰن کو سلمان رشدی کے زمرے میں رکھا ہے۔ غالباً تبصرہ نگار کو یہ علم نہیں ہے کہ مولانا عتیق الرحمٰن برطانیہ کی اسلامی تنظیم اسلامی دفاعی کونسل (اسلامک ڈیفنس کاؤنسل)

More than this book, Maulana Abdullah Abbas Nadvi's review in Taamir-e-Hayat, the official organ of Darul Uloom Nadwatul Ulama, Lucknow, whose administrator is Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi, has become controversial. Maulana Abdullah Abbas is Secretary for Education of this prestigious Ulama institution and the points raised in his review are the subject matter of Al- Furqan, Lucknow May-June 1992 issue.

What amused rather amazed me was that Nadwa's reviewer has put Maulana Atiqur Rahman in the category of Salman Rushdie. Presumably, the reviewer does not know that M. Atiqur Rahman is the Chairman of Islamic Defence Council formed in United Kingdom and is one of those who led a massive demonstration of British Muslims organized by the British Muslim Action Front in London in protest against Rushdie's book on 27 May 1989. Ignorance is bliss and this bliss made Nadwa's reviewer to sketch a similarity in approach between Rushdie and M. Atiqur Rahman.

M. Atiqur Rahman's book is thought-provoking, informative and history. It is a MUST for research on Karbala.

Abul Amal.

کے صدر ہیں اور اُن لوگوں میں ہیں جن کی قیادت میں برطانیہ کے مسلمانوں نے برطانوی مسلم ایکشن فرنٹ کے زیر اہتمام لندن میں ۲۷ مئی ۱۹۸۹ء کو رشدی کی کتاب کے خلاف ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا تھا۔ [ع] یہ خبری میں بھی بڑی راحت ہے اور اسی راحت کا نتیجہ ہے کہ ندوی مبصرؒ کو رشدی اور مولانا عتیق الرحمٰن کے طرزِ فکر میں مماثلت نظر آئی۔

مولانا عتیق الرحمٰن کی کتاب فکر انگیز پُراز معلومات اور تاریخ پر مبنی ہے کربلا کے واقعہ پر تحقیق کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ) [لے]

لے ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۲ء از ص ۷۵ تا ص ۷۷

ع اُس مظاہرے کی صحیح تاریخ جس کی قیادت مولانا عتیق الرحمٰن نے کی ۲۸ جنوری ۸۹ء ہے۔ تبصرہ نگار کو یہاں قدرے اشتباہ ہوا ہے۔ (الفرقان)

ذکر و فکر / جناب خالد مسعود (لاہور) — تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحی

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر

یہ کتاب تاریخ اسلام کے ایک نہایت اختلافی مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے برصغیر میں بیسیوں کتابیں تصنیف کی گئی ہیں یہ کتاب ان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

کتاب کا آغاز حضرت معاویہؓ کی حضرات حسنینؓ کے بارے میں اکرام و عطا کی پالیسی اور ان کے حلم و عفو کے تذکرہ سے ہوتا ہے۔ جس کے تحت انہوں نے ہمیشہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا حضرت حسینؓ کو اہل کوفہ نے جو تلون مزاجی انتشار پسندی اور حکومت کے خلاف باغیانہ جذبات رکھنے کے لئے مشہور تھے حکومت کے خلاف کسی اقدام پر آمادہ کرنا چاہا لیکن انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کا احترام کیا اور اہل کوفہ کو گھروں میں قرار پکڑنے اور شک و شبہ کا ماحول پیدا کرنے سے باز رہنے کی ہدایت کی۔

حضرت معاویہؓ نے ۵۶ھ میں اپنی ضعیف العمری اور قرب موت کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ اپنے بعد خلافت کی باگ ڈور اپنے بیٹے یزید کے حوالے کرنے کے اقدامات کریں۔ اس سلسلہ میں فاضل مصنف اس روایت کو صحیح قرار نہیں دیتے جس میں یزید کی نامزدگی کی تجویز کا خالق حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو بتایا گیا ہے۔ اولاً ان کا انتقال ۴۹ یا ۵۰ھ میں ہو چکا تھا ثانیاً روایت کی رو سے وہ یہ تجویز اپنی خود غرضی اور نفس پرستی کی بناء پر پیش کرتے نظر آتے ہیں جبکہ یہ بات محل نظر ہے کیونکہ وہ سو سے زائد روایات بیان کرنے والے جلیل القدر صحابی ہیں جو بیعت رضوان سے مشرف ہوئے اور خلفائے راشدین کے عہد میں بحرین بصرہ اور کوفہ کے گورنر رہے۔ حضرت معاویہؓ نے یزید کی نامزدگی کا مسئلہ عرب کے مختلف شہروں سے بلائے گئے وفود کے ایک اجلاس میں پیش کیا تھا جنہوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور اس کے بعد صوبائی دارالحکومتوں میں اس مسئلہ پر بیعت لی گئی۔

حضرت معاویہؓ نے خلافت کے لئے یزید ہی کو کیوں نامزد کیا؟ اس حقیقت کو جاننے کے لئے فاضل مصنف نے شواہد جمع کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یزید کو کاروبار

مملکت چلانے کے لئے اہل تر اور اس کے انتخاب کو ملت کی مصلحت کے مطابق سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ منبر پر اپنے خطبہ کے دوران یہ دعا کی کہ "اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یزید کو اس کی اہلیت کی بناء پر ولی عہد بنایا ہے تو اس ولایت کو تو تکمیل تک پہنچا اور اگر میں نے اس کو محبت کی بناء پر ولی عہد بنایا ہے تو پھر تو اس مقصد کو پورا نہ ہونے دے"۔ تاہم فاضل مصنف اس تجویز کو مصلحت اندیشی کا بہترین نمونہ نہیں سمجھتے کیونکہ اس سے سابقین کو نظر انداز کر کے متاخرین کو خلافت سونپنے کا آغاز ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ کے ہم عصر معترضین نے اس انتخاب پر یہی اعتراض کیا تھا۔ یزید کی بے اخلاقی، بے قیدی، یا فسق و فجور اس زمانہ میں کبھی موضوع بحث نہیں بنا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد کی فسانہ طرازی کا حصہ ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یزید کے زمام اقتدار سنبھالنے پر جب اہل مدینہ نے بیعت کی تو حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو بھی بیعت کے لئے بطور خاص بلوایا گیا۔ انہوں نے گورنر سے غور کرنے کی مہلت لے لی۔ اواس سے فائدہ اٹھا کر مکہ کو روانہ ہو گئے اہل کوفہ کے مسلسل اصرار پر حضرت حسینؓ نے مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا اور خود بھی وہاں جانے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ اہل خاندان اور دوسرے بہی خواہوں نے ان کو حکومت کے خلاف کسی اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس مشورہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ جب کوفہ کی جانب روانہ ہوئے تو سفر کے دوران پے در پے کئی شہادتیں ملیں کہ اب حالات موافق نہیں رہے اور کوفہ پر حکومت کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے لیکن وہ برابر اپنے عزم پر قائم رہے۔ بالآخر جب مسلم بن عقیل کے قتل کی خبر بھی آگئی تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ مسلم کے بھائیوں نے انتقام کا نعرہ بلند کر دیا اور حضرت کو ان کی رائے کے سامنے جھکنا پڑا۔

کوفہ کے قریب عمر بن سعد کے فوجی دستہ نے آپ کا راستہ روکا۔ عمر کے ساتھ مذاکرات میں آپ نے اپنی تین مشہور شرائط پیش کیں کہ یا تو مجھے مکہ واپس جانے دو یا یزید کے پاس جانے دو یا اجازت دو تو میں سرحدوں کی جانب نکل جاؤں۔ ابن سعد نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ اور اس کی اطلاع گورنر کوفہ عبید اللہ ابن زیاد کو دی۔ وہاں سے حکم نامہ آیا کہ حضرت پہلے کوفہ آئیں اور ابن زیاد کے ہاتھ میں ہاتھ دیں۔ اس تجویز کو حضرت حسینؓ نے رد

کر دیا تو قافلے کو میدان کربلا میں روک لیا گیا۔

میدان کربلا میں کیا ہوا؟ اس سلسلہ کی روایت کو فاضل مصنف متضاد اور اعجوبہ روایتوں کا ایک جنگل قرار دیتے ہیں جو صرف تحیر کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہ بے سند، ناشقابل اعتبار، مبالغہ آمیز، زندگی کے حقائق سے ہٹی ہوئی اور روایوں کی قوت تخیل کا کرشمہ ہیں۔ یہ کسی معرکہ کارزار کا تاثر نہیں دیتیں بلکہ میلہ عکاظ کا تاثر دیتی ہیں۔ جہاں لوگ اٹھ اٹھ کر اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے ہیں۔ پھر مبارزت ہوتی ہے۔ پھر جنگ کا طویل سلسلہ چلتا ہے۔ اس میں راویوں نے ماتمی ماحول پیدا کیا ہے اور شیعی عقائد کے حق میں فضا ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ میدان کربلا کے واقعات اور اس کے بعد کی سرگزشت کسی شیطانی منصوبے کی تکمیل کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔

فاضل مصنف کے نزدیک ابتداء میں بنو عقیل کے نعرہ انتقام اور بعد میں ابن زیاد کے کوفہ میں بیعت لینے پر اصرار نے معاملہ خراب کر دیا ورنہ نہ یزید اور نہ اس کے مدنی گورنروں نے حضرت کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کیا تھا۔ ابن زیاد ایک سخت گیر منتظم اور بنوامیہ کا احسان مند تھا۔ کوفہ کے حالات اس کے لئے ایک چیلنج بنے ہوئے تھے جن میں اس نے وہ روش اختیار کی جو امت میں ایک عظیم حادثہ کا پیش خیمہ بن گئی۔

فاضل مصنف نے دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسی راہ اعتدال تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس سے نہ کسی صحابی رسول کے کردار پر حرف آئے اور نہ بے جا تعصب سے کام لیا جائے۔ وہ یقیناً اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔

(مجلہ "تدبر" لاہور مئی ۱۹۹۲ء ص۴۵ تا ۴۷)

۲

صدر اول کی تاریخ کے لئے چند رہنما نکات:

تدبر کی گزشتہ اشاعت میں ہم نے مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی کتاب واقعہ کربلا کا تعارف کرایا تھا۔ ہمارے ایک قاری نے یہ استفسار کیا ہے کہ اس واقعہ کے بارے میں تدبر کا اپنا موقف کیا ہے؟۔ یہ واقعہ امت مسلمہ کے اندر اختلاف کی جڑ ہے اور اس کی توجیہات کی بڑی بہتات ہے۔ اس لئے لوگ وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں استفسارات کرتے

رہتے ہیں۔ ادارہ تدبر کا موضوع تاریخ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم تاریخ کے مسائل کے بارے میں تحقیق کے دعویدار نہیں ہیں۔ تاہم ہماری رائے میں صدر اول کی تاریخ کے بارے میں بنیادی رہنمائی خود قرآن و سنت سے مل جاتی ہے۔ اس کی روشنی میں اگر مؤرخین کے بتائے ہوئے ان امور پر غور کیا جائے جن پر ان کا اجماع ہے تو ہمارے خیال میں حق سے قریب تر نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند نکات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱- رسول اللہ ﷺ کو یہ مقام حاصل ہے کہ آپ کے فرضِ رسالت کی کامیابی کے ساتھ تکمیل اور دوسرے ادیان پر غلبہ کی خبر خود قرآن نے دی ہے۔ تیئیس برس کی محنت کے بعد آپ نے انسانوں کی وہ جماعت تیار کی جو قرآن کے الفاظ میں کفار کے لئے بے حد سخت اور اہل ایمان کے لئے نہایت شفیق تھی۔ اس کی تمام جدوجہد کا مقصد اللہ کی رضا کی تلاش تھی۔ ایمان کی نورانیت ان پاکیزہ انسانوں کی جبینوں سے ہویدا تھی اور ان کے شب و روز خدا کی محبت میں رکوع و سجود میں بسر ہوتے تھے۔ لہٰذا قرآن کو ماننے والا کوئی شخص کسی ایسے نقطۂ نظر کو نہیں مان سکتا ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کی اس جماعت کو اسلام کی باغی یا ایمان سے خارج بتایا گیا ہے۔ ایسا نقطۂ نظر مان لینا رسول اللہ ﷺ کو معاذ اللہ اپنے فرضِ رسالت میں ناکام ماننے کے مترادف ہے۔

۲- قرآن مجید نے صحابہ کرامؓ کی جماعت میں سابقون اولون، مہاجرین، انصار اور بعد میں اسلام لانے والوں کے الگ الگ درجات بیان کئے ہیں۔ پہلے گروہوں کی بطور خاص تحسین فرماتے ہوئے خبر دی ہے کہ اللہ ان کے حسن کارکردگی کے باعث ان سے راضی ہو گیا۔ ان کا صلہ اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ قرآن کے اسی بیان کی روشنی میں صدرِ اول کی اسلامی حکومت اور عوام دونوں نے جماعتِ صحابہ کے ان طبقات کے ساتھ ہمیشہ خاص معاملہ کیا اور انکے اکرام میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انکے بارے میں یہی صحیح رویہ ہے۔ اللہ کے ان منظور نظر اور نبی ﷺ کے معتمدؓ ساتھیوں کے ساتھ اس کے برعکس کوئی رویہ اختیار کرنا خدا اور رسول کے ساتھ دشمنی ہے۔

۳- اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ وحی الٰہی کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ اگر کبھی وہ جانب حق میں بھی کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ تو وحی کے ذریعے ان کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ انبیاء کے سوا اور کسی کو خواہ اس کا تعلق صحابہ کرام سے ہو یا صلحاء و ابرار سے وحی

کا یہ تحفظ حاصل نہیں۔ لہٰذا وہ معصوم نہیں ہیں اور ان سے اجتہادی غلطیاں سرزد ہوتی رہی ہیں۔ ان کے افعال کے لئے کسوٹی قرآن و سنت ہی ہے۔

۴- تاریخی طور پر حضرت علیؓ کا شمار سابقون اولون میں ہے اور اسلام کے لئے ان کی خدمات نہایت شاندار ہیں۔ حضرت معاویہؓ فتح مکہ سے قبل اسلام اور ہجرت سے مشرف ہوئے کتابت وحی کی عزت سے سرفراز ہوئے اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے رومیوں پر اسلام کی دھاک بٹھائی۔ حضرت علیؓ کے صاحبزادگان کا شمار صغار صحابہ میں ہے جن کو عالم شعور میں نبی ﷺ کی تربیت میں رہنے اور آپ کے ہمراہ دین کے لئے جدوجہد کا موقع نہیں ملا۔ یہ جب سن رشد کو پہنچے تو اسلامی مملکت مستحکم ہو چکی تھی۔ ان اہم شخصیات کے معاملات پر غور کرتے وقت ان کے فرقِ مراتب کو نگاہ میں رکھنا بے حد ضروری ہے۔

۵- مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی مملکت اسلامیہ میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو گیا تھا۔ منصب قضاء پر فائز لوگوں کا انتخاب اہل علم و تقویٰ میں سے ہوتا۔ پورے دور بنی امیہ میں اسلامی قانون نافذ رہا اور اس سے کوئی انحراف نہیں ہوا۔ لہٰذا اس دور میں حکومت کے ساتھ کفر و اسلام کے معرکے پیش آنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اگر شریعت سے انحراف کی کوئی صورت پیدا ہوئی ہوتی تو اموی دور کے دو تہائی عرصہ تک بڑے جلیل القدر صحابہ ابھی زندہ تھے۔ ان کا وجود اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کے سامنے کسی حکومت سے کفر بواح کا صدور نہیں ہوا اور نہ وہ اس کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کرتے۔

۶- حکومت میں باپ کے بعد بیٹے کا جانشین ہونا خلاف شرع نہیں۔ سیدنا عمرؓ نے اپنی جانشینی کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بھی رکن نامزد کیا تھا۔ وہ مشورہ میں شریک تھے لیکن حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ایسا کرنا خلاف شرع ہوتا بلکہ اس لئے کہ حضرت عمرؓ کے بقول بار خلافت کی جوابدہی کے لئے خاندان بنی عدی میں سے تنہا حضرت عمرؓ ہی کافی تھے۔ اسی طرح حضرت علیؓ کی جانشینی کے لئے ان کے صاحبزادے حضرت حسنؓ کا انتخاب کیا گیا حالانکہ ان سے اہل تر اور زیادہ تجربہ کار معمر صحابہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔

۷- خاص واقعہ کربلا میں اس امر پر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ حضرت حسینؓ کے کوفہ جانے کے فیصلہ سے متعدد صحابہ نے اختلاف کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ خدا نخواستہ اسلام کے بہی خواہ نہ تھے بلکہ دین کے ان وفادار و جانثار خادموں کی نگاہ میں حقائق وہ نہیں تھے۔ جو

حضرت حسینؓ کو بتائے گئے تھے۔

۸۔ اصل صورت حال سے مطلع ہو کر حضرت حسینؓ کا تین شرائط پیش کرنا بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس اقدام کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اقدام کو کفر و اسلام کے معرکہ کی حیثیت نہیں دے رہے تھے۔ بلکہ اب وہ اس غلط فہمی سے نکل آئے تھے جس میں مبتلا کئے گئے تھے۔ ورنہ کفر کے مقابل میں اسلام کے حق میں اٹھایا ہوا قدم واپس لینے کے کیا معنی!

۹۔ جس دور میں واقعہ کربلا پیش آیا اس زمانہ کے لوگوں نے اس کو کبھی کفر و اسلام کی آویزش کے رنگ میں نہیں دکھایا بلکہ اس کو ایک افسوس ناک حادثہ کی حیثیت دی۔ اس حیثیت کا تعین کرنے والوں میں بڑے جلیل القدر صحابہ شامل تھے۔

ہمارے خیال میں اس پر آشوب دور کے ہر اس مؤرخ کی تحقیق یقیناً قابل قدر ہے۔ جو مذکورہ بنیادی حقائق جو قرآن و سنت کے نصوص اور مؤرخین کے اجماع پر مبنی ہیں، کالحاظ کر کے حقیقت کو دریافت کرنے کی سعی کرے، ان حقائق سے ہٹ کر جب ہم کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو یہ امت کے اندر تفرقہ اور انتشار کا باعث ہوتی ہے۔

(ماہنامہ "تدبر" لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۹۲ء)

الفرقان کی ڈاک

۱

(مولانا) عبدالقدوس رومی
مفتی شہر شاہی جامع مسجد آگرہ (یوپی)

محب گرامی جناب مولوی خلیل الرحمٰن سجاد صاحب زید فضلہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

اتفاق ہی ہے کہ بہت دنوں بعد جامعہ اشرف المدارس میں آج تعمیر حیات کا تازہ شمارہ سامنے آگیا اور دوسرا اتفاق یہ بھی دیکھئے کہ یہ شمارہ ایک ایسے مضمون پر مشتمل نکلا کہ اگر کہیں تعمیر حیات اب بھی میرے پاس آنا ہوتا تو اس مضمون کو پڑھنے کے بعد آپ کو خط لکھنے سے پہلے مجھے ادارہ تعمیر حیات کو خط لکھنا پڑتا کہ ازراہ کرم آئندہ سے وہ مجھے اس اعزاز سے محروم فرما دیں اور میرے نام رسالہ کا اجرا بند کر دیں لیکن اس کی ضرورت ہی نہ رہی کہ تعمیر حیات ادھر جب سے میرا الٰہ آباد میں قیام کا سلسلہ شروع ہوا از خود ہی آنا بند ہو گیا ہے۔

اس تحقیق کی داد و تحسین کے لئے ابلیس لعین سے بہتر کون ہوگا کہ حضرات صحابہ کرام کے مرتبہ و مقام اور ان کے تقدس و احترام کا درجہ متعین کرنے کے لئے آیات خداوندی و ارشادات نبوی کافی نہیں ہیں...... بلکہ اگر ان کا صحیح مرتبہ و مقام سمجھنا ہے تو آیات قرآنی و ارشادات نبوی سے قطع نظر کرکے سید قطب، احمد امین، عبدالقادر مازنی، عباس محمود العقاد جیسے محروم الحقیقہ محققین کی کتابوں کی ظلمات کی تاریکی میں دیکھنا ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پتہ نہیں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب تک بھی یہ تبصرہ پہنچا ہوگا کہ نہیں؟ اور آپ یا وہ کوئی صاحب اس تبصرہ کا نوٹس لیں گے یا نہیں؟

اپنے حضرت والد صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرکے دعا کی درخواست پیش کر دیں

اور خود بھی رمضان المبارک کی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ والسلام

عبدالقدوس رومی غفرلہٗ

۲

مولانا مفتی منظور احمد مظاہری، قاضی شہر کانپور، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

ملک کے دینی و علمی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ مولانا موصوف نے "تبصرہ" کے بارے میں اپنے تأثرات حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کو بھیجے تھے ــــ حال ہی میں انھوں نے اس کی ایک نقل مدیر الفرقان کے نام اپنے خط کے ساتھ بھیجی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۵ رمضان۔ کانپور

محترم و مکرم بندہ حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

رمضان المبارک کا یہ محترم مہینہ جس میں بزرگوں کے یہاں ڈاک کا سلسلہ ہی بند رہتا ہے اس میں قلبی تاثرات سے مجبور ہو کر آنجناب کی توجہ تعمیر حیات لکھنؤ کی ۱۰ مارچ ۹۲ء کی اشاعت کی جانب مبذول کرا رہا ہوں جس میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں ان صحابہ کرامؓ پر تبرّا کیا ہے جو بنو امیہ سے تعلق رکھتے ہیں بالخصوص حضرت ابوسفیانؓ اور انکے خانوادہ کو خوب خوب ہدف ملامت بنایا ہے بلکہ انکے اسلام کو بھی مشکوک بنانے کی سعی نامشکور کی ہے۔ ہم اس تبرّائی ذہنیت کا جواب دینا جانتے ہیں لیکن آپ کو صرف اس لئے زحمت دی گئی کہ "تعمیر حیات" ندوہ کا ترجمان ہے اور مولانا عبداللہ عباس ندوی ندوہ کے ناظم تعلیمات ہیں اور آنجناب ندوہ کے ناظم اور تعمیر حیات کے سرپرست ہیں اس لئے اس تبرّائی

مضمون کی تردید آپ کی طرف سے ضروری ہے ورنہ ایک بڑا طبقہ غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتا ہے اور لوگ ایک ندوی کے خیال باطل کو ندوہ کی ترجمانی سمجھ سکتے ہیں اس لئے باوجودیکہ آپ کے بارے میں ہمارا یقین ہے کہ آپ مذکورہ تبصرہ سے بیزار ہوں مگر بوجوہ مذکورہ سے آپ کی خاموشی سے بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس لئے اسکے بارہ میں اپنی دوٹوک رائے عالی جلد ظاہر فرمائیں۔ بڑوں کے سامنے زبان کھولنا بے ادبی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صحابہ کے بارے میں ایسا بیباک ندوہ کے اس منصب جلیلہ کے لائق نہیں ایسا شخص ندوہ کو مسلک اہل سنت کے معتدل مسلک سے ہٹا کر رفض کے غار میں ڈھکیل دے گا یہ صاحب عرب میں زیادہ رہے ہیں اور سید قطب اور سید مودودی سے زیادہ فیض یاب ہوئے انھیں غالباً ابھی لکھنؤ کی ہوا نہیں لگی اور شاید انھیں ابھی ہندوستان کے [illegible] سے واسطہ نہیں پڑا ہے۔ کاش میں نے رمضان میں یہ گندا مضمون نہ پڑھا ہوتا دو روز سے مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہے۔ تعمیر حیات میں آپ کی جانب اس تبصرہ کی تردید سکون بخش ہوگی اور بہت سے فتنہ کو دبا دے گی۔

فقط والسلام۔ منظور احمد مظاہری کانپور

۳

(مولانا) محمد عیسیٰ، لندن

باسمہ سبحانہٗ

۲۸ اپریل ۱۹۹۲ء

بخدمت گرامی جناب مولانا عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ۔۔۔۔ ہندوستان میں آپ سے نہ مل سکنے کا افسوس ہے۔ کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی جس توازن و اعتدال کے ساتھ آپ نے سانحہ کربلا کو قلمبند کیا ہے طبیعت خوش ہو گئی اس کتاب کے متعلق پاکستان کے بھائی عبدالوہاب سے گذشتہ سال بھی اور اس سال ڈھاکہ میں بھی میری بات ہوئی تھی پاکستان میں نہ جانے کتنے لوگوں تک انھوں نے کتاب کے تذکرے پہنچائے رائے ونڈ سے بہت سے

یہ کہتے ہوئے آئے کہ بھائی عبدالوہاب صاحب کہہ رہے تھے کہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی بہت اہم کتاب آرہی ہے۔

شروع رمضان ہی میں تعمیر حیات میں کتاب پر تبصرہ پڑھ کر حیران رہ گیا ایسا لگتا تھا کوئی پشتینی عداوت نکال رہے ہوں کوئی توجیہہ سمجھ میں نہ آسکی سوائے اس کے کہ خلیج کے مسئلہ میں آپ کے موقف پر کس کے بدلہ چکا رہے ہوں خاص طور سے اموی صحابہؓ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر دل کانپ گیا مودودی صاحب نے تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا تھا غالی رافضی کے علاوہ صحابہؓ کے بارے میں اتنے سخت الفاظ کہیں نہیں دیکھے بدر کے ساتھ ڈانڈے ملا کر اموی صحابہؓ کے ساتھ سخت عداوت کا مظاہرہ کیا ہے گذشتہ نصف صدی سے الفرقان میں علی میاں کی کتاب کا تعارف بلکہ تعریف ہی دیکھی آپ نے خوب صلہ پایا..........

میرا خیال ہے تعمیر حیات میں آج تک کسی پر ایسا سخت و معاندانہ تبصرہ نہیں پڑھا حتیٰ کہ قادیانیوں وشیعوں پر بھی نہیں انھوں نے جس روایت پر تبصرہ کی بناء رکھی ہے مجھے یاد نہیں پڑتا پوری کتاب میں آپ نے کہیں بیعت کے معنیٰ میں بیان کیا ہو ہر جگہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور اس کی مرضی کے حوالے کرنے کے معنیٰ ہی میں لکھا ہے پتہ نہیں کون سی عبارت سے عبداللہ عباس ندوی صاحب نے حسینؓ دشمنی کشید کر کے اسے رسولؐ دشمنی کا نتیجہ قرار دے دیا میرا تو خون کھول اٹھا، میرے نزدیک تعمیر حیات کے تبصرہ سے ندوہ (جس کا وہ ترجمان ہے) اور مولانا ...... بری الذمہ نہیں قرار دیئے جاسکتے ....

والسلام

محمد عیسیٰ
لندن

(۴)

(مولانا) محمد عبیداللہ
خطیب جامع مسجد، مشرقی بازار
بھمبر، کشمیر (پاکستان)

مکرم و محترم جناب مدیر الفرقان۔ سلام مسنون
امید کہ مزاج بعافیت ہوگا۔

کتاب "واقعۂ کربلا" تین عدد وصول ہوگئی ہے۔ کتاب روایۃً و درایۃً نہایت معقولیت اور انصاف پسندی پر مبنی ہے شیعیت سے متأثر ہو کر اور سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہوئے جن اصل حقائق پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اور ہمارے آدمی بھی لکیر کے فقیر ہو کر تسلیم و بیان کرتے چلے آرہے تھے، اصل حقائق سے ان پردوں کو نہایت محتاط انداز سے اٹھا دیا گیا ہے کاش یہ کتاب ہند و پاک کے ہر خطیب تک پہنچ سکے..........

والسلام
محمد عبیداللہ

طعنِ صحابہؓ

صحابہ پر طعن کرنا درحقیقت پیغمبر پر طعن کرنا ہے جس نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ کی تعظیم و توقیر نہ کی وہ رسول پر ایمان لایا ہی کب؟ اگر اصحاب نبیؐ میں کوئی خباثت تھی تو (نعوذ باللہ) یہ بات پیغمبر تک پہنچی گی۔ اللہ ہمیں ایسے برے اعتقاد سے بچائے۔ علاوہ ازیں جو احکام شرعیہ قرآن و حدیث کی راہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ وہ صحابہ کے توسط اور ذریعہ سے ہی تو پہونچے ہیں۔ صحابہ قابلِ طعن ہوں گے تو انھوں نے جو چیزیں نقل کی ہیں وہ بھی قابلِ طعن ہوں گی۔ اور یہ بات کسی ایک کے ساتھ یا چند کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کل کے کل صحابہ عدالت صدق اور تبلیغ میں مساوی ہیں۔ پس ان میں سے کسی پر طعن و تبرا کرنا دین پر طعن کرنا ہے۔ اللہ اس جرأت بیجا سے پناہ میں رکھے۔

ماخوذ از مکتوب امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ
بنام مرزا فتح اللہ شیرازی
تجلیات ربانی نمبر۱ - از مولانا نسیم احمد فریدی

⑤

مولانا جمیل احمد نذیری
ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم
مبارک پور۔ اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہٗ

۲۵ ر ذوقعدہ ۱۴۱۲ھ

مکرمی و محترمی ! زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

"الفرقان" کی اشاعت خاص "مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ" موصول ہوئی تفصیلات پڑھ کر حیران رہ گیا۔ ذمہ دارانِ ندوہ اتنی زبردست چوک کا شکار ہو گئے اور تلافی و تدارک بھی نہ کر سکے، سخت رنج و افسوس ہوا۔

۱۰ رمئی کے "تعمیر حیات" میں مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی کے تبصرہ کے بارے میں یہ وضاحت آئی ہے کہ وہ "ایک انفرادی رائے کا مظہر تھا" اسی کے ساتھ چند باتیں اور بھی۔

احقر نے اس کے متعلق مدیر "تعمیر حیات" کے نام ایک مراسلہ بھیجا ہے اس کی نقل آپ کو بھی بھیج رہا ہوں، مناسب سمجھیں تو "الفرقان" میں شائع کر سکتے ہیں۔

والسلام

جمیل احمد نذیری

مراسلۂ مولانا جمیل احمد نذیری بنام ایڈیٹر تعمیر حیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۳ ر ذوقعدہ ۱۴۱۲ھ

مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب پندرہ روزہ تعمیر حیات۔ زیدت حسناتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"واقعۂ کربلا اور اس کا تاریخی پس منظر" پر "تعمیر حیات" میں شائع شدہ مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کے تبصرہ کے متعلق آپ "تعمیر حیات" کے شمارہ ۱۰ رمئی ۹۲ء صفحہ ۱۲ پر لکھتے ہیں۔

"وہ ایک انفرادی رائے کا مظہر تھا" میرے خیال میں یہ بات تبصرہ کے ساتھ ہی لکھ دینے

کی تھی کہ اتنی ردّ و قدح کے بعد اس قدر تاخیر سے، جب وہ انفرادی [illegible] تبصرہ نگار کا عقیدہ وہی ہے جو جمہور اہلِ سنت کا رجحان و عقیدہ ہے ــــ جیسا کہ آپ کے بقول انھوں نے آپ کو مطلع کیا ہے ــــ پھر آخر انھیں اپنی انفرادی رائے سے صاف اور صریح رجوع کا اعلان کرنے میں کیا امر مانع ہے؟ جبکہ ان کے عقیدے سے ان کی رائے ٹکرا گئی ہے۔ اور کیا رائے اور عقیدے میں فرق رکھنے کی شرعاً گنجائش ہے؟ تبصرہ نگار اس پر غور فرمائیں۔

آپ تحریر فرماتے ہیں ـ "دفتر کو تبصرہ کی تائید و تحسین میں بعض خطوط ملے اور بعض خطوط ردّ و اعتراض میں، ان سب کے شائع کرنے کے لئے "تعمیر حیات" کے صفحات متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

احقر عرض کرتا ہے کہ تبصرہ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال جس کا تعلق عقیدہ و ایمان کی سلامتی سے ہو، کے متعلق بھی اگر آپ خطوط کی اشاعت سے گریز کریں اور "تعمیر حیات" کے کچھ ہی شماروں کو ان کا متحمل نہ بنا سکیں تو یہ نہایت افسوسناک بات ہے، آپ کو دو چار خطوط دونوں طرف کے شائع کر دینے ہی چاہئے تھے تاکہ پتہ چلتا کہ کون کیا رجحان رکھتا ہے۔ اور آپ حضرات سے بدگمانی اور سوءِ ظن کی راہ نہ کھلتی، پھر آپ یہ سلسلہ بند کر دیتے۔

آپ کی یہ بات پڑھ کر بہت تعجب ہوا کہ "دفتر کو تبصرہ کی تائید و تحسین میں بعض خطوط ملے":

تائید و تحسین میں کس کے خطوط ملے؟ یقین ہے کہ یہ وہی لوگ ہوں گے، دشمنیٔ صحابہؓ جن کا ہمیشہ سے وتیرہ رہا ہے۔ یا پھر وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو اپنوں میں ہوتے ہوئے عقیدہ و مسلک کی گہرائی و گیرائی اور فقہی بصیرت و مہارت کو اختلاف و افتراق کا ذریعہ قرار دے کر دامن جھٹک کر گزر جاتے ہوں، کیونکہ یہ چیزیں بہرحال جانکاہی، دقتِ نظر اور محنت و مشقت کی طالب ہیں، عقیدہ و مسلک کا معاملہ سطحی مطالعے، ثانوی حوالوں اور غیر مستند مصنفین کی تحریروں سے حل نہیں ہوتا۔

اسی طرح مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے تبصرہ کے رد میں خطوط لکھے وہ شرعی مسائل و معاملات میں درک رکھنے والے معتبر و مستند افراد یا ان سے متسلک حضرات ہوں گے کیونکہ اس قسم کے افراد سے تبصرہ میں ظاہر کردہ رجحان ورائے کے رد و ابطال کے سوا تائید و تحسین کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔

تبصرہ نگار بلکہ ہر اس شخص کو جو "واقعۂ کربلا اور اس کا تاریخی پس منظر" کے مصنف کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہو علمی و تحقیقی انداز میں کتاب پر رد و اعتراض کا حق ہے مگر خدارا ناموسِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر حرف نہ آئے۔ والسلام جمیل احمد نذیری

نوٹ:۔ اس خط کی فوٹو کاپی حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی دامت برکاتہم کے نام بھی بھیجی جا رہی ہے۔

(۶)

سید خالد محمود
قاضی پورہ - بہرائچ
۲۳ مئی ۹۲ء

محترم مدیر صاحب ماہنامہ "الفرقان لکھنؤ"

"قومی آواز" کے نام ایک مراسلے کی نقل ارسال خدمت ہے گزارش ہے کہ "الفرقان" میں بھی اسے جگہ عنایت فرمائیں۔ والسلام

مکرمی۔ کل کی ڈاک میں ماہنامہ "الفرقان" کا مئی جون ۹۲ء کا مشترکہ جریدہ "خاص اشاعت" کے نام سے ہاتھ میں کیا آیا کہ حسب دستور رسالے کے مستقل کالم نگاہِ اولیں کا تھوڑا حصہ پڑھتے ہی آپ یقین کریں لرزہ آگیا۔ جلدی جلدی ... پڑھا اور دل و دماغ سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کا بار بار ورد ... ہوتا رہا۔ دل و دماغ عقل یہ سب قبول کرنے کو کسی طرح تیار نہیں ہو رہا تھا کہ بیسویں صدی کے اواخر میں یا یوں کہہ لیں کہ قمری پندرہویں صدی کے اوائل میں ہی اس طرح کا حادثۂ جانکاہ رونما ہوگا جس کی تفصیلات سے مسلمانانِ ہند کو ایسا دھچکا لگے گا ....

.... عالمی شہرت یافتہ تعلیمی مرکز ....
.... ندوۃ العلماء لکھنؤ کے موجودہ معتمد تعلیم مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب اپنے قلم سے ندوہ کے ترجمان "تعمیر حیات" کے صفحات پر...... مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی نئی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایسے الفاظ کا استعمال کریں گے جس سے ہر دو فریقین کے ذاتی تعلقات پر جو کچھ ضرب آئے گی سو آئے گی ساتھ ہی اسلامی عقائد کے چودہ سو سال پرانے مضبوط قلعہ کی چولیں ہل جائیں گی، جس کے بعض جملوں سے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی رح کے خلافتِ راشدہ پر تحقیقی کاموں پر پانی پھرتا نظر آتا ہے، اور لاتعداد مجھ جیسے حقیر طالبِ علم سیرُ الصحابہ کے دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت برپا ہوگئی ہے (عرض کر دوں کہ مولانا عبدالشکور فاروقی رح کی مشہور زمانہ کتاب "خلفائے راشدین" کا انگریزی میں ترجمہ اس خاکسار نے ابھی ابھی چند ماہ قبل مکمل کر کے مولانا کی پشتِ سوئم کی فرمائش پر ان حضرات کے حوالے کیا ہے۔)

"الفرقان" کے اس خصوصی شمارہ میں مولانا سجاد ندوی مدیر الفرقان نے نہایت دیانتداری سے کتاب مذکور پر عباس ندوی صاحب کا تبصرہ، اس کی اشاعت کے بعد خود مولانا منظور نعمانی صاحب کا اپنی تمام زندگی میں دل کی گہرائی سے بلکہ خون جگر میں ڈبو کر لکھا مولانا علی میاں صاحب قبلہ کے نام خط مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کا خط بنام مولانا عباس ندوی صاحب، مراسلہ بنام مدیر تعمیر حیات از طرف مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی من و عن شائع کر کے اتمام حجت کر دیا ہے، یقین کامل تو یہی ہے اور دل سے دعا بھی کہ اس خصوصی شمارہ کے ایک ایک لفظ کو پڑھ کر مولانا عباس ندوی صاحب کو سانحۂ عظیم کی نزاکت کا احساس ضرور ہو جائے گا بلکہ اب تک ہو گیا ہوگا۔

خون جگر میں ڈوبے اپنے اس نوک قلم سے میں آنجناب حضرت مولانا علی میاں

صاحب قبلہ دامت فیوضہم سے دست بستہ گذارش کروں گا کہ عجلت میں اپنے تمام تر اختیارات کا برمحل استعمال کرتے ہوئے اس اٹھتے طوفان کو یہیں روکنے کی کوشش میں وظائف و نوافل ملتوی کرکے اپنے فرائض منصبی کے حقوق ادا فرماکر بے شمار دل گرفتہ دلوں کو سکون قلبی عطا فرمائیں ورنہ مستقبل کا مؤرخ اس بھیانک موڑ کی تصویر کو مزید بگاڑ کر پیش کرنے کو تیار بیٹھا ہے۔

آخر میں اتنا عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا علی میاں صاحب مدظلہ العالی اور مولانا منظور نعمانی صاحب ہر دو بزرگانِ ملت سے قریبی تعلق پر فخر ہے۔ اپنے والد ماجد مرحوم سید محمود حسن صاحب بہرائچ کے ہر دو مولانا محترم سے عقیدت، غریب خانے پر ہر دو علماء کرام کی جوتیاں میں نے بھی سیدھی کی ہیں۔ والد مرحوم کی تصنیف کردہ کتاب "قرآن پاک کی بیسک ریڈرز" پر حضرت مولانا نعمانی صاحب کا تحریر کردہ مقدمہ اور کتاب مذکور کی حضرت مولانا علی میاں صاحب کے دست مبارک سے رسم اجراء وغیرہ مجھے آج بھی فخر و مسرت کے احساس سے مالا مال کرتی ہیں، ہر دو حضرات سے دل کی گہرائی سے التماس ہے کہ عقائد میں آنے والے بحران سے سب کو بچائیں ورنہ ماضی حال اور مستقبل سب پارہ پارہ ہو جائیں گے۔

سید خالد محمود
ریڈر شعبہ باٹنی ترھبوت یونیورسٹی نیپال
قاضی پورہ - بہرائچ

(۷)

(مولانا) تسخیر الحسن ندوی
شریف آباد، بارہ بنکی

محترمی و مکرمی جناب مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب! السلام علیکم

"واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر"..... دستیاب ہوئی، میں نے اس کو بار بار پڑھا اور ہر بار معلومات میں اضافہ ہوا، اپنے حلقۂ احباب میں بھی بغرض مطالعہ دیا اور ابھی احباب کے مطالعہ کا سلسلہ جاری ہے بہتوں کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں، اور حقیقت عیاں ہو گئی۔

مجھے کتاب کی جو خصوصیات نظر آئیں وہ یہ ہیں کہ آپ نے عدل و انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ سیدنا حضرت حسینؓ کی شان و عظمت وعلوّ مرتبہ کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے حضرت امیر معاویہؓ کے صحابیت کے مرتبہ کا حق بھی ہر وقت نگاہ کے سامنے رہا ہے۔ یزید کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے۔ یقیناً آپ نے اس کے لئے بہت عمیق مطالعہ کیا ہے اور تاریخ کے واقعات کو بہت ہی باریک بینی سے چھانا پھٹکا ہے۔ اس کے لئے آپ تہ دل سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دل یہ چاہتا ہے کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھ میں پہنچے اور دنیا کی اکثر زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوں۔ تاکہ جاہلانہ رسوم جو پھیلی ہوئی ہیں وہ ختم ہو سکیں۔

والسلام
تسخیر الحسن ندوی

(۸)

حضرت مولانا مفتی منظور احمد مظاہری
قاضی شہر، کانپور

محترم و مکرم مولانا خلیل الرحمن سجاد صاحب، مدیر الفرقان لکھنؤ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

جولائی کے شمارہ کے تمام مشتملات تو احقر کی نظر میں بہت مناسب ہے۔ البتہ آپکے تحریر کردہ "گذارش احوال واقعی" کے ایک حصہ پر مجھے بہت حیرت ہوئی اور اسی حیرت کے اظہار کیلئے اس وقت آپ سے مخاطب ہوں ـــ آپ نے ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی صاحب کے وضاحتی بیان کی ان آخری سطروں کے بارے میں جن میں انھوں کہا تھا:۔

"میں پھر پوری صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ میرے قلم سے جو غلط عبارت نکل گئی تھی اس سے میں رجوع کر چکا ہوں۔ مزید اپنی براءت ظاہر کرتا ہوں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں، اللہ تعالیٰ نے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقام بلند

کتاب وسنت میں بیان فرمایا ہے۔ میں اسی عقیدہ پر جینا اور مرنا چاہتا ہوں"۔

آپ نے لکھا ہے :۔

"ہم وضاحتی بیان کی ان آخری سطروں کی اس خبر پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور بخوشی تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب نے بالآخر اپنی قابلِ اعتراض "عبارت" سے رجوع کرلیا ہے"۔

آپ کا یہی وہ جملہ ہے جس پر مجھے سخت حیرت ہوئی، آپ نے ان آخری سطروں پر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا ہے ـــــ اور میرا تأثر یہ ہے کہ یہ آخری سطریں بھی کتمان وتقیہ والے اس مخصوص مزاج پر مبنی ہیں، جو اس گروہ منافقین کا شعار ہے جس کے مسلک کی مسلمانوں میں اشاعت وحمایت کا کام نہ جانے کن مقاصد کے تحت عبداللہ عباس صاحب نے سنبھال لیا ہے۔ عبداللہ عباس صاحب کی [illegible] ان آخری سطروں سے خوشی کے بجائے میری فکروتشویش تو دوچند ہوگئی ہے۔ میرے نقطۂ نظر پر غور کرتے وقت آپ اگر عبداللہ عباس صاحب کی یہ عبارت پیش نظر رکھیں تو بہتر ہوگا کہ :۔

"غزوۂ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقے کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا اس کے سربراہ ابوسفیان تھے، اسی طرح غزوۂ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار، یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مورخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے [illegible] مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا یا بقول سید قطب شہیدؒ "استسلام" کیا، مگر اس

"استسلام" کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے، اپنی انانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے"۔....

میرے نزدیک بالکل بدیہی بات یہ ہے کہ ان جملوں میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان سے رجوع کیلئے شرعی وعلمی طور پر صرف یہ کہہ دینا ہرگز کافی نہیں ہوگا کہ "میرے قلم سے جو غلط عبارت نکل گئی تھی، اس سے میں رجوع کرچکا ہوں، مزید اپنی براءت ظاہر کرتا ہوں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہوگا کہ عبداللہ عباس صاحب ان لوگوں کے خیالات کو پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ

دلائل کی روشنی میں، غلط قرار دیں جو یہ کہتے ہیں کہ بنو امیہ کے لوگوں نے فتح مکہ کے موقع پر حالات سے مجبور ہوکر ہتھیار تو ڈال دیئے تھے، مگر وہ دل سے کبھی مسلمان نہیں ہوئے (اور آگے چل کر انھوں نے اور ان کی اولادوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرکے بدر کا حساب چکایا، گویا غزوۂ احد میں ستر بڑے بڑے صحابہ کو شہید کرکے بھی اور اتنے ہی کو زخمی کرکے بھی ان کے دل کو قرار نہیں آیا تھا)

میں تو سمجھتا ہوں کہ ان حضرات کے اسلام کو سچا اسلام نہ ماننے والی مجرمانہ ذہنیت کے غلط ہونے کا جب تک صاف صاف اعتراف نہ ہو اور ان حضرات کے سچے مسلمان ہونے کا جب تک صاف صاف اعلان واقرار نہ ہو، کوئی علمی ذوق رکھنے والا شخص صرف اتنا کہہ دینے کو ہرگز رجوع شرعی نہیں قرار دے سکتا، جتنا انھوں نے کہا ہے، اور جتنے کو آپ نے بھی شاید کافی سمجھ لیا؛ انھوں نے جو لکھا کم از کم اپنے خیال میں تاریخی وعقلی دلائل کے حوالے سے لکھا، اور اس انداز سے لکھا جس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ یہ ان کے وہ خیالات ہیں جو ان کے دل ودماغ میں رچے بسے ہیں، پس کیا صرف عبارت اور الفاظ پر معذرت خواہی کی وجہ سے یہ مان لینا ممکن ہے کہ اب ان کے دماغ کے جالے صاف ہوگئے ہیں اور انھوں نے اپنے ان خیالات کا بالکل غلط ہونا صمیم قلب سے تسلیم کرلیا ہے؟

اس سلسلہ میں ایک اور بات جو اور زیادہ کھلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ عبداللہ ندوی صاحب نے پہلے تو کسی اور کے حوالہ سے کسی قدر ڈرتے ڈرتے یہ بات نقل کی کہ یہ لوگ فتح مکہ کے موقع پر اسلام نہیں لائے تھے، صرف مجبوراً ہتھیار ڈال دیئے تھے، اور پھر ذرا حوصلہ پاکر اس بنائے فاسد پر اپنا یہ خیال بھی ظاہر کرڈالا کہ: اس استسلام کے بعد (یعنی مقابلہ سے عاجز ہوکر ہتھیار ڈال دینے کے نتیجہ میں) اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہوگئی کہ وہ بدر کا غم بھول گئے اپنی انانیت کو بھول گئے "عقلاً محال بات ہے"۔

ذرا گہرائی سے غور کیجئے کیسی خطرناک بات اس شخص کی زبان سے نکلی ہے ـــــ یعنی یہ کہ اس گروہ کے دل سے بدر کا غم نکل جائے، یہ عقلاً محال ہے۔ یہ تو رکھئے گا کہ جو چیز عقلی طور پر محال ہوتی ہے اس کا وجود ناممکن ہوتا ہے ـــــ تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اس شخص کے خیال کے مطابق یہ ناممکن ہے کہ بنوامیہ کے جو لوگ فتح مکہ مکرمہ کے موقع پر اسلام لائے تھے، کبھی بھی ان کے

دل سے غزوۂ بدر کی شکست کا غم نکل سکے، اور کبھی وہ انانیت کو بھول سکے ہوں — اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ کیا ایسے گہرے اور فاسد دلائل پر مبنی خیالات کو صرف "عبارت کی لغزش" قرار دیا جاسکتا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ فکر و نظر کا فساد ہے؛ ورنتا ہر ہے کہ جب تک فاسد عقیدہ اور باطل خیالات سے علی الاعلان توبہ نہ کی جائے، صرف عبارت کی غلطی تسلیم کرلینے یا عبارت کو تھوڑا سا بدل دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس موقع پر اگر آپ عبداللہ عباس ندوی صاحب کے اس معصومانہ جملہ کو بھی پیش نظر رکھیں کہ یزید کے خلاف شدت جذبات میں میرے قلم سے ایک ایسی عبارت نکل گئی جس سے حضرت ابوسفیان، حضرت ہندہ اور بنی امیہ کے بعض دیگر صحابیوں کی تنقیص کا مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے — تو آپ کو موصوف کا تقیہ اور ڈھٹائی صاف نظر آجائے گی کہ پورے ایک کالم میں مزعومہ دلائل کی بنیاد پر اور غیر مبہم الفاظ میں ان صحابہ کو اسلام سے خارج کرنے کے بعد جب کسی ٹوکنے والے نے انھیں ٹوکا تو ان حضرت نے اپنے ان خیالات سے توبہ کرنے کے بجائے صرف اتنے اعتراف سے کام چلانے کی کوشش کی کہ ہاں! میری عبارت سے ان صحابہ کی تنقیص کا مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے۔

بہر حال میرا مدعا یہی ہے کہ اپنے وضاحتی بیان میں بھی عباس ندوی صاحب نے ہرگز ہرگز اپنے فاسد خیالات سے رجوع نہیں کیا ہے، بلکہ عام لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔ کم از کم آپ حضرات کو اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ یہ ایک علمی مسئلہ ہے، عوام اس کی نزاکت اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرا یہ عریضہ بھی الفرقان میں شائع کردیں۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو حق کی نصرت پر ثابت قدم رکھے، حضرت مولانا نعمانی دامت برکاتہم اور مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کی خدمت میں احقر کا سلام اور درخواستِ دعا پیش فرمادیں۔ (لے حاشیہ اگلے صفحے پر)

والسلام

منظور احمد مظاہری

قاضی شہر، کانپور

۸ رجولائی ۱۹۹۳ء

(۹)

مولانا امام علی دانش
ادارہ محمودیہ، محمدی (کھیری)

مکرمی مدیر "الفرقان" — حافاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

محترمی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی کتاب اور اس پر "تعمیر حیات" کا تبصرہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب تحقیقی ہے انداز بیان بھی سنجیدہ اور علمی ہے مصنف نے امکانی حد تک اظہار رائے میں غیر جانبداری کو برقرار رکھا ہے، البتہ زبان بوجھل ہے سلیس ہونا چاہئے تھی

"تعمیر حیات" کا تبصرہ بہت ہی دل آزار، گمراہ کن اور رفض پرور ہے۔ ندوی تبصرہ نگار نے اسلامی عقائد سے انحراف کیا ہے صحابہ کرامؓ کے ایک پورے گروہ کو (معاذ اللہ) مسلم نہ تسلیم کرنا اور ان کے دلوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف نہ کہنا قرآن و حدیث کے خلاف ہے، صحبت نبوی کی اعجازی تاثیر کا انکار ہے واقعۂ کربلا کا غزوہ بدر سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے اس قسم کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جنکو قاتلین عثمانؓ اور دشمنان حسینؓ سے ہمدردی ہے وہ منافقین اسلام کی بدکرداریوں سے توجہ ہٹانے کے لئے ہر واقعہ کو بنو امیہ اور بنو ہاشم کی عداوت پر محمول کرتے رہتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیرینہ عداوتوں کو مٹا کر صحابہ کرام کے قلوب کو آپس میں ملا دیا اور ان میں الفت ڈالدی (جس پر قرآن شاہد ہے) پھر بیان قرآنی کے خلاف ان میں عداوت و

(حاشیہ سابقہ صفحہ)

لہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے اعلان رجوع کے بارے میں اسی قسم کے احساسات ہم لوگوں کے بھی تھے، اور اسی وجہ سے ہم نے "عبارت" سے رجوع پر اظہار مسرت کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ:۔

"مگر اس خوشی کے ساتھ ہم اس تمنا کا اظہار بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ کاش وہ اپنے اس اعلان رجوع کے حق کو بے بنیاد الزامات سے داغدار نہ کرتے اور امید کرتے ہیں کہ زیادہ صاف لفظوں میں اور کسی ملاوٹ کے بغیر صرف عبارت نہیں بلکہ اپنے ان خیالات اور تاریخی تجزیے سے بھی اعلان رجوع فرمائیں گے جو اس سارے ہنگامہ کا باعث بنے ہیں۔۔۔"

افسوس کہ ہماری یہ امید پوری نہ ہوئی، اور اسی بنا پر حضرت مولانا مفتی منظور احمد صاحب کا یہ مکتوب شائع کرنے کا فیصلہ ہمیں کرنا پڑا — الفرقان

بغض ثابت کرنا کہاں کا اسلام و ایمان ہے۔ ندوہ کے منتظمین کو اپنے آدمی کی حمایت میں عقائد اسلامی کے معاملہ میں تہاون سے اور مداہنت سے کام نہیں لینا چاہیئے ایسے شخص کو جو صحابہ کرامؓ سے بغض کا مظاہرہ کرے اور توجہ دلانے پر بھی مسلمانوں کی دل آزاری سے باز نہ آئے اور بر سر عام معافی نہ مانگے ممکن حد تک اپنے سے الگ رکھنا ضروری ہے احقر بہت علیل تھا اب کچھ حالت سنبھلی ہے۔ یہ خط دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کیلئے ضروری سمجھ کر تحریر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ غلطیوں کو معاف فرمائے۔ آمین

ادارہ کے دیگر اساتذہ کرام بھی "تعمیر حیات" کے تبصرہ کے اس حصہ کو جس میں صحابہ کرامؓ کے ایک طبقہ کی مذمت لکھی گئی ہے گمراہ کن قرار دیتے ہیں اور نفس کتاب پر جس انداز سے اظہار رائے ہوا ہے اسے بھی ناپسند کرتے ہیں البتہ اقدام حسینؓ کو برحق سمجھتے ہیں۔

دعاؤں کا بہت حاجت مند ہوں۔ اگر موقع ہو تو حضرت مولانا منظور صاحب دامت برکاتہم سے سلام و درخواست دعا عرض کردیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عافیت دارین سے نوازے۔ آمین

والسلام

احقر نام علی دانش عفی عنہ صدر المدرسین ادارہ محمودیہ محمدی ضلع لکھیم پور کھیری

١٠

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترم و مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ڈاکٹر خالد صدیقی صاحب کی معرفت آپ کا انتہائی حسین، وقیع علمی تحفہ "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" ملا۔ اس خصوصی عنایت کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون و متشکر ہوں حقیقت تو یہ ہے کہ اس جذبۂ امتنان کے اظہار کے لئے نہ میرے پاس مناسب الفاظ ہیں اور نہ ان کو ادا کرنے کی مجھ میں صلاحیت ہے۔

آپ قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے پورے واقعات کی تفصیلات بڑی تحقیق و جستجو سے جمع کیں اور ان پر غیر جانبدارانہ محاکمہ فرمایا، ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا اور کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا، یہ بات یقیناً باعث اجر عظیم ہے۔ اللہ نے آپ کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان میں سے ایک بہت بڑی نعمت اپنی بات کو واضح اور مدلل انداز میں پیش کرنے کا ملکہ بھی ہے۔ اس کے ساتھ انداز

بیان بھی سلیس اور شگفتہ ہے۔ اس سے عام قاری متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نے جس انداز سے جناب یزید کی کردار کشی کا پردہ فاش کیا ہے وہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ انشاء اللہ آپ کی سعی مشکور ہوگی اور جلد یا بہ دیر آپ کی حقیقت پسندی اور غیر جانبدارانہ رویہ سے متأثر ہو کر لوگ راہ راست پر آئیں گے۔

جناب یزید کی زندگی میں فتح قسطنطنیہ (۴۸ھ - ۶۶۹ء) کا واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس زمانہ میں عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "پہلا لشکر میری امت کا جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگا وہ مغفرت یافتہ ہے" چنانچہ حضرت عبداللہ عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسین ابن علی اور حضرت ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہ نے اس وعدۂ مغفرت کے شوق میں بڑے جوش و خروش سے حضرت امیر معاویہؓ کے تشکیل دیئے ہوئے لشکر میں شرکت فرمائی اور میدان جنگ میں داد شجاعت دی۔ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت سفیان بن عوف تھے۔ اور آپ کے ماتحت لشکر کے ایک حصہ کے سردار جناب یزید تھے۔ آپ نے اس جہاد میں جس بہادری، دلیری اور عسکری صلاحیت کا ثبوت دیا، اس پر ہمارے مورخین رطب اللسان ہیں۔ اس جنگ میں آپ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس لشکر میں آپ کو جو امتیازی حیثیت دی گئی تھی، وہ محض ولی عہدی کے طفیل نہیں ملی تھی، بلکہ غیر معمولی عسکری صلاحیت اور فقید المثال شجاعت کے سبب حاصل ہوئی تھی۔ کیا انکی بزرگی کے لئے یہی ایک واقعہ کافی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ حضورؐ کا ارشاد گرامی غیر مشروط ہے۔ کیا یہ بشارت کسی ایسے شخص کیلئے ہو سکتی تھی جو بعد میں فاسق و فاجر ہو جائے، تارک صلوٰۃ ہو جائے، لہو و لعب میں پڑ جائے، تمام اخلاقی حدود کو پار کر جائے، انسانیت کو بالائے طاق رکھ دے، سبط رسول کی نعش کی بے حرمتی کرے یا کسی بھی درجے میں تقویٰ کی راہ سے ہٹ جائے۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں اور جناب یزید میں اس قسم کے نقائص تلاش کرتے ہیں، وہ اس بشارت کی توہین کرتے ہیں۔ آپ نے درست لکھا ہے: علاوہ ازیں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اگر اتنے سنگین عیب یزید میں پائے جاتے اور اسکی ولی عہدی سے شدید اختلاف کرنیوالے حضرات انکی طرف اشارہ نہ کرتے جبکہ یہ کوئی چھپے رہنے والے عیب نہیں تھے۔ اور نہ ہی حقیقت میں یہ ہو سکتا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ ایسے فرزند کو جو ترک نماز اور اماتت صلوٰۃ کا عادی ہو

اس اُمت پر خلیفہ بنا کر مسلط کر دیں جس کی سب سے بڑی پہچان اقامت صلوٰۃ ہے" اس سے حضرت امیر معاویہؓ اور جناب یزید دونوں کی پوزیشن بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

آخر میں آپ اگر اجازت دیں تو چند باتیں بطور شکایت عرض کر دوں۔ جو گرچہ سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیجئے۔ جیسا کہ آپ نے بھی واضح کیا ہے۔ اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا کہ جناب یزید خلافت کے نشہ میں اتنے سرشار ہو گئے کہ تمام اخلاقیات کو نقش و نگار طاق نسیاں بنا دیا اور صلوٰۃ جیسے اسلام کے بنیادی رکن سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ہمیں مستند عصری شہادت بھی نہیں ملتی بلکہ نہایت مؤثر معاصر شہادتیں تردید میں پائی جاتی ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود آپ نے ان کا تذکرہ ہر جگہ بے تکریمی اور بے تحریمی سے کیا ہے۔ اس کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جناب یزید کے سلسلہ میں آپ کے ذہن میں اب بھی کچھ تحفظات ہیں یا اس قوم اور اس گروہ کا خوف غالب ہے جو پوری طرح سے شیعیت کے زیر اثر ہے۔ اسکے برخلاف آپ نے اُن حضرات کیلئے تکریمی الفاظ کا استعمال مسلسل کیا ہے جو واضح طور پر حضرت حسین کی شہادت کے ذمہ دار ہیں۔ طبری نے ایک روایت حضرت محمد الباقر کے حوالے سے درج کی ہے۔ اسے آپ نے صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹ پر نقل کیا ہے۔ اسکی رو سے سانحۂ کربلا کی تمام تر ذمہ داری مسلم بن عقیلؓ کے بھائیوں کے سر [illegible] اسکے باوجود آپ نے اِن برادران مسلم تک کا تذکرہ ادب و احترام سے کیا ہے۔ جناب یزید ان لوگوں سے یقیناً بدرجہا بہتر تھے۔

اِن حضرات کے علاوہ آپ نے جن لوگوں کا بھی تذکرہ کیا ہے یا حوالہ دیا ہے ان سب کے ساتھ آپ نے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا ہے حتیٰ کہ مولانا علی نقی جن پر آپ نے اخفائے حقیقت اور کذب و افترا کا الزام لگایا ہے (اور اس میں آپ صد فی صد حق بجانب ہیں) ان کا تذکرہ بھی آپ نے شیعہ عالم جناب سید علی نقی صاحب اور مولانا نقن صاحب جیسے القاب و آداب کے ساتھ کیا ہے۔ ہمارے مولانا مودودی بھی واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں شیعہ حضرات سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔ جناب یزید کی خلافت کے سلسلہ میں آپ نے انکی جو عبارت نقل کی ہے۔ اس میں انھوں نے حضرت امیر معاویہؓ اور جناب یزید دونوں کو لپیٹ دیا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ صرف جناب یزید کے والد ہی نہیں ہیں تو تاریخ اسلام کا ایک عظیم الشان باب ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کاتب وحی کی حیثیت سے وہ جس پر عظمت اور بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔ اس کا صحیح اندازہ کرنا بھی ہم لوگوں کیلئے مشکل ہے۔ چہ جائیکہ انکے کسی عمل پر ہم غیر ضروری حرف گیری کریں۔ اسکے علاوہ بھی خلفائے راشدین کو ہدف تنقید بنانا مودودی صاحب

کا عام وطیرہ رہا ہے جناب یزید سے تو کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی جاتی مودودی صاحب کا تذکرہ بھی آپ نے ادب و احترام سے کیا ہے۔ کیا جناب یزید نقن صاحب اور مودودی صاحب سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔

والسلام محمد ضیاء الدین انصاری
۲۲ر جون ۱۹۹۲ء علی گڑھ

⑪

پروفیسر محمد حاجن شیخ حیدرآباد۔ سندھ (پاکستان) مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا خط مورخہ ۲۰ر۷ر۹۲ء موصول ہوا۔ ۴ عدد واقعۂ کربلا پہونچ گئی۔

حضرت مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب نے کتاب "واقعۂ کربلا" تصنیف فرما کر ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں ۱۹۵۲ء سے لیکر ۱۹۸۳ء تک اسلامی تواریخ کا پروفیسر رہا ہوں میں نے پرچہ "بنو امیہ" ایم اے والوں کو نو سال "انگریزی زبان" میں ۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک پڑھایا ہے جس میں شیعہ طلبہ بھی موجود ہوتے تھے۔ اکثر حقائق جو حضرت مولانا نے دیئے ہیں ان کی تصدیق انگریزی زبان کی کتابوں میں بھی موجود تھی جن حالات میں حضرت حسینؓ کا خروج یزید کے مقابلہ میں تھا وہ اس وقت سازگار تھے اور نہ اس وقت کوئی مصلحت تھی لیکن خدا تعالیٰ کی مشیت تھی جس کے تحت یہ سانحہ وجود میں آیا جس میں مستقبل میں امت محمدیہ کے لئے رہنمائی ہے۔

فقط والسلام
بندہ محمد حاجن شیخ
۱۲ر اگست ۹۲ء

⑫

جناب عزیز الٰہی خاں صاحب (علیگ) حسن پور۔ (ضلع مرادآباد)

حضرت مخدومنا دام ظلکم! (حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کے نام مکتوب سے اقتباس)

چند ماہ سے جو اضطراب تعمیر حیات میں شائع شدہ تبصرہ (اور اُسکے نتیجہ میں بدمزگی اور انہونی ناقابل قیاس وگمان باتیں ظہور میں آگئی تھیں) پیدا ہو گیا تھا اس کے دفعیہ کیلئے مولانا عتیق الرحمن صاحب کی وقیع کتاب "واقعۂ کربلا اور اُس کا پس منظر" دوبارہ غور و فکر کے ساتھ دیکھی تو الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ علیہ السلام کے اہل بیت سے خود بخود تعلق و محبت میں اضافہ ہی اضافہ محسوس ہوا، نیز اب روزانہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے رفقاء کرام کے لئے ایصال ثواب کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اور مولانا موصوف کے لئے دعا نکلتی ہے، کہ کتنے اِشکالات اور توہمات اُن کی سعی و محنت نے بندہ کے دور کر دیئے۔

فقط بندۂ عاجز و فانی عزیز الہی عفی عنہ،
۵/۸/۹۲ء

(۱۳)

جناب امین الحسن رضوی (سابق ایڈیٹر ریڈینس دہلی) مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر کی تالیف پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے صفحہ ۱۳۱ پر یہ جملہ البتہ کھٹکتا ہے (یزید بڑا متقی و پرہیزگار ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا" مجھے یہ جملہ یکسر غیر ضروری اور یک گونہ معذرت خواہانہ لگتا ہے۔

حضرت یزید اول جہاد قسطنطنیہ میں حصہ لینے کے باعث (جس میں ان کی شمولیت اور ایک دستہ کی قیادت جس دستہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ شامل تھے غیر اختلافی اور تسلیم شدہ تاریخی حقیقت ہے)، مبشر بالجنہ اور غازی بہرحال ہیں پھر انکے بارے میں اس غالب گمان (بدگمانی) کی ضرورت ہی کیا ہے۔

بمبئی میں نہایت مختصر ملاقات ہوئی۔ امید کہ بخیر ہوں گے۔ والد صاحب قبلہ سے سلام فرمائیں۔

امین الحسن رضوی
۱۰/ جون ۱۹۹۲ء

یہ کتاب
ہندوستانی پاکستانی مبصرین کی نظر میں

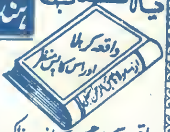

"اردو تصنیفات میں تحقیق کی ہمیشہ شدید کمی محسوس کی گئی ہے۔ اور اگر اس تحقیق کا تعلق اسلامی تاریخ کے ایک ایسے المناک واقعے ہو جس کے اندوہناک اثرات تنازع، اختلاف اور تشدد آمیز ردعمل کی صورت میں رونما ہوئے ہوں تو اس کی ضرورت اور اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن نے اپنی اس تصنیف میں، جسے ان کے وسیع مطالعہ کا شاہکار کہنا چاہیے، اس علمی ضرورت کو پورا کیا ہے"۔ . . .

"مولانا عتیق الرحمٰن کی کتاب فکر انگیز، پُراز معلومات اور تاریخ پر مبنی ہے۔ کربلا کے واقعہ پر تحقیق کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے"۔

(یونیورسل میسیج ۔ کراچی ۔ بابت جولائی [illegible] سے ترجمہ)

"اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصحاب رسولؐ کے سلسلہ میں اُمت کے اجماعی عقیدۂ احترام واعتبار کو قارئین کے ذہنوں میں راسخ کرانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اور یہی وہ ایک خدمت ہے جو ان شاء اللہ اجر اخروی سے خالی نہ ہوگی۔ کیونکہ واقعہ کربلا جیسے اہم نزاعی اور ہنگامہ خیز و ہنگامہ پرور عنوان پر قلم اٹھانے کے بعد "سبائی اور خارجی" دونوں فکروں سے دامن بچا کر اہلسنت کی معتدل فکر کو اپنا کر نباہ دینا، اور مقام صحابیت کے سلسلہ میں بنوامیہ و بنوہاشم کے درمیان تفریق نہ برتنا، اور یک چشمی و کور باطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنوہاشم سے اظہار عقیدت کے لیے بنوامیہ کو، یا بنوامیہ سے اظہار عقیدت کے لیے بنوہاشم کو مطعون کرنے کی غیر معتدل بلکہ غیر اسلامی فکر سے عافیت کے ساتھ دامن بچالے جانا بھی ایک بہت اہم اور لائق مبارکباد کارنامہ ہے"۔

(ماہنامہ البدر، کاکوری، لکھنؤ، بابت اپریل مئی [illegible])

"واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا ہمیشہ ایک نازک مسئلہ بنا رہا اس لیے اس پر قلم اٹھانا بڑا نازک بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک راہ اعتدال قائم کرنے کے ہم معنی ہے، اور جب کسی مسئلہ کے سلسلے میں دو انتہاؤں کے ماننے والوں نے اپنی بات کو حقیقت سمجھ لیا ہو تو پھر درمیانی راہ اختیار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے اس کتاب میں تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے بھی اپنے قلم کو بڑی حد تک انتہا پسندی سے بچائے رکھا ہے"۔

(ماہنامہ الرشاد اعظم گڈھ ۔ بابت اپریل [illegible])

"فاضل مصنف نے دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسی راہ اعتدال تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس سے نہ کسی صحابی رسولؐ کے کردار پر حرف آئے اور نہ بے جا تعصب سے کام لیا جائے۔ وہ یقیناً اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں"۔

(ماہنامہ تدبر لاہور ۔۔۔۔۔ بابت مئی [illegible])